فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ

فتاویٰ قاسمیه

منتخب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

خادم الافتاء و الحدیث جامعه قاسمیه

مدرسه شاهی مرادآباد، الهند

(جلد ۱۹)

المجلد الثامن عشر

بقیة الوقف باب المدارس، کتاب البیوع، البیع الصحیح الفاسد، المرابحه، الصرف، السلم، الاستصناع، الوفاء، الشفعة، المزارعة

۸۴۰۹ ——— ۸۸۵۶

ناشر

مکتبه اشرفیه، دیوبند، الهند

01336-223082

فتاویٰ قاسمیہ

صاحب فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی شبیر احمد القاسمی

پہلا ایڈیشن محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

ناشر

مکتبہ اشرفیہ، دیوبند، ضلع سہارنپور، الهند

01336-223082

ASHRAFI BOOK DEPOT

DEOBAND, SAHARANPUR, INDIA

Phone: 01336-223082

Mob. : 09358001571،08810383186

مکمل اجمالی فهرست ایک نظر میں

❖❖ ❍❖❍

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

٢٤/ بقية كتاب الوقف

	٩/ باب المدارس	٣٢

مسئلہ نمبر — صفحہ نمبر

الفصل الأول: في المدارس

❑	**الفصل الثاني: في التولية**	۶۹

الفصل الثالث: في المدرسين ۸۶

❑	الفصل الرابع:	۱۱۷

مدارس میں سرکاری اور غیر مسلم کا مال صرف کرنے کا حکم

الفصل الخامس: في التصرف ۱۳۸

❐	**الفصل السادس: اشیائے مدرسہ کی منتقلی کے احکام**	۱٦۸

❐	**الفصل السابع: في الإجارة**	۱۸۱

الفصل الثامن: في المشاهرة ١٩٥

۲۵/ کتاب البیوع

	۱/ باب البیع الصحیح	۲۴۸

۳۶۰	۲/ باب الخیار	❒

۳۷۲	۳/ باب العربون	❒

۵/ باب حط الثمن وزیادته نقدا و نسیئة	۵۰۱

۵۲۳	۶/ باب المرابحة	❐

۵۳۲	۷/ بيع التلجئة	❐

❐	۸/ باب الصرف	۵۷۵

	۹ / باب السلم	۵۸۷

❑	۱۰/ باب الاستصناع	۶۰۹

❐	۱۱ / باب بیع الوفاء	۶۶۱

۱۳ / باب المزارعة ۷۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۲۴/ بقية كتاب الوقف

۹/ باب المدارس

الفصل الأول: في المدارس

کیا مدرسوں میں دین پڑھایا جاتا ہے سکھایا نہیں جاتا؟

سوال [۸۴۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:
(۱) ایک شخص نے یہ کہا ہے کہ مدارس میں دین پڑھایا جاتا ہے، دین سکھایا نہیں جاتا اور دوسرے شخص نے بھی یہی کہا ہے کہ میں دیانت داری سے کہتا ہوں کہ مدرسوں میں دین نہیں سکھایا جاتا پڑھایا جاتا ہے، مدرسوں میں دین پڑھایا جاتا ہے۔ کیا ان صاحب کی یہ بات صحیح ہے؟
(۲) حدیث شریف: ''**خیر کم من تعلم القرآن وعلمه**'' کا مصداق کیا مدارس نہیں ہیں؟ اگر مدرسہ والے یہ کہیں کہ اس حدیث کے مصداق ہم ہیں، تو یہ بات درست ہے یانہیں؟

المستفتی: عقیل الرحمٰن نہٹور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) شخص مذکور کا یہ جملہ کہ مدارس میں دین پڑھایا جاتا ہے سکھایا نہیں جاتا ناواقفیت پر مبنی ہے؛ کیوں کہ مدارسِ اسلامیہ میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا بھی انتظام ہوتا ہے۔
(۲) اس حدیث شریف کا صحیح مصداق مدارسِ اسلامیہ ہی ہیں، جن میں قرآن کریم کی تعلیم

اورتربیت دی جاتی ہے۔

ثـم الـخـطـاب عـام لا يـخـتـص بـالـصـحابة، ولو خص بهم فغيرهم بـالـطـريـق الأولىٰ، ولـكـن لا بـد مـن تـقـييد التعلم والتعليم بالإخلاص. (بذل المجهود، كتاب الصلاة، باب في ثواب قراءة القرآن، دارالبشائر الإسلامية ٦/ ١٦٠، تحت رقم الحديث: ١٤٥٢)

والحاصل أنه إذا كان خيرا لكلام كلام الله، فكذلك خير الناس بعد النبيين من يتعلم القرآن ويعلمه، لكن لا بد من تقييد التعلم والتعليم بالإخلاص. (مرقاة، كتاب فضائل القرآن، الفصل الأول، مكتبه إمداديه ملتان ٤/ ٣٣٣، حاشية ابن ماجة/ ١٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۹/۵/۱۴۳۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۴۴/۱۱۵)	۲۹/۵/۱۴۳۵ھ

دینی مذہبی ادارہ کو رجسٹریشن کرانے کا حکم

سوال [۸۴۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (الف) ایک مسئلہ ہے کہ جس کے مفصل احکام اصول فقہ کے مطابق علماء کرام نے بیان فرمائے اور تمام فقہی کتابوں میں اس کے اصول سے مستقل ابواب قائم فرمائے، ہندوستان میں موجودہ اوقاف بورڈوں کے قوانین وضوابط اسی پر مشتمل ہیں جو کہ خالص مسلمانوں کے لئے ہے۔

(ب) مگر رفاہ عام کے لئے قائم کردہ اداروں کے لئے سیکولر نظریات کی رعایت کرتے ہوئے ایک مشترکہ قانون سوسائٹی ایکٹ ۱۸۹۰ بھی ہے، جو کہ کسی مذہب کے لئے مخصوص نہیں ہے؛ بلکہ اس کے قواعد وضوابط مشترک ہیں اور ان کے منتظمین بلا تخصیص مذہب وملت

مشترک ٹرسٹیان (سوسائٹی) کہلاتے ہیں، ٹرسٹ میں کوئی مخصوص مقصد ضروری نہیں ......
ٹرسٹ مستحق استفادہ ہوسکتا ہے۔

(ج) ٹرسٹ ہمیشہ ملکی قانون کے مطابق ہوتا ہے (جو بدلتے رہتے ہیں) ٹرسٹ میں جائیداد کی ملکیت ٹرسٹیان ودیعت کرتی ہے اور مودع قانونی طور پر اس کا مالک ہوتا ہے۔

(د) اور ناقابل تنسیخ ہونا ضروری نہیں، ٹرسٹ کی جائیداد ٹرسٹی فروخت کرسکتا ہے، غرض ٹرسٹ فقہ انگریزی کا تصور ہے، جب کہ وقف فقہ اسلامی کا ایک خاص مذہبی تصور ہے۔

(ہ) مذکورہ بالا ایکٹ ۱۸۶۰ کی دفعات کے مطالبہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے حکومت اور افسران (غیر مسلم) کے انتظامی معاملات میں مداخلت کا قانونی جواز فراہم ہوتا ہے، ایکٹ مذکور کی دفعہ ۲۳ر کے تحت رجسٹرار کو سوسائٹی کے حسابات کی جانچ کرنے دیگر معاملات کی جانچ کرنے اور اپنی تحقیقات کے نتیجہ میں سوسائٹی کو بذریعہ عدالت تحصیل کرنے کا اختیار ہوتا ہے، دفعہ ۱۲ر کے تحت تحلیل شدہ سوسائٹی کی جائیداد حکومت کو دے دی جاتی ہے۔ ۹۲۰ر ضابطہ دیوانی کے تحت بلا تخصیص مذہب وملت ایک عام ہندوستانی۔

(ی) شہری حساب فہمی وغیرہ کی دادرسی کا حقدار ہوجاتا ہے، میری یقینی معلومات کے مطابق ایک اسی قسم کے درگاہ کے ہندو معتقدین نے بارہ بنکی عدالت میں دعویٰ دائر کیا، ان جزئیات کی روشنی میں دریافت طلب امر یہ ہے:

(۱) کسی دینی مذہبی ادارہ کا رجسٹریشن سوسائٹی ایکٹ ۱۸۶۰ کرانا فرض، واجب، سنت میں سے کونسا درجہ رکھتا ہے؟

(۲) جب کہ اس قسم کے رجسٹریشن کے نتیجہ میں اختلاف پیدا ہوکر فتنہ کی شکل اختیار کرلے، جس سے قوم وملت کے وقار کا خطرہ ہو، مسلمان دو گروہ میں منقسم ہوکر ایک دوسرے کی بے عزتی اور قتل وخون پر آمادہ ہوجائیں، تو ایسے کام کے اصرار کرنے پر کیا حکم ہے؟

(۳) ایسا کام کرنے والوں کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ بینوا توجروا۔

(۴) اگر یہ صحیح و درست ہے تو منع کرنے یا اس سے اختلاف کرنے والے لوگوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد اشفاق عالم، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: احقر نے جن بڑے اداروں کا رجسٹریشن ہو چکا ہے ان کے رجسٹریشن فائلوں کا بغور مطالعہ کیا ہے، ان میں جو شرائط وقیودات مندرج ہیں، ان میں سے کوئی شرط فقہ اسلامی کے خلاف نہیں ہے؛ بلکہ ساری شرائط وقیودات فقہ اسلامی کے موافق اور ادارے کے حق میں مفید ومعاون ہیں؛ اس لئے ان میں کوئی تشویش کی بات نہیں۔

(الف) موجودہ دور میں مذہبی اداروں کا رجسٹریشن کرانا فقہ واصول فقہ کے خلاف نہیں۔

(ب) بلا تخصیص مذہب مشترک ہو تو سکتے ہیں، مذہب کی تخصیص کرنا لازم وضروری نہیں ہے؛ لیکن مذہب کی تخصیص بھی کر سکتے ہیں، جیسا کہ بعض بڑے اداروں کے رجسٹریشن فائلوں کے معائنہ کرنے پر صاف طور پر معلوم ہوا ہے کہ ان میں مذہبیت کی شرط بھی موجود ہے۔

(ج) جس کو آپ قانونی طور پر مالکیت سمجھ رہے ہیں وہ درست نہیں ہے؛ بلکہ وہ تصرفات کا ایک اختیار واقتدار ہے، جس کا مقصد صرف دوسروں کو غلط تصرفات سے روکنا ہے، جس کو شریعت کی اصطلاح میں منتظمانہ تصرف کہا جاتا ہے، نہ کہ مالکانہ؛ اس لئے کہ مالکانہ تصرف میں ساری آمدنی کو آپس میں تقسیم کر کے ذاتی استعمال میں صرف کیا جا سکتا ہے اور منتظمانہ تصرف میں ذاتی اخراجات میں خرچ نہیں کیا جا سکتا؛ بلکہ قانونی طور پر جو تنخواہ متعین ہوتی ہے وہی وصول کی جا سکتی ہے، اس سے زائد ایک پیسہ بھی نہیں لیا جا سکتا، نیز رجسٹریشن شدہ اداروں میں تو مجلس شوریٰ (سوسائٹی منتظمہ) کو تنخواہ بھی نہیں ملتی ہے؛ بلکہ صرف میٹنگ میں شرکت کے وقت آمد ورفت کے اخراجات ملتے ہیں۔

(د) اگرچہ سوسائٹی ٹرسٹ کو فقہ انگریزی کا تصور تسلیم کر لیا جائے، مگر فقہ اسلامی کے خلاف

بھی نہیں ہے۔

(ہ) ۱۸۶۰ء سے ایک سو انتالیس سال کے عرصہ میں کسی رجسٹریشن شدہ مذہبی اداروں کو نہ حکومت نے اپنے قبضہ میں لیا ہے اور نہ ہی کوئی غیر مسلم کسی رجسٹر شدہ ادارے کا منتظم ومقتدر ہوا ہے، یہ محض ذہنی تصورات وتشویشات ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

(ی) آپ نے جو بارہ بنکی کی عدالت کی نظیر پیش کی ہے اس کا فیصلہ اور نتیجہ اور پورے واقعہ کی تفصیل کی صحیح رپورٹ کے بعد غور کیا جا سکتا ہے، پھر بھی رجسٹریشن شدہ کوئی ادارہ ۱۲۹/سال کے عرصہ میں نہ حکومت کے قبضہ میں گیا اور نہ ہی غیر مسلم اس میں دخیل ہوئے۔

(۱) اس کا مدار ادارے کے ذمہ دار حضرات پر ہے، حالات کے اعتبار سے کبھی ذمہ داران پر واجب بھی ہوجاتا ہے۔ اور کبھی نہیں بھی ہوتا ہے۔

صاحب البيت أدرى بما فيه. (نخبة الفكر/٥)

(۲) اگر کسی صحیح کام پر اقدام کی وجہ سے دوسرے لوگ مسئلہ کی نزاکت پر غور کئے بغیر فتنہ وفساد پر اتر آئیں تو غلطی فتنہ کرنے والوں کی ہے، ان پر لازم ہے کہ خود کو فتنہ سے باز رکھ کر دوسروں کو فتنہ میں نہ مبتلا کریں۔

(۳) شرعی اعتبار سے رجسٹریشن کرانے والے حق پر ہیں؛ اس لئے ان پر شرعاً کوئی الزام نہیں۔

(۴) اختلاف کرنے والوں کو یا تو ۱۲۹/سال کے عرصہ میں واقع ہونے والے واضح نظائر پیش کرنے چاہئے یا اختلاف سے باز آجانا چاہئے؛ کیوں کہ رجسٹریشن کرانے میں کوئی شرعاً قباحت نہیں ہے، جو رجسٹریشن کے ہر پہلوں پر غور کرنے کے بعد پتہ چل سکتا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۳۸۵)

مجلسِ عاملہ ومجلسِ شوریٰ

سوال [۸۴۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی مدرسہ یا مسجد کی کوئی مجلسِ شوریٰ ہو اور وہ کمیٹی یا مجلسِ شوریٰ کوئی فیصلہ شریعت کے خلاف دے دے، تو شریعت کی بات مانی جائے گی یا کمیٹی کی؟ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ یہ کمیٹی اس مسجد یا مدرسہ کی بستی ہی میں سے ہونا ضروری ہے یا باہر کی کمیٹی بھی بنائی جا سکتی ہے؟ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس کمیٹی نے جو مجلسِ عاملہ تیار کی ہے اس مجلسِ عاملہ کو ہر پانچ سال میں تبدیل کرنا ضروری ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ کو واضح فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں عین نوازش ہوگی۔ والسلام

المستفتی: محمد معروف ساکن ویر پور تھان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مجلسِ شوریٰ یا کمیٹی شریعت کے خلاف فیصلہ کیسے دے سکتی ہے؟ اگر کوئی ایسا فیصلہ دیا ہے تو اس فیصلہ کو متعین کر کے واضح کریں کہ واقعی شریعت کے خلاف ہے اس کے بعد اس سلسلہ میں حکم شرعی لکھا جا سکتا ہے، مستفتی خود اپنے طور پر شریعت کے خلاف سمجھ رہا ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ پوچھا گیا ہے کہ مجلسِ شوریٰ یا کمیٹی کا بستی میں سے ہونا ضروری ہے یا باہر کی بھی بنائی جا سکتی ہے؟ تو اس سلسلے میں شریعت میں کوئی تعیین نہیں ہے، چاہے بستی کے لوگوں کو بنائیں یا سب باہر کے لوگ ہوں، یا کچھ باہر کے اور کچھ مقامی ہوں، ہر طرح جائز ہے، جیسا کہ خود ہمارے مدرسہ شاہی میں مقامی بھی ہیں اور باہر کے بھی ہیں۔ تیسرا مسئلہ یہ پوچھا گیا ہے کہ اس کمیٹی نے جو مجلس عاملہ تیار کی ہے اس مجلس عاملہ کو ہر پانچ سال میں تبدیل کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ اس مدرسہ یا مسجد کی کمیٹی کے اوپر موقوف ہے، چاہے ہر پانچ سال میں تبدیل کریں یا نہ کریں؛ اس لئے کہ مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط آپس کی تراضی اور

مشورہ کے مطابق ہوتے ہیں، جس میں قرآن وحدیث کے نصوص کے خلاف کوئی عمل نہ ہوجو ذیل کی حدیث شریف سے واضح ہوتا ہے:

عن عمرو بن عوف المزني أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، المستدرك للحاكم، كتاب الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز جديد ٧/ ٢٥٢٣، قديم ٤/ ١٠١، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١١٣، رقم: ٧٠٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍شوال ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۵۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸؍۱۰؍۱۴۳۴ھ

مجلسِ شوریٰ کے اختیارات

سوال [۸۴۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا تقرر تقریباً ۱۷؍سال قبل ایک ادارہ میں بحیثیت مدرس درجہ ناظرہ ہوا، ضابطہ کے تحت زید امور مفوضہ کی ادائیگی کرتا رہا، ناظم مدرسہ یا نائب مہتمم مدرسہ اپنے اختیار کے تحت مدرسہ کے دوسرے کام بھی زید سے لیتا تھا، جس کی وجہ سے آخری پانچ سال بحیثیت مدرس زید کی کارکردگی بہتر نہیں رہی اور زید کو خارجی کام نائب مہتمم مدرسہ زیادہ دیتا رہا، جس پر نائب مہتمم مدرسہ نے اپنے حکم نامہ مورخہ ۲۸؍۵؍۱۴۳۰ھ میں زید کو مدرس سے محرر تعلیمات میں عارضی طور پر منتقل کردیا، زید اس عہدے پر ۲۲؍ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ تک بحسن وخوبی کام کرتا رہا، ۲۵؍شوال المکرّم ۱۴۳۱ھ کو نائب مہتمم مدرسہ نے زید کو ایک حکم نامہ فراہمی چندہ سے متعلق جاری کیا، زید نے حسب الحکم ۵؍ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ کو مدرسہ ہذا کی ۲؍عدد رسید بک (جلد

نمبر: ۳۶۷، ۳۶۸) دفتر مالیات سے مع تصدیق نامہ چندہ حاصل کی، جن پر نائب مہتمم مدرسہ کے دستخط مع مہر وتاریخ کے ثبت ہیں۔ ۷/ ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ سے سفر فراہمی چندہ شروع کیا، تصدیق نامہ زید کو ۵/ ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ سے ۳۰/ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ تک جاری کیا گیا۔ اسی دوران مدرسہ مذکور جس میں زید ملازم ہے کی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس، جوکہ نامور علماء وصلحاء علاوہ ایک فرد کے پر مشتمل ہے۔ ۱۹/ ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ کو منعقد ہوا، شوریٰ کے اجلاس میں شوریٰ کے کسی رکن نے زید سے متعلق نائب مہتمم سے معلوم کیا کہ زید کہاں ہے؟ جس پر نائب مہتمم مدرسہ نے مجلسِ شوریٰ کو جواب دیا مجھے معلوم نہیں، پھر زید سے متعلق شوریٰ میں بحث ہوئی، ایک رکن نے زید پر خوب اعتراض کئے، نائب مہتمم مدرسہ خاموش بیٹھے سنتے رہے، یاد رہے یہ شوریٰ اس مذکورہ تاریخ میں مدرسہ مظاہر علوم کے امین عام حضرت اقدس الحاج سیدی محمد شاہد صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ ”خلیفہ قلم حضرت شیخ الحدیث“ کی صدارت میں چل رہی تھی، آخر کار مدرسہ مظاہر علوم کے ذمہ دار اعلیٰ اور اس شوریٰ کے ایک مؤقر رکن نے شوریٰ کے سبھی حضرات کو خاموش کر کے نائب مہتمم مدرسہ سے صاف طور پر معلوم کیا، کیا زید کا آپ کو علم ہے کہ زید کہاں ہے؟ کیا زید کو آپ نے کسی اپنے یا مدرسہ کے ضروری کام سے تو نہیں بھیج رکھا ہے؟ یکے بعد دیگرے مکرر استفسار پر نائب مہتمم مدرسہ نے شوریٰ کو جواب دیا کہ دو چار روز پہلے ان کا فون آیا تھا کہ وہ مدھیہ پردیش میں چندہ کر رہا ہے، جب کہ زید اپنے سفر سے متعلق روزانہ نائب مہتمم مدرسہ، نائب مہتمم مالیات مدرسہ کو آگاہ کرتا رہا اور ان کے شاگردوں سے موبائل فون پر گفتگو کراتا رہا، اس پر شوریٰ کے اسی موقر رکن نے نائب مہتمم مدرسہ سے معلوم کیا کہ چندہ بھی آپ کی بغیر اجازت کے کر رہا ہے؟ اس کو کاپیاں کس نے دیں؟ کاغذات کہاں سے لئے وغیرہ؟ اس پر نائب مہتمم مدرسہ خاموشی اختیار کر گئے، آخر کار شوریٰ نے ۵/ ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ سے غیر حاضر مان کر غیر حاضری کے الزام میں زید کی علیحدگی کا فرمان جاری کر دیا۔ ۲۲/ ذیقعدہ کو زید سفر سے واپس آیا اور سفر کا حساب وغیرہ مدرسہ کے تحویلدار کے حوالہ کیا۔ اور رجسٹری حاضری میں باضابطہ دستخط کے حساب سے فراغت کے بعد نائب مہتمم

مدرسہ نے تعلیمات کے محرر اعلیٰ کے ذریعہ زبانی پیغام پہنچایا کہ زید سے کہو وہ اپنا حساب کرکے چپ چاپ (خاموشی) سے مدرسہ سے چلے جائیں۔ زید کو یہ سن کر بہت رنج ہوا جو کہ ہر انسان کو ایسے وقت میں ہوا کرتا ہے۔ زید نے تحویلدار سے معلوم کیا، مہتمم مدرسہ سے معلوم کیا، مہتمم مدرسہ نے جواب دیا کہ نائب مہتمم مدرسہ نے جو رپورٹ مجلسِ شوریٰ میں رکھی، اس پر فیصلہ ہوگیا، میری یا مجلسِ شوریٰ کی کوئی غلطی نہیں، اس کے بعد زید نے نائب مہتمم سے معلوم کیا، نائب مہتمم مدرسہ حیلہ بازی کرنے لگے اور کہنے لگے کہ مجھے مجلسِ شوریٰ میں بولنے نہیں دیا گیا، زید نے سب کچھ ناظم مدرسہ نائب مہتمم مالیات کو بتلایا، زید کی گفتگو سن کر نائب مہتمم مہتمم مدرسہ سے ملے اور ان سے ایک مفتی صاحب کی موجودگی میں جو اسی مدرسہ میں ملازم ہیں بولے کہ وہ تو چندہ میں میں نے ہی بھیجا تھا، میرے یاد نہیں رہا، مہتمم مدرسہ نے اپنے نائب کی بات سن کر کہا کہ اب تو شوریٰ کا فیصلہ ہوگیا ہے، آپ کو شوریٰ میں ہی کہنا پڑے گا میں اکیلا اس کام کو نہیں کرسکتا، پھر ۲۳ ر ذیقعدہ کو علی الصبح مہتمم مدرسہ، نائب مہتمم مدرسہ، نائب مہتمم مالیات اور شوریٰ کے ایک رکن کی دفتر مدرسہ میں ایک میٹنگ ہوئی، دوران میٹنگ زید پھر سے ان سب کے درمیان پہنچ گیا اور معلوم کیا کہ مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے، یہ سب خاموش رہے، زید نے پھر معلوم کیا کہ جس وجہ سے اور جس تجویز پر مجلس شوریٰ نے علیحدگی کا فرمان جاری کیا ہے اس تجویز کو لکھ کر مجھے دے دو، تو مہتمم مدرسہ یوں گویا ہوئے کہ ہم نے بغیر تحریر کے رکھا تھا اور کوئی تحریر دئے بغیر الگ کررہے ہیں اور بس اب چلے جاؤ۔ اور مذکورہ چاروں حضرات مجھے نظر غیر سے دیکھنے لگے جیسے مجھے مار ہی ڈالیں گے اور ان چاروں حضرات نے تحویلدار مدرسہ کو حکم دیا کہ ان کی پانچ یوم کی تنخواہ دے کر ان کا حساب صاف کرو، حسب الحکم تحویلدار مدرسہ نے پانچ یوم کی تنخواہ مجھے دی اور رجسٹر قبض الوصول پر بغیر ٹکٹ لگائے میرے دستخط لئے، اس طریقہ سے میرے ۱۸ ر یوم کی اجرت ذمہ داران مدرسہ نے رکھ لی اور تعلقی فرمان سے بڑی بے عزتی سے زید کو مدرسہ سے باہر کا راستہ دکھایا۔ اس سے پیشتر بھی انھیں نائب مہتمم مدرسہ نے تقریباً ۱۶ ر آدمیوں کی مجلسِ شوریٰ میں غلط بیانی اور غلط

رپورٹ دے کر اور شوریٰ کو دھوکے میں رکھ کر مدرسین وملازمین کی عزت سے کھلواڑ کیا ہے، تو اس صورت میں:

(۱) کیا مجلسِ شوریٰ فریقین کی بغیر سنے اور نائب مہتمم کی رپورٹ پر مدرسین وملازمین کو الگ کرنے کا اختیار رکھتی ہے؟ کیا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین، بزرگانِ دین کی کسی مجلس سے اس قسم کا کوئی ثبوت ملتا ہے؟ اور کیا کسی عالم، حافظ، قاری کی عزت سے کھلواڑ کرنا بروئے شرع جائز ہے؟

(۲) کیا ایسا شخص جو خود ہی تحریری یا زبانی کہہ کر اپنے مدرس یا ملازم کو کہیں بھیجے اور شوریٰ کے وہ علماء وصلحاء مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں کسی مدرس یا ملازم کے متعلق معلوم کریں تو نائب مہتمم کذب گوئی، دھوکہ دھڑی سے کام لے، کیا ایسے شخص کو ایسے مؤقر ادارے کا نائب مہتمم مدرسہ بنائے رکھنا شرعی روشنی میں جائز ہے؟

(۳) مجلسِ شوریٰ آئندہ اجلاس میں اپنے اس فیصلہ پر دوبارہ غور کرنے کی مجاز ہے یا نہیں؟ اور زید کی بحالی کا حکم صادر کرنے میں مجلسِ شوریٰ کو شرعی کوئی قباحت نہیں؟

(۴) زید ۱۷ رسال قدیم مدرس وملازم ہے اور مدرسہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھتا ہے اور زید نے کبھی نائب مہتمم مدرسہ کی حکم عدولی بھی نہیں کی ہے، تو ایسی صورت میں نائب مہتمم کا یہ سارا برتاؤ زید سے کرنا اخلاقاً شرعاً جائز ہے؟ نیز ذمہ دارانِ مدرسہ کو ۶ رذیقعدہ ۱۴۳۱ھ سے ۲۳ر ذیقعدہ ۱۴۳۱ھ تک کی اجرت رکھنا مدرسہ یا ذمہ دارانِ مدرسہ کو جائز ہے؟ شریعت مطہرہ کی روشنی میں مع دلیل وحوالہ کے جواب سے مطلع فرمائیں، نوازش ہوگی۔

المستفتی: ابوحافظ محمد طلحہ بن محمد نسیم راوت، مقام سلیم پور گدا، ڈاکخانہ ساڈھولی قدیم، ضلع سہارنپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے اصول وضوابط حسب ذیل حدیث شریف پر مبنی ہیں:

عن عوف المزني أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون

علی شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، الأحكام، بـاب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، المعجم الكبير للطبراني، دارإحياء التراث العربي ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠)

اس حدیث شریف کی روشنی میں مدرسہ کے اصول وضوابط کی پابندی، امانت ودیانت کے ساتھ ہر ایک کے اوپر لازم ہے، اگر نائب مہتمم نے بددیانتی سے کام لیا ہے، تو اس کا گناہ ان ہی کے سر ہوگا، باقی سائل کے معاملہ کی جزئیات سے متعلق اسی مدرسہ کے ذمہ دار ودیانتدار علماء ہی کو غور کرنا چاہئے اور سب سے بڑی کمیٹی جس کو بالادستی حاصل ہے، وہ مجلسِ شوریٰ ہے اور مجلسِ شوریٰ تک صحیح رپورٹ پیش کرنے کی ذمہ داری مدرسہ کے ان ذمہ دار حضرات پر ہے جو شوریٰ میں رپورٹ پیش کرنے والے ہوتے ہیں، اگر ان کی طرف سے کوئی کمزوری ہے، جس کی وجہ سے مدرسہ یا کسی ملازم پر زد آسکتی ہے، تو اس کا گناہ ان ہی کے سر ہوگا۔ اور دیانتداری امانت داری اور کسی کی ہتک عزت سے متعلق ''المعجم الکبیر'' کی یہی حدیث شریف سب کے لئے سبق آموز ہے:

عن عبدالله بن مسعود -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله ﷺ: لا إيمان لمن لا أمانة له، ولا دين لمن لا عهد له، والذي نفس محمد بيده لا يستقيم دين عبد حتى يستقيم لسانه، ولا يستقيم لسانه حتى يستقيم قلبه، ولا يدخل الجنة من لا يأمن جاره بوائقه. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٠/ ٢٢٧، رقم: ١٠٥٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۵؍ رجب ۱۴۳۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۴۶۳)	۱۵؍۷؍۱۴۳۲ھ

مدارسِ اسلامیہ میں طلبہ کی دیکھ بھال کے لئے کیمرہ لگانے کا حکم

سوال [۸۴۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: آج کل ایک کیمرہ رائج ہے، جس کو عام اجتماع گاہوں، مثلاً بڑے بڑے ہوٹلوں، ہسپتالوں، اسٹیشنوں، ہوائی اڈوں اورشہر کے چوراہوں وغیرہ پرنصب کیا جاتا ہے اوراس کا کنکشن چھوٹی بڑی اسکرین سے ہوتا ہے،جس کوکسی دفتر یا کاؤنٹر میں رکھا جاتا ہے، جہاں اس چھوٹی یا بڑی اسکرین پر کیمرہ کی زد میں آنے والے تمام افراد کی تصاویر نظر آتی ہیں اور اس کے ذریعہ متعلقہ اشخاص کی نقل وحرکت پر مکمل نظر رکھی جاتی ہےاور ایک متعینہ مدت تک اس نقل وحرکت کوریکارڈ بھی کیا جاسکتا ہے، جسے بوقت ضرورت آن کرکے دیکھا جاسکتا ہے اور یہ چیز بظاہر چوری، خیانت، ایذارسانی اور ممکنہ خطرات سے حفاظت کا عمدہ سامان ہے، تواب سوال یہ ہے کہ اس کیمرہ کوکسی اسلامی درسگاہ ''مدرسہ یا جامعہ'' کی گذرگاہوں، گیلریوں، برآمدوں اور دارالاقامہ کے صحن وغیرہ میں نصب کرکے طلبہ کرام پر نظر رکھ کر متعلقہ فوائد حاصل کرنے اور ان کی لایعنی مصروفیات اور غیر قانونی حرکات پر کنٹرول کرنے کے ارادہ سے استعمال میں لانا شرعی نقطہ نظر سے کیا حکم رکھتا ہے۔ اوراس کے استعمال کی کہاں تک گنجائش ہے؟ امید ہے کہ تسلی بخش تفصیلی جواب عنایت فرما کرممنون فرمائیں۔

المستفتی: محمد مشتاق ستپونی، خادم دارالعلوم سعادت دارین ستپونی بھروچ، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس کیمرہ کا سوال نامہ میں ذکر ہے، مالی نقصان سے بچنے کے لئے دفع مضرت کے طور پر اس کی گنجائش ہے؛ لیکن مدارسِ اسلامیہ اور دینی درسگاہوں میں یہ کیمرہ لگانا کسی طرح مناسب نہیں ہے، اکابر ومشائخ کے طریقہ کے خلاف ہے۔ اورطلبہ کی اخلاقیات پرنظر رکھنے کے لئے اس قدر تجسس کے ہم مکلّف نہیں ہیں۔ اور مدارسِ اسلامیہ اور دینی درسگاہوں میں مالی نقصان اور حقوق العباد کے تلف ہونے کا ایسا خطرہ نہیں ہے، جس کے لئے ایسے تجسس کے کیمرے کے لگانے کی ضرورت ہو؛ لہٰذا مدارسِ اسلامیہ کوایسے کیمروں سے پاک رکھا جائے۔

وَلا تَجَسَّسُوا. الآية [حجرات: ۱۲]

الثابت بالضرورة يتقدر بقدرها. (قواعد الفقه أشرفي، ص: ٧٤، قاعده: ١٠٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۸۶۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/ ۱۱/ ۱۴۳۳ھ

ایک مدرسہ سے متعلق چند سوالات وجوابات

سوال [۸۴۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں ''مدرسہ جامعہ اسلامیہ جلالیہ'' میں درجہ اول دینیات میں غیر مقامی طلبہ داخلہ لیتے ہیں، ان سے مزید کھانے کے لئے پانچ ہزار پانچ سو روپئے لئے جاتے ہیں اوران بچوں کے سرپرست صاحبان کو یہ بتلایا جاتا ہے کہ آپ کا بچہ اگر مدرسہ سے چلا جائے تو پانچ ہزار پانچ سو روپئے آپ کو واپس نہیں کئے جائیں گے؛ اس لئے کہ اس سے مدرسہ میں طلبہ کی کمی ہوگی؛ کیوں کہ درجات کے اعتبار سے طلبہ کی تعداد متعین ہے، سرپرست صاحبان بھی اس وقت مان لیتے ہیں؛ لیکن بعد میں جب بچہ چلا جاتا ہے تو خوراکی کے نام پر جو رقم جمع کی تھی اسے مانگتے ہیں، مذکورہ صورت میں گارجین کو خوراکی کی رقم واپس کرنا ضروری ہے، جب کہ گارجین نے وعدہ کیا تھا کہ بچہ اگر چلا جائے تو رقم واپس نہیں لیں گے۔ دوسری صورت ہمارے یہاں یہ بھی ہے کہ ایک خصوصی مطبخ قیمتاً چلتا ہے، جس میں اہل ثروت حضرات کے بچے سالانہ نو ہزار روپئے جمع کرتے ہیں اوراپنا کھانا کھاتے ہیں، اس صورت میں بھی کبھی بچے چلے جاتے ہیں، ان بچوں کے سرپرست صاحبان بھی بوقت داخلہ وعدہ کرتے ہیں، بچے چلے جانے کی صورت میں روپئے واپس نہیں لیں گے؛ لیکن بعد میں کچھ لوگ مطالبہ کرتے ہیں، ایسی صورت میں یہ رقم شرعاً واپس کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

(ب) خوراکی کے نام پر جو رقم الگ سے لی جاتی ہے وہی رقم اگر داخلہ فیس کے ساتھ جوڑ کر

داخلہ فیس میں اضافہ کردیا جائے اور داخلہ فیس بجائے ۸۰۰؍ کے ۹۸۰؍ یا ۶۳۰۰؍ کردیا جائے اور اس صورت میں اگر بچہ چلا جائے تو رقم واپس نہیں کی جائے گی، تو کیا یہ شرعاً جائز ہے؟

(۲) ایک استاذ ایک مدرسہ میں پڑھاتے پڑھاتے بوڑھے کمزور اور بیمار و معذور ہوگئے، اب پڑھانے سے معذور ہیں، ادھر پوری زندگی مدرسہ میں رہنے کی وجہ سے دوسرا کوئی ذریعہ معاش کا بھی گھر میں انتظام نہیں ہے، اب کیا اس حالت میں مدرسہ کی طرف سے ان کے لئے پنشن جاری کرنا یا ان کے لئے پنشن لینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کس فنڈ سے ان کو رقم دی جائے گی؟

المستفتی: ارکان حل وعقد جامعہ جلالیہ ہوجائی آسام، ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حسب تحریر سوال جو رقم مدرسہ میں مقیم طلبہ کے سرپرستوں سے سال بھر کی خوراکی کے نام پر وصول کی جاتی ہے وہ رقم شرعاً طعام کے عوض میں ہے؛ لہٰذا درمیان سال میں اگر طالب علم چلا جاتا ہے، تو حساب لگا کر باقی ماندہ رقم سرپرستوں کو واپس کرنا ضروری ہے؛ کیوں کہ اب اس رقم کا کوئی مصرف نہیں رہا اور داخلہ کے وقت مدرسہ کے ذمہ داران اور طلبہ کے سرپرستوں کے درمیان یہ جو طے ہوا تھا کہ بیچ سال میں طالب علم کے چلے جانے کی صورت میں وہ رقم کی واپسی کے مطالبہ کے مجاز نہ ہوں گے، اس کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے؛ البتہ خوراکی کی رقم اگر داخلہ فیس میں منضم کرکے اصل داخلہ فیس میں اضافہ کردیا جائے تو اب ذمہ داران مدرسہ طالب علم کے درمیانی سال میں واپس چلے جانے کی صورت میں بقیہ رقم کی واپسی کے مکلّف نہ ہوں گے۔ اور نہ ہی سرپرست حضرات کو مطالبہ کا اختیار ہوگا؛ اس لئے کہ وہ پوری رقم داخلہ فیس ہی کے لئے متعین ہے اور منجانب مدرسہ اس کا داخلہ ہوچکا ہے۔

عن أبي حمید الساعدي أن رسول اللّٰہ ﷺ قال: لا یحل لمسلم أن یأخذ مال أخیه بغیر حق. (مجمع الزوائد، باب الغصب وحرمة مال المسلم، دارالکتب العلمیة بیروت ٤/ ١٤١، رقم: ٦٨٥٩، مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٣٠٠٣)

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲)

لو باع كاغذة بألف يجوز، ولا يكره. (فتح القدير، كتاب الكفالة، زكريا ديوبند ۷/ ۱۹۸، دارالفكر ۷/ ۲۱۲، كوئٹه ۶/ ۳۲٤، دارالحكام ۲/ ۳۰٤، الدر مع الرد، مطلب بيع العينة، كراچی ۵/ ۳۲۶، زكريا ۷/ ۶۱۳)

(۲) جب مدرسہ میں قانون وضابطہ یہ بن جائے کہ کمزور اور معذور مدرسین وملازمین کے لئے پنشن جاری کیا جائے گا، تو ایسی صورت میں اس ضابطہ کے مطابق مذکورہ مدرس کو منجانب مدرسہ پنشن دینا جائز اور درست ہے۔ اور بہتر یہ ہے کہ اخبارات اور کثیر الاشاعت رسائل میں اس ضابطہ کا اعلان کردیا جائے، تاکہ لوگوں کو اس کا علم ہو جائے۔

وأما شرائط الصحة، فمنها: رضا المتعاقدين. (هندية، كتاب الإجارة، الباب الأول، زكريا جديد ٤/ ٤٤٠، قديم ٤/ ٤١١)

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۱۷/ ۲۲، رقم: ۳۰، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۲۳، رقم: ۲۸۶۹)

والوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل، وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره. (شامي، كتاب الزكاة، زكريا ۳/ ۱۸۹، كراچی ۲/ ۲۶۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ /ذی قعدہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۱۱/۱۴۳۱ھ

مدارسِ اسلامیہ کے اصول کا ماخذ

سوال [۸۴۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک ادارہ میں تمام اساتذہ کو مدعو کرکے روبرو تنخواہ دی گئی، ایک مدرس کو نہ صرف فراموش کیا گیا بلکہ پیمنٹ رجسٹر اس کے مکان پر پہنچایا گیا، ایک بالغ لڑکے کے ذریعہ، جب کہ مدرس ادارہ میں حاضر تھا، شرارتاً اس طرح کیا گیا، دس ذی الحجہ کو ناظم مدرسہ اور مدرس میں تو تو میں میں ہوگئی، پھر مدرس نے ٹرسٹ کے مطالبہ پر معافی نامہ پیش کردیا، پھر بھی ناظم صاحب نے سبکدوش کرنے کا پلان بنالیا، ٹرسٹ کے سامنے کہتے ہیں: میں نے اکراماً تنخواہ ان کے گھر بھجوائی تھی، ناظم صاحب کا کہنا ہے کہ ادارہ پندرہ سو روپئے مکان کرایہ ایک ماہ کا آپ کو دے رہا ہے، پانچ سو روپئے میں اپنی جیب سے دے رہا ہوں، آپ مدرسہ کا مکان خالی کردیں؟ تحقیقی فتویٰ مطلوب ہے۔

المستفتی: سید ذاکر علی اشاعتی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط حسب ذیل حدیث شریف سے ثابت ہوتے ہیں کہ آپس میں جو معاملہ طے ہوجائے اسی پر پابند ہونا مدارس کے ذمہ دار اور ملازمین پر لازم ہے۔

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، المستدرك للحاكم، كتاب الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز جديد ٧/ ٢٥٢٣، قديم ٤/ ١٠١، دارالكتب العلمية ٤/ ١١٣، رقم: ٧٠٥٩)

اب رہی سوال نامہ میں جانبین کی ایک دوسرے کی شکایت کی باتیں، تو اس سلسلہ میں وہیں قریب کے بااثر علماء ومفتیان کرام سے رابطہ قائم کریں، اصل صورت حال کیا ہے اس کو پیش نظر رکھ کر وہاں کے علماء بہتر بات کہہ سکتے ہیں اور ہم اتنی دور رہ کر وہاں کی نزاکت کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۰۹۸۶)

مدرسہ کے قوانین کا ماخذ

سوال [۸۴۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اجتماع مرکز ماہانہ میں بلانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ شاخ کے جملہ رجسٹر جات جن میں اس شاخ کے متعلق پوری کارروائی درج ہوتی ہے، ان کا معائنہ مرکز میں ہوا کرتا ہے اور اس مقصد کے لئے مرکز میں بلایا جاتا ہے، تو اب اگر مرکز آنے کی صورت میں مدرسہ سے واپسی میں گھر جاتا ہے، تو ایک طرف کا کرایہ ملے گا۔ اور اگر گھر نہ جا کر مدرسہ واپس ہو جاتا ہے، تو دونوں طرف کا کرایہ ملے گا، کوئی مدرس اگر تاخیر کر کے آتا ہے، تو بھی کرایہ مل جاتا ہے۔ اور اگر اجتماع کی کارروائی ختم ہونے کے بعد حاضر ہوتا ہے، تو کرایہ نہیں ملتا ہے، مثلاً اگر شنبہ کی صبح کو اجتماع ہوتا ہے، تو جمعہ کو حاضری ضروری ہو جاتی ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے جمعہ کی شام تک حاضر نہ ہو سکے تو سنیچر کی صبح تک وہ حاضر ہو جاتا ہے، تو پھر بھی رعایۃً کرایہ مل جاتا ہے؛ لیکن اگر اجتماع ختم ہونے کے بعد یا سنیچر کی دو پہر کے بعد آتا ہے تو کوئی بھی کرایہ نہیں ملے گا۔ اب ایسے حالات میں ایک مدرس شاخ سے بجائے مرکز آنے کے اپنے گھر چلا گیا، براہ راست مرکز نہیں آیا گھر سے اجتماع ختم ہونے کے بعد مرکز آگیا اور درس میں بھی جملہ کارروائی رجسٹر لے کر نہیں آیا جس کی بنا پر اس مدرس کو اپنی کارروائی رجسٹر کے لئے دوبارہ

مدرسہ جانا پڑا، تو ان دونوں سفروں میں سے کس سفر کا کرایہ اس کو مدرسہ سے ملے گا یا کچھ بھی نہیں ملے گا، مدرس صاحب کو معطل کردیا گیا جس کا حکم نامہ مرکز حاضر ہونے کے بعد دیا گیا، نیز ابھی بحالی بھی نہیں ہوئی ہے، یعنی مدرسہ واپسی کا حکم نہیں ملا ہے۔ بینوا توجروا

المستفتی: فیض الحسن ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے قوانین اور ضوابط ترمذی شریف اور دارقطنی کی اس حدیث شریف سے مستنبط ہوتے ہیں:

عن عبداللہ بن عمرو بن عوف المزني أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: الصلح جائز بین المسلمین إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون علی شروطھم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، الأحکام، باب ما ذکر عن رسول اللہ ﷺ في الصلح بین الناس، النسخة الھندیة ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲، سنن الدارقطني، کتاب البیوع، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۲۳، رقم: ۲۸۶۹)

کہ مسلمان آپس میں جائز معاملہ میں جو شرائط طے کرلیں ان کی پابندی ہر ایک پر لازم ہوجاتی ہے، جیسا کہ مذکورہ حدیث سے واضح ہے؛ لہٰذا جب مذکورہ مدرسہ اور اس کے مرکز کے درمیان یہ قانون اور ضابطہ مقرر ہو چکا ہے کہ اجتماع کے موقع پر ذیل کے پانچ شرائط کی پابندی لازم ہے جو سوال نامہ سے سمجھ میں آرہے ہیں:

(۱) کارروائی رجسٹر مکمل لے کر کے مرکز میں پہنچنا۔

(۲) طے شدہ وقت کے اندر اندر پہنچنا۔

(۳) اگر مدرسہ سے طے شدہ وقت کے اندر مرکز میں پہنچ کر پھر کارروائی کے بعد مدرسہ لوٹ کر آیا ہے، تو مدرسہ دونوں طرف کا کرایہ دے گا۔

(۴) اگر ایاباً یا ذہاباً ایک دفعہ گھر ہوتے ہوئے آتا ہے یا جاتا ہے، تو مدرسہ ایک طرف کا کرایہ دے گا۔

(۵) آتے اور جاتے دونوں دفعہ گھر ہوکر جاتا ہے یا آتا ہے، تو مدرسہ کوئی کرایہ نہیں دے گا۔ یہ آپس کے قوانین اور شرائط ہیں، جن کی پابندی لازم ہے، سوال نامہ میں ذکر کردہ واقعہ کے مطابق مذکورہ مدرس نے طے شدہ شرائط میں سے جن کی پابندی سے کرایہ مل سکتا ہے کسی بھی شرط کی پابندی نہیں کی ہے؛ اس لئے مذکورہ مدرس کو مدرسہ کی جانب سے کوئی کرایہ نہیں ملے گا، پہلے سفر میں اس لئے نہیں ملے گا کہ ضابطہ نمبر۲ رکی پابندی نہیں کی ہے۔ اور دوسرے سفر میں اس لئے نہیں ملے گا کہ ضابطہ نمبر ا رکی پابندی نہیں کی۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۳۰ھ

مدارس کے اصول وضوابط کی شرعی حیثیت

سوال [۸۴۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک ادارہ میں قانون بنایا گیا کہ اساتذہ گھنٹہ میں دس منٹ سے زائد تاخیر سے آئیں گے، تو ان کا پورا گھنٹہ غیر حاضری شمار ہوکر پورے گھنٹہ کی تنخواہ وضع کی جائے گی، اگرچہ اڑتالیس منٹ استاذ نے پڑھایا ہو۔

(۲) ایسے ہی جو ملازم پندرہ منٹ سے زائد تاخیر سے آئیں گے ان کے پورے چار گھنٹے غیر حاضر شمار ہوکر پورے چار گھنٹے کی تنخواہ وضع کی جائے گی، اگرچہ ملازم نے تین گھنٹے چالیس منٹ دفتر وغیرہ میں کام کیا ہو اور ڈیوٹی انجام دی ہو، مذکورہ بالا قانون کی شرعی حیثیت سے مطلع فرماکر ممنون فرمائیں، کیا مذکورہ قانون میں حق تلفی نہیں ہے؟

(۳) ایک ادارہ میں تقسیم کار اور مختلف امور کے الگ الگ شعبے ہیں، جس شعبہ میں جس ملازم کا تقرر جس خدمت پر طے ہوا اس کی خدمت مفوضہ کے علاوہ دوسرا کوئی کام انجام نہ دینے پر غیر حاضری شمار کرکے تنخواہ وضع کرنا شرعاً کیسا ہے؟ بینوا توجروا

المستفتی: حکیم محمد مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط کا سارا مدار ایک حدیث شریف پر ہے، جس کو ہم پہلے نقل کردیتے ہیں، اس کے بعد تینوں سوالات کے جوابات اسی حدیث شریف کی روشنی میں پیش کئے جائیں گے۔حدیث شریف یہ ہے:

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲، المعجم الكبير للطبراني دار إحياء التراث العربي ۱۷/ ۲۲، رقم: ۳۰)

مسلمانوں کی آپسی تراضی سے ہر وہ صلح اور قانون جائز ہے جس سے قرآن وحدیث کے حرام کو حلال کرنا لازم نہ آتا ہو، اسی طرح ہر وہ شرط بھی ضابطہ اور قانون میں جائز ہے جس سے قرآن وحدیث کے قطعی حرام کو حلال، یا حلال کو حرام کرنا لازم نہ آتا ہو، اب سوالات کے جوابات ملاحظہ فرمایئے:

(۱) جب مدرسہ نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ دس منٹ کی تاخیر سے پورا گھنٹہ غیر حاضری میں شمار ہوا کرے گا تو مدرس کو یہ اختیار بھی حاصل ہوگیا کہ وہ گھنٹہ نہ پڑھائے اور دس منٹ کی تاخیر کے بعد رجسٹر پر دستخط کردے۔اور اگر رجسٹر پر دستخط کردیا گیا ہے اور پھر پورا گھنٹہ مدرس نے نہیں پڑھایا ہے او مدرسہ میں حاضر رہ کر کوئی کام نہیں کیا ہے، تو اس گھنٹے کی تنخواہ وضع کرلینا مدرسہ والوں کے لئے جائز ہے؛ لیکن مدرسہ والوں کے لئے یہ جائز نہیں ہوگا کہ پورا گھنٹہ غیر حاضر قرار دیں اور پھر اس گھنٹہ میں کام بھی لیں جیسا کہ اوپر کی حدیث شریف سے یہ بات واضح ہوئی۔

(۲) جب پندرہ منٹ کی تاخیر ہوگئی ہے اور پندرہ منٹ سے زائد تاخیر ہوجائے تو پورے چار

گھنٹے کی غیر حاضری لگ جاتی ہے، تو مدرسہ والوں کے لئے غیر حاضری لگانا جائز ہے؛ لیکن شرط یہ ہے کہ اب مدرس کو بھی اختیار حاصل ہو جائے کہ یہ پورے چار گھنٹے مدرسہ میں کوئی کام نہ کرے، گویا ایک وقت کی مکمل غیر حاضری ہوگئی؛ لیکن اگر مدرسہ والے پندرہ منٹ سے زائد تاخیر کے بعد چار گھنٹہ کی تنخواہ وضع کرلیں اور کام بھی لیں یہ جائز نہیں ہے، صرف اتنا جائز ہے کہ اپنا قانون ایسا بنالیں کہ پندرہ منٹ سے زائد تاخیر کی صورت میں مدرس کو اختیار ہو جائے گا کہ مدرسہ میں رہے یا غیر حاضر رہے، ان گھنٹوں کی تنخواہ نہیں ملے گی، جیسا کہ اوپر کی حدیث شریف کے مضمون سے واضح ہوتا ہے۔

(۳) مدرسہ کے مدرسین اور ملازمین کے کار مفوضہ متعین ہونے کے ساتھ ساتھ قانون اور ضابطہ میں اگر یہ بات بھی ملحوظ رکھی گئی ہے کہ صبح کے چار گھنٹے یا شام کے دو گھنٹے کے درمیان اس کار مفوضہ کے علاوہ، ضرورت مدرسہ کی وجہ سے ذمہ دار مدرسہ دوسرا کام بھی لے سکتا ہے، مثلاً چار گھنٹے میں سے دو گھنٹے پڑھانے کے بعد ایک گھنٹہ دفتری کام کرنا ہے، پھر چوتھا گھنٹہ پڑھانا ہے یا ایک دو گھنٹے مدرسہ کی ضرورت سے متعلق میٹنگ میں بیٹھنا ہے، یا مدرسہ کی ضرورت سے متعلق آس پاس کے لوگوں سے ملاقاتیں کرنی ہیں، تو اس طرح کا قانون مذکورہ حدیث شریف کی رو سے جائز اور درست ہے، ہاں البتہ مدرسہ میں اگر دو ٹائم کی پابندی ہے، مثلاً صبح کو چار گھنٹے اور شام کو دو گھنٹے، ان کے علاوہ خارج میں کام کرنا مدرس کی ذمہ داری نہیں، تو اگر خارج میں کام کرنے پر پابند کیا جائے تو اس کے لئے الگ سے الاؤنس مقرر کرنا من جانب مدرسہ لازم ہے اور بغیر الاؤنس مدرس پر دباؤ ڈالنا ذمہ دار کے لئے اس قانون کی رو سے درست نہیں ہے، ہاں البتہ اگر کوئی ملازم یا مدرس بخوشی کام کرتا ہے تو وہ اس کی طرف سے ایثار اور تبرع ہے۔ اور اگر درجہ حفظ کے لئے مدرسہ نے شروع سے یہ قانون بنایا ہے کہ ان کو تین ٹائم کام کرنا پڑے گا، صبح سے دوپہر تک، شام کے ٹائم عصر تک، اس کے بعد مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت، تو ایسے مدرسین کو تینوں ٹائم کام کرنے کی تنخواہ ملتی ہے، اگر ان کے لئے الگ سے ضابطہ نہیں بنا ہے، تو پھر مغرب کے بعد طلبہ کی نگرانی کے لئے بٹھانے پر

منجانب مدرسہ ان کو الگ سے الاؤنس دینا لازم ہے۔ اور الاؤنس مدرسہ اپنی صواب دید پر متعین کرسکتا ہے، یہ ساری باتیں اوپر کی حدیث شریف سے ثابت ہوتی ہیں، اسی طرح اگر کسی ملازم کو پڑھانے کے لئے اور چندہ فراہم کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے، تو یہ بھی مدرسہ کے ضابطہ کے مطابق جائز اور درست ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۶۳۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۶/۱۶ھ

ضوابط برائے اساتذہ، تعزیرات وتعطیلات برائے طلبہ

سوال [۸۴۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) نماز با جماعت کی پابندی طلبہ سے زیادہ ضروری ہوگی۔

(۲) طلبہ کی نگرانی اور امر بالمعروف نہی عن المنکر کی ذمہ داری ہوگی۔

(۳) درجہ میں بیٹھنے کی ہیئت ایسی رکھنی ضروری ہوگی جس سے چستی اور رعب ظاہر ہو۔

(۴) درجہ میں بلا عذر کمر لگا کر بیٹھنے کی اجازت نہ ہوگی۔

(۵) تعلیمی اوقات میں دوسرے مدرس کے پاس جانے یا درجہ میں بیٹھے ہوئے کسی کے ساتھ باتوں میں لگنے کی اجازت نہ ہوگی۔

(۶) تعلیمی اوقات میں کتب بینی، خط نویسی کی بھی اجازت نہ ہوگی۔

(۷) طلبہ میں بجائے زجر وتنبیہ انسیت کا پیدا کرنا ضروری ہوگا۔

(۸) نیز طلبہ کے اندر کپڑے، جسم، درسگاہ وغیرہ کی صفائی کا جذبہ پیدا کرنے کے طریقے اختیار کرنا ضروری ہوگا۔

(۹) کسی کی واقعی غیر واقعی کسی کمزوری کا تذکرہ یا حکایت وشکایت کسی مدرس وغیر مدرس کے سامنے کرنے کی اجازت نہ ہوگی؛ البتہ صدر مدرسہ کو پیش کر دینا مناسب ہوگا۔

(۱۰) حسب صواب دید صدر و مہتمم کسی وقت درجہ بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔
(۱۱) طلبہ سے خدمت لینے میں ان کی رضا ومناسبت کا لحاظ ضروری ہوگا۔
(۱۲) اوقات مدرسہ میں آنے والے مہمان کے لئے مدرسہ کی جانب سے ۱۰/منٹ مہمان نوازی کی اجازت ہوگی۔
(۱۳) ایک سال میں تعطیلات مقررہ کے علاوہ بیس یوم کی رخصت ہوگی، اس سے زیادہ غیر حاضری کی تنخواہ وضع کی جائے گی۔
(۱۴) مغرب وعشاء کے بعد طلبہ کی نگرانی ضروری ہوگی۔
(۱۵) درجہ میں ہر جدید کام کرنے کے لئے پہلے ذمہ دار سے مشورہ کرنا ضروری ہوگا۔
(۱۶) پندرہ روز سے پہلے گھر جانے کی اجازت نہ ہوگی۔
(۱۷) جمعرات میں دوپہر سے سنیچر کی دوپہر تک یا زائد سے زائد شام تک کی رخصت ہوگی۔
(۱۸) اوقات تعلیم میں جتنا وقت اپنے کام میں خرچ کیا جائے گا اس کی تنخواہ وضع کی جائے گی۔
(۱۹) وقتی ضرورت پر چھٹی مل جائے گی، مگر اس کا حساب ۲۰/یوم کی رخصت میں لگے گا۔
(۲۰) مسلسل دس پندرہ یوم کی تعطیل مدرسہ کی جانب سے نہیں مل سکے گی، شادی کے موقع پر صرف ۴/۵/یوم کی رخصت ملے گی۔
(۲۱) اگر کوئی استاذ درمیانی سال میں مدرسہ سے علیحدہ ہوگا تو اس کی اطلاع پندرہ روز پہلے دینا ضروری ہوگا، اگر بلا اطلاع الگ ہوگیا تو پندرہ یوم کی تنخواہ وضع کرلی جائے گی، اسی طرح اگر مدرسہ نے کسی استاذ کو بلا اطلاع علیحدہ کردیا تو اس کو پندرہ یوم کی تنخواہ مزید دی جائے گی۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: معلمین کے حق میں جو قوانین وضوابط مقرر کئے گئے ہیں، احقر حرفاً حرفاً ہر ایک سے متفق ہے، ماشاء اللہ اگر ان پر عمل ہو سکے تو مدرسہ طلبہ، استاذ، قوم سب کے حق میں فلاح ہی فلاح ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/شوال المکرم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۴۳۲/۲۵)

تعزیرات برائے طلبہ مدرسہ عربیہ امدادالاسلام ہرسولی ضلع مظفرنگر یوپی

سوال [۸۴۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) جماعت کی ایک رکعت چھوٹ جانے پر سب کے سامنے ہاتھ پر پانچ قمچی لگائی جائیں گی۔

(۲) ظہر کی پہلی سنت پہلے نہ پڑھنے پر مسجد کی شمالی دیوار سے جنوبی تک چار چکر مرغ بن کر لگانے ضروری ہوں گے۔

(۳) باہمی منازعت کی صورت میں دست درازی کرنے والے پر ایک کے عوض پچیس قمچی ماری جائیں گی۔

(۴) ایک گالی زبان سے نکالنے پر نفل کی چار رکعت ادا کرنی ہوگی۔

(۵) دس روپئے یا دس روپئے سے زائد کسی بھی سامان کی چوری کرنے کے ثبوت پر مدرسہ سے اخراج کردیا جائے گا۔

(۶) اگر دس روپئے سے کم چوری کی گئی تو (الف) فی روپیہ پانچ قمچی ہوں گی (ب) ضمان ہر صورت میں چور کے ذمہ ہوگا، جو کہ اسی وقت ادا کرنا ضروری ہوگا (ج) یہ سزا صاحب حق کے معاف کردینے سے بھی ساقط نہ ہوگی۔

(۷) تعطیلات مقررہ میں ایک کی بھی تاخیر معاف نہ ہوگی، دوروز کی تاخیر تک فی یوم دس قمچی ہوں گی اور تین روز کی غیر حاضری پر اخراج ہوجائے گا۔

(۸) وقتی تعطیل میں مقدار موجود سے زائد ایک دن پر دس قمچی ہوں گی۔

(۹) بیماری کی تعطیل میں اگر مسلسل بلا اطلاع دس روز تاخیر ہوگی تو اخراج ہوجائیگا۔

(۱۰) تندرستی کی حالت میں رخصت لی اور گھر جا کر بیمار ہوجائے تو ڈاکٹر کی تصدیق قابل قبول ہوگی۔

(۱۱) ہفتہ کے درمیان رخصت نہیں ملے گی، الا یہ کہ شدید بیماری یا گھر کسی پریشانی کی صحیح خبر

ملے۔

(۱۲) ایک مرتبہ اخراج کے بعد حسب صوابدید اراکین مدرسہ دوسرے سال داخلہ ممکن ہوگا، اسی سال داخلہ کی صورت نہ ہوگی۔ فقط

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: طلبہ کی تعزیرات کے سلسلہ میں جو ضوابط مقرر کئے ہیں سب سے احقر متفق ہے، البتہ جن میں پھچی کی سزا مقرر ہوئی ہے، ان کے ساتھ نوافل بھی مقرر ہو جائیں تو تربیت کے لئے زیادہ مناسب تھا، نیز نمبر ایک میں پانچ پھچی کے بجائے اگر دس مقرر کی جائے تو زیادہ اصلاح کی بات تھی، نیز مہذب ادارہ میں مہذب سزا مناسب ہے؛ اس لئے اگر مرغ بن کر چکر لگانے کے بجائے حسب مناسب نوافل مقرر کر دی جائیں تو زیادہ تربیت واصلاح کی امید ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۴۳۳)

ضوابط برائے مدرسہ عربیہ امداد الاسلام ہرسولی ضلع مظفر نگر

سوال [۸۴۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) تمام طلبہ کو نماز پنج گانہ باجماعت باہتمام تکبیر اولیٰ ادا کرنا ضروری ہوگا۔

(۲) لباس نیچے سے اوپر تک مطابق شرع سنت رکھنا ضروری ہوگا۔

(۳) غیبت واختلاط سے سخت پرہیز نہایت ضروری ہوگا۔

(۴) بدفعلی کے ثبوت یا ظہور پر یقیناً اخراج کر دیا جائے گا۔

(۵) سرقہ (چوری) کے ثبوت ملنے پر بھی اخراج کر دیا جائے گا۔

(۶) مدرسہ کے جملہ اساتذہ کا خصوصاً اور عامۃ المسلمین کا عموماً ادب واحترام ضروری ہوگا۔

(۷) وقتی طور پر جو اعلان کیا جائے اس کا احترام ضروری ہوگا۔

(۸) مدرسہ کے تعلیمی اوقات میں خصوصاً اور خارجی اوقات میں عموماً بستی کے اندر جانے سے پرہیز ضروری ہوگا۔

(۹) کسی بھی طالب علم کو مدرسہ سے متعلق کسی بھی واقعہ میں دخیل ہونے کا حق نہ ہوگا۔

(۱۰) تعطیلات مقررہ کے علاوہ پندرہ دن غیر حاضر ہونے سے مدرسہ آئندہ تعلیمی خدمت سے معذور رہے گا۔

(۱۱) ہر طالب علم کو ہر ماہ اپنے سر کے بال مشین سے صاف کرانا ضروری ہوگا۔

(۱۲) بالغ طلبہ کو نابالغ بچوں کے ساتھ تفریح کے لئے جانا ایک حجرہ میں رہنا قطعاً جائز نہ رکھا جائے گا۔

(۱۳) مدرسہ پر کسی بھی طالب علم کا کوئی حق مطالبہ نہ ہوگا۔

(۱۴) مدرسہ کے اصول کے مطابق بنے ہوئے کپڑے کم از کم دو جوڑی ہونا ضروری ہوگا۔

(۱۵) طلبہ کو کسی قسم کی جمعیت بنانے کا کوئی حق نہ ہوگا۔

(۱۶) ٹوپی پنج کلی یا دو پلی کے علاوہ دوسری نہیں چلے گی۔

(۱۷) اپنا لوٹا المونیم کا ہونا ضروری ہے۔

(۱۸) ایک ماہ سے پہلے چھٹی لینے کی اجازت نہ ہوگی، اس وقت بھی جمعرات کو دوپہر سے سینچر کی دوپہر تک اجازت ہوگی۔

(۱۹) کسی وقتی حادثہ پر بھی چھٹی مل سکتی ہے، مگر مدرسہ کو واقعی ثبوت ملنا ضروری ہے۔

(۲۰) چھٹی کے وقت سے دو روز زائد ہوتے ہی نام خارج کر دیا جائے گا۔

(۲۱) روشنی کا انتظام اپنے پاس سے کرنا ضروری ہوگا، اس کے لئے دو روپئے ماہانہ جمع کرنے ضروری ہوں گے۔

(۲۲) داخلہ فیس دس روپئے ہیں جو بلا طلب کئے پیش کر دینی چاہئے۔

(۲۳) قاعدہ، پارہ اور کلام پاک ناظرہ پڑھنے والوں کا مدرسہ میں امدادی داخلہ نہیں ہوگا۔
(۲۴) کوئی طالب علم اگر نصاب کے مطابق نہیں پڑھے گا یا پڑھنے میں سستی کرے گا تو اس کا نام خارج کردیا جائے گا۔
(۲۵) غیر امدادی داخلہ ہونے والے طلبہ کے کھانے کا انتظام مدرسہ کی جانب سے کیا جا سکتا ہے، خوراکی پچاس روپئے ماہانہ ہوگی، جس میں چار ماہ کا خرچ داخل ہونے سے پہلے جمع کرنا ضروری ہوگا۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: امور شرعیہ دو قسموں میں منقسم ہیں: (۱) وہ امور جن کا تعلق بابِ احکام سے ہے، جن کے لئے شارع کی طرف سے بنیادی نصوص ہوتے ہیں (۲) وہ امور جن کا تعلق بابِ تربیت سے ہوتا ہے اور بابِ تربیت کا مدار نصوص پر نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ حالات اور مربی اور مربی کے مزاج وصلاحیت پر مدار ہوتا ہے؛ اس لئے بابِ تربیت میں بہت سی ایسی چیزیں بھی جائز ہوتی ہیں جو بابِ احکام کے لحاظ سے ناجائز ہیں؛ اس لئے مذکورہ تمام ضوابط بابِ تربیت میں جائز ہیں؛ لیکن جن ضابطوں میں روپیہ پیسہ کی بات آتی ہے ان میں نادار طالبان علم کی تخصیص حتی الامکان ضروری ہے، مثلاً داخلہ فیس لوٹا جوڑے وغیرہ نیز غیر امدادی طلبہ پر چار ماہ کا خرچ پیشگی جمع کرنا لازم قرار دینا باقی تمام اصول ماشاء اللہ مناسب ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍شوال المکرّم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۴۳۴)

سوال [۸۴۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے مدرسہ کے ضوابط برائے اساتذہ وطلبہ اور تعزیرات وتعطیلات جو مقرر کی گئی ہیں ان میں کوئی نمبر خلاف شرع تو نہیں؟ اگر ہے تو اس کی اصلاح وترمیم کی درخواست ہے۔

امید ہے کہ مزاج آپ کے بخیر ہوں گے۔ فقط

نوٹ: تمام نقلوں کی واپسی کی ضرورت نہیں صرف آپ کا جواب ہمارے لئے کافی ہے۔

المستفتی: مہربان علی بڑوتوی خادم تعلیمات مدرسہ عربیہ امداد الاسلام ہرسولی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) معلمین کے حق میں جو ضوابط مقرر کئے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی شریعت کے خلاف نہیں ہے، ان میں مدرسہ، طلبہ، معلمین، عوام سب کے حق میں فلاح ہی فلاح ہے۔

(۲) طلبہ کی تعزیرات کے لئے جو قوانین مقرر کئے گئے ہیں باب تربیت میں ان کی گنجائش ہے؛ البتہ مہذب ادارہ میں مہذب سزا مناسب ہے؛ اس لئے نمبر۲ رمیں مرغ بن کر چکر لگانے کے بجائے اگر حسب مناسب نوافل مقرر کردی جائیں تو زیادہ اصلاح وبہتری کی بات ہوگی۔

(۳) طلبہ کے لئے جو قوانین مقرر کئے گئے ہیں، باب تربیت میں ان سب کی گنجائش ہے، البتہ جن ضابطوں میں مالی بھار طلبہ پر رکھا گیا ہے، ان میں نادار غریب طلبہ کے حق میں تخفیف ہونی چاہئے، لوٹا، جوڑا، داخلہ فیس وغیرہ میں ان کے ساتھ تخفیف ہونی چاہئے، نیز غیر امدادی طلبہ سے چار ماہ کا خرچ پیشگی لینے کی مصلحت احقر کو سمجھ میں نہیں آئی، ویسے آپس کی رضامندی سے جو معاملہ طے کرلیا جائے تو شرعاً وہ معاملہ درست ہے، خلاف شرع نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ رشوال المکرّم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۴۳۱/۲۵)

مدرسے کے من جملہ بچوں کی ضروریات مدّ زکوۃ سے پوری کرنے کا حکم

سوال [۸۴۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مدارسِ اسلامیہ میں جو طلبہ دور دراز سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں، ان

میں ہر طرح کے طلبہ ہوتے ہیں (مالدار، غرباء یتیم) اب ان کے لئے مدرسہ والے جو چندہ لاتے ہیں، اس چندہ میں زکوۃ، صدقات اور امداد وغیرہ سبھی مدات ہوتی ہیں، اب چندہ کی رقم مجموعی طور سے مذکورہ طلبہ پر صرف ہوسکتی ہے، جب کہ مذکورہ طلبہ میں دوسرے صوبوں کے بھی طلبہ ہیں، تفصیل سے جواب تحریر فرما کر کرم فرمائیں۔ والسلام

المستفتی: بندہ خدا ملی تال (نینی تال)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زکوۃ، صدقات اور امداد وغیرہم کی رقوم غرباء، یتیم ومساکین طلبہ کو دینا اور ان کی ضروریات طعام ووظائف وغیرہ میں خرچ کرنا درست ہے، نیز ان طلبہ پر بھی خرچ کرنا درست ہے کہ جن کی ملکیت میں بقدر نصاب مال نہیں ہے، اگرچہ ان کے گھر پر مال موجود ہے؛ البتہ وہ غنی طلبہ کہ جن کی ملکیت میں نصاب سے زائد مال اور رقم ہے، راجح قول کے مطابق ان کو زکوۃ کی رقم دینا یا مد زکوۃ سے خرچ کرنا جائز نہیں ہے؛ لیکن مدارس میں پڑھنے والے طلبہ میں ایک دو فیصد بھی ایسے طلبہ نہیں ہوتے ہیں کہ جن کے پاس نصاب کے بقدر ماں باپ سے ہٹ کر الگ سے پیسے ہوں۔ (مستفاد: فتاویٰ دار العلوم ۶/ ۲۵۵، امداد الفتاوی ۲/ ۱۸، احسن الفتاوی ۴/ ۲۵۲، ایضاح النوادر/ ۴۸)

والأوجه تقييده بالفقير، ويكون طلب العلم مرخصا لجواز سؤاله من الزكوة وغيرها، وإن كان قادرا على الكسب إذ بدونه لا يحل له السؤال. (فتاوى شامي، كتاب الزكوة، باب المصرف، زكريا ۳/ ۲۸۶، كراچی ۲/ ۳۴۰، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۸/ ۳۳۶)

لا يجوز دفع الزكوة إلى من يملك نصابا، أي مال كان. (هندية، الباب السابع في المصارف، زكريا قديم ۱/ ۱۸۹، جديد ۱/ ۲۵۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸ رمحرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۴۳۳)

مدرسہ میں آمدہ غلہ میں اشیاء کی رسید دینے کا حکم

سوال [٨٤٢٣]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک دینی مدرسہ ہے، جس میں بیرونی طلبا مقیم ہیں، طلبا کا طعام مدرسہ کے مطبخ میں بنتا ہے، اکثر طلبا کا کھانا امدادی ہے، بعض کا غیر امدادی ہے، مدرسہ میں دوقسم کی رسید بک ہیں: ایک عام چندہ کرنے کی، دوسری رسید اشیاء کی ہے، جو غلہ وغیرہ مدرسہ میں آتا ہے اس کو اشیاء کی رسید دی جاتی ہے، اور اس کو مطبخ میں استعمال کیا جاتا ہے، گویا کہ اشیاء کی رسید کا مطلب یہ ہے کہ یہ مطبخ کی رسید ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ جو غیر امدادی طلبا طعام کی فیس جمع کرتے ہیں، ان کو اشیاء کی رسید دی جائے یا عام چندہ کی رسید دے کر اس رقم کو مین بیلنس میں جمع کیا جائے؟

المستفتی: مرغوب الرحمٰن، دھام پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں دوقسم کی رسیدوں کا ذکر ہے، ایک عام چندہ کی ہے۔ اور ایک اشیاء کی ہے اور اشیاء کے بارے میں یہ شبہ ظاہر کیا گیا ہے کہ جو بھی اشیاء ہوں وہ مطبخ میں آئیں گی، یہ بات عمومی طور پر ہے؛ لیکن کبھی کبھی ایسی اشیاء بھی ہوتی ہیں جو مطبخ سے متعلق نہیں ہیں، مثلاً تعمیر کے موقع پر سریا، چوکہ، سیمنٹ وغیرہ چندہ میں آجائے تو اس میں بھی اشیاء ہی کی رسید کاٹ کر دی جاتی ہے؛ اس لئے غیر امدادی طلبہ کی فیس جمع کرنے میں کوئی بھی رسید کاٹ کر دینے میں کوئی حرج نہیں، بس اتنی بات ضروری ہے کہ مطبخ میں خوراکی کی قیمت متعین ہو اور اس قیمت کی رسید کاٹ کر دے دی جائے۔ اور رسید کاٹنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اتنے دنوں کی خوراکی کا پیسہ مدرسہ میں آگیا ہے۔ اور مدارس میں اس طرح کا تعامل اور عرف ہے؛ اس لئے اس میں کسی کو اشکال نہیں ہونا چاہئے۔

المعروف كالمشروط. (الأشباه والنظائر، جديد ص: ٢٧٨)

المعروف بالعرف كالمشروط شرطا. (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ١٢٥، رقم: ٣٣٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٢؍ربیع الثانی ١٤٣٦ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٤١/١١٨٩)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١١/٤/١٤٣٦ھ

مدارس میں فیس لے کر تعلیم دینے کا حکم

سوال [٨٤٢٤]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مدارسِ اسلامیہ کے اندر درجہ حفظ یا درجہ عربی کے بچوں سے فیس لینا درست ہے، اس سے قرآن کا بیچنا تو لازم نہیں آئے گا؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کو مدرسے میں اس لئے داخل نہیں کراتے کہ فیس نہیں لگتی اور اسکولوں میں ہر مہینہ فیس لگتی ہے؛ حالانکہ قرآن کا مرتبہ اس سے بہت بڑھا ہوا ہے، پھر بھی مدرسہ والے فیس نہیں لیتے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ حافظ لوگ صدقہ کا مال کھاتے ہیں، جس سے ہمارے بچوں پر اس کا اثر پڑے گا۔

المستفتی: نسیم احمد غازی پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ میں طلبہ کو قرآن کریم اور دیگر دینی کتابوں کی تعلیم دے کر ان سے فیس وصول کرنا شرعاً جائز ہے۔ اور آج کل چوں کہ مدارس میں عموماً غریب اور نادار طلبہ ہوتے ہیں جو صدقات وخیرات وغیرہ کے مستحق ہوتے ہیں اور وہ تعلیم کی فیس ادا کرنے کے متحمل نہیں ہوتے ہیں؛ اس لئے مدارس میں ان سے تعلیمی فیس وصول نہیں کی جاتی ہے؛ لیکن اگر کسی مدرسہ میں تعلیمی فیس وصول کی جائے تو شرعاً اس کی اجازت ہے، اس کو قرآن کریم کا معاوضہ کہنا اور قرآن کی آیتوں کی فیس کہنا قطعاً درست نہیں؛ بلکہ تعلیم

دینے والے بچوں کے حبس وقت کی فیس اور تنخواہ ہے، جو فیسوں کے نام سے وصول کیا جاتا ہے، ورنہ قرآن کی آیتوں کی فیس کون ادا کرسکتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱/۴۲۲)

قال في الهداية: وبعض مشايخنا استحسنوا الاستئجار على تعليم القرآن اليوم؛ لظهور التواني في الأمور الدينية، ففي الامتناع تضييع حفظ القرآن وعليه الفتوى. (شامي، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، مطلب تحرير مهم في عدم جواز الاستئجار على التلاوة والتهليل، زكريا ٩/ ٧٦، كراچی ٦/ ٥٥، هداية أشرفی ٣/ ٣٠٣، البناية، أشرفيه ديوبند ١٠/ ٢٨٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/۳/۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۲۲۰/۳۸)

طلبہ کا بلا اجازت مدرسہ کی چیزوں کو استعمال کرنے کا حکم

سوال [۸۴۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی طالب علم مدرسہ کے ذمہ داران کی اجازت کے بغیر کھانے کی کوئی چیز اٹھا کر کھالے تو اس کا مدلل حکم تحریر کیجئے۔

المستفتی: محمد ابو الکلام، مظفر نگر، متعلم مدرسہ شاہی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مدرسہ کی جس چیز کا ذکر کیا جارہا ہے، اگر وہ چیز مدزکوۃ کی ہے، تو اس کے مستحقین میں مذکورہ طالب علم بھی ہے، اس نے جو چیز ذمہ داروں کی اجازت کے بغیر کھائی ہے، دیانۃً تو وہ چیز اس کے لئے حلال ہوئی؛ لیکن مدرسہ کے ذمہ داران اور مدرسہ کے نظام کے خلاف اس نے یہ عمل کیا ہے اور اس طرح کے اعمال کی بنا پر مدرسہ کا نظم ونسق باقی نہیں رہ سکتا؛ اس لئے کسی طالب علم کے لئے مدرسہ کے قانون اور نظام کی مخالفت کی بنا پر ذمہ داران کی اجازت کے بغیر از خود مدرسہ کی کسی چیز کے کھانے کی اجازت نہیں۔

وظاهره أن من له حظ في بيت المال بكونه فقيرا، أو عالما، أو نحو ذلک، ووجد ما مرجعه إلى بيت المال من أي بيت من البيوت الأربعة الآتية في آخر الجزية له أخذه ديانة بطريق الظفر في زماننا، ولا يتقيد أخذه بأن يكون مرجع المأخوذ إلى البيت الذي يستحق منه. (شامي، كتاب الجهاد، باب المغنم وقسمته، مطلب: فيمن له حق في بيت المال، وظفر بشيء من بيت المال زكريا ٦/ ٢٦٥، كراچی ٤/ ١٥٩، البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ١١٨، زكريا ٥/ ٢٠٠، هندية زكريا قديم ١/ ١٩١، جديد ١/ ٢٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍صفر المظفر ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۴۹۵)

تعلیمی اوقات کے دوران طلبہ کو قرآن خوانی کے لئے بھیجنا

سوال [۸۴۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ کے تعلیمی وقت میں طلبہ کو قرآن خوانی کی دعوت میں بھیجنا کیسا ہے، جب کہ تعلیمی وقت میں قرآن خوانی کے لئے بھیجنے کی صورت میں تعلیم کا نقصان یقینی ہوتا ہے، اس سلسلے میں مدرسہ والوں کی کیا ذمہ داری ہے؟

المستفتی: راشد علی (کاتب) پیپلسانہ، ضلع مرادآباد (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: ارباب مدرسہ کی اہم ذمہ داری یہی ہے کہ طلبہ کو ہر ایسی چیز اور امور سے محفوظ رکھیں جو ان کی تعلیم میں نقصان دہ ہوں، چاہے وہ امور فی نفسہ اچھے کیوں نہ ہوں، کیونکہ ان کے لئے تعلیم سے اہم کوئی چیز نہیں ہے، نیز موجودہ دور میں جن لوازمات کے ساتھ قرآن خوانی ہوتی ہے، اس کو بعض فقہاء نے ناجائز اور مکروہ قرار دیا ہے۔

من قال من المشايخ: قراءة القرآن بالجماعة جهرا ويسمى

بالفارسية سی پاره خوانده مکروه الخ. (نفع المفتي والسائل، ص: ۱۲٤، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ۷/ ۵۱۳، رقم: ۹٤۵۲، الفتاوى التاتارخانية زكريا ۱۸/ ۵۸، رقم: ۲۸۰۲۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۱۷۸)

مدارس کے طلباء سے قرآن خوانی کرانا

سوال [۸۴۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدارس کے بچوں سے کلام پاک پڑھوانا کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: عبدالمعید قاسمی آزادنگر، ہلدوانی نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: فی نفسہٖ قرآن کریم کی تلاوت باعث خیر وبرکت ہے؛ لیکن اس زمانہ میں جو مدارس کے طلبہ کو تعلیمی وقت وغیرہ میں لے جاکر پڑھوایا جاتا ہے، اس میں بہت سی خرابیاں ہیں، مثلاً طلبہ کی تعلیم کا حرج وہاں جاکر کھانے پینے کا التزام وغیرہ، اس لئے مروجہ طریقہ سے گھروں میں لے جاکر پڑھوانا ممنوع اور بدعت سئیہ ہے۔

ومن قال من المشايخ: إن ختم القرآن بالجماعة جهرا ويسمى بالفارسية سي پاره خوانده مكروه. (المحيط البرهاني، كتاب الكراهية والاستحسان، الفصل الرابع، المجلس العلمي ۷/ ۵۱۳، رقم: ۹٤۵۲، الفتاوى التاتارخانية زكريا ۱۸/ ۵۸، رقم: ۲۸۰۲۳، نفع المفتي والسائل، ص: ۱۲٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۰۷۹)

لڑکیوں کا مدرسہ قائم کرنا

سوال [۸۴۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خواتین کی بڑھتی ہوئی جہالت کو مٹانے کے لئے ایک شخص پورے پردہ وغیرہ کی رعایت کے ساتھ لڑکیوں کا مدرسہ کھولنا چاہتا ہے، جس میں اساتذہ کی اکثریت عورتوں کی ہوگی، مگر کچھ مرد بھی ہوں گے، جو پردہ کے اندر سے تعلیم دیں گے، تو اس کا یہ اقدام کیسا ہے؟

المستفتی: محمد محسن علی متعلم تکمیل ادب مدرسہ امدادیہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زنانہ مدارس کا کھولنا اور جاری کرنا اور لڑکیوں کے لئے وہاں تعلیم کے لئے جانا اور عورتوں کو ان کی صنف کے مناسب علوم وفنون سکھانا یہ تمام امور نہ یہ کہ صرف جائز ہیں؛ بلکہ مستحسن ہیں؛ لیکن لڑکیوں کے اسکول صرف لڑکیوں کے لئے مخصوص ہونے چاہئے تاکہ فتنہ کا احتمال باقی نہ رہے، جس کے لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ نیک کردار پاک دامن عورتوں کو تعلیم وتربیت کے لئے مقرر کیا جائے، اگر معلمات نہ مل سکیں، تو مجبوراً نیک اور صالح قابل اعتماد مردوں کو متعین کیا جائے۔ اور ان کی کڑی نگرانی رکھی جائے اور کسی بھی طرح بے پردگی بالکل نہ ہونے پائے، تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۲/ ۳۵-۳۶، جدید مطول ۲/ ۳۸۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۰۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۵/۲۹ھ

مدارسِ اسلامیہ میں غیر مسلم بچوں کو تعلیم دینے کا حکم

سوال [۸۴۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کیا اسلامی مدارس میں غیر مسلم ہندو بچوں کو ان کے والدین کی خواہش پر عربی تعلیم دینا درست ہے، جب کہ وہ مسلم بچوں کے مقابلہ میں صاف ستھرے ہوکر آئیں؟

المستفتی: سید اشرف علی شیر کوٹ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسلامی مدارس میں غیر مسلم ہندو بچوں کو ان کی خواہش کے مطابق داخل کر کے عربی تعلیم دینا درست ہے، جب کہ ان غیر مسلم بچوں کی نیت صاف ہو، علم حاصل کر کے مذہب اسلام پر اعتراض کرنے کی نیت نہ ہو۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۲/ ۱۴، جدید مطول ۲/ ۵۲۸)

وفي الخانية: من بحث القراءة الحربي أو الذمي إذا طلب تعلم القرآن، والفقه، والأحكام يعلم رجاء أن يهتدي؛ لكن يمنع من مس المصحف إلا إذا اغتسل فلا يمنع. (حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح، دارالكتاب ديوبند، ص: ١٤٣)

ويمنع النصراني من مسه، وجوزه محمد إذا اغتسل، ولا بأس بتعليمه القرآن والفقه عسى يهتدى. (شامي، كتاب الطهارة، مطلب يطلق الدعاء على ما يشمل الثناء، زكريا ١/ ٣٢١، كراچی ١/ ١٧٧، وهكذا في حلبي كبير سهيل اكيڈمی لاهور، ص: ٤٩٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ر شعبان ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۵۶۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۸/۲۹ھ

طلباء کو انعام میں ملنے والے روپیوں کا مالک کون؟

سوال [۸۴۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی بچہ نے مقابلہ قراءت ونعت خوانی میں اول نمبر حاصل کیا، اس بچہ سے خوش ہوکر

مقابلہ کرانے والی کمیٹی نے بطور انعام ایک قرآن شریف اور -/500 روپئے نقد اور ایک دیوار گھڑی اور ایک سند بھی دی اور وہ بچہ اس وقت ہاپوڑ میں زیر تعلیم تھا اور وہیں سے مقابلہ کے لئے گیا تھا، جب سب انعام مل گیا تو مدرسہ والوں نے قرآن تو بچہ کو دے دیا؛ لیکن بقیہ مذکورہ سامان بچہ کو نہیں دیا اور مدرسہ والے یہ کہہ رہے ہیں کہ مدرسہ کی طرف سے بھیجا گیا تھا؛ لہٰذا سامان مدرسہ ہی لے گا، شریعت کی روشنی سے مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد نذیر احمد مؤذن مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: دینی مدارس کی جانب سے جن بچوں کو قراءت وغیرہ کے مقابلہ ومظاہرہ کے لئے بھیجا جاتا ہے، اس سے یہ مقصود نہیں ہوتا ہے کہ بچے مدرسہ کے لئے آمدنی حاصل کر کے لائیں گے؛ بلکہ صرف بچہ کی ہمت افزائی اور مدرسہ کی شہرت مقصود ہوتی ہے اور انعام دینے والے بھی محض بچہ کی حوصلہ افزائی کی غرض سے خاص طور پر بچے کو دیتے ہیں، اگر یہ معلوم ہو جائے کہ بچے سے لے لیا جائے گا، تو بچے کو بھی نہیں دیں گے؛ اس لئے عرف میں جو کچھ بھی انعام بچے کو ملتا ہے وہ سب بچے کا حق ہے، جبراً یا دباؤ ڈال کر بچے سے لے لینا جائز نہیں ہے۔

عن أبي حميد الساعدي –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلک لما حرم الله مال المسلم على المسلم. (مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

عن أبي حرة الرقاشي عن عمه، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (شعب الإيمان للبيهقي، باب في قبض اليد عن الأموال المحرمة، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٧، رقم: ٥٤٩٢)

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (شرح عقود رسم المفتي، قديم، ص: ٩٤، قواعد الفقه أشرفي، ص: ٧٤، رقم: ١٠١)

لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. (قواعد الفقه أشرفي،

ص: ۱۱۰، رقم: ۲۶۹، شرح المجلة رستم اتحاد ۱/ ۶۲، رقم المادة ۹۷، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲۱/ ۱۱۲، ۲۸/ ۲۶٤، ۳۷/ ۳۰٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم رمضان ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۱۹۳۸)

کیا پرانے مکتب میں تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھنا ضروری ہے؟

سوال [۸۴۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں کی مسجد کو بنے ہوئے ۳۵؍ سال ہوگئے ہیں اور مکتب کو جو اسی مسجد کی ملکیت کی زمین میں ہے۔ ۲۷؍ سال ہوگئے، اب اس مکتب کی چھت کمزور ہوگئی ہے، تو مکتب چلانے والے ذمہ دار اور مہتمم مسجد کے متولی کی اجازت سے اس چھت کی مرمت یا تعمیر کر سکتے ہیں، تاکہ آئندہ بھی بچے وہاں تعلیم حاصل کر سکیں، یا اس مکتب کی زمین کو بھی مسجد میں شامل کرلیا جائے شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: عبد الکریم راجہ غالب پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب ۲۷؍ سال سے مکتب قائم ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ متولی وواقف کی اجازت سے ہے؛ لہٰذا اس کو آئندہ کے لئے بھی باقی رکھ کر تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھنا بلا تردد جائز ہوگا۔ اور کمزور چھت کی مرمت بھی متولی وغیرہ کی اجازت سے کر دینا جائز ہوگا۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۵/ ۲۳۷، ڈابھیل ۱۵/ ۵۹۷)

وسائر التصرفات لمن يتولى. (درمختار على الشامي، الوقف، مطلب لا يستبدل العامر إلا في أربع، زكريا ٦/ ٥٨٩، كراچی ٤/ ٣٨٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤/ ١٣٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱/۵ھ

الفصل الثاني: في التولية

طلبا کی تعلیمی کوتاہی پر مسئول کون ہے؟

سوال [٨٤٣٢]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: طلبہ قومی وملی امانت ہیں، ان کی تعلیم وتربیت میں دانستہ کوتاہی ہورہی ہے، عنداللہ مسئول کون ہوں گے؟ ان حالات کی روشنی میں مدرسہ کی ملازمت کا کیا حکم ہے؟ مفصل ومدلل جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: نبی حسن، خادم دار العلوم ارریہ بیر گاچھی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر طلبہ کی تعلیم وتربیت میں دانستہ کوتاہی ہورہی ہے تو اساتذہ عنداللہ مسئول ہوں گے۔ اور اگر اس کوتاہی میں ناظم مدرسہ یا مہتمم مدرسہ کا دخل ہے تو اللہ کے نزدیک وہی مسئول ہوگا؛ کیوں کہ مہتمم کے سامنے اساتذہ کا اختیار نہیں چلتا؛ البتہ مدرسے کی ملازمت آپ کے لئے ہر حال میں جائز ہے، انتظامی کوتاہی کے آپ ذمہ دار نہیں ہیں، اس کے ذمہ دار منتظمین حضرات ہیں، اللہ کے یہاں انہیں سے پوچھا جائے گا۔

عن ابن عمر –رضي الله عنه– عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ألا! كلكم راع، وكلكم مسئول عن رعيته، فالأمير الذي على الناس راع، وهو مسئول عن رعيته. (مسلم شريف، باب فضيلة الإمام العادل، النسخة الهندية ٢/ ١٢٢، بيت الأفكار، رقم: ٨٢٩، صحيح البخاري، كتاب الجمعة، النسخة الهندية ١/ ١٢٢، رقم: ٨٨٣، ف: ٨٩٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٦/ صفر ١٤٢٦ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٨٧٢/٣٧)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٢٦/٢/١٨ھ

موقوفہ جائیداد کو ذاتی ملکیت سمجھنے کا حکم

سوال [۸۴۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) اگر کوئی مہتمم مدرسہ یا متولی زبان سے تو ملکیت نہ کہتا ہو، مگر دل میں وقف دینی مدرسہ کو اپنی ذاتی ملکیت ہی سمجھتا ہو، تو اس کا کیا حکم ہے؟

(۲) اس کے برعکس زبان سے کچھ نہ کہتا ہو، مگر عملاً وقف کی جائیداد مدرسہ کی جائیداد کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتا ہو، تو اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: عبدالحق چندرہاں عمری الہ آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) دینی مدرسہ کی زمین اور جائیداد کو اپنی ملکیت قرار دینا یا اپنی ملکیت سمجھنا درست نہیں ہے؛ بلکہ مہتمم یا متولی کو اپنے آپ کو مدرسہ یا مسجد کا خادم سمجھنا چاہئے۔

لم يبق على ملک الواقف، ولا انتقل إلى ملک غيره بل صار على حكم ملک الله تعالىٰ الذي لا ملک فيه لأحد سواه. (شامي، الوقف، مطلب لو وقف على الأغنياء وحدهم لم يجز، زكريا ٦/ ٥٢١، كراچی ٤/ ٣٣٩، الفقه الإسلامي وأدلته، دارالفكر ١٠/ ٧٦٠١، هدى انٹر نيشنل ديوبند ٨/ ١٥٣، مجمع الأنهر دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٥٧١، مصري قديم ١/ ٧٤٠، هندية، زكريا قديم ٢/ ٣٥٠، جديد ٢/ ٣٤٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/۳/۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۲۱۶/۳۸)

مہتمم صاحب کا مدرسہ کی زمین اپنے نام رجسٹری کروانے کا حکم

سوال [۸۴۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: دینی مدرسہ کی زمین وجائیداد کواپنے ذاتی نام سے رجسٹری یارجسٹریشن کرانا کیسا ہے؟ جس طرح لوگ اپنی زمین وجائیداد اور باغ وغیرہ اپنے نام بیع نامہ یا رجسٹری کراتے ہیں، اسی طرح زمین ومکان اپنے نام کرانا کیسا ہے؟ کیا مہتمم یا متولی اپنے نام کرا سکتا ہے یانہیں؟ اگر دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اپنے نام رجسٹری یا بیع نامہ کرالیا ہوتو پھراب کیا کرنا چاہئے،اسے یوں ہی رہنے دیا جائے یارد کرائیں؟

المستفتی: عبدالحق چندوہاں عمری الہ آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کی زمین وجائیداد کومہتمم یا ناظم مدرسہ کے لئے مدرسہ کے نام رجسٹری کرانا لازم اورضروری ہے،اگررجسٹری اپنے نام سے کرالی ہےتو اس کو مدرسہ یامسجد کے نام سے دوبارہ رجسٹری کرالیناچاہئے۔

وینزع وجوبا لو الواقف فغیرہ بالأولیٰ غیر مامون (درمختار) وفي الشامیة: قال في الإسعاف: ولا یولی إلا أمین قادر بنفسه أو بنائبه؛ لأن الولایة مقیدة بشرط النظر، ولیس من النظر تولیة الخائن؛ لأنه یخل بالمقصود. (شامي، الوقف، مطلب في شروط المتولي زكريا ٦/ ٥٧٨، كراچی ٤/ ٣٨٠، الموسوعة الفقية الكويتية ٤٤/ ٢٠٧، البحرالرائق، زكريا ٥/ ٣٧٨، كوئٹه ٥/ ٢٢٦، هندية زكريا قديم ٢/ ٤٠٨، جديد ٢/ ٣٨٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۲۱۶)

مدرسہ کے لئے خریدی گئی زمین کا شخصی بیع نامہ کرانا

سوال [۸۴۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک عمارت مدرسہ کے لئے خریدی گئی، یہ مدرسہ امدادالعلوم محلّہ قریشیان کے نام سے

موسوم ہے، جو عرصہ پچاس سال سے دینی خدمت انجام دیتا چلا آرہا ہے، جس میں حفاظ فارغ ہوتے چلے آرہے ہیں، آج بھی اس مدرسہ میں معلمین حضرات حافظ وقاری دینی خدمت کو انجام دے رہے ہیں، وہ نئی عمارت جو مدرسہ کے پیسہ سے خریدی گئی، اس میں بھی عرصہ آٹھ سال سے دینی تعلیم بدستور چلی آرہی ہے، جگہ کی قلت کی وجہ سے یہ عمارت مدرسہ نے اپنی جیب خاص سے خریدی، اس میں بھی آٹھ سال سے بدستور دینی خدمت انجام دی جارہی ہے، اب یہ عمارت کسی نے وقف نہیں کی؛ بلکہ یہ عمارت مدرسہ نے صدقہ خیرات زکوۃ وچرم قربانی اور تمام ہی مدات سے بطور امداد خریدی، اب زید نے اس عمارت کو آٹھویں یا دسویں تک کرانے کے لئے بیع نامہ اپنے نام کرالیا ہے، جب کہ یہ عمارت مدرسہ کے پیسہ سے خریدی گئی تھی، اب اس مدرسہ کو بجائے مدرسہ کے جونیر ہائی اسکول کے نام سے موسوم کرلیا ہے، اب جب کہ جونیر ہائی اسکول کے نام سے بیع نامہ کرالیا ہے، تو پھر جب کبھی سرکاری پیسہ آنا شروع ہوگا تو پھر مدرسہ سے اس کا کچھ تعلق نہ رہے گا اور مدرسہ جو کہ دین کی بقا کا ذریعہ ہے بالکل ختم ہوجائے گا، تو کیا زید مدرسہ کے حق میں اچھا کر رہا ہے یا برا؟ کیا زید کا شمار دین کے باغیوں میں ہوگا یا فرماں برداروں میں؟ اور زید نے یہ بیع نامہ بغیر قوم وملت کے مشورے کے خود اپنے نام کرالیا ہے، قوم وملت اس بیع نامہ کے خلاف ہے، ان تمام امر کا جواب دے کر ماجور ہوں۔

المستفتی: امیر حسین ٹھیکیدار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ عمارت جو مدرسہ کے لئے مدرسہ کے نام سے خریدی گئی تھی، اس کو زید کا اپنے نام سے بیع نامہ کرالینا سخت ترین خیانت اور غصب ہے، وہاں کے اہل حل وعقد اور بااثر لوگوں پر لازم ہے کہ ایسے خائن ذمہ دار کو فوری طور پر ذمہ داری سے سبکدوش کردیں، اس کا نام بیع نامہ سے خارج کردیں اور مدرسہ کی عمارت کی حفاظت کریں، مدرسہ کی کسی بھی عمارت کو کسی شخص کے نام کرنا جائز نہیں ہے۔

إن عزل القاضي للخائن واجب عليه. الخ (مجمع الأنهر، كتاب الوقف، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٦٠٢، قديم ١/ ٧٦٢، شامي، زكريا ٦/ ٥٧٨، كراچی ٤/ ٣٨٠، البحر الرائق، زكريا ٥/ ٤١١، كوئٹه ٥/ ٢٤٥، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٣٤، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۴۲۲)

احکام شریعت کا لحاظ نہ رکھنے والے مہتمم کا حکم

سوال [۸۴۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں دینی مدرسہ میں جو مہتمم ہے وہ داڑھی نہیں رکھتا ہے، انگریزی لباس پہنتا ہے، اپنے گھر کی عورتوں کو بے پردہ رکھتا ہے، گھر میں ٹی وی رکھتا ہے، ہر وقت فلم وغیرہ دیکھتا ہے اور پہلے کسی دوسرے کالج میں پرنسپل رہا ہے اور وہاں پر غبن کیا ہے اور وہاں سے دو سال قبل ان ہی حرکتوں کی وجہ سے رٹائر کر دیا گیا ہے اور مستقل علماء دین کے ساتھ توہین آمیز گفتگو کرتا ہے، جب تک دوسرے مہتمم رہے ان کو ہر طرح پریشان کرتا رہا اور مجلسِ شوریٰ میں بہت سے دیندار پابند شریعت متبع سنت لوگ ہیں، تو کیا ایسے آدمی کو مہتمم بنانا درست ہے؟ اور مدرسہ کے حق میں دعا فرمائیے۔

المستفتی: محمد خالد معرفت اسعد الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مدرسہ کا مہتمم اگر داڑھی کٹا تا ہو، اپنے گھر کی عورتوں کو بے پردہ رکھتا ہو، گھر میں ٹی وی رکھ کر فلمیں وغیرہ دیکھتا ہو اور بلا وجہ مدرسین اور اساتذہ کو پریشان کرتا ہو اور گالیاں دیتا ہو، تو ایسا مہتمم فاسق ہے، اس کو معزول کر دینا چاہئے اور جب

کہ شوریٰ میں اس کے علاوہ دوسرے حضرات پابند شریعت اور متبعین سنت موجود ہیں، تو ان ہی میں سے کسی کو مہتمم بنایا جائے، تاکہ مدرسہ کا نظام اور مقصد قیام تعلیم وتعلم کا سلسلہ باقی رہے۔

وینزع وجوبا لو الواقف. فغیره بالأولی غیر مامون أو عاجزا، أو ظهر به فسق، کشرب خمر ونحوه. (درمختار) وفي الشامیة: قوله: ''غیر مامون'' قال في الإسعاف: ولا یولي إلا أمین قادر بنفسه، أو بنائبه؛ لأن الولایة مقیدة بشرط النظر الخ. (درمختار مع الشامي، الوقف، مطلب في شروط المتولي زکریا ٦/ ٥٧٨، کراچی ٤/ ٣٨٠، البحرالرائق زکریا ٥/ ٤١١، کوئٹه ٥/ ٢٤٥، بزازیة، زکریا جدید ٣/ ١٣٤، وعلی هامش الهندیة ٦/ ٢٥٣، مجمع الأنهر دارالکتب العلمیة بیروت ٢/ ٦٠٢، مصري قدیم ١/ ٧٦٢، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ٤٤/ ٢٠٧)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۹ رجب ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۲۸۴/۳۴)	۲۹/۷/۱۴۲۰ھ

مہتمم سے متعلق سوال وجواب

سوال [۸۴۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے گاؤں میں ایک مدرسہ ہے جو بریلوی حضرات کے قبضہ میں چل رہا ہے، اور مسلک اہل سنت (مسلک علماء دیوبند) کا کوئی مدرسہ نہ تھا، چند نوجوانوں نے جدوجہد کرکے رضا خانیوں سے مدرسہ چھین لیا اور مسلک دیوبند کے قبضہ میں آگیا، مدرسہ کی ایک کمیٹی بھی بنائی گئی، جس میں ہمارے گاؤں کے ایک صاحب ہیں جو مدرسہ فرقانیہ گونڈہ میں مدرس ہیں، ان کو مہتمم کے نام سے منتخب کیا گیا، مدرسہ چلنے لگا اور تعلیم بھی بہترین طریقہ سے

ہونے لگی، آمدنی کے وسائل بھی پیدا ہوگئے، مدرسہ صحیح ڈھنگ سے چلنے لگا، اس کے بعد مہتمم صاحب نے من مانی کرنا شروع کی، یہاں تک کہ کئی سال ہوگئے میٹنگ تک نہیں کی، کمیٹی کے لوگ کرتے رہے؛ لیکن کوئی توجہ نہ کی، آہستہ آہستہ تعلیم بالکل کمزور ہوگئی اور مہتمم صاحب کے اندر اقربا پروری بھی آگئی اور اپنے بہنوئی کو مدرس رکھ لیا جو پڑھانے لکھانے میں نہایت ہی نکمے تھے، ان کے آنے سے مدرسہ کی حالت اور زیادہ خراب ہوگئی، علاقہ سے بہت شکایتیں آنے لگیں، مدرسہ کے نائب مہتمم اور دیگر حضرات مہتمم صاحب کے پاس گونڈہ گئے کہ میٹنگ کرو؛ لیکن مہتمم صاحب نے بات سنی ان سنی کردی اور مدرسہ کا نظام بہت ہی زیادہ خراب ہوگیا، مہتمم صاحب کے بہنوئی صاحب نے مدرسین میں گروپ بندی کرنا شروع کردی، جس کی وجہ سے تعلیم اور زیادہ خراب ہوگئی، یہاں تک کہ مہتمم صاحب نے چوری چوری ایک کمیٹی بنائی، جس میں اپنے ایک بھائی کو صدر دوسرے کو سکریٹری اور خود مہتمم اور بقیہ بھائیوں اور بھتیجوں اور بہنوئی کو ممبر بنا کر کمیٹی فیض آباد سے رجسٹریشن کرالی، جب کچھ دنوں کے بعد علاقہ والوں کو پتہ چلا کہ حضرت مہتمم صاحب ایسی ٹیڑھی چال چلے ہیں، تو لوگ فیض آباد گئے تو رجسٹرار نے بتایا کہ مدرسہ رجسٹریشن ہو چکا ہے، اب مقدمہ دائر کرو تب شاید کچھ نکلے، ان لوگوں نے چونکہ کافی رشوت دے کر رجسٹریشن کرایا تھا، علاقہ والوں نے سرکاری مقدمہ دائر کرنا مناسب نہ سمجھا اور کچھ لوگ اکٹھا ہوئے کہ مہتمم صاحب سے کہا جائے کہ انہوں نے ایسا کام کیوں کیا ہے؟ لیکن وہ سامنے نہیں آئے اور مہتمم صاحب رات میں مدرسہ جا کر مدرسہ کا تالا توڑ کر مدرسہ کی روداد اور رسیدات، رجسٹر، بالٹی، ٹاٹ، پٹی وغیرہ سب اٹھالے گئے اور مدرسہ کی رقم جو انہیں کے پاس سب جمع تھی سب لے لی اور دینے سے انکار کردیا۔ اور رجسٹریشن کے حساب سے پرانے مدرسہ کے نام سے دوسری جگہ چھپر رکھ کر اپنے گھر کے اپنے بہنوئی کے بچوں کو لے کر مدرسہ قائم کردیا اور پرانے مدرسہ والوں نے مقدمہ کرنا نامناسب سمجھ کر خدا کے بھروسہ پر مدرسہ کا نام تبدیل کر کے مدرسہ چلانا شروع کیا، اب یہ حضرات ایسی ہٹ دھرمی پر تلے ہیں کہ باہر جا کر پرانے معاونین کو روکتے ہیں کہ وہاں چندہ مت دو اور

تعاون نہ کرو، جس کی کئی شہادتیں موجود ہیں۔ اور اب بھی اسی کوشش میں لگے ہیں کہ کسی طریقہ سے یہ پرانا مدرسہ بند ہوجائے، پرانے مدرسہ کی عمارت پختہ عمارت ہے، رقبہ ستر ستر فٹ ہے؛ لہٰذا مہتمم صاحب کی کارستانیوں کو قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان فرمائیں؛ کیوں کہ اس کا علاقہ والوں پر بہت برا اثر پڑا ہے، رضا خانی حضرات خوب مذاق اڑاتے ہیں اور جو لوگ رضا خانیت سے توبہ کرکے اس طرف آئے تھے وہ لوگ بہت برا اثر لے رہے ہیں، اس میں پورے مسلک کی بدنامی ہورہی ہے۔

المستفتی: محمد خان سراوستی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مہتمم صاحب کے لئے مدرسہ کی رقم، رسیدات، روداد اور رجسٹر وغیرہ دیگر سامان روکنا اور لے جانا اور سابقہ مدرسہ کے نام پر دوسرے مدرسہ کا نام رکھنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے؛ بلکہ تمام چیزوں کی واپسی لازم ہے؛ کیوں کہ ایک مدرسہ کی رقم یا دیگر اشیاء دوسرے مدرسہ میں صرف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۶/ ۴۰۷، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۰/ ۲۱۱، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۴۷۲-۴۷۳)

ومن اختلاف الجهة ما إذا كان الوقف منزلين أحدهما للسكنى والآخر للاستغلال، فلا يصرف أحدهما للآخر، وهي واقعة الفتوى. (شامي، الوقف، مطلب في نقل القاضي المسجد ونحوه، زكريا ٦/ ٥٥١، كراچی ٤/ ٣٦١) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۸۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۹ھ

مدارس اسلامیہ کے قوانین کی پابندی مہتمم وملازم سب پر لازم ہے

سوال [۸۴۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: (۱) مغربی یوپی کے بیشتر مدارس ومساجد میں مدرسین وملازمین اورمؤذنین وائمہ حضرات کومشاہرہ اتنا کم دیا جاتا ہے کہ اس میں ان کی زندگی کی اہم ضروریات بھی پوری نہیں ہو پاتیں، سخت دوڑ دھوپ اور جدوجہد کے بعد بھی یہ حضرات ضروریات زندگی کی فراہمی اور اہل وعیال کے حقوق ادا کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ حقوق العباد ادا نہ کر پانے کی وجہ سے بعض اوقات معاشرہ میں سب کی بے توقیری اور اندرون خانہ حقارت آمیز رویہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، دیگرمراعات کا تو کیا ذکر، ان حضرات کو اکثر اضافی کاموں کا بھی کچھ عوض نہیں ملتا۔ از روئے شریعت ذمہ دارانِ مدارس ومساجد کا یہ عمل کیسا ہے؟ اور مدارس ومساجد کے ایسے ذمہ دار لوگ شریعت کی نظر میں کیا کہلانے کے مستحق ہیں؟

(۲) بعض مدارس میں حال یہ ہے کہ جب مدرسین وملازمین تنخواہ کا مطالبہ کرتے ہیں، تو ان کو رسید دے دی جاتی ہے کہ وہ چندہ کر کے اپنی تنخواہ خود وصول کرلیں، منتظمینِ مدرسہ کا یہ عمل کیسا ہے؟

(۳) اس تکلیف دہ صورتِ حال کا مناسب اور معقول حل کیا ہونا چاہئے؟

(۴) ضروریاتِ زندگی کی فراہمی، حقوق العباد کی ادائے گی اور گوناگوں حالات کے مقابلے کے لئے مدرسین وملازمین اورمؤذنین وائمہ حضرات کا مشاہرہ کتنا ہونا چاہئے؟

(۵) ہمارے حضرات علماء کرام جو یقیناً مذکورہ حضرات کی زبوں حالی سے واقف ہیں، وہ ان کے حق میں کوئی آواز کیوں نہیں اٹھاتے؟

(۶) مساجد میں ائمہ سے مسلسل کام لیا جاتا ہے اور ائمہ کو ضرورتاً ایک دو روز کے لئے کہیں جانا پڑتا ہے تو مسجدوں کے ذمہ داران ائمہ حضرات ہی کو اس کا پابند بناتے ہیں کہ وہ کسی نماز پڑھانے والے کا انتظام کریں، بعض اوقات کسی کا انتظام نہیں ہو پاتا تو اماموں کا جانا موقوف وناممکن ہو جاتا ہے۔

(۷) بعض مدارس میں مدرسین وملازمین کو کوئی چھٹی منجانب مدرسہ قطعاً نہیں دی جاتی، اگر کوئی بیمار ہو جائے یا ضرورت سے کہیں جانا پڑ جائے تو اس کی تنخواہ وضع کر لی جاتی ہے۔ کیا شرعاً یہ درست ہے؟

(۸) بعض مقامات پر مقتدی قربانی کی کھال بطور ہدیہ ائمہ کرام کو دے دیتے ہیں؛ لیکن اہل مدارس اس سے منع کرتے ہیں، کیا مدرسہ والوں کا یہ عمل از روئے شریعت جائز ہے؟

(۹) بعض مدارس والے یہ زیادتی کرتے ہیں کہ ابتداً ملازم و مدرس کو معمولی تنخواہ پر عارضی کہہ کر رکھ لیتے ہیں اور دو دو، ڈھائی ڈھائی سال گذر جاتے ہیں اور اسی طرح ان سے کام لیتے رہتے ہیں، نہ ان کی تنخواہ بڑھاتے ہیں، نہ ان کا استقلال منظور کرتے ہیں، منتظمینِ مدرسہ کے لئے ایسا کرنا کیسا ہے؟

(۱۰) بہت کم مساجد میں ائمہ کرام کے لئے رہائشی مکان کا نظم ہے، زیادہ تر مساجد کے ذمہ دار اور عوام اماموں کی ضرورت سے لاپرواہ اور غافل ہیں، وہ اس بات کا قطعاً خیال نہیں کرتے کہ امام اور مؤذن کے لئے مسجد کے قریب کسی مناسب رہائشی مکان کا نظم کردیں، اگرچہ اس میں امام اور مقتدی دونوں کو سہولت ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ یہ انتظام نہیں کرسکتے؛ اس لئے کہ مساجد کی تزئین و بے جا آرائش پر نیز سردی گرمی سے حفاظت کے نام پر اور مسجدوں کے بلند میناروں اور گنبدوں پر پانی کی طرح پیسہ بہایا جاتا ہے، تو ایسی حالت میں اگر امام اہل محلّہ سے رہائشی مکان کی درخواست کرے تو امام کا یہ مطالبہ جائز ہے یا نہیں؟ اور اہل محلّہ کو اس کا نظم کرنا چاہئے یا نہیں؟ فقط

المستفتی: تنظیم برائے فلاح و بہبود ائمہ مساجد سہارنپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مساجد اور مدارسِ اسلامیہ کے قوانین اور آپس میں تقرر و عزل اور ملازمت سب چیزوں کا مدار اس حدیث پاک پر ہے۔

حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن كثير بن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا أو أحل

حراما. (ترمذي شريف، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۲۳، رقم: ۲۸۶۹)

اس حدیث شریف کے پیشِ نظر مساجد ومدارس کے جوبھی قانون بنائے جاتے ہیں اور آپس کی تراضی سے ان قانون وضوابط کے مطابق تقرر ہوجائے، تو جانبین اسی کے پابند ہیں؛ لہٰذا جس مدرسہ میں جوبھی قانون بنایا جائے ذمہ داران اور ملازمین اسی کے پابند ہیں اور اسی قانون کی روسے تنخواہ وظیفہ اور الاؤنس لینے اور دینے کا حکم ہوگا۔ اور یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ ہر مدرسہ اور مسجد کا قانون ایک نہیں ہوتا؛ بلکہ الگ الگ ہوتا ہے اور اس حدیث شریف کی روسے الگ الگ قانون بنانے کا حق ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۸؍ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ	احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۰۸)	۱۸؍ ۳؍ ۱۴۳۴ھ

کیا ذمہ دارانِ مدرسہ اصول کے پابند ہیں؟

سوال [۸۴۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید مدرسہ اسلامیہ میں تین سال سے مسلسل مستقل طور پر تدریسی خدمات انجام دے رہا ہے، مدرسہ کے اصول کے مطابق پابندی سے کام کررہا ہے، مدرسہ کا اصول یہ ہے کہ اگر کسی مدرس کو ہٹانا ہے تو اس کو ایک ماہ قبل مطلع کردیا جاتا ہے کہ تم کو اگلے ماہ سے الگ کردیا جائے گا۔ اور اگر علی الفور کسی مدرس کو ہٹانا ہوتا ہے تو اسے ایک ماہ پیشگی مشاہرہ دے کر الگ کردیا جاتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ مندرجہ بالا اصول کو چھوڑ کر کسی مدرس کو ہٹادیا جائے، تو ہٹانے والا شخص عنداللہ وعندالناس وعندالرسول کیسا ہے؟ دلائل کے ساتھ لکھیں۔

المستفتی: محمد انیس چھپی ٹولہ پہانی، ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے اصول وضوابط کا مدار آقائے نامدار علیہ السلام کا ارشاد ہے:

عن كثير بن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حراما. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۱۷/ ۲۲، رقم: ۳۰، ترمذي شريف، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲) پر ہے۔

جب قانونی شرط یہی ہے کہ جب مدرس کو فوری طور پر ہٹایا جائے تو اس کو پیشگی ایک مہینہ کی تنخواہ دی جائے، اب اگر کسی مدرس کو فوری طور پر ہٹا دیا گیا ہے اور اس کو ایک مہینہ کی پیشگی تنخواہ نہیں دی گئی ہے، تو مدرسہ پر اس مدرس کی ایک مہینہ کی تنخواہ باقی ہے، وہ بہر حال اس مدرس کا حق ہے، مدرسہ پر لازم ہے کہ اس کا شرعی حق اس کے حوالہ کردے اور مدرسہ جس کے زیر انتظام چل رہا ہے اس کی طرف سے اگر ادائے گی میں کوتاہی ہے تو عنداللہ وہ شخص پکڑا جائے گا، پھر بھی مدرسہ کے اوپر اس مدرس کا حق بدستور باقی رہے گا، چاہے بیس سال کے بعد کیوں نہ ہو، اس کا حق اسے ملنا چاہئے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۶۳۲/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۵ھ

مدرسہ اور قبرستان کے نام چندہ لے کر اپنی ضروریات میں خرچ کرنے کا حکم

سوال [۸۴۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عرض حال یہ ہے کہ بحیثیت ایک عام آدمی ایک شرعی مشورہ مانگتا ہوں، آپ مہربانی

کر کے ناچیز کو مفید مشورے سے نوازیں، تاکہ اس کے ذریعہ ہمارے سماج میں مسلم نما درندے جو پھیلے ہیں، ان کا اصلی چہرہ سماج کو دکھا سکوں، میرے گاؤں گرام ماہرس ٹولہ، پوسٹ بھگوتی پور، وایہ رام پٹی، ضلع مدھوبنی، صوبہ بہار میں ایک کمیٹی بنی اور گاؤں والوں نے گاؤں کے خاص خاص آدمیوں کو خاص خاص عہدہ دیا اور تمام عہدہ داروں نے مسجد میں قرآن شریف ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ ہر ممکن کوشش کریں گے غریبوں اور لاچاروں کے ساتھ انصاف ہوگا اور ایمانداری کے ساتھ مسجد و مدرسہ کو چلائیں گے، خاص عہدہ پر جن کو فائز کیا گیا وہ یہ ہیں: محمد عابد حسین صدر، محمد اسلام سردار نائب صدر اور سکریٹری حافظ محمد بھولی حسن سابق متعلم مدرسہ شاہی، نائب سکریٹری محمد اسرائیل۔ یہ لوگ بالا طبقہ کے لوگ ہوئے اور خزانچی محمد صابر اور محاسب منشی محمد شعیب، یہ کمزور طبقہ کے لوگ ہوئے، باقی ممبر لوگ دونوں طبقہ سے چن کر رکھے گئے، جب سے کمیٹی بنی بیرونی چندہ آنے لگا اور گاؤں سے بھی ماہانہ چندہ وصول ہونے لگا اور صرف ایک مدرس رکھ سکے اور پیسہ جو بھی باہر سے آتا وہ بحکم سکریٹری خزانچی کے پاس جمع نہ ہو کر صدر کے پاس جمع ہونے لگا، قبرستان کی رقم اور مدرسہ کی رقم صدر کے پاس جمع ہونے لگی، گاؤں پنچایت میں جو جرمانہ ہوتا ہے وہ بھی صدر کے پاس رہتا ہے، پہلے مسجد کے متولی دوسرے آدمی تھے، ان کو الزام لگا کر ہٹا دیا، اس کے بعد اپنی خواہش کے مطابق صدر سکریٹری نائب صدر کو مسجد کا متولی چنا گیا اور مسجد کی رقم نائب صدر محمد اسلام کے پاس رہنے لگی، جب کچھ لوگوں نے ان سے ان کے رویہ سے تنگ آکر حساب مانگا تو کافروں کے اکسانے پر آپس میں لڑ پڑے اپنے حصے کی خاطر جو فضول لڑائی تھی جس حصہ پر لڑے تھے وہاں پر اس کا کچھ نہیں ہے، بعد میں مقدمہ ہوگیا، اپنی ذاتی لڑائی میں جو روپیہ مسجد کا نائب صدر کے پاس تھا اور مدرسہ کا جو روپیہ صدر کے پاس تھا، مقدمہ میں دونوں نے خرچ کردیا، جب تک پیسہ باقی رہا لڑتے رہے اور جب ختم ہوگیا، تو لوگوں کو جمع کر کے صلح کرنی چاہی؛ لیکن پنچ نے فیصلہ کیا کہ جب تک مسجد اور مدرسہ کا پیسہ جو ان لوگوں کے پاس ہے واپس نہ کردیں فیصلہ نہیں ہوگا، انہوں نے پنچ سے وعدہ کیا کہ اگلی بیٹھک میں جمع کردیں گے؛ لیکن

اس سے پہلے ایک خط معافی نامہ کا لکھا اور گاؤں والوں سے سائن کرانا شروع کیا، سب سے پہلا سائن نائب سکریٹری جنرل سکریٹری اور نائب صدر کا تھا کہ روپیہ معاف کردیا جائے، باقی پچاس سائن ڈپلیکیٹ کراکے جمع کردیا، جب کہ گاؤں کی آبادی تین سو ہے، ان پنچوں نے آدمیوں کو بلانے کے لئے کہا جنہوں نے سائن کئے تھے، تو کسی کو بلاکر نہیں لائے، صدر نے صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ظلم کی انتہا کردی اور جو وعدہ کیا تھا اس کے برعکس کیا، حضور والا سے گزارش ہے کہ ایسے لوگوں کے بارے میں ہماری شرعی عدالت کیا فیصلہ سناتی ہے؟ اوران کا ساتھ دینے والوں کے بارے میں علماء کیا فرماتے ہیں؟ مفید مشوروں سے نوازیں، مدرسہ حمایت الاسلام پوسٹ بھگوتی پور، ضلع مدھوبنی اگر اس مدرسے کی رسید لے کر کوئی پہنچے تو فوراً اسے گرفتار کرادیں؛ کیوں کہ اس سے وہ زمین خریدتے ہیں اور عیش کرتے ہیں، اس پیسہ سے مدرسہ کا کوئی بھلا نہیں ہوتا۔

المستفتی: آپ کا کفش بردار شرکت علی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چندہ کا پیسہ اس کام میں صرف کرنا واجب ہے جس کام کے لئے لوگوں نے دیا ہے۔

شرط الواقف كنص الشارع، فيجب اتباعه. (شامي، الوقف، مطلب ما خالف شرط الواقف، فهو مخالف للنص، زكريا ٦/ ٧٣٥، كراچی ٤/ ٤٩٥)

شرط الواقف كنص الشارع في وجوب العمل به، وفي المفهوم والدلالة. (قواعد الفقه أشرفي، ص: ٨٥، رقم: ١٥٢)

ظاہر ہے کہ لوگوں نے اس روپیہ کو ناجائز مقامات اور آپسی لڑائی میں صرف کرنے کے لئے نہیں دیا؛ بلکہ مدرسے پر خرچ کرنے کے لئے دیا ہے، ارکان مدرسہ چندہ دینے والوں کے وکیل ہیں اور وکیل اگر موکل کی منشاء کے خلاف خرچ کرے تو خود وکیل ضامن ہوتا ہے؛ لہٰذا جن لوگوں نے ناجائز مقدمات اور آپسی لڑائی پر مدرسہ وقبرستان کا روپیہ صرف کردیا ہے، ان

پر ضروری ہے کہ اپنی جیب سے وہ روپیہ مدرسہ وقبرستان کو واپس کریں، وہ کسی کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ یہ مدرسہ وقبرستان کی امانت ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۷/ ۹۹، جدید زکریا مطول ۱۰/ ۴۸۰)

الوكيل إذا خالف، إن خلافا إلى خير في الجنس كبع بألف درهم، فباعه بألف ومائة نفذ، ولو بمائة دينار لا ولو خيرا. (الدر مع الرد، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء، زكريا ٨/ ٢٥٦، كراچی ٥/ ٥٢١، الحكام شرح عزرا الأحكام ٢/ ٢٨٩)

ایسے لوگوں کو مدرسہ وقبرستان وغیرہ اوقاف کے ارکان بننے کا شرعاً کوئی حق نہیں ہے، ایسی حالت میں مسلمانوں کو چاہئے کہ دیندار وامانت دار لوگوں کو ارکان بنائیں۔

ولا يولي إلا أمين قادر بنفسه. (الدر مع الرد، الوقف، مطلب في شروط المتولي زكريا ٦/ ٥٧٨، كراچی ٤/ ٣٨٠، هندية، زكريا قديم ٢/ ٤٠٨، جديد ٢/ ٣٨٠، البحر الرائق، زكريا ٥/ ٣٧٨، كوئٹه ٥/ ٢٣٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤/ ٢٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ رجب ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۰۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/ ۷/ ۱۴۱۵ھ

بچہ کے قاعدہ پورا ہونے پر مہتمم صاحب کا دعوت کا مطالبہ کرنا

سوال [۸۴۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک بچہ ایک مدرسہ میں ایک استاذ کے پاس پڑھتا ہے، اس استاذ کا نظریہ یہ ہے کہ بچوں سے کسی طرح کی کوئی چیز نہ لی جائے، نہ دعوت کھائی جائے؛ کیوں کہ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم مدرسہ سے تنخواہ لیتے ہیں تو بچوں سے استاذوں کو کچھ لینے کا حق نہیں، خصوصاً جب کہ بچہ کو دعوت کرنے پر یا کچھ ہدیہ دینے پر مجبور کیا جائے؛ لیکن اس مدرسہ کا ناظم ایک بچہ کے قاعدہ پورا ہونے پر اس کا ذہن بناتا ہے کہ تم ہماری دعوت کرو اور جب اس بچہ کے والد صاحب آتے ہیں

توان سے یہ ناظم دعوت کا مطالبہ کرتا ہے، بچہ کا والد دعوت منظور کر لیتا ہے، تو پھر ناظم کہتا ہے کہ ہمارے پاس تمہارے گھر جانے کی فرصت نہیں ہے؛ لہٰذا آپ یہاں پر ہی مرغی یا بطخ پہنچا دیں، چنانچہ باضابطہ ناظم مدرسہ اس بچہ کو بطخ لانے کے لئے چھٹی دیتا ہے اور وہ بطخ ناظم مذکور اپنے گھر پکوا کر کھا لیتا ہے، جب کھانا تیار ہو جاتا ہے تو مدرسہ کے ایک استاذ اور بچہ کے استاذ سے بھی کھانے کے لئے کہتا ہے؛ لیکن چونکہ یہ دونوں استاذ اس طرح زبردستی دعوت کھانے کے خلاف ہیں، اس لئے ناظم مدرسہ کی یہ لوگ دعوت قبول نہیں کرتے۔ سوال یہ ہے کہ ناظم مدرسہ کا اس طرح طلباء سے دعوت کھانا جائز ہے یا نہیں؟ ایسی دعوت کا کیا درجہ ہے؟

المستفتی: محمد صابر عمری کلاں، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کسی شخص سے دعوت کا مطالبہ کرنا اور اس کو مجبور کرنا جائز نہیں۔ حدیث میں آتا ہے:

عن أبي حرة الرقاشي، عن عمه، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (مسند أبي يعلى الموصلي، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٩١، رقم: ١٥٦٧، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٢، رقم: ٢٨٦٣، مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٧٢، رقم: ٢٠٩٧١، مشكوة ١/ ٢٥٥) کہ کسی کا مال بغیر اس کی دل کی خوشی کے لینا جائز نہیں۔ اور اگر صرف بچوں سے ہی یہ مطالبہ کیا جائے اور ان کے مال سے دعوت کھائی جائے تب بھی جائز نہیں۔

وأما ما يرجع إلى الواهب، فهو أن يكون الواهب من أهل الهبة، وكونه من أهلها أن يكون حرا، عاقلا، بالغا، مالكا للموهوب (إلى قوله) حتى لو كان صغيرا، أو مجنونا، أو لا يكون المالك للموهوب لا يصح. (هندية، كتاب الهندية، الباب الأول، زكريا جديد ٤/ ٣٩٥، قديم ٤/ ٣٧٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۰۹۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۳/ ۱۴۲۰ھ

مہتمم کے مدرسہ کی رقم اپنے کاروبار میں لگانے یا دوسرے کو قرض دینے کا حکم

سوال [۸۴۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید جو اپنے مدرسہ کا مہتمم ہے، اگر مدرسہ کی رقم سے قرض لے کر اپنے کاروبار میں لگالے، تو اس کا کیا حکم ہے، اس سے جو منفعت ہوگی اس کا کیا حکم ہے؟ اور اگر دوسرے کو بطور قرض دینا چاہے، تو اس کا بھی حکم مدلل با حوالہ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: مولانا خورشید انور صاحب، مولانا عبدالناصر صاحب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کا مہتمم مدرسہ کی رقم کا مالک نہیں ہے؛ بلکہ امین ہے؛ اس لئے اس میں مالکانہ تصرف کرکے اس میں سے کسی کو قرض دینا یا بطور قرض لے کر ذاتی کاروبار میں لگانا ہرگز جائز نہیں ہے، یہ امانت میں زبردست خیانت ہے، اگر ایسا کرے گا تو خیانت کے گناہ کے ساتھ ساتھ وہ رقم ضمانت بن جائے گی اور مدرسہ کا مہتمم اب امین نہیں رہے گا؛ بلکہ ضامن بن جائے گا اور ضامن جب ضمان ادا کرے گا تو حاصل شدہ منفعت کا تصدق اس پر لازم نہ ہوگا؛ البتہ خیانت کا خطرناک گناہ کا وبال اس پر عائد ہوکر رہے گا۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۶/ ۵۲۶، ڈابھیل ۱۵/ ۵۰۴)

وليس للمودع حق التصرف والاسترباح في الوديعة. (المبسوط للسرخسي، كتاب الوديعة، دارالكتب العلمية بيروت ۱۱/ ۱۲۲)

ولا يجوز للقيم شراء شيء من مال المسجد لنفسه ولا البيع له، وإن كان فيه منفعة ظاهرة للمسجد -إلى- ليس للمتولي إيداع مال الوقف والمسجد إلا ممن في عياله، ولا إقراضه، فلو أقرضه ضمن. (البحرالرائق، كوئٹه ۵/ ۲۳۹، زكريا ۵/ ۴۰۱)

فإن خلطها المودع بماله حتى صار لا تتميز ضمنها؛ لأنه استهلاک، ثم لا سبيل للمودع عليها عند أبي حنيفة -رحمه الله-. (الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ۲/ ۲۷، دارالكتاب ديوبند ۲/ ۳۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ محرم الحرام ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۹۶۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۱/ ۱/ ۱۴۱۳ھ

الفصل الثالث: في المدرسين

ذمہ دارانِ مدرسہ ومدرسین کے تعلق سے چند سوالات کے جوابات

سوال [۸۴۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ کی ایک باضابطہ بااختیار تقریباً بیس ارکان پر مشتمل کمیٹی ہے۔

(۱) کیا مدرسہ کے اساتذۂ کرام کو خود اپنی تنخواہ بڑھانے کا جواز ہے؟ اگر بغیر مہتمم مدرسہ اور بغیر کمیٹی کے مشورہ کے تنخواہ بڑھالی ہے اور وہ انہوں نے خود مدرسہ کے فنڈ سے ادا کرلی ہے، تو یہ بڑھائی ہوئی تنخواہ لوٹانا ضروری ہے یا نہیں؟

(۲) بغیر کمیٹی کے پاس گئے رمضان میں فراہمی چندہ کے عوض ڈبل تنخواہ خود اپنی مرضی سے ادا کرلی ہے یہ جائز ہے یا ناجائز؟

(۳) مہتمم مدرسہ اور ایک رکن شوریٰ نے ایک تجویز منظور کی، کیا ان دو کی منظور کردہ تجویز قابل عمل ہے یا نہیں، جب کہ ارکان شوریٰ کی تعداد تقریباً بیس ہے؟

(۴) کیا مہتمم مدرسہ کو بغیر کمیٹی کے مشورہ کے تنخواہ ملازمین بڑھانے کا جواز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ارکان شوریٰ مدرسہ جامعہ علمیہ مسجد کہنہ ٹانڈہ بادلی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) کمیٹی کے سرگرم اور بااختیار رہونے کی حالت میں اگرچہ اساتذہ کو خود اپنی تنخواہ بڑھانے کی اجازت نہیں ہے؛ لیکن اگر کمیٹی کے ارکان کسی استاذ یا مہتمم کو مکمل اختیار دے دیں اور وہ اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے تنخواہ بڑھائیں اور ان کے اس عمل پر کمیٹی کے ارکان نکیر نہ کریں؛ بلکہ خاموش رہیں یا توثیق کریں، تو یہ اضافہ کرنا شرعاً جائز ہوگا۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۲/ ۲۰۷، جدید ڈابھیل ۱۴/ ۱۲۸)

وسائر التصرفات لمن يتولى. (درمختار على الشامي، الوقف، مطلب لا يستبدل العامر إلا في أربع، زكريا ٦/ ٥٨٩، كراچی ٤ / ٣٨٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤ / ١٣٣)

والنائب مثل الأصيل. (درمختار على شامي، الوقف، مطلب فيما إذا شرط المعلوم مباشر الإمامة الخ۔ زكريا ٦/ ٦٣٢، كراچی ٤/ ٤٢٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٢، ٤٨)

(۲) رمضان کی ڈبل تنخواہ کے سلسلہ میں بھی وہی تفصیل ہے جو نمبر ایک میں لکھی گئی کہ اگر بااختیار مدرس نے یہ فیصلہ کیا اور بعد میں اس کی توثیق صراحتاً یا دلالۃً ہوگئی ہے، تو یہ مقرر کرنا درست ہے۔

وسائر التصرفات لمن يتولى. (درمختار على الشامي، الوقف، مطلب لا يستبدل العامر إلا في أربع، زكريا ٦/ ٥٨٩، كراچی ٤/ ٣٨٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤/ ١٣٣)

والنائب مثل الأصيل. (درمختار على شامي، الوقف، مطلب فيما إذا شرط المعلوم مباشر الإمامة الخ۔ زكريا ٦/ ٢٣٢، كراچی ٤/ ٤٢٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٢، ٤٨)

(۳) اگر مذکورہ تجویز بعد میں دیگر اراکینِ شوریٰ منظور کریں تو وہ قابل عمل ہے۔

وسائر التصرفات لمن يتولى. (درمختار على الشامي، الوقف، مطلب لا يستبدل العامر إلا في أربع، زكريا ٦/ ٥٨٩، كراچی ٤/ ٣٨٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤/ ١٣٣)

والنائب مثل الأصيل. (درمختار على شامي، الوقف، مطلب فيما إذا شرط المعلوم مباشر الإمامة الخ۔ زكريا ٦/ ٢٣٢، كراچی ٤/ ٤٢٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٢، ٤٨)

(۴) مہتمم کو اگر کمیٹی نے اختیار دے رکھا ہے، تو مہتمم کو اضافۂ تنخواہ کا فیصلہ کرنے کی شرعاً اجازت ہے۔

وسائر التصرفات لمن يتولى. (درمختار على الشامي، الوقف، مطلب لا يستبدل العامر إلا في أربع، زكريا ٦/ ٥٨٩، كراچی ٤/ ٣٨٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤/ ١٣٣)

والنائب مثل الأصيل. (درمختار على شامي، الوقف، مطلب فيما إذا شرط المعلوم مباشر الإمامة الخ۔ زكريا ٦/ ٢٣٢، كراچی ٤/ ٤٢٠، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٢، ٤٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۲/۲/۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۲/۱۰ھ

مدرسہ کے مفاد کے پیش نظر کسی ملازم کو برطرف کرنا

سوال [۸۴۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) اکبر حسین بن عبدالکریم کو قومی مدرسہ کا عہدہ خزانچی دیا، اس سے جب حساب مانگا تو اس نے اولاً تو منع کیا کہ میں حساب نہیں دوں گا، مگر جب قوم اس کے سر ہوگئی، تو اس نے مجبوراً حساب دیا اور حساب ۱۹۸۱ء سے ۱۹۹۱ء تک دیا اور ایک ہی سیاہی اور ایک ہی قلم سے آمد اور خرچ کا دیا اور خرچ مع واؤچر کے نہیں دیا۔

(۲) اکبر حسین بن عبدالکریم نے اپنے والد مرحوم کو عرصہ دراز کے بعد مدرسہ کا متولی بنایا ۱۹۸۴ء میں جب کہ باپ مر چکا ہے ۱۹۳۷ء میں۔

(۳) اکبر حسین مدرسہ کو اپنی ملکیت بنانا چاہتا ہے اور لوگوں کے ساتھ بداخلاقی سے پیش آتا ہے۔ اور پولیس کو روپیہ بھر دیتا ہے اور ناجائز لوگوں کو ستاتا ہے اور عرصہ ۲۱؍سال میں مدرسہ میں تعلیم بھی نہیں دی ہے۔

(۴) اکبر حسین بن عبدالکریم نے مدرسہ میں ایک طرف مسجد بنانے کے لئے چندہ اکٹھا کر کے تعمیر مسجد کا کام شروع کر دیا، اس نے اپنے ذاتی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پیسے کو دوکان میں صرف کر دیا اور مسجد مکمل نہیں بنائی، لوگوں نے کہا تو مارنے مرنے کے لئے تیار ہو گیا؛ لہٰذا ان تمام صورتوں میں شرعاً اس اکبر حسین پر کیا حکم لاگو ہوتا ہے۔ اور کیا مدرسہ کا کوئی عہدہ دیا جا سکتا ہے۔

المستفتی: سائل امجد علی کاشی پور، نینی تال (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر اکبر حسین کو مدرسہ میں رکھنا مدرسہ کے ذمہ دار حضرات مدرسہ کے مفاد کے خلاف سمجھتے ہیں، تو ان کو علیحدہ کرنے کا اختیار رہے۔ اور اگر مدرسہ کے مفاد کے خلاف نہیں ہے تو الگ کرنے سے اکبر حسین مظلوم ہوگا اور ذمہ دار حضرات ظلم کے مرتکب ہوں گے۔

عن ابن عباس – رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: لا ضرر ولا ضرار. (سنن ابن ماجة، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره، النسخة الهندية ۱/ ۱٦۹، دارالسلام، رقم: ۲۳٤۱، موطا إمام مالك، باب القضاء في المرفق، أشرفي ص: ۳۱۱، رقم: ۲۷٥۸)

لا عبرة بالتوهم. (قواعد الفقه أشرفي، ص: ۱۰۷، رقم: ۲٥٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ۱٤/ ۲۰٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍صفر ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۰۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۳/۲/۱۱ھ

مدرسہ کے صدر مدرس کے خلاف عوام کے انتشار کا حکم

سوال [۸۴۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مولوی صاحب مدرسہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے ہیں اور اس شخص کی وجہ سے مسلمانوں میں آپس میں انتشار وخلفشار ہے اور اس شخص سے یہاں کے عوام ومسلمان بدظن ہیں اور اس کی وجہ سے زبردست کشیدگی ہے، تو ایسے شخص کا مدرسہ میں رہنا ٹھیک ہے یا نہیں؟ اور یہاں کے مسلمان ان سے کہتے ہیں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ تو بھی وہ جانے کے لئے تیار نہیں ہے، اگر یہ شخص یہاں سے نہ گیا تو مسلمانوں میں آپس میں خون ہوسکتا ہے، صحیح ومدلل جواب تحریر فرمائیں۔ فقط

المستفتی: ناظم تیاگی، محلّہ ستی رڑکی، سہارنپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ ذمہ داری اربابِ انتظام واہل شوریٰ کی ہے، کسی دوسرے شخص کے لئے اظہار رائے اس کے منصب سے خارج ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۷/ ۱٦۱، جدید مطول ۱۰/ ۴۷۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍صفر ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۱۱)

اوقات مدرسہ میں مہتمم کی اجازت سے حوائج ضروریہ کے لئے جانا

سوال [۸۴۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں شعبۂ حفظ کا مدرس ہوں مدرسہ کے بالکل سامنے مدرسہ کے مکان میں میرے بچے رہتے ہیں، میں مہتمم صاحب کی اجازت سے روزانہ گھر جاکر استنجاء ووضو نماز چاشت مدرسہ کے تعلیمی وقت میں ادا کرتا ہوں، کیا میرے لئے یہ جائز ہے اور مہتمم صاحب کا اس طرح اجازت دینا جائز ہے؟ جواب سے نوازیں۔ والسلام

المستفتی: مجیب الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حسب تحریر سوال آپ کا اوقات مدرسہ میں مدرسہ کے قریب اپنے گھر جاکر حوائج ضروریہ سے فارغ ہونا اور وضو کرکے چاشت کی نماز پڑھنا شرعاً جائز ہے؛ کیوں کہ مہتمم صاحب کی اجازت کی بناپر آپ کے مدرسہ کا عرف اس کی اجازت کا ہوگیا ہے اور ایسے مسائل کا مدار عرف پر ہوا کرتا ہے۔

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ٧٤، رقم: ١٠١، مجموعة رسائل ابن عابدين ثاقب بكڈپو ١/ ٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍صفر ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۸۹۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۱۴ھ

مدرس کو دو وقت پڑھانے پر مجبور کرنا

سوال [۸۴۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں حافظ فرید احمد مدرسہ عربیہ احیاء العلوم محلّہ ترک پٹی خیرآباد میں شعبۂ حفظ کا مدرس

ہوں، میرا کمیٹی سے طے تھا کہ میں صرف صبح کے وقت درسگاہ میں بیٹھوں گا، باقی وقت دوسرے حافظ نوشاد صاحب پڑھائیں گے، اب اس وقت ہمارے مدرسہ کی کمیٹی میں کچھ خلفشار ہے اور کمیٹی میں دوگروہ ہوگئے ہیں، اپنی بات منوانے کی غرض سے ہمارے منیجر حاجی محمد آفاق صاحب چاہتے ہیں کہ میں اب تینوں وقت مدرسہ میں تدریسی کام دیکھوں، جس کے بارے میں میں نے منع کردیا ہے، ہمارے صدر صاحب سکریٹری وخزانچی وغیرہ حضرات کا کہنا ہے، جب تک خلفشار دور نہیں ہوجاتا کوئی مدرس نہ تو نکالا جائے گا اور نہ ہی کسی سے کوئی زبردستی کی جائے گی۔ الحمد للہ مدرسین میں کوئی خلفشار نہیں ہے، جب میں نے منیجر صاحب کو تینوں وقت پڑھانے سے منع کیا، تو گذشتہ ۶ ستمبر کو انہوں نے حفظ کی درسگاہ میں آکر کافی گالی گلوچ اور بدکلامی کی، درسگاہ میں ہم تین حافظ موجود تھے، حافظ معین الدین، حافظ نوشاد اور حفظ کے طلبہ کی موجودگی میں جب کہ قرآن کریم پڑھایا جارہا تھا، مجھ سے کہا کہ تمہیں میرے ساتھ تینوں اوقات میں مدرسہ آکر قوم لوط والا عمل کرنا ہوگا۔ اور اگر میری ماں زندہ ہوتی تو تمہیں ان کے اوپر تینوں وقت چڑھواتا وغیرہ، اس سے زیادہ کہنے سے قاصر ہوں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایسے شخص کا کسی دینی ادارہ کا ذمہ دار بنے رہنا چاہئے جو قرآن وحافظ قرآن کی توہین کرے اور اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہئے؟ اس کا اسلام سے کوئی رشتہ ہے یا نہیں؟ براہ کرم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جواب مرحمت فرما کر ملت اسلام کے کچھ افراد پر احسان فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مدرس کا منصب تدریس پر فائز ہونے سے پہلے یہ شرط لگانا کہ میں صرف ایک وقت پڑھاؤں گا جائز اور درست ہے۔ اور اس کے برخلاف مدرس کو اس سے زیادہ وقت پڑھانے پر مجبور کرنا درست نہیں ہے؛ البتہ اگر مدرس اپنی خوشی سے دوسرے وقت میں پڑھانے پر تیار ہوجائے تو اسے اس کا مکمل اختیار ہے؛ لیکن زائد وقت نہ پڑھانے پر اس کو گالم گلوچ کرنا یا اس کے حق میں نامناسب الفاظ استعمال کرنا یہ قطعاً غلط ہے، ایسے شخص کو

چاہئے کہ مدرس صاحب سے معافی مانگے اور اپنے اس غلط عمل پر توبہ واستغفار کرے؛ لیکن اگر مذکورہ شخص اپنی غلطی پر مصر ہو تو ایسا شخص فاسق ہوگا اور فاسق آدمی دینی ادارہ کا ذمہ دار بننے کا اہل نہیں، اس کے بجائے کسی متبع شریعت دیندار آدمی کو ذمہ دار بنانا چاہئے۔

قال عبدالله: قال النبي ﷺ: سباب المسلم فسوق، وقتاله كفر. (بخاري شريف، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم لا ترجعوا بعدي كفارا، النسخة الهندية ٢/ ١٠٤٨، رقم: ٦٧٩٧، ف: ٧٠٧٦)

وينزع وجوبا لو غير مأمون أو عاجزا أو ظهر به فسق، كشرب خمر ونحوه. (درمختار مع الشامي، الوقف، مطلب في شروط المتولي، زكريا ٦/ ٥٧٨، كراچی ٤/ ٣٨٠، البحرالرائق، زكريا ٥/ ٤١١، كوئٹه ٥/ ٢٤٥، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٦٠٢، قديم ١/ ٧٦٢، بزازية زكريا جديد ٣/ ١٣٤، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍محرم الحرام ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۸۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۱/۳ھ

مدرس سے مدرسہ کی رقم گھر سے چوری ہوگئی

سوال [۸۴۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص مدرسہ میں مدرس ہے جس نے رمضان المبارک میں مدرسہ کے لئے مالیات کی وصولیابی کی، وصول کی ہوئی رقم اس کے پاس بطور امانت اس کے گھر میں رکھی ہوئی تھی، امانت کی حفاظت میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ ہی اپنی ذاتی رقم میں اس امانت کو ملایا، وہ شخص کسی کام سے باہر چلا گیا اور اس کے بال بچے گھر پر ہی تھے، اس کی غیر موجودگی میں اس کے بڑے لڑکے جس کی عمر سترہ سال ہے نے نہ جانے کیسے سیف الماری کا تالا کھولا اور بیگ کی

چین توڑ کر امانت کی رقم جو اس کے پاس ساٹھ ہزار روپئے تھی اس میں سے چھیالیس ہزار پانچ سو لے کر فرار ہو گیا، یعنی چوری کی، اس شخص نے اپنے بیٹے کو بہت تلاشا ڈھونڈا؛ لیکن وہ نہ ملا تیسرے روز اس کے بیٹے کا فون اس کے بیٹے کے دوست کے پاس آیا تو اس کے دوست کے والد نے اس شخص کے بیٹے کو بہت سمجھایا اور والدین کے کچھ نہ کہنے کی اپنے اوپر ذمہ داری لی، تو اس کے بیٹے نے چوتھے روز دوست کے گھر شام کو آنے کا وعدہ کیا اور اس شخص کا بیٹا چوتھے روز دوست کے گھر پر آ گیا، جہاں اس کے بیٹے کے تایا کو بلا کر بات چیت ہوئی اور اس شخص کا بیٹا اپنے تایا کے ہمراہ گھر پر آ گیا، اس شخص کا بیٹا جو رقم چھیالیس ہزار پانچ سو روپئے لے گیا تھا، اس میں سے جو رقم اس کے بیٹے کے پاس سے وصول ہوئی وہ اڑتیس ہزار پانچ سو تھی، یعنی پوری رقم میں سے آٹھ ہزار روپیہ کم۔ مذکورہ صورت میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس شخص پر تاوان واجب ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد شاہد قاسمی سرائے خام، بریلی (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مدرسہ کی رقم وصول ہونے کے بعد وصول کنندہ کے لئے اپنے گھر پر رکھنے کا حق نہیں ہوتا، جب اس نے اپنے گھر پر رکھا ہے، تو اس کی ضمانت میں داخل ہو گیا، چاہے باہر کے چور آ کر چوری کر لیں یا گھر کے افراد میں سے کوئی یہ حرکت کر لے ہر حال میں پوری پوری رقم مدرسہ کو ادا کرنا اس کے اوپر لازم ہے، نیز اگر منجانب مدرسہ مدرسہ کی کمیٹی اور ذمہ دار نے مل کر کے مدرسہ کی رقم اس شخص کے پاس امانت میں رکھی ہے، پھر اس شخص کے بیٹے یا گھر کے افراد میں سے کوئی بھی فرد اس میں سے چوری کر لے، تو بھی اس کی مکمل ادائیگی اس شخص کے اوپر لازم ہے؛ اس لئے کہ گھر کے افراد میں سے کسی کا اس میں سے لے کر خرچ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے خود یہ کام کیا ہو؛ اس لئے بہر صورت مدرسہ کی مکمل رقم مدرسہ کو واپس کرنا اس شخص پر لازم ہے، جیب خاص سے دے یا قرض لے کر دے یا کسی بھی طریقہ سے اسی کے ذمہ لازم ہے۔

عن الحسن، قال: إذا خالف المستودع غير ما أمر به ضمن، وإن كان فيه فضل فهو له بضمانه. (مصنف عبدالرزاق، البيوع، باب الوديعة، المجلس العلمي ۸/ ۱۸۳، رقم: ۱٤۸۰٦)

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده، عن النبي ﷺ قال: ليس على المستعير غير المغل ضمان، ولا على المستودع غير المغل ضمان.

(سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۳٦، رقم: ۲۹۳۹)

وللمودع أن يحفظها بنفسه وبعياله ...... ويشترط أن يكون من في عياله أمينا؛ لأنه لو دفع إلى زوجته، وهي غير أمينة، وهو عالم بذلك أو تركها في بيته الذي فيه ودائع الناس، وذهب فضاعت ضمن. الخ

(البحرالرائق، كتاب الوديعة، كوئٹه ۷/ ۲۷٤، زكريا ۷/ ٤٦٥، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ٤٦۹، قديم ۲/ ۳۳۹، الدر مع الرد، زكريا ۸/ ٤٥٦، كراچی ٥/ ٦٦٤)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ رشوال ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۸۰۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۱۰/۱۴۳۰ھ

مدرسین کا چرم قربانی وصول کرنے پر معاوضہ لینے کا حکم

سوال [۸۴۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک دینی مدرسہ میں عید الاضحیٰ کے موقع پر مدرسین کو تعطیل نہیں دی جاتی ہے، بمشکل کسی سخت ضرورت کی وجہ سے مہتمم صاحب کسی مدرس کو گھر جانے کی اجازت دیتے ہیں بقرعید کے دنوں میں مدرسین سے چرم کی وصولی کا کام لیا جاتا ہے اور بقرعید کے ایام کے کام کی الگ سے کوئی تنخواہ متعین نہیں کی جاتی ہے، تدریسی خدمات پر مدرسین کی جو تنخواہ متعین ہے، اسی

حساب سے بقرعید کے دنوں کی تنخواہ ملتی ہے، مزید برآں مثلاً ہر چرم کی وصولی پر بطور انعام کے دس روپئے ملتے ہیں، تو کیا ایسے تنخواہ دار مدرس کے لئے ہر چرم کی وصولی پر دس روپئے انعام لینا شرعاً جائز ہے، یا یہ صورت غیر تنخواہ دار محض کمیشن پر چندہ کرنے یا چرم وصول کرنے والے کے حکم میں داخل ہے۔

المستفتی: محمد طاہر عفی عنہ دارالعلوم رحمانیہ ٹانڈہ بادلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: قربانی کے موقع پر چرم قربانی کی وصولی مدرسین کے ذمہ لازم نہیں ہوتی ہے۔ اور یہ ایام چھٹی کے ہوتے ہیں اور جب چھٹی کے ایام میں مدرسین اپنی چھٹیوں سے فائدہ اٹھانے کے بجائے چرم قربانی کی وصولی پر محنت کریں تو ان کو فی چرم دس روپیہ پندرہ روپیہ محنتانہ کے طور پر لینا جائز اور درست ہے؛ اس لئے کہ اس محنت کا تعلق تنخواہ سے نہیں ہے۔

وشرطها كون الأجرة والمنفعة معلومتين. (درمختار، كتاب الإجارة، زكريا ۹/ ۷، كراچی ٦/ ٥)

ولا يصح حتى تكون المنافع معلومة، والأجرة معلومة. (هداية، أشرفي ۳/ ۲۹۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ذی الحجہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۴۴)

مدارس کے ملازم اجیر بالعمل ہیں یا اجیر فی الوقت

سوال [۸۴۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ہمارے مدارس عربیہ میں مدرسین ملازمین ومنتظمین اجیر فی الوقت ہیں یا اجیر بالعمل، یا اجیر بالعمل فی الوقت؟

(۲) اگر صرف اجیر فی الوقت ہیں تو منتظمین کو نصاب وامور مفوضہ کی تکمیل کا مطالبہ ومؤاخذہ کرنا کیسا ہے؟

(۳) اگر اجیر بالعمل ہیں تو کیا منتظمین کی جانب سے اوقاتِ متعینہ کے علاوہ اوقات میں وہ اپنے امورِ مفوضہ کو پورا کرسکتا ہے؟ اور اوقاتِ متعینہ میں غیر حاضر رہنے یا نہ کرسکنے پر مؤاخذہ تو نہیں ہوگا؟ بینوا توجروا

المستفتی: مدیر ماہنامہ ندائے شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) مدارسِ اسلامیہ کا عرف اس زمانہ میں یہ ہے کہ ملازمین ومدرسین ومنظمین وقت مقررہ میں امورِ مفوضہ کی تکمیل کیا کریں اور یہی ضابطہ مقرر اور معروف ہے اور شریعت اسلامیہ میں اس طرح اجارہ اور ملازمت کا معاملہ کرنا جائز اور مشروع ہے؛ اس لئے مدارسِ اسلامیہ کے ملازمین اجیر بالعمل فی الوقت ہیں؛ لہٰذا عمل نہ کرنے اور وقت مقررہ میں حاضر نہ ہونے پر مقررہ ضابطہ کے مطابق مؤاخذہ جائز ہے، نیز عرف وشرط وضابطہ کی وجہ سے بوقت تقرری بغیر صراحت قانونی تعطیلات کے مستحق ہوجاتے ہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۴۸، ۳/ ۳۴۹، ۳/ ۳۵۶، فتاوی محمودیہ ۶/ ۳۱۱، ڈابھیل ۱۶/ ۵۷۲)

لأن المعروف كالمشروط. (الأشباه والنظائر قديم، ص: ۱۵۲، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ۱۲/ ۵۴، ۱۳/ ۷۹، ۱۴/ ۳۶، البناية أشرفيه ۵/ ۴۸۱، ۸/ ۲۴۵، ۱۱/ ۴۸۳، قواعد الفقه أشرفي، ص: ۱۲۵، رقم: ۳۳۴)

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. الخ (عقود رسم المفتي، قديم ص: ۹۵، قواعد الفقه أشرفي، ص: ۷۴، رقم: ۱۰۱)

(۲) صرف اجیر فی الوقت نہیں ہے؛ اس لئے شرائط وضوابط کے مطابق مطالبہ ومؤاخذہ کا حق ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۴۹، ۳/ ۳۵۶)

اور اگر کسی مدرسہ میں کوئی ضابطہ بنا ہوا نہیں ہے، تو علاقہ کے مشہور اداروں کے عرف وشرائط کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔

وإن شرط المعلم على المولى أن يعطيه في كل شهر كذا، ويقوم على غلامه في تعليم كذا، فهو جائز، وإذا لم يشترط كل واحد منهما شيئا فلما فرغ وتعلم قال المعلم لي الأجرة على رب العبد كذا، وقال سيد العبد: لي الأجرة على المعلم ينظر في ذلک إلى عرف تلک البلدة، فإن كان سيد العبد هو الذي يعطي، فالأجرة عليه، وإن كان المعلم هو الذي يعطي، فالأجرة على المعلم. الخ (البحرالرائق، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة كوئٹه ٨/ ١٩، زكريا ٨/ ٣٤)

(۳) صرف اجیر بالعمل نہیں ہے؛ اس لئے اوقاتِ مقررہ پر غیر حاضری کی وجہ سے مؤاخذہ کا حق ہوگا۔ (مستفاد: امدادالفتاویٰ ۳/ ۳۴۹، ۳/ ۳۵۶)

اور اگر کسی ملازم کو مخصوص شرط پر رکھا ہے تو وہ اسی شرط کا پابند ہوگا۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۱۱/۵/۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۲۲۱۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۱۰/۱۳ھ

شخص واحد کے ذمہ درس وتدریس اور امامت وغیرہ سپرد کرنا

سوال [۸۴۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: درس وتدریس وعظ ونصیحت، امامت، اذان یہ سب الگ الگ شعبہ ہیں، کیا ایک شخص کو ان امور کا پابند کیا جاسکتا ہے، جب کہ گذر اوقات اور بال بچوں کے اخراجات بھی ہوں؟

(۲) کیا امام اپنے ذاتی کام یا اور مجبوری سے چھٹی کرسکتا ہے؟

(۳) امام کے کل اخراجات کس کے ذمہ ہیں، جب کہ امام پردیسی ہو فی سبیل اللہ امامت کرتا ہو اور امام کی مالی حالت بھی کمزور ہو، ایسی صورت میں اہل محلّہ کیا کریں؟ ان کی کیا ذمہ داری ہے؟ امام شادی شدہ ہے، نوجوان ہے، تو کیا بیوی بچوں کے ساتھ رکھنے کا نظم وبندوبست مقتدیوں کے اوپر ہے؟

المستفتی: محمد ہارون، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) مذکورہ امور سب الگ الگ شعبہ کی حیثیت رکھتے ہیں؛ لیکن اگر ایک شخص ان سب ذمہ داریوں کو تنہا ادا کرسکتا ہے، تو اس کے لئے اس کی گنجائش ہے اور امام کے ساتھ ساتھ اگر ان کاموں کی ذمہ داری کی شرط بھی لگائی گئی ہے۔ اور امام صاحب نے منظور کرلیا ہے، تو اس پر ان تمام امور کو انجام دینا لازم ہوگا۔ (مستفاد: کفایت المفتی ۳/۴۶)

عن عمرو بن عوف المزني، عن رسول اللہ ﷺ قال: المسلمون على شروطهم إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ۷/ ۲۲، رقم: ۳۰)

(۲) امام اپنی ذاتی ضروریات کے لئے چھٹی لے سکتا ہے، مگر ان امور کی شرط لگا لینی چاہئے یا علاقہ میں ان کا عرف ہو۔

المعروف كالمشروط، فصار كأنه صرح به. (الأشباه والنظائر قديم/ ۱۵۶)

نیز ایام رخصت کی تنخواہ بھی امام کو ملنی چاہئے۔

فحيث كانت البطالة معروفة في يوم الثلاثاء والجمعة، وفي رمضان والعيدين يحل الأخذ. (شامي، الوقف، مطلب في استحقاق القاضي والمدرس الوظيفة في يوم البطالة، زکریا ٦/ ٥٦٨، کراچی ٤/ ٣٧٢، سكب الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۲/ ۵۸۹)

(۳) امام کے کل اخراجات خود امام کے ذمہ ہیں، ہاں البتہ امام کی تنخواہ کے ذمہ دار مسجد کے ذمہ دار حضرات ہوتے ہیں، وہ لوگ مسجد کے فنڈ میں سے ادا کریں گے۔

رزق القاضي من بيت المال. (درمختار، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زکریا ۹/ ۵۵۸، کراچی ٦/ ۳۸۹، المبسوط دارالكتب العلمية بيروت ۱٦/ ۱۰۲، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۳/ ۳۱۸)

امام جب ضرورت مند ہے تو وہ فی سبیل اللہ امامت کیوں کرے؟ وہ اپنی تنخواہ متعین کرلیا کرے، تاکہ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍صفر المظفر ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۶۲۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۲/۸ھ

کیا گاؤں کے مدرس پر مسجد کی امامت بلا اجرت واجب ہے؟

سوال [۸۴۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بستی میں مدرسہ اسلامیہ ہے، جس میں غلہ کی سیر من کی آمدنی کے ساتھ ساتھ بستی کے چرم قربانی، فطرہ، زکوۃ وغیرہ بھی صرف ہوتا ہے، مدرسہ میں چار مدرس ہیں، انہیں کی تنخواہوں یا تعمیر میں جملہ رقم خرچ ہوتی ہے، مدرسہ میں بیرونی بچے بھی دس پندرہ رہتے ہیں، جو بستی میں گھروں میں کھانا کھاتے ہیں، مدرسہ کے مدرسین کی ذمہ داری مسجدوں میں نماز پڑھانا بھی ہے جبکہ نماز کی اجرت مدرسہ سے ملنے والی تنخواہ میں ہی مشروط ہے، علیحدہ مسجد سے کوئی وظیفہ نہیں ہے، معلوم کرنا یہ ہے کہ یہ شکل کہاں تک صحیح ہے؟

المستفتی: ظہیر احمد قاسمی، مدرسہ بدر العلوم گنگوار حسن پور، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب گاؤں میں امامت کی شرط پر مدرس کا تقرر ہوتا ہے، تو مدرس اس شرط کا پابند ہوگا۔ اور اگر تقرر کے وقت امامت طے نہیں ہے تو امامت لازم نہیں ہے۔

ومن استأجر عبدا ليخدمه له أن يسافر به إلا أن يشترط ذلك. الخ

(هداية، كتاب الإجارات، باب إجارة العبد أشرفي ۳/ ۳۱۲، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤٣٥، جديد ٤/ ٤٦٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۱۵/۳/۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۹۴۳)

مدرس کونابالغ طلباء کی امامت کاپابند بنانا

سوال [۸۴۵۳]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مدرسہ میں مستقل مدرس ہے، اس مدرسہ میں بیرونی طلبہ بھی کافی تعداد میں ہیں، کوئی طالب علم پندرہ سال کی عمر کا نہیں پایا جاتا اورنہ ہی کسی دوسری صورت سے سن بلوغ کا اظہار ہوتا ہے، یعنی سب نابالغ ہیں، مدرسہ کے مہتمم نے زید کے اوپر یہ پابندی عائد کی ہے کہ تم مدرسہ میں ان طالب علموں کونماز پڑھایا کرو، یعنی زید امام بنے اورسب نابالغ طالب علم اس کے مقتدی بن کرفرض نماز باجماعت مدرسہ ہی میں ادا کریں، اس صورت میں زید کی فرض نماز صحیح ہوگی اور جماعت کا ثواب ملے گا یانہیں؟ مہتمم صاحب کی طرف سے زید پران نابالغ بچوں کی امامت کے لئے جبرکرنا شرعاً درست ہے یانہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں زید کی فرض نمازادا ہوجائے گی اور جماعت کا ثواب بھی ملے گا، مگرمسجد میں نماز پڑھنے کےثواب سےمحروم ہوجائے گا، نیز مہتمم صاحب کااس بات پر پابندکرنا درست نہیں ہے کہ مدرس مسجد چھوڑ کر یہیں نماز پڑھائے، اگر مدرس خود مسجد میں جا کرنماز پڑھنا چاہتا ہے تواس پرر کاوٹ ڈالنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

(مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۲۹۹)

والجماعة سنة مؤكدة للرجال، وأقلها اثنان واحد مع الإمام ولو مميزا. (وتحته في الشامية) أي ولو كان الواحد المقتدى صبيا مميزا، ويؤخذ منه أنه يحصل ثواب الجماعة باقتداء المتنفل بالمفترض؛ لأن الصبي متنفل. (ردالمحتار، كتاب الصلاة، باب الإمامة، مطلب في تكرار الجماعة في المسجد زكريا ۲/ ۲۸۷، ۲۸۹، کراچی ۱/ ۵۵۲، ۵۵۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۵۱۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۳/۲ھ

کیا مدرس کا بیماری میں چھٹی لے کر اپنے نجی کام سے جانا دھوکہ نہیں؟

سوال [۸۴۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرس اپنے نجی کام سے باہر جاتے ہیں، چھٹی کا ان کو استحقاق نہیں ہے تو وہ میڈیکل سرٹیفکیٹ دے کر چلے جاتے ہیں، میڈیکل سرٹیفکیٹ میں ڈاکٹر صاحب نے آرام کا مشورہ دیا ہے، یہ مدرس ہزاروں میل دور سفر پر چلے جاتے ہیں، اس طرح ان ایام کی تنخواہ ان کے لئے حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ یہ مدرس حافظ، مولوی، عالم اور فاضل بھی ہیں، ان کا یہ کردار ایک مشہور زمانہ دارالعلوم کے لئے جہاں سے یہ فارغ التحصیل ہیں، بدنما داغ ہے یا نہیں؟ شریعت مطہرہ میں ایسے علماء کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: صابر رضا خان منیجر مدرسہ جامع العلوم، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر واقعی جعلی سرٹیفکٹ ہے تو دھوکہ دہی ہے جو جائز نہیں ہے۔ اور اگر جعلی سرٹیفکٹ نہیں ہے؛ بلکہ سرٹیفکٹ اپنی جگہ درست ہے اور بیماری کی حالت میں آدمی اپنے ذاتی کسی کام سے جا آسکتا ہے، جیسا کہ دنیا بھر میں بہت سے بیمار لوگ بھی اپنے ضروری اسفار کرتے ہیں اور ہلکے پھلکے کام بھی کرتے ہیں، تو ایسی صورت میں دھوکہ دہی نہیں ہے، رخصت علالت لینا بھی درست ہے اور جب مدرسہ میں رخصت علالت منجانب مدرسہ دینے کا قانون ہے تو ان ایام کی تنخواہ لینا بھی درست ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: …… من غشنا فليس منا. (مسلم شريف، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم من غشنا فليس منا، النسخة الهندية ١/ ٧٠، بيت الأفكار، رقم: ١٠١)

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني عن أبيه عن جده أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل

حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حراما.
(سنن الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٣، رقم: ٢٨٦٩، المستدرك، كتاب الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز ـ ٧/ ٢٠٢٣، قديم ٤/ ١٠١، رقم: ٧٠٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۲۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴/۵/۱۴۳۵ھ

مکتب میں استاذ کا جمعراتی لینا

سوال [۸۴۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض جگہوں پر یہ رواج ہے کہ مکتب میں پڑھانے والا استاذ جمعراتی پیسے لیتا ہے، کیا یہ پیسے لینا جائز ہے؟ نیز نکاح پڑھانے کے بعد قاضی کو جو روپیہ ملتے ہیں اس کا بھی لینا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب تقرر کے وقت یہ معلوم ہے کہ جمعرات میں کچھ ملتا ہے اس کی وجہ سے اس کم تنخواہ پر بھی استاذ تیار ہوجاتا ہے؛ اس لئے جمعراتی پیسہ اس کے لئے اس کا حق بھی ہے؛ اس کے لئے لینا جائز ہے، یہ اصل تنخواہ پر انعام اور تحفہ ہے، اس سے ملازمت کی ترغیب ہوتی ہے، ملازمت کی اصل تنخواہ نہیں ہے اور چونکہ نکاح پڑھانا مدرس کی ذمہ داری میں شامل نہیں ہے؛ اس لئے نکاح خوانی کی اجرت الگ سے لینے کی گنجائش ہے۔

وكل نكاح باشره القاضي وقد وجبت مباشرته عليه كنكاح الصغار، والصغائر، فلا يحل له أخذ الأجرة عليه، وما لم تجب مباشرته عليه حل له أخذ الأجرة عليه كذا في المحيط. الخ (عالمگيری، كتاب أدب القاضي، الباب الخامس عشر في أقوال القاضي، وما ينبغي، زكريا قديم ٣/ ٣٤٥، جديد ٣/ ٣٠٦، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٢/ ٢٣٢، ٢٣٣، رقم: ١٤٢٩٩، الفتاوى التاتارخانية زكريا ١١/ ١١٩، رقم: ١٥٦٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ ر صفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۳۰ھ

مدرس کے جمعراتی وصول کرنے کا حکم

سوال [۸۴۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مکاتب کے اندر مدرسین حضرات جو جمعراتی پیسے وصول کرتے ہیں درست ہے یا نہیں؟ نیز بچوں سے کرناٹک کے علاقہ میں مسجد کی کمیٹی کی طرف سے نکاح خوانی کی فیس متعین ہوتی ہے، اس کی وضاحت یوں ہے کہ جب کسی مسجد کے امام کو کسی شادی میں نکاح خوانی کے لئے بلایا جاتا ہے، تو اس مسجد کی کمیٹی کی طرف سے لڑکا اور لڑکی کے والدین کو تین تین سو مجموعہ پانچ سو روپیہ کمیٹی کو ادا کرنے پڑتے ہیں، کیا یہ روپئے کمیٹی کے لئے لینا درست ہے؟ اور کمیٹی کے ان ہی روپیوں میں سے امام کو روپئے لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر امام خود شادی والوں سے نکاح خوانی کی فیس مانگ لے تو کیا یہ روپیہ اس کے لئے درست ہوگا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مکاتب کے اندر مدرسین حضرات جو بچوں سے جمعراتی وصول کرتے ہیں، وہ ان کے لئے لینا درست ہے؛ کیوں کہ مدرس کو تقرر کے وقت ہی معلوم

رہتا ہے کہ جمعرات کے روز بچوں کے ذریعہ اس کو کچھ ملے گا، اس کی وجہ سے وہ کم تنخواہ پر بھی راضی ہوجاتا ہے؛ اس لئے جمعراتی پیسہ اس کے لئے لینا جائز ہے۔ (مستفاد: عزیز الفتاوی/ ۷۵۸)

اور چونکہ نکاح پڑھانا مدرس کی ذمہ داری نہیں ہے؛ اس لئے نکاح خوانی کی اجرت اس کے لئے لینا جائز اور درست ہے، البتہ کمیٹی کی طرف سے نکاح خوانی کی فیس متعین کرنا درست نہیں ہے؛ بلکہ جو جتنا دے دے اتنا لے لینا چاہئے اور جس شخص (امام) نے نکاح پڑھایا ہے اس کے لئے نکاح خوانی کی اجرت لینا جائز ہے، اور کمیٹی کے لئے لینا درست نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۲/ ۳۷۰)

وكل نكاح باشره القاضي، وقد وجبت مباشرته عليه كنكاح الصغار والصغائر، فلا يحل له أخذ الأجرة عليه، وما لم تجب مباشرته عليه حل له أخذ الأجرة عليه. (هندية، كتاب أدب القاضي، الباب الخامس عشر في أموال القاضي، زكريا قديم ۳/ ۳٤٥، جديد ۳/ ۳۰٦، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ۱۲/ ۲۳۲، ۲۳۳، رقم: ۱٤۲۹۹، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ۱۱/ ۱۱۹، رقم: ۱٥٦۳٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ صفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۹۳۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۲/۱۹ھ

طلبہ کی طرف سے معلم کو ملنے والے ہدیہ کا حکم

سوال [۸۴۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک ادارہ میں ۱۶؍ معلم کام کرتے ہیں، اس میں ابتدائی تعلیم سے لے کر حفظ وتجوید تا شرح جامی کی تعلیم ہے، دس سال قبل اس ادارہ میں یہ قانون نافذ ہوا کہ جس معلم کو بھی طلبہ کی

طرف سے ہدیہ انعام واکرام ملے گا اس کو فنڈ میں جمع کیا جائے گا اور اخیر سال میں سب معلموں میں تقسیم کیا جائے گا، ان میں چند معلم ایسے ہیں جن کو ہدیہ یا انعام وغیرہ ملتا ہے، باقی ایسے ہیں جن کو بالکل انعام نہیں ملتا اور وہ چند معلموں کا انعام سب معلموں میں تقسیم ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ معلم جن کو انعام ملتا ہے وہ دل میں کڑھتے ہیں ور ناخوش ہیں اور وہ چاہتے ہیں ہمیں علیحدہ کر دیا جائے، ہم اس فنڈ میں شریک نہیں ہیں، اب ان معلموں میں بھی کسی کو کم اور کسی کو زیادہ انعام اور ہدیہ ملتا ہے جو کہ سب میں شریک ہوتا ہے، یہاں تک کہ جو کوئی اشیاء جیسے کپڑے ملتے ہیں تو ان کو بھی فروخت کیا جاتا ہے جس کو وہ کپڑے ملتے ہیں وہ دل سے ناخوش ہے۔ اور اگر اس فنڈ سے کسی کو علیحدہ کر دیا جائے تو ہر معلم علیحدہ ہوگا جو انتشار کا باعث ہے، تو آپ تحریر فرمائیں شرعاً اس فنڈ میں جمع کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اس کے لئے کوئی صریح جزئیہ نظر سے نہیں گذرا؛ البتہ اگر طے شدہ قانون طلبہ اور معلمین سب کو معلوم ہے۔

تو "**المسلمون عند شروطهم**". (بخاري تحت ترجمة الباب أجر السمسرة، النسخة الهندية ۱/ ۳۰۳) کے تحت جواز معلوم ہوتا ہے، مگر طلبہ سے ہدیہ لینا نامناسب عمل ہے، اس سے بہت سے مضر اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۶۲۱)

مدرسے میں بے پردہ معلّمہ کے تقرر کرنا کا حکم

سوال [۸۴۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا مدارسِ اسلامیہ میں جہاں پر معلم حضرات تعلیم دیتے ہیں وہاں پر نوجوان

معلّمہ صاحبہ کا تقرر کرنا درست ہے، جب کہ معلّمہ صاحبہ آتے جاتے اور پڑھاتے وقت بھی بے پردہ رہتی ہوں، یعنی کہ سر پر ڈوپٹہ تک بھی نہ رکھتی ہوں، اگر معلّمہ صاحبہ کا تقرر کیا جائے تو کن شرائط کے ساتھ؟

المستفتی: محمد مسلم امروہوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسے مدارسِ اسلامیہ جن میں صرف لڑکیاں ہی تعلیم حاصل کرتی ہیں، وہاں بہتر یہ ہے کہ معلّمہ کا ہی تقرر کیا جائے، جب کہ وہ پابند شرع ہو۔ اور اگر مدرسہ ایسا ہے جس میں لڑکے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اکثر پڑھانے والے مرد ہیں، تو وہاں معلّمہ کے تقرر کرنے میں بہت سارے مفاسد ہیں، مثلاً بے پردگی نامحرم مردوں کے ساتھ اختلاط، بعض موقعوں پر تنہائی اور خلوت کا بھی موقع آسکتا ہے، آپس میں بے تکلفانہ بات چیت اور نامحرم مردوں کے ساتھ آمد ورفت وغیرہ کے بھی امکانات ہیں؛ اس لئے عورتوں کے لئے شرعاً ایسی ملازمت کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۱۰/ ۳۰۸، جدید۱۰/۱۰۳-۹۰، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۷/ ۲۳۵، ڈابھیل ۳/ ۳۸۹، فتاوی نظامیہ اندوریہ ۱/ ۴۳۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ ۶/ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳۰/ ۶/ ۱۴۱۹ھ

اساتذہ کے لئے طلباء کو ملنے والے کنسیشن استعمال کرنے کا حکم

سوال [۸۴۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدارسِ دینیہ کے طلبہ کے لئے جو سرکار کی طرف سے کنسیشن فارم دیا جاتا ہے، کیا اس پر مدرسہ کے اساتذہ کرام سفر کرسکتے ہیں؟

المستفتی: منظور احمد اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکار نے صرف طلبہ کے لئے کنسیشن فارم دیا ہے، اساتذہ یا ملازمین کے لئے نہیں؛ اس لئے اساتذہ کرام وملازمین کے لئے اس پر سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۴۴۵، ۴/ ۱۴۲، ۴/ ۱۴۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۵۳۱)

مدرسے کے کمروں میں مدرس کا فیملی کے ساتھ رہنا

سوال [۸۴۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید ایک مدرسہ کا مدرس بھی ہے اور مسجد کا امام بھی اور اس کا نگراں بھی زید ہے، تو کیا زید کے لئے مدرسہ کے کمروں میں فیملی لے کر رہنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ اشکال کرتے ہیں کہ مدرسے کے کمرے میں فیملی لے کر کیسے رہیں گے؟ واضح ہو کہ مدرسہ میں چار پانچ کمرے ہیں، مدرسے میں بیرونی طلبا بھی نہیں ہیں، گاؤں والے بچے پڑھ کر چلے جاتے ہیں، مدرسہ خالی رہتا ہے، تو کیا زید کے لئے مدرسے کے کمرے میں فیملی لے کر رہنا جائز اور گنجائش ہے یا نہیں؟ براہ کرم تفصیلی جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد منظور عالم خوشحال پوری، مدرسہ کاشف العلوم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مدرس کی ملازمت کے لئے مدرسہ کی طرف سے کمرہ یا مکان کا بھی معاملہ طے ہوا ہے یا کمیٹی وذمہ داران مدرسہ کی جانب سے بچوں واہلیہ کے رکھنے کی اجازت ہے، تو ایسی صورت میں مدرس کا اپنے بچوں واہلیہ کو مدرسہ کے کمرہ میں رکھنا شرعاً درست ہے، ہاں پردہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، لوگوں کا اس سلسلہ میں اعتراض جہالت اور غلطی پر مبنی ہے۔ (مستفاد: محمودیہ قدیم ۱۴/ ۱۶۸، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۵۲۰)

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.
(ترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دار السلام، رقم: ۱۳۵۲، مشكوة شريف: ۲۵۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۰۳۹/۳۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۱/۲۳ھ

مدرسین کے وسعت ونجی گھر ہونے کے باوجود مدرسہ کا گھر خالی نہ کرنے کا حکم

سوال [۸۴۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک دینی مدرسہ جو کافی عرصہ سے دینی تعلیم کی خدمت میں مصروف ہے، اس ادارے کے ذمہ داران نے اس ادارے میں مامور مدرسین وملازمین کی پریشانی اور کم وسعتی کو سامنے رکھتے ہوئے ادارے کی مملوکہ اراضی میں مدرسین وملازمین کے لئے مکانات مہیا کر دیئے تھے، جس سے مدرسین وملازمین کو سکون اور یکسوئی کے ساتھ خدمت کا موقع فراہم ہوا، مدرسہ کی جانب سے سہولیات فراہمی کے ساتھ معمولی کرایہ بھی طے کر دیا گیا، جس کی ادائیگی ہوتی رہی، مزید کوئی دوسرا معاملہ یا عہد وپیمان نہ ہوا، آج تک ان مکانات میں رہنے والے مدرسین وملازمین ان مکانات کو ادارے کی ہی ملک سمجھتے ہیں؛ لیکن موجودہ صورت یہ ہے کہ ان میں سے بعض کو اللہ نے کافی وسعت سے نواز دیا ہے، وہ لوگ اسی بستی میں جہاں ادارہ قائم ہے یا تو اپنے نجی مکانات کے مالک ہیں یا مکان بنانے کی مکمل وسعت رکھتے ہیں، جب کہ ادارے کو مکانات کی ضرورت ہے، ایسے حالات میں چند امور دریافت طلب ہیں:

(۱) ادارے کا مدرسین وملازمین کو رہائش کے لئے مکان دینا یہ معاملہ شرعی اعتبار سے کس دائرے میں آئے گا؟

(۲) کیا وسعت وفراخی آنے یا اپنے نجی مکان کا مالک ہونے کے بعد ایسے لوگوں کا ادارے کے مکان میں قیام پذیر رہنا جب کہ ادارے کوضرورت بھی ہے، شرعی اعتبار سے درست ہے؟

(۳) کیا ادارہ مکان کے انخلاء کے لئے کوئی دباؤ یا اصرار کا طریقہ اپنا سکتا ہے؟

(۴) کبھی کبھی ان مکانات پر قبضہ کی صورت بن جانے سے ان کی حفاظت کا مسئلہ بھی اٹھتا ہے، اس سلسلہ میں کیا پیش رفت کی جاسکتی ہے؟ مفید مشورہ مطلوب ہے، شرعی نقطہ نظر سے جواب عنایت فرما کر ممنون ہوں۔

المستفتی: عبدالمقتدر، محلّہ خانقاہ دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) کوئی بھی ادارہ اپنے ماتحت ملازمین کے لئے رہائشی مکان مہیا کرتا ہے، اس میں دو باتیں پیش نظر رہتی ہیں: اولاً اس میں ادارہ کا فائدہ پیش نظر رہتا ہے، ملازمین کی فیملی کی رہائش کا انتظام نہ ہونے کی صورت میں ان کو ادارے کا کام چھوڑ کر بار بار اپنی فیملی اور بچوں کے حقوق کی ادائے گی اور ان کی خبر گیری کے لئے جانا پڑتا ہے، اس میں ادارہ کا نقصان ہوتا ہے، اس سے بچنے کے لئے ادارہ رہائشی مکانات کا انتظام کرتا ہے۔ دوسری یہ کہ ادارے کے پیش نظر یہ بات بھی ہوتی ہے کہ اس سے ملازم کو سہولیات فراہم ہوتی ہیں، جس سے اپنے بال بچوں کے متعلق بے فکر ہو کر کام کرنے میں جماؤ پیدا ہوجائے اور ملازم دلجمعی کے ساتھ ادارے کے کام میں لگ جائے۔ اور جب ملازم کی یہ ضرورت اپنے ذاتی مکان کے ذریعہ پوری ہوجائے تو ملازم کے اوپر لازم ہے کہ ادارے کا مکان رضا کارانہ طور پر خالی کردے اور ذاتی مکان میں رہائش اختیار کرلے، تاکہ ادارے کے دوسرے ضرورت مند ملازمین خالی کردہ مکانات سے ادارے کے واسطے سے اپنی ضرورت پوری کرسکیں۔ اور سوال میں یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ یہ معاملہ شرعی اعتبار سے کس دائرہ میں آئے گا؟ واضح ہو کہ یہ معاملہ کرایہ دار کے دائرہ میں تو آتا ہے، مگر مطلقاً نہیں؛ بلکہ ضرورت پوری ہونے کی حد تک آتا ہے۔

قال في الأشباه: فيفرق بين اشتراط تقديم العمارة كل سنة والسكوت عنه، فإنه مع السكوت تقدم العمارة عند الحاجة إليها، ولا يدخر لها عند عدم الحاجة إليها، ومع الاشتراط تقدم عند الحاجة ويدخر لها عند عدمها. (شامي، كتاب الوقف، مطلب في قطع الجهات لأجل العمارة، زكريا ٦/ ٥٦٦، كراچی ٤/ ٣٧١)

(۲) جب ملازم کواللہ تعالیٰ وسعت اورفراخی عطافرما دے اوراپنا نجی مکان بنالے تو ملازم پر ضروری ہے کہ ادارے کا مکان خالی کرکے اپنے نجی مکان میں منتقل ہوجائے اورذاتی رہائشی انتظام کے باوجودادارے کامکان خالی نہ کرنا جب کہ ادارےکواپنے دوسرےضرورت مند ملازمین کے لئے مکان کی ضرورت ہے،تو یہ قابض ملازمین کی طرف سے ناجائز قبضہ ہے، اس کوخالی کرانے میں ادارےکواپنی طاقت کےاستعمال کرنے کاحق ہےاور قابض ملازمین کےسخت گنہگاراورعنداللہ سخت پکڑ میں آنے کاخطرہ ہے۔

إذا مضت مدة الإجارة قلع البناء والغرس، وسلم الأرض إلى المؤجر فارغة؛ لأنه يجب عليه تسليمها إلى صاحبها غير مشغولة ببنائه وغرسه، وذلک بقلعهما في الحال؛ لأنهما ليس لهما حالة منتظرة ينتهيان إليها.

(تبيين الحقائق زكريا ٦/ ٩٦، مكتبه إمداديه ملتان ٥/ ١١٤)

وتصح إجارة أرض للبناء والغرس ...... مضت المدة قلعهما وسلمها فارغة لعدم نهايتهما إلا أن يغرم له الموجر قيمته، أي البناء والغرس مقلوعا. (درمختار مع رد المحتار زكريا ٩/ ٤١، كراچی ٦/ ٨٣، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤٢٩، جديد ٤/ ٤٦٢)

عن سعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من اقتطع شبرا من الأرض ظلما طوقه الله إياه يوم القيامة من سبع أرضين.

(مسلم شريف، كتاب المساقاة، باب تحريم الظلم وغصب الأرض، النسخة الهندية ٢/ ٣٢، بيت الأفكار رقم: ١٦١٠، بخاري شريف ١/ ٤٥٣، رقم: ٣٠٩١، ف: ٣١٩٥)

(٣) مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط اس حدیث شریف کی روشنی میں بنائے جاتے ہیں۔حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن كثير بن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (جامع الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، طبراني ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٣، رقم: ٢٨٦٩)

اس حدیث پاک کے پیش نظر ضرورت مند ملازمین کو جو رہائشی مکانات منجانب ادارہ دئے جاتے ہیں وہ وقتی ضرورت پوری کرنے کے لئے دئے جاتے ہیں، جب ان کی ضرورت ذاتی رہائشی مکانات یا کسی اور طریقہ سے پوری ہوجائے تو ان پر لازم اور ضروری ہے کہ ادارے کے مکانات کو رضا کارانہ طور پر خالی کر کے ادارے کے حوالہ کردیں اور ازخود خالی نہ کرنے کی صورت میں ادارے کو دباؤ ڈالنے اور خالی کرانے پر اصرار کا حق ہے، پھر بھی خالی نہ کریں تو ادارے کو جہاں تک ہوسکے اپنی طاقت استعمال کرنے کا حق ہے، اگر کوئی ملازم ایسا مضبوط ہے کہ اس پر دباؤ ڈالنے کی صورت میں ادارے کو طرح طرح کے خطرات کا اندیشہ ہے، تو ایسی صورت میں وہ ملازم شرعاً غاصب اور ظالم شمار ہوگا اور عنداللہ سخت پکڑ میں آنے کا خطرہ ہے۔

عن كثير بن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (جامع الترمذي، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

إذا مضت مدة الإجارة قلع البناء والغرس، وسلم الأرض إلى المؤجر

فـارغة؛ لأنـه يـجـب عليه تسليمها إلى صاحبها غير مشغولة ببنائه وغرسه، وذلک بـقـلـعهـمـا في الحال؛ لأنهما ليس لهما حالة منتظرة ينتهيان إليها. (تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ١١٤، زكريا ٦/ ٩٦)

وتـصح إجارة أرض للبناء والغرس ...... مضت المدة قلعهما وسلمها فـارغة لـعـدم نهايتهما (وتحته في الشامية:) أي البناء والغرس إذ ليس لهما مدة معلومة. (الدرالمختار مع الشامي، کراچی ٦/ ٨٣، زكريا ٩/ ٤١)

(۴) جب ادارہ کو ملازمین کی طرف سے ان مکانات پر قبضہ کرلینے کا خطرہ ہوتو مکانات ملازمین کو ہندوستانی قانون کے مطابق ۱۱رمہینے کے اگریمنٹ کے ساتھ دینے چاہئیں اور ہر گیارہ مہینے پر نئے اگریمنٹ پر دستخط کرائے جائیں، جب یہ سلسلہ رہے گا تو آگے چل کر ملازمین کی نیت میں فتور نہیں آئے گا اور ادارہ جب چاہے خالی کراسکتا ہے، اسی وجہ سے بہت سے فقہاء نے اوقاف کی جائیداد کو صرف ایک سال کے لئے کرایہ پر دینے کا مشورہ دیا ہے۔ اور بعض نے تین سال کی بھی اجازت دی ہے۔ اور مقصد یہی ہے کہ ادارہ کے حق میں جائیداد خطرہ میں نہ پڑجائے۔

ومـنها: بيان المدة في الدور والمنازل والحوانيت. (هندية، زكريا قديم ٤/ ٤١١، جديد ٤/ ٤٤٠)

وشـرطهـا كون الأجرة والمنفعة معلومتين؛ لأن جهالتهما تفضي إلى الـمـنـازعة، ويـعـلـم النفع ببيان المدة كالسكنى والزراعة. (الـدرالمختار مع الشامي، زكريا ٩/ ٧-٨، كراچی ٦/ ٦٥)

وكـان الـقـاضي الإمام أبو علي النسفي رحمه الله يفتي بأن المتولي لا ينبغي أن يؤاجر أكثر من ثلاث سنين. (هندية، زكريا ٢/ ٤١٩، تاتارخانية ٨/ ٦٩، رقم: المسألة: ١١٢٣٣، تبيين الحقائق، زكريا ٧٩، ١٨٠، إمداديه ملتان ٥/ ١٠٦)

فـإن كـان الـواقف شـرط أن لا يـؤاجر أكثر من سنة، فليس للقيم أن

يخالف شرطه ويؤاجرها أكثر من سنة. (تاتارخانية، زكريا ٨/ ٦٨، رقم: ١١٢٣٢)

روي عن الفقيه أبي جعفر رحمه الله أنه كان يقول في الوقف لا يؤاجر أكثر من سنة. (تاتارخانية ٨/ ٦٨، رقم: ١١٢٣٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍محرم الحرام ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/۱۱۸۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۱/۱۴۳۶ھ

غیر صاحب نصاب مدرس کے لئے مدرسہ کا کھانا کھانا

سوال [۸۴۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کوئی مدرس صاحب نصاب نہ ہو، تو مدرسہ میں طلباء کے لئے پکا ہوا کھانا بغیر قیمت یا فیس ادا کئے ہوئے کھا سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: زاہد الاسلام، مدرسہ رحمانیہ محمد نگر سہاگ پور، شہڈولی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مدرس خواہ صاحب نصاب ہو یا غیر صاحب نصاب، اگر بوقت ملازمت کھانا مدرسہ سے طے ہوا ہے جو کہ جزوِ تنخواہ ہے یا فیس ادا کر کے کھانا لیتا ہے بہرصورت مدرس کو مطبخ سے کھانا لینا درست ہے؛ لیکن اگر مدرس کی خوراکی منجانب مدرسہ جمع نہ ہوئی ہو یا فیس ادا کئے بغیر کھانا لے اور مطبخ میں زکوۃ کی رقم بلا تملیک صرف کی جاتی ہو تو ایسی صورت میں مدرس کو کھانا لینا درست نہ ہوگا۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۵/ ۲۸۵، جدید ڈابھیل ۱۵/۴۸۰، ۵۵۱)

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ. الآية [التوبة: ٦٠]

مصرف الزكوة والعشر هو فقير. (شامي، كتاب الزكوة، باب المصرف، كراچی ٢/ ٣٣٩، زكريا ٣/ ٢٨٣)

(۲) معطی کی طرف سے زکوۃ کی رقم دوقسموں پر ہوتی ہے: (۱) مدِ زکوۃ کے نام سے علی الاطلاق زکوۃ کی رقم دی جاتی ہے، اس میں یہ تخصیص نہیں ہے کہ یہ پیسہ مستحقین پر کس طریقہ سے خرچ کیا جائے، ایسی صورت میں معطی کی طرف سے مدرسہ کے ذمہ دار یا سفراء کے ہاتھ میں پیسہ آتے ہی معطی کی زکوۃ ادا ہو جاتی ہے؛ اس لئے کہ سفراء اور مدرسہ کے ذمہ دار طلباء کے وکیل ہیں اور زکوۃ کے ایسے پیسے کو طباخ کی اجرت، آٹا پیسائی کی اجرت اور لکڑی کی خریداری وغیرہ میں صرف کرنا درست نہیں، ہاں البتہ ایسی چیز کی خریداری اس پیسے سے جائز ہے جس کی بقاء طلباء کے ہاتھوں میں کھانا پہنچنے تک رہتی ہے، جیسا کہ گوشت، دال، مسالا، آٹا وغیرہ۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۱/ ۱۱۵، جدید ڈابھیل ۹/ ۶۰۳)

هي تمليك خرج الإباحة جزء مال خرج المنفعة فلو أسكن فقيرا داره سنة ناويا لا يجزيه المال كما صرح به أهل الأصول ما يتمول ويدخر للحاجة، وهو خاص بالأعيان، فخرج به تمليك المنافع. (درمختار مع الشامي، كتاب الزكوة، كراچی ۲/ ۲۵۶، ۲۵۷، زكريا ۳/ ۱۷۱-۱۷۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰/ ۵/ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۵۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/ ۶/ ۱۴۲۲ھ

مدرسین کے لئے ایصال ثواب کا کھانا کھانا

سوال [۸۴۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ میں مطبخ کا کھانا تیار ہوتا ہے، اس میں مدرسین وملازمین اور طلباء کا کھانا ایک ساتھ تیار کیا جاتا ہے، کبھی کبھی صدقہ کا مال یا ایصال ثواب کا کھانا بریانی وغیرہ آجاتی ہے، اب مدرسین جو مدرسہ کے مطبخ سے کھانا کھاتے ہیں، وہ بھی اس میں کھا سکتے ہیں یا نہیں؟ کیوں کہ جب کھانا آگیا تو مطبخ میں کھانا بنتا نہیں ہے، نیز مدرسہ کے ناظم صاحب کا کہنا ہے

کہ اگر علیحدہ کھانا بنے گا تو مدرسہ کا نقصان ہوتا ہے اور اس کھانے کا جو بستی سے آتا ہے، ہم کیا کریں گے اور وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہ صدقہ نافلہ ہے؛ کیوں کہ نیت ثواب کی ہوتی ہے اور طباخ بھی جلد کھانا بنانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

المستفتی: رحمت اللہ قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایصال ثواب کا کھانا صدقہ ہے۔ اور صدقہ فقہاء کا حق ہے، اغنیاء کو صدقہ دینے سے صدقہ کا ثواب نہیں ملتا؛ لہٰذا اگر اساتذہ سرمایہ دار ہیں، تو ان کے لئے ایصال ثواب کا کھانا درست نہیں ہے؛ البتہ اگر صدقہ نافلہ کریں تو اس کا کھانا اساتذہ کے لئے درست ہوگا، خواہ صاحب نصاب ہوں یا نہ ہوں۔ سوال نامہ میں جس پریشانی کا ذکر ہے کہ الگ سے کھانا تیار کرنے میں مدرسے کا نقصان ہوگا، نیز طباخ بھی تیار نہیں ہوتے، تو اس صورت میں جواز کی صورت یہ ہے کہ مستحق طلبہ کھانا لے آئیں وہ اپنا کھانا اساتذہ کو اپنی خوشی سے کھلا دیں، تو اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ حدیث بریرہ سے واضح ہوتا ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۴/ ۱۰۸، جدید زکریا مطول ۵/ ۱۷۵)

عن عائشة –رضي الله عنها– أنها أرادت أن تشتري بريرة للعتق ...... وأوتي النبي صلى الله عليه وسلم بلحم، فقلت: هذا ما تصدق به على بريرة، فقال: هو لها صدقة ولنا هدية. (صحيح البخاري، باب الصدقة على موالي أزواج النبي صلى الله عليه وسلم، النسخة الهندية ١/ ٢٠٢، رقم: ١٤٧١، ف: ١٤٩٣)

وأما بقية الصدقات المفروضة والواجبة (وقوله) فلا يجوز صرفها للغني (إلى قوله) خرج النفل عنها؛ لأن الصدقة على الغني هبة. (البحرالرائق، كتاب الزكوة، باب المصرف، دارالفكر بيروت ٢/ ٢٤٥، زكريا ٢/ ٤٢٧، كوئٹه ٢/ ٢٤٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ صفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۷۱۹)

مدرسے کے ملازم کے علاج کی ذمہ داری کس پر ہے؟

سوال [۸۴۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کسی مدرسہ کا ملازم ہے جو درس وتدریس کا کام انجام دیتا ہے اور وہ باقاعدہ مدرسہ سے اپنی متعین تنخواہ لیتا ہے، اتفاقا وہ کسی سے ملاقات کرنے کے لئے کہیں چلا گیا، مدرسہ کے کام سے نہیں گیا، واپسی میں وہ شدید بیمار پڑ گیا یا اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا، تو کیا اس کے علاج ومعالجہ کی پوری ذمہ داری مدرسہ کے اوپر ہوگی یا کس کے اوپر ہوگی؟ جب کہ زید کے وارث مثلاً اس کا بھائی یا اس کا لڑکا اس کے پاس موجود ہے اور اس کے علاج کی کیا شکل ہوگی؟

المستفتی: ڈاکٹر عبدالکافی مہتمم جامعہ اخلاق العلوم چکر کی ملک، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مدرسہ کی رقم سے علاج کرنے کا حق نہیں ہے، ہاں البتہ علی الحساب لے کر بعد میں تنخواہ میں مجرا کرتے رہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اور تنخواہ اور منجانب مدرسہ مقرر کردہ دیگر وظائف کے علاوہ لینے کا حق نہیں ہے۔

لا يجوز لأحد أن يتصرف في ملك الغير بغير إذنه. الخ (قواعد الفقه، أشرفي ديوبند، ص: ۱۱۰)

لا يجوز التصرف في مال غيره بغير إذنه، ولا ولايته عليه. (الأشباه، كتاب الغصب، كراچی ۲/ ۹۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۴۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۴/۱۴۱۴ھ

الفصل الرابع:

مدارس میں سرکاری اور غیر مسلم کا مال صرف کرنے کا حکم

مدرسہ کو ایڈ کرانا

سوال [۸۴۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) بعد آداب وتسلیمات کے خدمت اقدس میں عرض یہ ہے کہ مدرسہ جامعہ عربیہ اصلاح العلوم عرصہ سے دینی خدمات انجام دے رہا ہے، جس میں چار مدرس اور دو ٹیچر ایک عالم دو قاری اور ایک حافظ دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، تعلیمی نصاب حافظہ، ناظرہ درجات پرائمری اول تا درجہ پنجم ہے۔

(۲) ہمارے گاؤں میں دوسرا مدرسہ ہدایت العلوم ملحق حضرت ناظم صاحب مدظلہ مجلس دعوۃ الحق ہردوئی بھی چل رہا ہے، وہ مدرسہ امسال رکنائز ہو گیا ہے، نیز امداد برائے وظائف طلبہ بھی ملتی ہے، اس وجہ سے اکثر طلباء مدرسہ ہدایت العلوم میں داخل ہو رہے ہیں اور ہمارے مدرسہ اصلاح العلوم میں ابتدائی بچوں کی آمد پر کافی اثر پڑا، وظیفہ کی وجہ سے اکثر لوگ اپنے طلباء کو مدرسہ ہدایت العلوم میں داخل کر رہے ہیں، موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اہم اراکین مدرسہ اصلاح العلوم کو گورنمنٹ سے رکنائز کرانا چاہتے ہیں، شرعاً کیسا ہے؟

(۳) نیز گورنمنٹ سے امداد برائے وظائف طلبہ ملتی ہے، اس کا لینا شرعاً کیسا ہے؟

المستفتی: اراکین مدرسہ اصلاح العلوم بڑ اانو اردہ غوث گنج، ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دینی مدارس اللہ تعالیٰ پر توکل اور عامۃ المسلمین کے تعاون سے چلتے ہیں، جن مدارس نے حکومت سے ایڈ اور وظائف لینا شروع کیا ہے وہ کبھی بھی آزاد مدارس سے آگے بڑھ کر ترقی نہیں کر پائے؛ اس لئے دینی مدارس کا حکومت سے ملحق

ہوکر وظائف حاصل کرنا روحانی ترقیات پر روک لگانا ہے؛ اس لئے حکومت سے ملحق کرنا مناسب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَعَسَى اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَعَسَى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. [البقرة: ٢١٦] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۲۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴؍۴؍۱۴۱۸ھ

کیا ایڈ کے مدارس میں سرکاری قوانین کی پابندی لازم ہے

سوال [۸۴٦٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک سرکاری مدرسہ کا مدرس ہے اور اس کی تنخواہ تقریباً ۲۰؍ ہزار روپیہ مہینہ ہے اور اب جبراً زید سے اور اس کے تمام ساتھیوں سے ہر مہینہ تنخواہ کا دس فیصد منیجر مدرسہ لیتا ہے، جو سالانہ تقریباً ۲۴؍ ہزار روپیہ ہوتا ہے، جو ہم لوگ ظلم وجبر کی وجہ سے دیتے ہیں اور اس کے باوجود تعلیم کے بارے میں بھی کڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اور اگر کوئی مدرس ۵؍ منٹ بھی دیر سے پہنچتا ہے، تو اسے غیر حاضر کر دیا جاتا ہے، ایسی صورت میں اگر کوئی شخص سفر حج کے لئے جائے تو مدرسہ اس کی تنخواہ نکال کر آدھی تنخواہ دے دیتا ہے اور آدھی مدرسہ کے نام پر لے لیتا ہے، یا پوری تنخواہ دے دیتا ہے یا اگر کوئی جماعت میں جانا چاہتا ہے تو مدرسہ والے اس کو بھیج دیتے ہیں اور اس کی تنخواہ اس کو دی جاتی ہے، کبھی پوری کبھی آدھی، تو کیا ان تمام حالتوں میں جبراً دی گئی رقم کو ہم ان کاموں کے لئے جوڑ سکتے ہیں یا ہمارا تنخواہ لے کر حج وجماعت کے لئے جانا درست ہوگا؟ جب کہ تنخواہ کٹوا دینے میں بڑی دقتیں قانونی اعتبار سے پیش آتی ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل وضاحت فرمائیں۔

المستفتی: محمد عرفان پنتے پور، ضلع سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: سرکاری مدرسہ میں منجانب حکومت طے کئے گئے ضوابط کی پابندی منیجر اوراساتذہ سب پر لازم ہے؛ لہٰذا منیجر کا جبراً اساتذہ کی تنخواہ سے ۱۰ر فیصد حصہ کاٹ لینا شرعی نقطہ نظر سے جائز نہیں ہے، اسی طرح اساتذہ بھی شرعاً اتنے ہی دن کی تنخواہ لینے کے مجاز ہیں جتنے دن انہوں نے مدرسہ میں حاضر ہوکر باقاعدہ پڑھایا ہو، غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ لینا جائز نہیں ہے، اسی طرح غیر حاضر رہنے کی صورت میں منیجر کے ذریعہ لی گئی رقم کو اس کا عوض مان کر اس دن کی حاضری لگانا بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔

وقال النبي صلى الله عليه وسلم: المسلمون عند شروطهم. (صحيح البخاري، تحت ترجمة الباب، باب أجر السمسرة، النسخة الهندية ١/ ٣٠٣)

وأما شرائط الصحة، فمنها: رضا المتعاقدين. (هندية، كتاب الإجارة، الباب الأول، زكريا جديد ٤/ ٤٤٠، قديم ٤/ ٤١١)

والأجرة إنما تكون في مقابلة العمل. (شامي، كتاب النكاح، باب المهر، مطلب أنفق على معتدة الغير، زكريا ٤/ ٣٠٧، كراچی ٣/ ١٥٦)

ليس لأحد أن يأخذ مال غيره بلا سبب شرعي. (شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ١/ ٦٢، رقم المادة: ٩٧، قواعد الفقه، ص: ١١٠، رقم: ٢٦٩، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢١/ ١١٢)

عن أبي حميد الساعدي أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل لمسلم أن يأخذ مال أخيه بغير حق. (مجمع الزوائد، باب الغصب وحرمة مال المسلم، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۳۹)

سرکار کی طرف سے آئے ہوئے رسد کو مدرسہ یا مسجد میں لگانے کا حکم

سوال [۸۴۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سرکار کی طرف سے اسکول میں جو چاول اور گیہوں آتا ہے بچوں کے لئے اگر گاؤں کے سبھی لوگ مل کر اسی چاول کو مدرسہ یا مسجد میں لگانا چاہیں تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: شمس الحق، جھارکھنڈ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن طلبہ کے لئے رسد آتا ہے، ان ہی کو دینا لازم ہے، مدرسہ یا مسجد والوں کو دینا جائز نہیں۔

إنهم صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة. (شامي، الوقف، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة، زكريا ٦/ ٦٦٥، كراچی ٤/ ٤٤٥)

ومن اختلاف الجهة، ما إذا كان الوقف منزلين أحدهما للسكنى والآخر للاستغلال، فلا يصرف أحدهما للآخر، وهي واقعة الفتوى. (شامي، الوقف، مطلب في نقل أنقاض المسجد ونحوه، زكريا ٦/ ٥٥١، كراچی ٤/ ٣٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ / رجب المرجب ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۳۰۴)

اسکولوں میں آمدہ سرکاری امداد کی بچی ہوئی رقم کا مصرف

سوال [۸۴۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل حکومت اسکولوں وغیرہ میں اس کی ضروریات کے لئے اسی طرح طلبہ

کی ضروریات کے لئے کافی بڑی مقدار میں رقم دیتی ہے، پھر اس رقم کے ذریعہ اسکولوں اور طلبہ دونوں کی ضروریات بحسن خوبی ادا ہونے کے بعد کافی رقم بچ جاتی ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ اس بچی ہوئی رقم کو واپس کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر نہیں، تو اس رقم کا مالک کون ہوگا؟ نیز واپسی کی صورت میں وہ رقم حکومت تک نہیں پہنچ پاتی ہے؛ بلکہ اس رقم کو پانے والے اس کا غلط استعمال کرتے ہیں، تو اب ایسی صورت میں رقم کا کیا کرنا چاہئے؟

المستفتی: عبدالعظیم، جگر کالونی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسکول اور اسکولی طلبہ کی ضروریات پوری ہونے کے بعد بچی ہوئی فاضل رقم سرکار کو واپس کرنا ضروری ہے، اگر سرکار کو واپس کرنے میں سرکار کے خزانہ تک وہ رقم نہیں پہنچتی ہے، تو ایسی صورت میں اسکولی طلبہ پر اس فاضل رقم کو بطور وظیفہ اور کھانے وغیرہ کی شکل میں خرچ کر دینا ضروری ہے۔ اور اسکول کے ذمہ داروں کے لئے اپنی ذاتی استعمال میں لانا جائز نہ ہوگا؛ اس لئے کہ یہ ایک امانت ہے اور امانت کو اس جگہ پہنچانا لازم ہے جہاں کے لئے یہ امانت دی گئی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوْا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا. [النساء: ٥٨]

ليس أداء الأمانة منحصرا في مال الوديعة ونحو ذلك بل كل حق لأحد على أحد أمانة يجب أدائه لأهله كما يدل عليه سبب نزول هذه الآية.

(تفسير مظهري، زكريا قديم ٢/ ١٤٨، جديد ٢/ ٣٦٤، تحت تفسير رقم الآية: ٥٨، من سورة النساء)

ولو فضل من الخشب ونحوه شيء فهو على وجهين: إن كان يقدر على أربابها يشاورهم القيم في ذلك، وإن كان لا يقدر على أربابها فللقيم أن يفعل به ما يرى، وفي جامع الجوامع: وما فضل من الخشب ونحوه جاز صرفه في قنطرة أخرى بجنبها بمشورة أربابها: أوقاف على قنطرة فيبس الوادي وصار الماء إلى شعبة أخرى من الأرض من تلك المحلة، واحتيج

إلی عمارة القنطرة للوادي الجديد، فهل يجوز صرف القنطرة الأولى إلى الثانية؟ إن كانت القنطرة الثانية للعامة، وليس هناک قنطرة أخرى للعامة أقرب إلى القنطرة الأولیٰ جاز. (الفتاوى التاتارخانية، زكريا ٨/ ١٩٦، رقم: ١١٦٢٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ربیع الاول ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۹۶۰)

اسکول کی تعمیر یا طلبہ کی خوراک سے بچی ہوئی رقم کو ہیڈ ماسٹر کا استعمال کرنا

سوال [۸۴۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) حکومت ہند کی طرف سے اسکول کے طلبہ کو متعینہ خوراک ملتی ہے کہ ہیڈ ماسٹر فی طالب علم اتنا کھانا یا اس کی رقم طالب علم کے حوالہ کرے گا۔ اور ان کا یہ بھی قانون ہے کہ کھانا صرف اس طالب علم کو دیں جو اسکول میں حاضر ہو ورنہ نہیں اور ظاہر ہے کہ جتنے طلبہ کا نام رجسٹر میں ہے سب نہیں آتے ہیں، جس کی وجہ سے ہر ماہ کافی مقدار میں خوراک بچ جاتی ہے، تو اب اس خوراک اور اس کی رقم کو کیا کریں؟ حکومت ہم سے اس کا مطالبہ بھی نہیں کرتی ہے، تو کیا ہیڈ ماسٹر اس میں تصرف کرسکتا ہے؟ اور اگر ان میں سے کچھ رقم دوسرے اساتذہ کو دیں تو کیا اس کے لئے یہ حلال ہے؟

(۲) اسی طرح حکومت اسکول کی عمارت بنانے کے لئے روپئے دیتی ہے، عمارت بنانے کے بعد کچھ رقم بچ جاتی ہے، تو کیا اس رقم میں بھی ہیڈ ماسٹر تصرف کرسکتا ہے؟ اور اگر دوسرے کو دے تو کیا یہ اس کے لئے حلال ہے؟ اگر اس طرح کے روپئے حرام ہیں، تو کیا سود کی ادائے گی میں یہ رقم دے سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد فیاض عالم، ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) صورت مسئولہ میں طلبہ کی خوراکی کے بعد جو روپیہ بچ جاتا ہے، ہیڈ ماسٹر کے لئے اس کو اپنے استعمال میں لانا اور اپنے اوپر خرچ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے؛ بلکہ ان بچے ہوئے پیسوں کو سرکار کو واپس کرنا یا پھر طلبہ ہی پر دوبارہ خرچ کرنا واجب ہے؛ اس لئے کہ ہیڈ ماسٹر سرکار کی طرف سے ان روپیوں کو خرچ کرنے کا وکیل ہے؛ لہٰذا حسب ہدایت خرچ کرنے کے بعد جو بچ جائے گا وہ اس کے قبضہ میں سرکاری امانت ہوگا، جس میں تصرف کرنے کی اسے اجازت نہیں؛ ہاں البتہ طلبہ کی خوراکی سے بچا ہوا پیسہ طلبہ ہی پر خرچ کرنے کی گنجائش ہے۔

قال في الشامية: وهنا الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل، وقد أمره بالدفع إلى فلان، فلا يملك الدفع إلى غيره. (شامي، كتاب الزكوة، زكريا ۳/ ۱۸۹، كراچی ۲/ ۲٦۹)

والمال الذي قبضه الوكيل بقبض العين بحسب وكالته هو في حكم الوديعة بيد الوكيل. (شرح المجلة سليم رستم، اتحاد ۲/ ۷۸٤، رقم المادة: ۱٤٦۳، مستفاد: فتاوی محموديه جديد ۱۵/ ۵۷۵، امداد الفتاوی ٤/ ۱۳۹)

(۲) منجانب سرکار اسکول کی عمارت کی تعمیر کے لئے جو پیسہ آتا ہے، تعمیر کی تکمیل کے بعد اس میں سے بچا ہوا پیسہ حکومت کو واپس کر دینا واجب ہے، ہیڈ ماسٹر یا کسی اور کے لئے اس میں تصرف کرنا یا اسے خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ جدید ۱۵/ ۵۷۵، امداد الفتاوی ۴/ ۱۴۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۹/۲/۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۶ھ

امام باڑہ کے اوپر مدرسہ بنانے کا حکم

سوال [۸۴۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: شہراجل پور میں مسلمانوں کا امام باڑہ ہے، جو پورے سال دوسروں کے پاس کرایہ پر رہتا ہے؛ لیکن محرم الحرام کی یکم تاریخ سے ۱۰/ تاریخ تک کرایہ داروں سے خالی کرالیا جاتا ہے،علم اورسواری رکھنے کے لئے ،باقاعدہ اس کی رجسٹرڈ کمیٹی ہے، یہ کمیٹی چاہتی ہے کہ دھیرے دھیرے یہ ساری خرافات ختم ہوں تو کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ اس عمارت کے اوپر ایک مدرسہ تعمیر کیا جائے اور اس میں بچوں کی دینی تعلیم کے لئے مدرس رکھے جائیں، تاکہ یہ خرافات بند ہوسکیں، آیا اس امام باڑہ کی جو سال بھر کرایہ کی آمدنی ہے اس میں سے مدرس کی تنخواہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: نسیم احمد قاسمی، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تعزیہ نکالنا امر معصیت ہے اور اس کے لئے امام باڑہ بنانا اور اسی کے نام سے وقف کرنا شرعی طور پر ناجائز اور باطل ہے؛ لہٰذا مذکورہ عمارتیں اور دوکانیں صرف کمیٹی والوں کے تحت جائیداد ہیں؛ لہٰذا کمیٹی والوں کے مشورہ سے ان عمارتوں اور دوکانوں کو مدرسہ کے تحت لانا اور اس کے اوپر باقاعدہ دینی مدرسہ بنانا جائز اور درست ہوگا، ایک چیز جو ناجائز کام میں چل رہی تھی وہ ایک دینی کام میں شامل ہو جائے گی۔ اور جو لوگ مدرسہ بنانے میں شامل ہوں گے وہ سب بہت بڑے اجر وثواب کے مستحق ہوں گے۔ اور دوکانوں کی آمدنی سے مدرسین کو تنخواہ دینا بھی جائز ہوگا۔

من شرائط الوقف: أن يكون قربة في ذاته، وعند التصرف، فلا يصح وقف المسلم على البيعة، والكنيسة، أو على فقراء أهل الحرب. الخ (هندية، كتاب الوقف، الباب الأول، زكريا قديم ٢/ ٣٥٣، جديد ٢/ ٣٤٧، النهر الفائق، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٣١٣)

ولا يصح وقف مسلم، أو ذمي على بيعة أما في المسلم فلعدم كونه قربة في ذاته، وأما في الذمي فلعدم كونه قربة عندنا وعنده. (الدر مع الرد،

الوقف، مطلب في وقف المرتد والكافر، زكريا ٦/ ٥٢٦، كراچی ٤/ ٣٤٢، الفقه الإسلامي وأدلته، دارالفكر ١٠/ ٧٦٤٠، هدى انٹر نيشنل ديو بند ٨/ ١٨٧-١٨٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۱۷۷۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/۴/۱۴۱۷ھ

غیر کی زمین میں اس کی اجازت کے بغیر مدرسہ بنانے کا حکم

سوال [۸۴۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اب سے دس بارہ سال پہلے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ایک زمین میں مدرسہ قائم کیا، جب کہ دوسرے مدارس کے ذریعہ تعلیم کا معقول انتظام تھا، اور اب بھی ہے، یہ زمین بہت سارے لوگوں کی ہے، ان میں سے چند حضرات نے مدرسہ بنانے کی اجازت دے دی تھی؛ لیکن باقی حق دار اب تک اجازت نہ دے کر میری اس کارکردگی سے ناراض ہیں؛ لیکن کچھ رعب دار لوگ میرے ساتھ ہیں، اس وجہ سے وہ بیچارے مجھ سے اپنے حق کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے اور مدرسہ کی تعمیر وتعلیم جاری ہے، اس صورت میں میرے لئے اس زمین میں تعمیر وتعلیم کا کیا حکم ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں واضح فرمائیں، جس سے ہماری آخرت برباد نہ ہو، میں اس ادارے اور پراپرٹی کا خود ہی مالک ہوں۔

المستفتی: ابن خان ککرالہ، بدایوں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب مدرسہ قائم ہو چکا اور اس زمین پر مدرسہ کے نام سے تعمیر ہو چکی، اب اس کو مدرسہ ہی باقی رکھنا لازم ہے، اطراف میں دوسرے مدارس کیوں نہ ہوں اور دوسروں کی زمین جو مدرسہ کی عمارت میں آچکی ہے، منجانب مدرسہ اس کی قیمت ادا

کردی جائے، اب مدرسہ بن جانے کے بعد یہ مسلمانوں کا قومی ادارہ بن چکا ہے، شرعاً آپ اس کے مالک نہیں ہیں، آپ کا مالکانہ تصرف کرنا جائز نہیں ہے، اگر آپ سے انتظام نہیں چل سکتا ہے، تو کسی تجربہ کار عالم دین کو منصب نظامت پر بٹھا دیجئے، اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو اطراف میں جو مدارس چل رہے ہیں، اس مدرسہ کو ان میں سے کسی اچھے مدرسہ کی شاخ بنا دیجئے اور اسی مدرسہ کے منتظمین کے اختیار میں دے دیجئے۔ اور آپ اس میں دخل اندازی نہ کریں، تاکہ مدرسہ صحیح طریقے سے چل سکے۔

فإذا تم ولزم لا يملك ولا يعار ولا يرهن. قال في الشامية: لا يملك: أي لا يكون مملوكا لصاحبه، ولا يملك: أي لا يقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه لاستحالة تمليك الخارج عن ملكه ولا يعار. (ردالمحتار شامي، الوقف، مطب مهم فرق أبو يوسف بين قوله موقوفة، زكريا ٦/ ٥٣٩، كراچی ٤/ ٣٥١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۴۰۹)

مالک کی اجازت کے بغیر اس کی زمین پر مدرسہ بنانا

سوال [۸۴۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کیا کسی کی زمین پر زمین کے مالک کی اجازت کے بغیر مدرسہ قائم کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو بلا اجازت کسی کی زمین پر مدرسہ قائم کر کے اس کو چلانے والے کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟

(۲) ہم دو بھائی مسمیٰ راجا، وراہو، ابنا حاجی محمد عاقل (عقلو) کی تقریباً ۵۲؍ بیگہ رقبہ کی زمین ہے، جس زمین کی ملکیت کا ثبوت شرعی وسماجی ہمارے پاس موجود ہے، ہماری اس ۵۲؍ بیگہ والی رقبہ کی زمین میں سے تقریباً ۱۲؍ بیگہ زمین پر ایک مدرسہ کے ناظم نے زبردستی قبضہ کرلیا

ہے، جس زمین پر مدرسہ کی ایک عمارت بھی بنوالی ہے اور مابقیہ زمین کو کھیتی کے طور پر استعمال کرر ہا ہے، کئی بار پٹواریوں کو بلوا کر ہم نے ناپ کروائی؛ لیکن مدرسہ کا ناظم اور اس کے کچھ دبنگ ساتھیوں نے پٹواریوں کو گالی گلوج دے کر بھگا دیا، آخر کار ۲۳/۳/۲۰۱۱ء کو صحیح طور پر زمین کی پیائش کی گئی، تو پیائش کرنے والے پٹواری نے ہماری زمین کی حد بندی کی اور حد بندی میں مدرسہ کی پوری بلڈنگ سوائے برآمدہ کے ہماری زمین ثابت ہوئی اور اس سے پہلے بھی کئی بار اس بات کی وضاحت کی گئی اور گاؤں کے لوگوں نے بھی کئی بار مدرسہ کے ناظم سے کہا کہ آپ اس غریب کی زمین سے مدرسہ کا قبضہ ہٹالو؛ اس لئے کہ اس غریب کا ذریعۂ معاش کھیتی باڑی ہی ہے اور مدرسہ کے پاس مدرسہ کی نجی زمین بھی ہے، اس کے باوجود بھی ناظم اور اس کے حواری ہماری زمین سے اپنا قبضہ نہیں ہٹا رہے ہیں، ۱۹۹۴ء سے آج تک ہماری زمین پر زبردستی مدرسہ چلا رہے ہیں اور باقی بچی زمین پر کھیتی بھی کرر ہے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح زبردستی کسی کی زمین پر قبضہ کر کے مدرسہ قائم کرنا اور اس کا چلانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو زبردستی کسی کی زمین پر قبضہ کر کے مدرسہ قائم کرنے اور اس کے چلانے والے اور اس کی معاونت کرنے والے کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟

المستفتی: محمد راہو و راجا بنا حاجی محمد عاقل، عرف عقلو، ریتانی باڑمیر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: کسی کی زمین پر مالک زمین کی اجازت کے بغیر قبضہ کرنا جائز نہیں۔ اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ شخص غاصب ہے، جس کے بارے میں حدیث شریف میں بڑی سخت وعید آئی ہے؛ لہٰذا اگر حقیقت میں زمین راجہ اور راہو ہی کے نام ہے تو ناظم مدرسہ کو اس پر قبضہ کر کے مدرسہ چلانے کا حق نہیں ہے اور مالکان زمین کو مدرسہ منہدم کر کے اس زمین کو اپنے تصرف میں لینے کا حق ہے؛ لہٰذا ناظم مدرسہ وہ زمین مالک زمین کو واپس کردے اور جو زمین شرع کے مطابق مدرسہ کی ہے اسی پر مدرسہ چلائے، ورنہ قیامت کے روز سخت باز پرس ہوگی۔

عن سالم، عن أبيه، قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم: من أخذ شيئا من الأرض بغير حقه، خسف به يوم القيامة إلى سبع أرضين. (صحيح البخاري، كتاب بدء الخلق، باب ماجاء في سبع أرضين، النسخة الهندية ١/ ٤٥٣، رقم: ٣٠٩٢، ف: ٣١٩٦، صحيح مسلم، باب تحريم الظلم وغصب الأرض وغيرها، النسخة الهندية ٢/ ٣٢، بيت الأفكار، رقم: ١٦١٠)

لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي. (هندية، كتاب الحدود، فصل في التعزير، زكريا قديم ٢/ ١٦٧، جديد ٢/ ١٨١، قواعد الفقه أشرفي، ص: ١١٠، رقم: ٢٦٩، الدرمع الرد، زكريا ٦/ ١٠٦، كراچی ٤/ ٦١، البحر الرائق، زكريا ٥/ ٦٨، كوئٹه ٥/ ٤١)

ومن غصب أرضا، فغرس فيها أو بنى قيل له: اقلع البناء والغرس، وردها لقوله عليه السلام: ليس لعرق ظالم حق ...... فإن كانت الأرض تنقص بقلع ذلک فللمالک أن يضمن له قيمة البناء. (هداية، كتاب الغصب، أشرفي ٣/ ٣٧٩)

لا يجوز لأحد أن يتصرف في ملك غيره بلا إذنه، أو وكالة منه أو ولاية عليه، وإن فعل كان ضامنا. (شرح المجلة رستم باز، مكتبة اتحاد ١/ ٦١، رقم المادة: ٩٦) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۳۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۵/۴ھ

مغصوبہ زمین پر مدرسہ بنانا

سوال [۸۴۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مسلمان کی زمین پر غیر مسلم نے قبضہ کرکے مسلمانوں کے ہی ہاتھ فروخت

کردی، خریدنے والے مسلمان یہ جانتے ہیں کہ یہ زمین اس غیر مسلم کی نہیں اور نہ ہی اس اکیلے مسلمان کی ہے جو حیات ہے؛ بلکہ اس زمین پر دو مرحوم اشخاص کا حق ہے، جن کی وراثت ان دونوں کی بیواؤں کو پہنچتی ہے، خریدنے والے اشخاص اتنی قدرت بھی رکھتے ہیں کہ اگر چاہیں تو غیر مسلم سے ان دونوں بیواؤں کا حق دلواسکیں، مگر یہ اشخاص غیر مسلم کو پوری رقم دے کر اس جگہ دینی مدرسہ بنا رہے ہیں، کیا ایسی غاصبانہ جگہ میں تدریس کا سلسلہ جائز ہوگا؟ کیا بچے ایسی جگہ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، چنانچہ قرآن وحدیث کی روشنی میں مع دلیل مندرجہ سوالات کے جوابات دینے کی زحمت گوارہ کریں، ایسی جگہ جو غاصبانہ ہو اور بچوں کے والدین کو معلوم ہو کہ یہ جگہ غاصبانہ ہے، تعلیم حاصل کرانا درست ہوگا یا نہیں؟ یہ جانتے ہوئے کہ یہ جگہ غیر مسلم کی نہیں بلکہ کسی دیگر فرد کی ہے اور اس میں دو بیواؤں کا حصہ ہے اور بیواؤں پر ظلم ہو رہا ہے، یہ اشخاص شریعت حقہ کی نظر میں گناہ کے مرتکب ہونے کی صورت میں کس سزا کے لائق ہیں؟ کیا ایسے مدرسہ میں بیٹھ کر علماء تعلیم دے سکتے ہیں؟ مزید اس بات کی بھی تشریح فرما دیں کہ جو لوگ حقدار کا حق دلوانے پر قادر ہوں اور نہ دلوائیں، ان کے لئے حدیث میں کیا وعید ہے؟ اور اگر دلوا دیں تو کیا ثواب ہے ان لوگوں کے لئے؟

المستفتی: محمد عرفان گڑھی، سلیم پور، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ مذکورہ زمین اس غیر مسلم بائع کی نہیں ہے؛ بلکہ غصب کردہ ہے، ان کے لئے وہ زمین خریدنا جائز نہیں ہے، اس میں مسجد یا مدرسہ بنانا اور اس میں تعلیم جاری رکھنا اس وقت تک ممنوع ہوگا جب تک اصل مالک کو راضی نہ کرلیا جائے اور مشتری کے لئے ضروری ہے کہ وہ زمین اس کے حق داروں کو لوٹا دے اور اپنا حق بائع سے وصول کرے۔ حدیث شریف میں مظلوم کی مدد کرنے اور ظالم کو ظلم سے روکنے کی تاکید آئی ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۳/ ۱۱۱، جدید زکریا مطول ۱۰/ ۳۳۶، فتاوی محمودیہ ۶/ ۲۸۰، ۶/ ۲۱۷)

وقال هشام: أنا أكره الصلاة فيه حتى يطيب أربابه، وأكره شراء المتاع من أرض غصب، أو حوانيت غصب. (البحرالرائق، كتاب الغصب، کوئٹه ۸/ ۱۱۵، زکریا ۸/ ۲۰۹، هندية، زكريا ٥/ ١٤٢، جديد ٥/ ١٦٦)

الحرام ينتقل، فلو دخل بأمان وأخذ مال حربي بلا رضاه وأخرجه إلينا ملكه وصح بيعه لكن لا يطيب له ولا للمشتري منه. (الدرالمختار، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد قبيل مطلب البيع الفاسد لا يطيب له، ويطيب للمشتري منه، زكريا ٧/ ٣٠٠، کراچی ٥/ ٩٨)

وفي الشامية: ولا للمشتري منه فيكون بشرائه منه مسيئا؛ لأنه ملكه بكسب خبيث، وفي شرائه تقرير للخبث، ويؤمر بما كان يؤمر به البائع من رده -إلى قوله- إن لم يرده يكره للمسلمين شراؤه منه؛ لأنه ملك خبيث بمنزلة المشتري فاسدا إذا أراد بيع المشتري بعد القبض يكره شراءه منه. (شامي، مطلب البيع الفاسد لا يطيب له ويطيب للمشتري منه، زكريا ٧/ ٣٠٠، ٣٠١، کراچی ٥/ ٩٨)

عن سمرة بن جندب قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من وجد عين ماله عند رجل فهو أحق به، ويتبع البيع من باعه. (سنن أبي داؤد، باب في الرجل يجد عين ماله عند رجل، النسخة الهندية ٢/ ٤٩٨، دارالسلام رقم: ٣٥٣١، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٤، رقم: ٢٨٧٤)

فهو أحق به أي من غصب مال أحد أو سرق، ثم باعه من آخر، فصاحب المال إن وجده في يد المشتري أخذه، ويرجع المشتري على البائع. (حاشية مشكوة شريف ١/ ٢٥٥) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ربیع الاول ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۲۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/ ۳/ ۱۴۱۸ھ

پریس کرنے پر پریس بیچ کر رقم مدرسہ میں لگانا

سوال [۸۴۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ کے لڑکوں کے پاس بجلی کی پریس پکڑی گئی تو ذمہ دارانِ مدرسہ اس پریس کو بیچ کر اس کی رقم مدرسہ میں لگا سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد عزیز مدرسہ اشرف العلوم لکھیم پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوالِ مذکور میں طالب علم سے جو بجلی کی پریس پکڑی گئی اس کو فروخت کر کے اس کی رقم مدرسہ میں لگانا جائز نہیں ہے۔ اور جس کی پریس ہے اس کو واپس کرنا لازم ہے؛ البتہ مدرسہ کے طلبہ کو مدرسہ کی بجلی بلا اجازت استعمال کرنا ناجائز ہے؛ لہٰذا اس نے مدرسہ کی قانون شکنی کی ہے، تو زیادہ سے زیادہ جو اس نے مدرسہ کی بجلی خرچ کی ہے اس کا معاوضہ لیا جاسکتا ہے۔

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلک لما حرم الله مال المسلم على المسلم.

(مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

قال: وعلى الغاصب رد العين المغصوبة، معناه مادام قائما لقوله عليه السلام: على اليد ما أخذت حتى ترد، وقال عليه السلام: لا يحل لأحد أن يأخذ متاع أخيه لاعبا ولا جادا، فإن أخذه فليرد عليه. (هداية، كتاب الغصب، أشرفي ٣/ ٣٧٣) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ رصفر المظفر ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۰۵۱)

لیٹ فیس وصول کرنے کی شرعی حیثیت

سوال [۸۴۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: طالبات کے مدرسہ میں تعطیلات کے ختم ہوجانے کے بعد تاخیر سے حاضر ہونے پر مدرسہ والوں کا ان بچیوں سے لیٹ فیس لینا جائز ہے، اگر جائز ہے تو کتنی مقدار تک لے سکتے ہیں؟ اور اس کا مصرف کیا ہے؟ کیا کسی سے کم اور کسی سے زیادہ لینے کی گنجائش ہے؟

المستفتی: محمد یاسر، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: لیٹ فیس کے نام سے جو لیا جاتا ہے یہ تاخیر سے آنے کا جرمانہ ہے اور شرعاً اس طرح مالی جرمانہ لینا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر یہ انتظام کیا جائے کہ وقتی طور پر مالی جرمانہ ان سے وصول کرلیا جائے، تاکہ وہ آنے میں لیٹ نہ کریں اور سال کے آخر میں جس سے جتنا مالی جرمانہ لیا گیا ہے وہ ان کو واپس کردیا جائے تو گنجائش ہے، ورنہ جائز نہیں ہے۔

عند أبي يوسفؒ يجوز التعزير للسطان بأخذ المال، وعندهما وباقي الأئمة الثلاثة لا يجوز، كذا في فتح القدير، ومعني التعزير بأخذ المال على القول به: إمساك شيء من ماله عنده مدة لينزجر، ثم يعيده الحاكم إليه لا أن يأخذه الحاكم لنفسه، أو لبيت المال كما يتوهم الظلمة. (عالمگيري، كتاب الحدود، فصل في التعزير، زكريا قديم ٢/ ١٦٧، جديد ٢/ ١٨١، البحر الرائق، زكريا ٥/ ٦٨، كوئٹه ٥/ ٤١، الدرمع الرد، زكريا ٦/ ١٠٦، كراچى ٤/ ٦٠-٦١، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٧/ ٣٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴ محرم الحرام ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۱۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱/۵ھ

مدرسہ کے لئے غیر مسلموں کا چندہ لینا

سوال [۸۴۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مدرسہ کے لئے غیر مسلموں کا یعنی ہندوؤں کا چندہ لے سکتے ہیں یا نہیں؟ جواب سے نوازیں مہربانی ہوگی۔

المستفتی: محمد آفاق میاں سرائے

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفیق: اگر یہ احتمال نہ ہو کہ کل کو اہل اسلام پر احسان رکھیں گے اور نہ یہ احتمال ہو کہ اہل اسلام ان کے ممنون ہو کر ان کے مذہبی شعائر میں شرکت یا ان کی خاطر سے اپنے شعائر میں مداہنت کرنے لگیں گے، تو اس شرط سے قبول کر لینا جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۲/۶۶۴)

وأما الإسلام فليس من شرطه، فصح وقف الذمي بشرط كونه قربة عندنا وعندهم. (البحرالرائق، كتاب الوقف، كوئٹه ٥/ ٨٩، زكريا ٥/ ٣١٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٧/ ٣٢٢، هندية زكريا قديم ٢/ ٣٥٢، جديد ٢/ ٣٤٧، الدر مع الرد، زكريا ٦/ ٥٢٤، كراچی ٤/ ٣٤١)

وللمسلمين أن يقبلوا من الكافر إذا لم يكن في ذلک ضرر ديني، أو سياسي. (تفسير مراغی ٤/ ٧٤، بحواله محموديه ميرٹھ ٢٥/ ٤٨٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ شعبان المعظم ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۳۰۳)

ہندو کی رقم کارِ خیر میں لگانا

سوال [۸۴۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: کوئی جگہ ایسی ہے جہاں علم دین اٹھتا جارہا ہے اور لوگوں کو اس کی کچھ پرواہ نہیں، کوئی بھی امداد نہیں کرتا تو علم دین کو جاری کرنے کے لئے اور برقرار رکھنے کے لئے زکوۃ صدقات لے سکتے ہیں یا نہیں؟ اور پھر اس میں ہندو دس ہزار روپئے دینا چاہتے ہیں، تو کیا ہندو کی رقم چل سکتی ہے یا نہیں؟ کوئی صورت نکال کر تفصیلی جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد آفاق غفرلہ قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صدقات، زکات کی رقوم کا پہلے کسی فقیر کو مالک بنادیا جائے، پھر فقیر مدرسہ وغیرہ کو دے دے، تو اس طرح حیلہ تملیک کے ساتھ جائز ہوگا۔

کما فی الدرالمختار: ویشترط أن یکون الصرف تملیکا لا إباحة.

(الدر مع الرد، کتاب الزکوة، باب المصرف، زکریا ۳/ ۲۹۱، کراچی ۲/ ۳٤٤، مصري ۲/ ۸٥)

اور ہندو کی رقم میں اگر یہ احتمال نہ ہو کہ کل کو اہل اسلام پر احسان رکھیں گے اور نہ یہ احتمال ہو کہ اہل اسلام ان کے ممنون ہو کر ان کے مذہبی شعائر میں شرکت یا ان کی خاطر سے اپنے شعائر میں مداہنت کرنے لگیں گے تو اس شرط کے ساتھ قبول کر لینا جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۲/۶۶۴)

شرط وقف الذمي أن یکون قربة عندنا وعندهم، کالوقف علی الفقراء، أو علی مسجد القدس. (شامي، الوقف، مطلب قد یثبت الوقف بالضرورة، زکریا ٦/ ٥٢٤، کراچی ٤/ ٣٤١، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ٣٧/ ٣٢٢، هندیة زکریا قدیم ٢/ ٣٥٢، جدید ٢/ ٣٤٧)

وأما الإسلام فلیس من شرطه، فصح وقف الذمي بشرط کونه قربة عندنا وعندهم. (البحرالرائق، کتاب الوقف، زکریا ٥/ ٣١٦، کوئٹه ٥/ ١٨٩)

وللمسلمین أن یقبلوا من الکافر إذا لم یکن في ذلک ضرر دیني، أو سیاسي.

(تفسیر المراغی ٤/ ٧٤، بحواله محمودیه میرٹھ ٢٥/ ٤٨٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍شعبان المعظم ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۰۳/۲۳)

مدرسہ کی تعمیر میں سودی رقم یا کافر کا پیسہ لگانا

سوال [۸۴۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ خان العلوم دڑھیال کی رقومات بینک میں جمع کر کے حسب ضرورت نکال کر خرچ کی جاتی ہے، جمع شدہ رقومات پر سیونگ چالو کھاتہ میں حسب ضابطہ بینک سے سود ملتا ہے، اسی طرح اور فاضل رقم چھ مہینہ کی میعاد مدت کھاتے میں ڈال کر مذکورہ سود اور زیادہ ملتا ہے، اس وصول شدہ سود کو مدرسہ کی ضروریات پر صرف کر سکتے ہیں یا نہیں؟

فی الحال مدرسہ کی چہار دیواری باؤنڈری نہیں ہے، جس کی وجہ سے انتظامی اور حفاظتی پریشانیاں ہیں، خرچ زیادہ ہونے کی وجہ سے اصل رقم سے یہ کام ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے، وجہ ظاہر ہے کہ عموماً مدارس مسلسل مقروض ہورہے ہیں، اصل ضروریات کی تکمیل بھی نہیں ہو پاتی، اسی طرح بستی کا پانی جو مدرسہ سے متصلا گذرتا ہے نالہ خام ہونے کی وجہ سے مدرسہ میں داخل ہوتا رہتا ہے، اس نالے یا چہار دیواری پر بینک سے حاصل شدہ سود کی رقم خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

(۲) مدرسہ ہذا کا رجسٹریشن ۲۵؍سال قبل ہوا تھا، اس کے بعد تجدید نہ ہوسکی، اب اس کی تجدید پر بیس ہزار روپئے کام میں آنا چاہتے ہیں، اس طرح کہ دس ہزار روپیہ متعلقہ آفیسر لیتا ہے، آٹھ ہزار روپیہ تاخیر اور تجدید کی سرکاری فیس ہے، دو ہزار روپیہ کاغذات کی تیاری کے ہیں، کیا یہ رقم بینک کے سود کی رقم میں سے دی جاسکتی ہے؟

(۳) ایک غیر مسلم اپنے کسی اعتقاد یا کسی اور وجہ سے بنا کسی دباؤ کے مدرسہ کو کچھ رقم دینا چاہتا ہے، کیا اس رقم کو مطبخ یا تعمیر یا دیگر ضروریات مدرسہ پر خرچ کر سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد عثمان مفتاحی مدرسہ اسلامیہ خازن العلوم، دڑھیال، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سودی اور حرام پیسے کا شرعی حکم یہ ہے کہ کسی بھی

عنوان سے اصل مالک کو واپس کردیا جائے، جیسا کہ سیل ٹیکس، انکم ٹیکس کے ذریعہ سرکاری پیسہ سرکاری بینک میں واپس ہو جائے، اگر یہ شکل نہ ہوسکے تو نہایت مجبور اور محتاج فقیر کو بغیر نیت ثواب دے دیا جائے؛ لہٰذا مدرسہ کی جانب سے بینک میں جمع شدہ رقم پر جو سود حاصل ہوگا اس کو مدرسہ کی کسی ضرورت میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے؛ البتہ غریب طلبہ کو جوتا، چپل لے کر دے دیا جائے تو اس کی گنجائش ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مكتبه سهارنپور، قديم ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلاميه ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، هندية، زكريا قديم ۵/ ۵٤۹، جديد ۵/ ٤۰٤، البحرالرائق، زكريا ۹/ ۳٦۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱)

(۲) جو آٹھ ہزار روپیہ سرکاری فنڈ میں جمع ہوگا وہ سرکاری بینک کے سود کے پیسے سے دینا جائز ہے اور بقیہ چیزوں کے لئے سرکاری بینک کے سود کے پیسے سے دینا جائز نہیں ہے۔

وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه، ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مكتبه سهارنپور، قديم ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلاميه ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳٤/ ۲٤٦، الدر مع الرد، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچی ٦/ ۳۸۵، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ۲۷، زكريا ۷/ ٦۰)

(۳) اگر کوئی غیر مسلم اپنی خوشی سے مدرسہ کے لئے چندہ دینا چاہتا ہے اور کسی مضرت کا اندیشہ نہیں ہے، تو اس کو مدرسہ کی ضروریات میں چاہے تنخواہوں میں یا تعمیر میں یا مطبخ یا کسی بھی ضرورت میں خرچ کرنا جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ٦/ ۲۴۹، ڈابھیل ۱۵/ ٦۲۱)

اختلف الفقهاء في وقف الذمي على المسجد، فذهب الجمهور إلى

صحته لعموم أدلة الوقف. (الموسوعة الفقهية ۳۷/ ۳۲۲، عالمگری، زکریا قدیم ۲/ ۳۵۳، جدید ۲/ ۳۴۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ شوال ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۱۴۹/۳۷)

طوائف کی زمین پر مدرسہ تعمیر کرنا

سوال [۸۴۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: طوائف نے ایک زمین ثواب جان کر دی ہے، کیا اس زمین پر مدرسہ کی بنیاد قائم کرنا درست ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: طوائف کی دی ہوئی زمین پر مدرسہ قائم کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ مدرسہ ایک خالص دینی ادارہ ہے اور اس میں حرام کمائی لگانا جائز نہیں ہے۔

رجل اكتسب مالا من حرام، ثم اشترى، فهذا على خمسة أوجه: أما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولا، ثم اشترى منه بها أو اشترى قبل الدفع بها، ودفعها الخ. قال الكرخي في الوجه الأول والثاني: لا يطيب، وفي الثلاثة الأخيرة يطيب -إلى قوله- والفتوى الآن على قول الكرخي.

(شامی، کتاب البيوع، باب المتفرقات، مطلب إذا اكتسب حراما، ثم اشترى على خمسة أوجه، زكريا ۷/ ۴۹۰، كراچی ۵/ ۲۳۵، هندية زكريا قديم ۳/ ۲۱۵، جديد ۳/ ۲۰۱)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/۵/۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴۸۴/۲۹)

الفصل الخامس: في التصرف

کیا کسی مدرسے کا دو نام رکھنے سے وہ دو مدرسے ہوجائیں گے؟

سوالات ذیل کے جوابات درکار ہیں، جواب دینے کی زحمت فرمائیں۔

سوال [۸۴۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سیتاپور میں مدرسہ ملت نام کا ایک ادارہ ہے، جو تحفیظ القرآن اور عالمیت اور دینیات، اردو نیز ناظرہ قرآن پاک کے لئے قائم کیا گیا تھا، پہلے اس کی ذاتی عمارت نہیں تھی، ۱۲ر نومبر ۱۹۷۶ء کو میں نے ایک بوسیدہ عمارت مدرسہ ملت کے نام رجسٹری کرائی تھی، جس کو سنی سینٹرل آف یوپی بورڈ سے رجسٹرڈ کرالیا تھا، جس میں میرا نام بحیثیت ناظم درج ہے، چونکہ سیتاپور رسوماتِ بد کا مرکز تھا، دینی تعلیم کے لئے خاص کر مسلک دیوبند کے لئے اس کی فضاء مدرسہ کے حق میں نہیں تھی، بوجہ اضطرار (سرکار کے ہتھکنڈے) سے بچنے کی غرض سے ایک دوسرا ادارہ مدرسہ عربیہ ملیہ کے نام سے سرکار سے منظور کرالیا اس سے تنخواہوں کے لئے آسانی ہوگئی، امدادی تنخواہیں نام بنام مدرسین کے لئے آتی ہیں، اس کے علاوہ مدرسہ ملت کے بھی مدرسین ہیں، ان مدرسین کی تنخواہیں اور طلباء کا کھانا ہر ایک کے فرش، فروش، تعمیر بلڈنگ اور دیگر مصارف مسلمانوں سے ملنے والی رقومات سے پورے کئے جاتے ہیں، نیز حسب گنجائش ووظائف طلباء مدرسہ ملیہ کے پاس پیسہ اور بلڈنگ نہیں ہے، وہ مدرسہ ملت کے طلبہ کی تعلیم میں لگے ہوئے ہیں اور مدرسہ ملت کی آمدنی نہایت قلیل ہے، جس کی وجہ سے بحسن وخوبی کام نہیں چل پارہا ہے، اور بلڈنگ بھی کمزور ہے، اس کی مرمت کے لئے بھی رقم درکار ہے؛ اس لئے نیچی سطح کے ملازمین کے علاوہ کو بلا کر میں نے گزارش کی کہ جس طرح دوسرے مسلمانوں سے امداد ملتی ہے آپ لوگ بھی اسی طرح بلڈنگ کی مرمت کے لئے امداد کردیں اور آپ لوگ باقاعدہ مشورہ کرکے بتادیجئے؛ لیکن مثبت یا منفی جواب نہ ملنے پر میں نے بذریعہ تحریر مطالبہ کیا کہ آپ

لوگ بھی اپنی اپنی تنخواہوں میں سے پانچ پانچ دنوں کی تنخواہیں دے دیں، جب کہ آپ لوگ مدرسہ ملت سے کافی فائدہ اٹھاتے ہیں، اس کا بھی جواب نہیں ملا، میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے اجتماعی کاموں کے لئے یا اہل حاجت مسلمانوں کی ضرورتوں کے لئے گنجائش والے مسلمانوں پرزکوۃ کے علاوہ بھی دینا ضروری ہے۔حدیث پاک میں فرمایا ہے: ''إن في مال المرء لحق سوى الزكوة'' دینی اداروں کے لئے ایسے حضرات سے مطالبہ کرنا جو صاحب گنجائش ہیں اور مدرسہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں، یعنی بجلی، پانی، فرش فروش وغیرہ، یہ مطالبہ اگر درست ہے، تو مطالبہ کیا جائے ورنہ تو میں اپنی بات واپس لے لوں۔مدرسہ ملیہ عربیہ کے بعض مدرسین مدرسہ ملت کے لئے چندہ میں ہاتھ بٹاتے ہیں، ان علماء، حفاظ، مدرسین کو یہ بھی معلوم ہے کہ فقہ کا جزئیہ ہے کہ ''اگر زکوۃ سے مسلمانوں کی حوائج نہ پوری ہوں تو حسب ضرورت مسلمانوں سے رقم لی جاسکتی ہے''۔والسلام

المستفتی: سائل ولی محمد ناظم مدرسہ ملت

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: سوال نامہ میں صاف الفاظ میں اس کا ذکر ہے کہ دو مدرسے الگ الگ ہیں، ایک مدرسہ ملت ہے اور دوسرا مدرسہ ملیہ ہے۔اور سوال نامہ میں اس انداز سے اس کو واضح کیا گیا ہے کہ مدرسہ ملت الگ ادارہ ہے اور مدرسہ ملیہ مستقل دوسرا ادارہ ہے۔اور مدرسہ ملیہ کے نام حکومت سے ایڈ آتا ہے۔اور مدرسہ ملت کے نام ایڈ نہیں آتا ہے، مگر اس میں سوال یہ ہے کہ دونوں ادارے الگ الگ ہوں اور ان کی عمارتیں مدرسین وملازمین اور طلبہ الگ الگ ہوں چاہے ناظم اور ذمہ دار ایک ہی کیوں نہ ہوں، مگر مختلف انداز سے معلوم کرنے کے بعد یہ پتہ چلا کہ دو ادارے مستقل الگ الگ نہیں ہیں، جن کے لئے دو عمارتیں الگ الگ ہوں اور ان کے ملازمین ومدرسین بھی الگ الگ ہوں، ایسا نہیں ہے؛ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مدرسہ ملت کے نام سے اصل ادارہ ہے اور سارے ملازمین اسی میں کام کرتے ہیں، اور اسی عمارت پر وہی مدرسین وملازمین درس دیتے ہیں اور ایسا بھی نہیں ہے کہ مدرسہ ملت کے نام سے ایک وقت میں تعلیم ہوتی ہو اور مدرسہ ملیہ میں دوسرے وقت میں تعلیم

ہوتی ہوں؛ بلکہ شئ واحد ہے، الگ الگ دوشئ نہیں ہے؛ بلکہ مدرسہ ملت ہی کے لئے ذراسا املا بدل کر حکومت سے ایڈ حاصل کرنے کے لئے فرضی نام مدرسہ ملیہ کا غذات میں اندراج ہے، جس کے نام سے ایڈ آتا ہے، تو اس طرح محض نام بدلنے کی وجہ سے شرعی طور پر الگ الگ دو ادارے نہیں ہو جائیں گے؛ بلکہ یہ ایک ہی ادارہ کے دو نام ہیں، جیسا کہ دارالعلوم دیوبند کے دو نام ہیں: (۱) مدرسہ اسلامیہ اورالجامعۃ الاسلامیہ۔ اوراب مدرسہ اسلامیہ کا نام مستعمل نہیں ہے، صرف دارالعلوم دیوبند ہی مستعمل ہے، اسی طرح مدرسہ شاہی کے دو نام ہیں: (۱) مرکز العلوم الاسلامیہ (۲) جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی، آج بھی دونوں نام موجود ہیں، اسی طرح مدرسہ ملت کے دو نام ہیں: (۱) مدرسہ ملت (۲) مدرسہ ملیہ۔ ہاں البتہ اتنا ہے کہ ایڈ والے مدرسہ میں دو قسم کے ملازمین و مدرسین ہوتے ہیں: (۱) وہ مدرسین و ملازمین جن کے نام سے ایڈ آتا ہے (۲) وہ مدرسین وملازمین جن کے نام سے ایڈ منظور نہیں ہے، جن کی تنخواہیں عوامی چندہ سے پوری ہوتی ہیں، تو اتنے فرق کی وجہ سے نہ دو ادارے الگ الگ شمار ہوں گے اور نہ ہی ایڈ والے مدرسین وملازمین ایک مستقل ادارہ کے شمار ہوں گے اور غیر ایڈ مدرسین وملازمین دوسرے ادارہ کے شمار ہوں گے؛ بلکہ سب ایک ہی ادارہ کے مدرسین وملازمین شمار ہوں گے، جیسا کہ ہندوستان کے ایڈ والے تمام مدارس کی یہی صورت حال ہے، ورنہ ہر ایڈ والے مدرسہ میں دو مدرسے شمار کئے جاسکتے ہیں اور ایسا ہے نہیں، اور اگر بالفرض جیسا کہ سوال نامہ میں دو الگ الگ مدرسہ ہونے پر زور دیا گیا ہے، اگر واقعہ ایسا ہی ہے اور مدرسہ ملیہ کے تمام مدرسین وملازمین مدرسہ ملت میں کام کرتے ہیں اور مدرسہ ملیہ کے نام سے حکومت سے ایڈ لیتے ہیں، تو یہ دھوکہ اور فریب ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے اور نہ ہی سرکار کی طرف سے اس کی اجازت ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ مر على صبرة من طعام –إلى– ثم قال: من غش فليس منا. (سنن الترمذي، البيوع، باب ماجاء في كراهية الغش في البيوع، النسخة الهندية ١/ ٢٤٥، دارالسلام، رقم: ١٣١٥)

عن ابن عمر –رضی الله عنه– قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: إذا جمع الله الأولین والآخرین یوم القیامة یرفع لکل غادر لواء، فقیل هذه غدرة فلان بن فلان. (مسلم شریف، باب تحریم الغدر، النسخة الهندیة ۲/ ۸۳، بیت الأفکار، رقم: ۱۷۳۵، صحیح البخاري، باب إثم الغدر للبر والفاجر، النسخة الهندیة ۱/ ۴۵۲، رقم: ۳۰۸۴، ف: ۳۱۸۸)

سوال نامہ میں دوسری بات یہ پوچھی گئی ہے کہ مدرسہ کے وہ ملازمین جن کوسرکار سے ایڈ ملتا ہے،ان کی تنخواہوں کا ایک حصہ مدرسہ میں تعاون کے نام سے لینا جائز ہے یانہیں؟ چاہے وہ بطیب خاطر دینے کے لئے راضی نہ ہو، ذمہ دار مدرسہ تحریری طور پر دباؤ ڈال کر ان کی تنخواہوں کا ایک حصہ تعمیر مدرسہ کے نام سے لے سکتا ہے یانہیں؟ تو اس سلسلہ میں شرعی حکم یہ ہے کہ کسی کے مال اور ملکیت کو زور وزبردستی یا دباؤ ڈال کر حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔اور سوال نامہ میں جو حدیث شریف پیش کی گئی ہے، وہ نفلی صدقہ خیرات کے بارے میں ہے، جس کے حصول کے لئے دباؤ ڈالنا اور نہ دینے کی صورت میں تحریری طور پر مطالبہ کر کے زور ڈالنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ اور اس حدیث شریف میں صرف ترغیب مراد ہے جو دینا چاہے وہ دے اور جو نہ دینا چاہے اس پر زور ڈالنا جائز نہیں ہے۔

عن أبي هرة الرقاشي، عن عمه. أن رسول الله ﷺ قال: لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منه. (شعب الإیمان للبیهقي، باب في قبض الید عن الأموال المحرمة، دارالکتب العلمیة بیروت ٤/ ۳۸۷، رقم: ۵٤۹۲، مسند أحمد بن حنبل ۵/ ۷۲، رقم: ۲۰۹۷۱، مسند أبي یعلی الموصلي، دارالکتب العلمیة بیروت ۲/ ۹۱، رقم: ۱۵٦۷)

لا یجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعي. (هندیة، کتاب الحدود، فصل في التعزیر، زکریا قدیم ۲/ ۱٦۷، جدید ۲/ ۱۸۱، قواعد الفقه أشرفي دیوبند، ص: ۱۱۰، رقم: ۲٦۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵ رصفر المظفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۶۸۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۲/۵ھ

مسجد مدرسہ بنانے سے متعلق چندسوالات کے جوابات

سوال [۸۴۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: شہر امراوتی مہاراشٹر میں ایک علاقہ جو پانچ مسلم کالونیوں پر مشتمل ہے، پیراڈائز کے نام سے موسوم ہے۔ ۱۹۹۲ء میں جگہ خرید کرایک مدرسہ عربیہ کے نام سے عارضی عمارت کی شکل میں بنیاد رکھی گئی تب سے پنجوقتہ اذان ونماز کا عمل جاری ہے، ساتھ ہی دو وقت مقامی طلبہ وطالبات کے لئے دینی تعلیم کا انتظام ہے، فی الوقت رہائشی مکانات ۲۵۰ر سے کچھ زائد ہوگئے ہیں، مکانات کے تعمیری سلسلہ کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہے کہ مستقبل قریب میں مکانات کی کل تعداد ۴۰۰ر تک ہو جائے گی، ان کالونیوں میں اکثر سرکاری ملازمین وآفیسر اور چند تاجر اور کاروباری حضرات رہتے ہیں، بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر مسجد ومدرسہ سے منسلک SF 3500 کا پلاٹ خریدا گیا، اس طرح مسجد ومدرسہ کا کل رقبہ تقریباً: SF 11000 فٹ ہے، جس کے مشرقی سمت میں بڑی شاہراہ ہے اور ''حی علی الصلاۃ'' اور ''حی علی الفلاح'' کی طرف بھی راستے ہیں، صرف مسجد کے سمت قبلہ مکانات ہیں، مسجد ومدرسہ کالونیوں کے درمیان واقع ہے، مسجد ومدرسہ کی انتظامیہ مع مصلیان مسجد کی دلی خواہش ہے کہ اس وسیع آراضی میں از سرنو مسجد ومدرسہ کی پختہ تعمیر اس انداز سے کی جائے کہ مسجد ومدرسہ کا انتظام چلانے کے لئے مستقل آمدنی کی شکل بھی نکل آئے جو سردست احباب خیر کے ہر ماہ چندہ عطیات وغیرہ سے انجام پاتا ہے، اس لئے اکثر احباب کی رائے ہے کہ نئی تعمیر زیرزمین کے ساتھ ہو اور بیسمینٹ کا بڑا حصہ شادی خانہ اور دینی پروگرام کے استعمال کے لئے ہو، جس کے دونوں جانب کمروں کی تعمیر اس طرح ہو کہ طہارت خانہ بیت الخلاء وضو وغسل خانہ کا انتظام ہو، مصلیان مسجد کے لئے زیرزمین کے اوپری سطح پر بھی دونوں جانب طہارت خانہ، بیت الخلاء، وضو وغسل خانے علیحدہ تعمیر ہوں۔ اور کمروں کی بھی تعمیر ہو، جس میں سے مدرسہ کے کمروں کے علاوہ کمروں کو اسکول وکالج کے طلبہ کو کرائے پر دیا جائے، زیرزمین اور اوپری

سطح کے آمد وخروج کے گیٹ وراستے علیحدہ ہوں، تاکہ بدنظمی نہ ہو، انجینئر اور آرکیٹیکٹ کے پلان کے مطابق سرکاری وکارپوریشن کے قانونی ضابطے کے تحت راستوں سے لگ کر غیر تعمیر جگہ چھوڑنے پر اور کمروں کی تعمیری جگہ چھوڑ کر بھی مسجد کے لئے 4500 SF جگہ نماز کی ادائے گی کے لئے آسانی سے استعمال میں آسکتی ہے۔ درخواست ہے کہ اس مسئلہ کو مفصل ومدلل تحریر فرما کر ممنون فرمائیں۔

المستفتی: شریف الدین امام مسجد الصحابہ، نورنگر امراؤتی، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کے نام سے شروع کی بنیاد رکھی گئی ہے، اس کے بعد سلسلہ بڑھتا چلا گیا، معاون و چندہ دہندگان نے دینی مدرسہ ہی کے نام سے چندہ اور عطیات دئے اور دیتے رہے؛ اس لئے اصل عمارت دینی مدرسہ ہی کے لئے ہونا لازم ہے۔ اور زیر زمین جو پروگرام رکھا گیا ہے وہ بھی مدرسہ کے ہی مفاد کے لئے ہونا لازم ہے۔ اور مدرسہ کی عمارت میں اسکول وکالج کے طلبہ کا رہنا چاہے کرایہ پر ہی کیوں نہ ہو اس سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہے؛ اس لئے اسکول کالج کے طلبہ کو کرایہ پر دینے کے لئے مدرسہ کی عمارت تیار کرنا خود مدرسہ کو خطرہ میں ڈالنا ہے؛ اس وجہ سے یہ پروگرام دینی مصلحت کے خلاف ہے؛ لہٰذا دینی ہی مدرسہ کے طلبہ کے قیام کے لئے کمروں کی تعمیر ہونی چاہئے، ہاں البتہ مدرسہ کی آمدنی کے لئے شادی خانہ کی جو بات کہی گئی ہے وہ بھی ایک فتنہ ہے؛ اس لئے کہ شادی خانہ میں بھی مردوں کے ساتھ عورتوں کی آمد ورفت بھی کثرت سے رہتی ہے جو آگے چل کر طلبہ ومدرسین کے لئے فتنہ کا سبب بن سکتا ہے؛ البتہ جب تک طلبہ کے قیام کا نظم نہ ہو اس وقت تک شادی کے واسطے یومیہ کرایہ پر دیا جاسکتا ہے، مثلاً دن بھر تعلیم ہو اور شام کو کرایہ پر دے دیا جائے، پھر صبح وہیں تعلیم ہو، اس طرح سے شادی کا کام بھی ہوتا رہے گا، جس سے مدرسہ کا فائدہ بھی ہوگا اور دینی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہے گا، تو جائز ہوسکتا ہے۔ اور سائڈ میں جو غسل خانہ کی بات کہی گئی ہے، اسی طرح بیت الخلاء کی بات وہ درست ہے اور جو اوپر کے حصہ پر مسجد بنے گی اتنے حصہ پر مسجد بنانا

ضروری ہے، جتنے کے نیچے بیت الخلاء وغسل خانہ نہ آرہا ہو۔

لو تبين أن المستأجر يخاف منه على رقبة الوقف يفسخه القاضي، ويخرجه من يده. (شامي، كتاب الإجارة، باب فسخ الإجارة، مطلب فسق المستاجر ليس عذرا في الفسخ، زكريا ۹/ ۱۱۱، كراچی ٦/ ٨١، مطلب في الأرض المحتكرة ومعني الاستحكار، زكريا ۹/ ٤٤، كراچی ٦/ ٣٣، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٠٠)

وما يأتي متنا لا يفيد الجواز؛ لأن بيت الخلاء ليس من مصالحه. (تقريرات رافعي ملحق بالشامي زكريا ۲/ ۸۵، کراچی ۱/ ۸۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۸۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/ ۶/ ۱۴۲۶ھ

کیا مدرسہ کی موقوفہ چیزوں میں غرض واقف لازم ہے؟

سوال [۸۴۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ محمد تقی صاحب مرحوم نے ایک قطعہ مکان واضح ڈھکیہ پیر ضلع مرادآباد میں ۸۱ء میں ایک دینی مدرسہ کے لئے یہ کہہ کر کہ اس میں قرآن پاک کی تعلیم مسلمان بچوں کو دی جاتی رہے، تاکہ اس کا اجر وثواب مجھے ملتا رہے اور آخرت میں میرے کام آئے، وہ قطعہ مکان حافظ عبد الحمید کی تحویل میں دے کر اس میں دینی مدرسہ قائم کرا دیا، اس وقت سے اب تک برابر اس میں مدرسہ فرقانیہ لطیف العلوم کے نام سے جاری ہے، محمد تقی صاحب مرحوم کا فروری ۸۷ء میں انتقال ہوگیا۔ موصوف اس سلسلہ میں کوئی تحریر نہیں لکھ سکے، اب موصوف کے شرعی ورثاء ان کی اہلیہ قدسیہ بیگم اور ان کے لڑکے محمد اقبال تقی نے ایک تحریر اسی سلسلہ میں لکھ کر دی کہ ہمارے مورث محمد تقی مرحوم نے یہ مکان مدرسہ کو دے دیا تھا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ مرحوم کی طرف سے وقف علی الخیر سمجھا جائے گا یا نہیں؟ تفصیلی کاغذات ہم رشتہ ہیں، مطالعہ فرما کر جواب باالصواب سے نوازیں۔

المستفتی: حکیم محمد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: رجسٹری کاغذات اورسوال نامہ کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ محمد تقی صاحب مرحوم نے مذکورہ مکان خاص طور پر مدرسہ مذکورہ کی ملکیت میں دے دیا ہے؛ اس لئے شرعاً مذکورہ مکان مدرسہ کی ملکیت میں داخل ہو چکا ہے، اس میں مدرسہ مذکورہ کے مفاد کے خلاف کسی کو تصرف کا حق حاصل نہیں ہوسکتا ہے، نیز اس کی حفاظت کے لئے رجسٹریشن کرالینا بہتر ہوگا۔

ولو قال: وهبت داري للمسجد، أو أعطيتها له صح، ويكون تمليكا، فيشترط التسليم. (هندية، الوقف، الباب الحادي عشر في المسجد و ما يتعلق به، زكريا قديم ٢/ ٤٦٠، جديد ٢/ ٤١٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۷۶۶۸)

مدارس میں قائم کردہ انجمن کی تقسیم کا حکم

سوال [۸۴۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عرض یہ ہے کہ ضلع بستی سرکاری طور پر دوحصوں میں تقسیم ہوگیا ہے، تو دارالعلوم دیوبند میں ضلع بستی کے طلبہ کی قائم کردہ انجمن تہذیب الکلام کی تقسیم کا مسئلہ پیدا ہوگیا، ابھی ہم لوگ اس سلسلہ میں غور وخوض کر رہی رہے تھے کہ چند طلبۂ عزیز نے ایک استفتاء اوراس کا جواب پیش کر کے درخواست کی کہ اس کے مطابق معاملہ کا فیصلہ کیا جائے، یہ صورت نہایت مناسب ہے کہ فقہ اسلامی کے مطابق معاملہ کا تصفیہ کیا جائے؛ لیکن استفتاء اوراس کے جواب میں چند تنقیح طلب جواب ہیں اوراسی لئے یہ تحریر پیش خدمت ہے۔ استفتاء میں یہ بات ذکر میں نہیں آسکی کہ تمام انجمنوں کے دستور اساسی میں یہ وضاحت ہوتی ہے کہ اس انجمن سے فلاں

ضلع یا فلاں صوبہ یا فلاں مدرسہ کے طلبہ استفادہ کرسکیں گے، چنانچہ طلبہ بدلتے رہتے ہیں اور انجمن اپنی جگہ قائم رہتی ہے، اسی طرح کی انجمنوں کو اصطلاحی وقف تو نہیں کہا جاسکتا؛ کیوں کہ ان پر وقف کی تعریف صادق نہیں آتی؛ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ انجمن یا اس کی املاک سے افراد انجمن کا تعلق ذاتی ملکیت کی طرح کا نہیں ہوتا؛ بلکہ ان کا باہمی تعلق اس طرح ہوتا ہے جیسے وقف کی املاک سے موقوف علیہ کا ہوتا ہے؛ اس لئے اس انجمن کا قریب ترین مقیس علیہ وہ اوقاف ہیں جن کا موقوف علیہ کسی خطہ کے فقراء وغیرہ کو قرار دیا گیا ہو، چونکہ استفتاء میں یہ وضاحت نہیں تھی؛ اس لئے جواب فتویٰ میں ذاتی املاک والے جزئیات کو مقیس علیہ قرار دے کر حکم بیان فرمایا گیا ہے۔

(۲) مندرجہ بالا وضاحت کے بعد اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان ذاتی ومشترک املاک میں تو عند الطلب تقسیم ضروری ہوتی ہے؛ لیکن وقف یا وقف جیسی عوامی املاک میں بھی تقسیم ضروری ہے، مثلاً کسی شخص نے کوئی جائیداد وقف کی اور اس میں تصریح کی کہ یہ فلاں ضلع کے طلبہ یا فقراء یا یتیموں کے لئے ہے، پھر وہ ضلع دو حصوں میں تقسیم ہوگیا تو کیا اس وقف کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ضروری ہوگا؟

(۳) یا مثلاً واقف نے تصریح کی کہ یہ جائیداد فلاں مدرسہ کے لئے ہے، پھر وہ مدرسہ دو حصوں میں اس طرح تقسیم ہوگیا کہ ایک حصہ تو سابقہ نام سے قائم رہا اور دوسرا حصہ نئے نام سے موسوم ہوا، تو کیا اس وقف کو تقسیم کرنا ضروری ہوگا؟

(ب) اگر تقسیم کرنا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ صرف جائز ہے یا جائز بھی نہیں ہے، تو کیا یہ صورت اختیار کرنا جائز ہوگا کہ وہ انجمن صرف انہیں طلبہ کے لئے خاص کردی جائے جو ضلع کی تقسیم کے بعد بھی سابقہ نام سے منسوب ہیں اور نو تشکیل شدہ ضلع کے طلبہ کی زیادہ سے زیادہ مدد کرکے ان کے لئے دوسری انجمن قائم کرادی جائے؟

المستفتی: حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب بستوی، مدرس دار العلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مدارس میں طلبہ کی انجمنوں کی حیثیت شرعاً وقف کی ہے،

اگرچہ اموال منقولہ میں امام ابو یوسف ومحمد رحمہما اللہ کے درمیان اختلاف ہے؛ لیکن تمام متأخرین نے حضرت امام محمد رحمہ اللہ کے قول پرفتویٰ دیا ہے اور یہی مفتی بہ ہے، اسی پر امت کا عمل ہے؛ لہٰذا اسے وقف نہ کہنا درست نہیں ہے، نیز کتابیں ورقوم وغیرہ سب وقف ہیں، اس کے لئے چند عبارتیں معتبر کتب فقہ سے پیش کی جاتی ہیں:

(۱) صح أيضا وقف كل منقول قصدا فيه تعامل للناس كفأس وقدوم بل ودراهم ودنانير، وفي الشامية: ولما جرى التعامل في زماننا في البلاد الرومية وغيرها في وقف الدراهم والدنانير دخلت تحت قول محمد المفتى به في وقف كل منقول فيه تعامل الخ. (الدرالمختار مع الشامي، الوقف، مطلب في وقف المنقول قصدا، زكريا ٦/ ٥٥٥، كراچی ٤/ ٣٦٣، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٣٧، وعلى هامش الهندية قديم ٦/ ٢٥٩، البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ٢٠٣، زكريا ٥/ ٣٣٨، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٥٨٠، مصري قديم ١/ ٧٤٦)

(۲) وجوز الفقيه أبو الليث وقف الكتب وعليه الفتوى. (البحرالرائق، كتاب الوقف، كوئٹه ٥/ ٢٠٢، زكريا ٥/ ٣٣٨، قاضيخان زكريا جديد ٣/ ٢١٨، وعلى هامش الهندية ٣/ ٣١١، هندية زكريا قديم ٢/ ٣٦١، جديد ٢/ ٣٥٢، البناية قديم ٢/ ٩٩٥، أشرفيه ٧/ ٤٤٠)

(۳) ومحمد يقول القياس قد يترك بالتعامل كما في الاستصناع وقد وجد التعامل في هذه الأشياء، وعن نصير بن يحيى أنه وقف كتبه إلحاقا بالمصحف، وهذا صحيح؛ لأن كل واحد يمسك للدين تعليما وتعلما وقراءة، وأكثر فقهاء الأمصار على قول محمد. الخ (هداية، كتاب الوقف، أشرفي ٢/ ٦٤٠، البناية، قديم ٢/ ٩٩٥، أشرفيه جديد ٧/ ٤٤٠، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٣/ ٣٢٧، زكريا ٤/ ٢٦٥، بزازية، زكريا جديد ٣/ ١٣٧، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٥٩، البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ٢٠٢، زكريا ٥/ ٣٣٨)

(٤) وإن على طلبة العلم وجعل مقرها في خزانته التي في مكان

كـذا، فـفـي جواز النقل تردد. (وفي الشامية:) **ظاهره صحة الوقف عليهم؛ لأن الـغـالـب فيهـم الـفـقـر -إلى قوله- وقد يقال: إن هذا مما يستوى في الانتفاع به الغني والفقير. الخ** (الدرالمختار مع الشامي، الوقف، مطلب في حكم الوقف على طلبة العلم، زكريا ٦/ ٥٥٨- ٥٥٩، كراچی ٤/ ٣٦٦، منحة الخالق على البحر الرائق، کوئٹه ٥/ ٢٠٢، زكريا ٥/ ٣٣٨)

(٥) **الـوقف عـلـى ثلاثة أوجه: إما للفقراء أو للأغنياء، ثم الفقراء أو يستوى فيه الفريقان، كرباط وخان ومقابر وسقايات، وقناطر ونحو ذلک، كـمسـاجـد وطواحين وطست لاحتياج الكل لذلک، وفي الشامية: وكذا مصاحف مساجد وكتب مدارس. الخ** (الدرالمختار مع الشامي، الوقف، مطلب في وقف الراهن والمريض والمديون، زكريا ٦/ ٦٠٣، كراچی ٤/ ٣٩٩)

جب مذکورہ عبارات سے انجمن کی کتب ورقوم کا موقوفہ ہونا ثابت ہوگیا ہے، تو ضلع بستی کی قدیم حدود دائرہ کے اندر رہنے والے تمام طلبہ مذکورہ وقف میں شامل ہوں گے، اوران سب کے لئے انتفاع کا حق مذکورہ انجمن کے ساتھ برابر طریقہ سے منسلک ہوگا، چاہے شہر بستی کے رہنے والے ہوں یا خلیل آباد کے یا سدھارتھ نگر کے یا مذکورہ ضلع کے کسی گاؤں یا دیہات کے رہنے والے ہوں، سب برابر کے حق دار ہوں گے، اوراب سرکاری طور پر تقسیم کی صورت میں بھی قدیم حدود کے تمام طلبہ کو انتفاع کا حق یکساں طور پر باقی رہے گا؛ لہٰذا ضلع کی حدود تقسیم ہونے کی وجہ سے ان کا ثابت شدہ حق باطل نہیں ہوگا، اگرچہ نام دوسرا رکھ دیا گیا، نفس نام کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ اغراض ومقاصد کا اثر ہوا کرتا ہے؛ لہٰذا ضلع کی حدود دو حصوں میں تقسیم ہو جانے پر دوسرے حصہ کا نیا نام رکھ دینے کی وجہ سے اس حصہ کے طلبہ اپنے حق سے محروم نہیں ہوں گے، اس لئے ضلع تقسیم ہو جانے کی وجہ سے اگر موقوفہ انجمن کا تقسیم ہونا مجبوراً لازم آجائے تو برابر طریقہ سے تقسیم کر دینا ضروری ہوگا اور حدود ضلع کے کسی ایک حصہ کے طلبہ کو دوسرے حصہ پر محض نام کے بدل جانے کی وجہ سے کوئی فضیلت وترجیح حاصل

نہیں ہوگی، جیسا کہ بزازیہ، شامی و بحر و عالمگیری کی عبارات ذیل سے وضاحت ہوتی ہے:

(۱) **إذا وقف كتبا وعين موضعها، فإن وقفها على أهل ذلك الموضع لم يجز نقلها منه لا لهم ولا لغيرهم، وظاهره أنه لا يحل لغير هم الانتفاع بها، وإن وقفها على طلبة العلم، فلكل طالب الانتفاع بها فى محلها. الخ** (شامي، الوقف، مطلب في نقل كتب الوقف من محلها، زكريا ٦/ ٥٥٩، كراچی ٤/ ٣٦٦)

(۲) **إذا وقف على طلبة علم بلدة كذا يجوز؛ لأن الفقر غالب فيهم، فكان الاسم منبئا عن الحاجة، والحاصل أنه متى ذكر مصرفا فيه نص على الفقراء والحاجة، فالوقف صحيح يحصون أم لا.** (البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ١٩٩، زكريا ٥/ ٣٣٢)

(۳) **وقف على فقراء أقربائهم المقيمين في خوارزم، فانتقلوا إلى بلد آخر، إن كان مما يحصون لا تنقطع وظيفتهم، وإن لا يحصون تنقطع، ثم إن بقي هناك منهم أحد يصرف الكل إليه، وإن لم يكن صرف الكل إلى الفقراء، فلو رجعوا إلى خوارزم ثانيا يعود حقهم، وقال في الفتاوى: لا ينقطع حقهم مطلقا. الخ** (فتاوى بزازية، الوقف، الفصل السادس في الوقف على الفقراء، زكريا جديد ٣/ ١٤٩، وعلى هامش الهندية ٦/ ٢٧٨)

(٤) **ولو قال لقرابتي، وجيراني، وموالي، والمساكين يضرب كل واحد من القرابة، وكل واحد من الجيران، وكل واحد من الموالي بسهم، والمساكين بأسرهم بسهم، كذا فى خزانة المفتين، ولو قال لقرابتي، وللمساكين، ضرب كل واحد من القرابة بسهم والمساكين بسهم. الخ** (فتاوى عالمگيرى، الباب الخامس، في ولاية الوقف، فصل في كيفية قسمة الغلة، زكريا قديم ٢/ ٤٢٨، ٤٢٩، جديد ٢/ ٣٩٢)

(۲) جی ہاں دو حصوں میں تقسیم کرنا واجب ہوگا، جیسا کہ عالمگیری کی عبارت نمبر ۴ سے

واضح ہوتا ہے، نیز وقف علی الاولاد کا بھی یہی حکم ہے، جس کی تفصیل اپنی جگہ موجود ہے۔

(۳) اگر بغیر نفسانیت کے اضطراری طور پر مدرسہ کی تقسیم دو حصوں میں ہو جائے اور نام بھی دو ہو جائیں، تو موقوفہ املاک بھی دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گی، جیسا کہ عالمگیری کی عبارت سے واضح ہوتا ہے، لیکن اشخاص کا تقسیم ہو جانا املاک کی تقسیم کو مستلزم نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ دارالعلوم وجامع مسجد دیوبند کا واقعہ ہے، نوتشکیل شدہ ضلع کے طلبہ کی زیادہ سے زیادہ مدد کر کے دوسری انجمن قائم کر دینے سے ان طلبہ کا حق قدیم انجمن سے ساقط نہیں ہوگا؛ کیوں کہ غرض واقف کے تحت سب طلبہ داخل ہیں، جس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے۔ اور موقوفہ انجمن کے ساتھ طلبہ کے جو حقوق منسلک ہیں وہ حقوق مجردہ میں سے ہیں، اس کا عوض دینا شرعاً درست نہیں ہے۔

إن مراعاة غرض الواقفين واجبة. الخ (شامي، الوقف، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة، زكريا ٦/ ٦٦٥، كراچی ٤/ ٤٤٥)

الحقوق المجردة لا يجوز الاعتياض عنها، ومثالها: كحق الشفعة، فلو صالح عنه بمال بطلت ورجع به، ولو صالح المخيرة بمال لتختاره بطل ولا شيء لها، ولو صالح إحدى زوجتيه بمال تترك نوبتها لم يلزم ولا شيء لها. الخ (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ٧٧-٧٨، رقم: ١١٨)

الحق متى ثبت لا يبطل بالتأخير ولا بالكتمان. (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ٧٧، رقم: ١١٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ ؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۲۷۸)

چندہ کے پیسے سے بنی ہوئی عمارت میں اراکین مدرسہ کا کتبہ لگانا

سوال [۸۴۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک زمین جس میں اس وقت مدرسہ قائم ہے، یہ اپنی گھونگھر وسوسائٹی کی ملکیت تھی، پھر

کام ٹھپ ہوجانے کی وجہ سے اس زمین کے خریدار بتیس آدمی ہوگئے، اور اب بتیس کی ملکیت ہے، جس میں مدرسہ سراج العلوم گڑھی مان خان جلیسر قائم ہے اور مدرسہ کا پچھلا حصہ گھونگھر وسوسائٹی کا ہی بنا ہوا ہے اور اب جو آگے کا حصہ برآمدہ تیار کیا گیا ہے، اس میں محلّہ کا چندہ اور شہر کا چندہ اور دیگر مختلف شہروں کے چندے سے تیار کیا گیا، اس حصہ میں مدرسہ کے اراکین کے نام کا پتھر لگنا کیسا ہے؟ جب کہ اب تک مدرسہ کے صدر گیٹ پر گھونگھرو کمیٹی کے نام کا پتھر بھی موجود ہے، مدرسہ کی زمین کی ملکیت گھونگھر وسوسائٹی کی ہے، ایسی حالت میں ان اراکین کمیٹی کے نام کا پتھر لگنا کیا ضروری تھا؟ وہ نام حسب ذیل ہیں:

عہدیداران	
صدر مدرسہ	عبدالرشید صاحب عرف گوپ
نائب	عبدالستار صاحب چھوٹے
سکریٹری	محمد حسن صاحب
خازن	جمال الدین صاحب
نائب	عبدالرشید صاحب
//	عبدالجبار صاحب

ممبران کمیٹی: محمد خلیل، محمد ہارون، باب الدین، عبدالحسیب، محمد مشتاق، عبدالعزیز، محمد حنیف، عبدالغفار۔ اس کا جواب مدلل ومفصل دینے کی زحمت گوارہ کریں، عین کرم ہوگا۔

المستفتی: صابر حسین عباسی، محلّہ گھڑی مان خان، جلیسر ٹاؤن، ضلع ایٹہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب اراکین وممبران مدرسہ کی ذاتی رقم سے مدرسہ کا مذکورہ حصہ نہیں بنایا گیا ہے؛ بلکہ عوامی چندے سے بنایا گیا ہے، تو اس حصہ کے پتھروں میں اراکین مدرسہ کے نام درج کردینا اور اراکین مدرسہ کی طرف منسوب کردینا ناجائز اور حرام ہے، سب اراکین مدرسہ سخت گنہگار رہوں گے۔ حدیث شریف میں ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم بتلایا گیا ہے:

عن أبي ذر –رضي الله عنه– أنه سمع رسول الله ﷺ يقول: ......

ومن ادعى ما ليس له، فليس منا، وليتبوأ مقعده من النار. (صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان حال إيمان من رغب عن أبيه وهو يعلم، النسخة الهندية ۱/ ۵۷، بيت الأفكار، رقم: ٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ / جمادی الثانیہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۲۸۸)

جلسہ کی بچی ہوئی رقم کا مصرف

سوال [۸۴۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: علاقائی جمعیۃ علماء کے تحت کرائے گئے جلسہ کے مصارف سے بچی ہوئی جلسہ کی مد کیا مدرسہ میں اس کا منتظم اپنی صوابدید پر خرچ کرسکتا ہے یا نہیں؟ جب کہ جلسہ میں اگر رقم کم پڑتی تو مدرسہ کی مد سے پوری کی جاتی، ویسے بھی جمعیۃ کی لائبریری کے لئے کتب وغیرہ کی فراہمی مدرسہ سے کی جاتی ہے، چونکہ دونوں کا انتظام تقریباً مشترک ہے۔

المستفتی: حمید الرحمٰن، ساکن رسول پور، پوسٹ امیر نگر، ضلع کھیری لکھیم پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ بچی ہوئی رقم چندہ دہندگان کی اجازت سے مدرسہ میں خرچ کرسکتے ہیں، جمعیۃ کی لائبریری کے کتب کی فراہمی مدرسہ کی مد سے درست نہیں ہے، الا یہ کہ چندہ دہندگان کو یہ معلوم ہو کہ دونوں کا انتظام اسی چندہ سے ہوگا تب جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/ ۲۷۹، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۱۶۷، فتاوی رحیمیہ قدیم ۸/ ۲۶۶، جدید زکریا ۹/ ۸۸، امداد الفتاوی ۲/ ۵۹۳، امداد المفتیین / ۷۷۹)

أن الفتوى على أن المسجد لا يعود ميراثا، ولا يجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد آخر. (شامي، مطلب فيما لو خرب المسجد أو غيره، زكريا ٦/ ٥٤٩، كراچی ٤/ ٣٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ رجب ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۳۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/ ۷/ ۱۴۲۲ھ

طلبہ سے لی گئی قیمت طعام کو مدرسہ کی تعمیر میں لگانا

سوال [۸۴۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ میں کچھ امراء کے بچے تعلیم حاصل کررہے ہیں، وہ اپنے طعام پر مدرسہ کی طرف سے مقرر رقمیں جمع کرتے ہیں، کیا ان رقوم کو مدرسہ کی تعمیر پر خرچ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: بشیر احمد قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں ان کی طرف سے جمع شدہ رقم مدرسہ کی تعمیر اور تنخواہ وغیرہ میں صرف کرسکتے ہیں؛ کیوں کہ وہ زکوۃ نہیں ہوئی۔

فيجوز لو بأمره، أي يجوز عن الزكاة على أنه تمليك منه، والدائن يقبضه لحكم النيابة عنه، ثم يصير قابضا لنفسه. (شامي، كتاب الزكاة، باب المصرف، زكريا ٣/ ٢٩٢، كراچى ٢/ ٣٤٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/۱۲/۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۲۵۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳/۱۲/۱۴۱۵ھ

مدرسہ کی رقم سے امام ومؤذن کو وظیفہ دینے کا حکم

سوال [۸۴۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا مدرسہ کی رقم سے مسجد کی امامت ومؤذنی کا وظیفہ دے سکتے ہیں؟

المستفتی: نسیم احمد چلہ امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مسجد مدرسہ کے تابع ہے اور مدرسہ کے مختلف شعبۂ

اخراجات میں سے ایک شعبہ مسجد بھی ہے،تو مدرسہ کی رقم سے امام ومؤذن کا وظیفہ جائز ہے۔ اوراگر تابع نہیں ہےتو جائز نہیں ہے۔

التابع تابع. (الأشباه، قديم: ١٨٣) **تابع اپنے لوازمات کے ساتھ تابع ہوتا ہے۔**

اتحد الواقف والجهة، وقل مرسوم بعض الموقوف عليه بسبب خراب وقف أحدهما جاز للحاكم أن يصرف من فاضل الوقف الآخر عليه؛ لأنهما حينئذ كشيء واحد. (تنوير الأبصار مع الدر المختار، كتاب الوقف، مطلب في انقاض المسجد ونحوه، كراچی ٤/ ٣٦٠، زكريا ٦/ ٥٥١، وكذا في البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ٢١٦، زكريا ٥/ ٣٦٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۸/۲/۱۴۱۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر:۲۹/ ۳۳۳۶)	۲۸/۲/۱۴۱۴ھ

انجمن کی رقم سے سرپرست انجمن کو ہدیہ دینا

سوال [۸۴۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کسی مدرسہ میں مختلف انجمنیں قائم ہیں اوران کے اراکین اورسرپرست بھی ہیں اور سال کے آخر میں جہاں ہم طلبہ کی بذریعہ انعام حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، وہیں سرپرست انجمن کی کافی محنت ہم طلبہ پر ہوتی ہے،تو کیا اراکین انجمن کی جانب سے سرپرست صاحب کو انجمن کی رقم سے بطور ہدیہ کے کچھ انعام مثلاً کتاب وغیرہ دینا چاہیں تو کیا دینا جائز ہے؟

المستفتی: محمد مظفر گڈاوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: انجمن کے بارے میں جتنے بھی امور عمل میں لائے جائیں وہ سارے کے سارے مدرسہ کے کسی بڑے مربی قسم کے استاذ کی ماتحتی میں ان ہی کے مشورہ سے عمل میں لائے جائیں۔اورسوال نامہ میں جن جن چیزوں سے متعلق سوال کیا

گیا ہے وہ سارے کام اس طرح کے اہم اساتذہ کی نگرانی اوران کے مشورہ اوران کے حکم کے مطابق عمل میں لانا چاہئے، اگر ہدیہ اورانعام کی بات آتی ہے،تو وہ بھی ان کے مشورہ کے بغیر عمل میں نہ لائی جائے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوْا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ وَاُوْلِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ.

[سورة النساء، آيت: ٥٩]

وقال ابن كيسان: هم أولو العقل والرائ الذين يدبرون أمر الناس.

(قرطبي، دارالكتب العلمية بيروت ٥/ ١٦٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍رجب ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۷۶۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۸/۵ھ

اسکول کے درجہ پنجم کے امتحان کا خرچ مدرسہ سے لینا

سوال [۸۴۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: درجہ پنجم کے امتحان کا خرچ جونیر میں داخلہ لینے کے لئے مدرسہ سے لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ربیع الاسلام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ عربیہ میں دینی امداد یا مال زکوۃ تملیک شدہ ہوتو اس مال سے جائز نہیں؛ کیوں کہ جونیر یونیورسٹی وغیرہ میں دینی چندہ دینا بھی جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۲/۴۷)

ويشترط أن يكون الصرف تمليكا، لا إباحة. (شامي، كتاب الزكوة، باب المصرف، زكريا ٣/ ٢٩١، كراچی ٢/ ٣٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۳۸۵)

مدرسہ کی رقم سے متعلقین کو ہدیہ دینے کا حکم

سوال [۸۴۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ کی رقم سے دوست احباب کو ہدیہ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: نبی حسن خادم دارالعلوم، ارریہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کی رقم اپنی ذاتی ملکیت نہیں ہے، ہدیہ تحفہ اپنی ذاتی ملکیت سے دیا جاتا ہے، ہاں البتہ جن حضرات کو مدرسہ کے مفاد کی غرض سے مدرسہ میں جلسہ جلوس یا امتحانات میں بلایا جاتا ہے، ان کو واپسی میں منجانب مدرسہ کچھ تحفہ ونذرانہ پیش کر دیا جائے، تو اس کی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ یہ ہدیہ تحفہ مدرسہ کا خرچ ہے، مگر دوستانہ طور پر دوست احباب کو دینا جائز نہیں، مدرسہ کی مالیات محتاط طریقہ سے خرچ کرنے میں ذمہ دارانِ مدرسہ ایک قسم کے امین کے درجہ میں ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۶/ ۷۸)

وليس للمودع حق التصرف والاسترباح في الوديعة. (المبسوط، كتاب الوديعة، دارالكتب العلمية بيروت ١١/ ١٢٢)

الثامنة في وقف المسجد أيجوز أن يبنى من غلته منارة؟ قال في الخانية: معزيا إلى أبي بكر البلخي إن كان ذلك من مصلحة المسجد بأن كان أسمع لهم فلا بأس به. (البحرالرائق، كتاب الوقف، كوئٹه ٥/ ٢١٥، زكريا ٥/ ٣٦٠)

ويبدأ من غلته بعمارته، ثم ما هو أقرب لعمارته ...... كذلك إلى آخر المصالح. (الدر مع الرد، الوقف، مطلب يبدأ من غلة الوقف بعمارته، زكريا ٦/ ٥٥٩-٥٦١، كراچی ٤/ ٣٦٦-٣٦٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ صفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۷۲۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۲/۱۸ھ

مدرسے کے فنڈ سے مہمان نوازی کرنا

سوال [۸۴۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا مدرسہ کے فنڈ سے مہتمم ضیافت کرسکتا ہے، چاہے ضیف سید ہو، تاجر ہو، عامی ہو، غیر عامی ہو، غریب ہو؟

المستفتی: عبداللہ عاصی، جامعہ اسلامیہ دارالعلوم قاضی باغ کاشی پور، اودھم سنگھ نگر، یوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مدرسہ کو نفع کی توقع ہو اور چندہ دہندگان کی طرف سے صراحتاً یا دلالۃً اجازت اور رضامندی ہو، تو مہمانوں کی ضیافت مدرسہ کی جانب سے کرنا درست ہے، یا مدرسہ میں باضابطہ ضیافت کا الگ سے فنڈ ہو، تو اس فنڈ سے کرنا درست ہے، ورنہ ذمہ دار اپنی جیب سے خرچ کرے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۶/ ۷۸، جدید زکریا ۹/ ۹۶)

شرط الواقف كنص الشارع في وجوب العمل به، وفي المفهوم والدلالة. (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ۸۵، رقم: ۱۵۲)

الثامنة في وقف المسجد أيجوز أن يبنى من غلته منارة؟ قال في الخانية: معزيا إلى أبي بكر البلخي إن كان ذلک من مصلحة المسجد بأن كان أسمع لهم فلا بأس به. (البحرالرائق، كتاب الوقف، كوئٹه ۵/ ۲۱۵، زكريا ۵/ ۳۶۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح:	کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ	۱۴۲۱/۳/۲ھ
۱۴۲۱/۳/۲ھ	(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۵۱۵)

مدرسہ کی رقم سے چائے، بسکٹ اور مہمانوں کی ضیافت

سوال [۸۴۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: (۱) مدرسہ کی رقوم سے، چائے، بسکٹ، پان وغیرہ کھانا اور کھلانا درست ہے یانہیں؟
(۲) کسی مہمان کی مہمان داری مدرسہ کی رقوم سے جائز ہوگی یانہیں؟
المستفتی: بندہ محمد عبداللطیف عفی عنہ، خادم مدرسہ مرکز العلوم، ڈاکخانہ بھیگا پور، ضلع کریم گنج، آسام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) غالب یہ ہے کہ چندہ دہندگان کی طرف سے اس کی اجازت نہیں ہوتی ہے؛ اس لئے اپنے پاس سے خرچ کرنا لازم ہے۔
(۲) مخصوص مہمان جس کی ذات سے مدرسہ کو معتد بہ نفع کی توقع ہو تو درست ہے، ورنہ مہتمم واہل شوریٰ اپنے پاس سے خرچ کریں۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ ۶/۸۷، جدید زکریا ۹/۹۶)

صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة. (شامي، الوقف، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة، زكريا ٦/ ٦٦٥، كراچى ٤/ ٤٤٥)

شرط الواقف كنص الشارع في وجوب العمل به، وفي المهوم والدلالة. (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ٨٥، رقم: ١٥٢)

الثامنة في وقف المسجد أيجوز أن يبنى من غلته منارة؟ قال في الخانية: معزيا إلى أبي بكر البلخي إن كان ذلک من مصلحة المسجد بأن كان أسمع لهم فلا بأس به. (البحرالرائق، كتاب الوقف، كوئٹه ٥/ ٢١٥، زكريا ٥/ ٣٦٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰ر شوال ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۲۶۹)

مدرسہ کی رقم سے تقریب میں گیٹ وغیرہ کی سجاوٹ

سوال [۸۴۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسی تقریب میں مدرسہ کی رقوم سے گیٹ وغیرہ کی سجاوٹ درست ہے یانہیں؟
المستفتی: بندہ عبداللطیف عفی عنہ، خادم مدرسہ مرکز العلوم، ڈاکخانہ بھیگا پور، ضلع کریم گنج، آسام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کی رقوم سے استحکام جائز ہے، تزئین ناجائز ہے، ہاں اگر مدرسہ کو معتد بہ اور بین نفع کا یقین ہے تو گنجائش ہے، محض احتمال نفع کی صورت میں اپنے پاس سے گیٹ وغیرہ کا خرچ ادا کریں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۲/۵۳۲)

الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل، وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إليه غيره. (شامي، كتاب الزكوة، زكريا ٣/ ١٨٩، كراچی ٢/ ٢٦٩)

الثامنة في وقف المسجد أيجوز أن يبنى من غلته منارة؟ قال في الخانية: معزيا إلى أبي بكر البلخي إن كان ذلك من مصلحة المسجد بأن كان أسمع لهم فلا بأس به. (البحرالرائق، كتاب الوقف، کوئٹہ ٥/ ٢١٥، زكريا ٥/ ٣٦٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰ر شوال ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۲۶۹)

مدرسے کی زمین میں اساتذہ وطلبہ کے لئے مسجد بنانا

سوال [۸۴۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مدرسہ ہے، جس میں کوئی زمین مستقل مسجد کے لئے نہیں ہے، تو محض مدرسہ کی زمین میں طلبہ واساتذہ کے لئے مسجد بنائی جاسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: ساجد انور، سیتامڑی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مسجد کے لئے مستقل طور پر مدرسہ کے پاس الگ سے کوئی زمین نہیں؛ بلکہ مدرسہ کی ضروریات کے لئے مدرسہ ہی کی زمین ہے اور طلبہ واساتذہ کو نماز کے لئے مسجد کی سخت ضرورت ہے، تو ایسی صورت میں مدرسہ کے اندر مدرسہ کی زمین میں

مسجد بنانا مدرسہ کی شرعی ضرورت ہے؛ اس لئے مدرسہ کی ملکیت کی زمین میں طلبہ واساتذہ کے واسطے شرعی مسجد بنانا بلاتردد جائز اور درست ہے۔

وإن جعل شيء من الطريق مسجدا صح كعكسه يعني إذا بني قوم مسجدا، واحتاجوا إلى مكان ليتسع، فأدخلوا شيئا من الطريق ليتسع المسجد وكان ذلك لا يضر بأصحاب الطريق جاز ذلك، وكذا إذا ضاق المسجد على الناس وبجنبه أرض لرجل تؤخذ أرضه بالقيمة كرها لما روي عن الصحابة رضي الله عنهم لما ضاق المسجد الحرام أخذوا أرضين بكره من أصحابها بالقيمة، وزادوا في المسجد الحرام. (البحر الرائق، كتاب الوقف، فصل في أحكام المسجد، كوئٹه ٥/ ٢٥٥، زكريا ٥/ ٤٢٨، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٣/ ٣٣١-٣٣٢، زكريا ٤/ ٢٧٣-٢٧٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/۴/۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۸۰۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/۴/۱۴۲۴ھ

مدارس کی جمع شدہ رقم اپنی ضروریات میں صرف کرنا

سوال [۸۴۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مساجد ومدارس میں خصوصاً مدارس میں زکوۃ کی مد میں رقومات جمع کی جاتی ہیں، تو کیا زکوۃ میں دی گئی رقم کاروبار میں لگانے کے مجاز مدارس کے متولیان یا ذمہ داران ہوسکتے ہیں، یہ ادارہ اگر R.B.I میں رجسٹرڈ ہے، تو کس بنا پر یہ کہتے ہیں کہ غیر سودی ہے۔ اور اگر رجسٹرڈ نہیں ہے تو عوام کے روپیوں کی کیا گارنٹی ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مساجد ومدارس کی جو رقومات ان کے ذمہ داران کے

پاس جمع ہیں وہ ان کے پاس امانت ہیں؛ لہٰذا اس کو کاروبار میں لگانا جائز نہیں۔ (مستفاد: عزیز الفتاویٰ ۱/ ۳۶۱، فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۵/ ۲۸۸، ڈابھیل ۱۵/ ۵۰۵)

وليس للمودع حق التصرف والاسترباح في الوديعة. (المبسوط للسرخسي، كتاب الوديعة، دارالكتب العلمية بيروت ١١/ ١٢٢)

ومقتضى ما قاله أبوسعود أنه يقبل قوله في حق براءة نفسه لا في حق صاحب الوظيفة؛ لأنه أمين فيما في يده، فيلزم الضمان في الوقف؛ لأنه عامل له، وفيه ضرر بالوقف. (شامي، الوقف، مطلب إذا كان الناظر مفسدا لا يقبل قوله بيمينه، كراچی ٤/ ٤٤٩، زكريا ٦/ ٦٧٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹؍۵؍۱۴۲۰ھ

خزانچی کا مدرسہ کی رقم اپنے استعمال میں لانا

سوال [۸۴۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے پاس مدرسہ کا فنڈ کمیٹی کی طرف سے رہتا ہے اور وہ مدرسہ کا خزانچی ہے، کیا خزانچی کے پاس زکوۃ وغیرہ کا پیسہ بغیر تملیک جمع کر سکتے ہیں؟ اور خزانچی مدرسہ کا پیسہ اپنے استعمال میں لاسکتا ہے یا نہیں؟ اگر تملیک شدہ رقم جمع ہے اور خزانچی امانت کے بطور نہیں رکھتا؛ بلکہ بطور قرض مدرسہ رکھتا ہے، تو وہ پیسہ اپنے استعمال میں یا کسی کو ادھار دے سکتا ہے یا نہیں؟
فقط والسلام

المستفتی: رحمت اللہ قاسمی، مدرسہ دارالعلوم جمعیت القریش ندائے السلام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید جب مدرسہ کا خزانچی ہے، تو اس کے پاس مدزکوۃ کا

بھی پیسہ جمع ہوگا اور مدامداد کا بھی جمع ہوگا اور اس پر لازم ہے کہ مدزکوۃ اورصدقات واجبہ کا حساب الگ رکھے اور امداد وخیرات کا حساب الگ رکھے، اس کے پاس بغیر تملیک کے زکوۃ کا پیسہ بھی جمع ہوسکتا ہے اور امداد کا پیسہ بھی۔ اور یہ دونوں قسم کے پیسے بطورضمانت جمع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے کوئی پیسہ ادھر ادھر ہوگیا تو اس کا ذمہ دار زید ہی ہوگا اور وہ اپنی جیب سے پورا کرے گا، جب کہ پہلے ہی سے ذمہ داران مدرسہ کی طرف سے اس طرح ضمانت کی بات طے ہوگئی ہو تو زید اس کا پابند رہے گا، نیز اس ضمانت کے باوجود جمع شدہ رقم نہ وہ اپنی ذات پر خرچ کرسکتا ہے نہ ہی دوسروں کو کمیٹی اور ذمہ داران مدرسہ کی اجازت کے بغیر دے سکتا ہے؛ بلکہ وہ امین ہونے کے ساتھ ساتھ ضامن بھی ہے، استعمال کی اجازت نہ ہونے کے اعتبار سے امانت ہے اور ضائع ہونے کی صورت میں تاوان دینے کے اعتبار سے ضمانت اور امانت مع الضمانت کا اکثر مدارس کے تحویل دار اور خزانچی کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے اور اس طرح کے معاملات میں امانت میں ضمانت کی شرط لگانا ضرورت اور حالات کی وجہ سے جائز اور درست ہے۔ اور آج کل کے زمانے میں اس طرح کا معاملہ حالات کی وجہ سے ضرورت کے درجہ میں ہوگیا ہے، اس کے بغیر امانت محفوظ نہیں رہتی۔

والأصل فيه أن الشرط إذا كان مقيدا والعمل به ممكنا وجب مراعاته والمخالفة فيه توجب الضمان. (عناية مع فتح القدير، كتاب الوديعة، زكريا ۸/ ۵۱۹، كوئٹه ۷/ ۴۶۰، دارالفكر ۸/ ۴۹۴-۴۹۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸ رصفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۷۱۹)

مدرسہ کا روپیہ ذاتی معاملہ میں خرچ کرنا

سوال [۸۴۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ایک دینی ادارے سے متعلق بستی میں دو پارٹی ہیں، ایک مدرسہ سے مخالف، دوسری معاون، مع عملہ مدرسین مخالف پارٹی طرح طرح کی الزام تراشیاں معاون پارٹی پر کرتی رہتی ہے، اسی دوران مخالف پارٹی کے ایک شخص سے مدرسہ کے ایک مدرس سے گھریلو معاملہ میں جھگڑا ہو جاتا ہے اور یہ جھگڑا ان کے مدرسہ میں مدرس بننے سے پہلے چلا آرہا ہے؛ لہٰذا یہ مدرس صاحب اب اس جھگڑے کے مقدمہ میں مدرسہ کا روپیہ صرف کرتے ہیں، آیا مدرسہ کا روپیہ اپنے ذاتی معاملہ میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟ جواب سے نوازیں گے۔

المستفتی: الطاف الرحمٰن، مدرسہ اختر العلوم بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرس یا متعلقین مدرسہ کا اپنے ذاتی معاملہ وجھگڑے میں مدرسہ کا روپیہ خرچ کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

إذ لا یجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعي.

(شامي، کتاب الحدود، باب التعزیر، زکریا ٦/ ١٠٦، کراچی ٤/ ٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ رمضان ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۱۹۷۰)

مدرسہ کے فون سے تبلیغی خبر کرنا

سوال [۸۴۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ کے فون سے تبلیغی خبر کرنا اور اپنے ذاتی کام میں استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کے فون سے ذاتی خبر لینا دینا جائز نہیں اور تبلیغی خبر

امور دینیہ میں سے ہے، اگر مدرسہ تبلیغ سے بھی منسلک ہے، تو ایسے مدرسہ کے فون سے تبلیغی خبر کرنا جائز ہے؛ اس لئے کہ تبلیغی انتظام بھی ایسے مدرسہ میں مدرسہ ہی سے منسلک ہوتا ہے؛ اس لئے کہ یہ کام بھی مدرسہ کا ایک جزو ہے، جیسا کہ مدارس میں مختلف شعبے ہوتے ہیں، شعبہ نشر واشاعت شعبہ دعوت وتبلیغ، شعبہ تنظیم وترقی وغیرہ، اسی طرح تبلیغی دعوت کا سلسلہ بھی مدرسہ کا ایک شعبہ بن سکتا ہے۔

ویبدأ من غلته بعمارته، ثم ما هو أقرب لعمارته ...... كذلك إلى آخر المصالح. (الدر مع الرد، الوقف، مطلب يبدأ من غلة الوقف بعمارته، زكريا ٦/ ٥٥٩-٥٦١، كراچى ٤/ ٣٦٦-٣٦٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٤ / ١٨٨)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/۱/۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۵۹۴۶)

مدرسے کی رقم بطور رشوت دینا

سوال [۸۴۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم ایک مدرسہ کے بنیادی اراکین میں سے ہیں، ایک مرتبہ اس مدرسہ کا ایک طالب علم غائب ہوگیا، اس کے گھر والوں نے تلاش کرنے میں ناظم مدرسہ سے تعاون مانگا؛ لیکن ناظم نے کسی قسم کی معاونت سے انکار کردیا، گھر والوں نے ناظم کے خلاف اغوا کی رپورٹ درج کرادی، اخبار کے مطابق اس میں مدرسہ کا کوئی تذکرہ نہ تھا؛ بلکہ یہ شخص متعین پر کیس تھا، اس مقدمہ کے سلسلہ میں ناظم نے قریبی تھانہ میں تقریباً پچاس ہزار روپئے بطور رشوت کے خرچ کیئے، مجلسِ شوریٰ نے اس رقم کو مدرسہ کی مد میں تسلیم کرلیا، اس فیصلہ سے آج تک مجھے تردد ہے کہ مدرسہ کی رقم کو بطور رشوت کے دینا جائز ہے یا نہیں؟ لیکن کثرت رائے کے مطابق

فیصلہ ہوگیا۔ واضح رہے کہ اس رپورٹ میں مدرسہ کا نام نہ تھا اور نہ ہی یہ تھا کہ یہ شخص مدرسہ کا ناظم ہے، آپ شریعت کی روشنی میں جواز یا عدم جواز کا فیصلہ فرما کر اطمینان قلب کا سامان فراہم کریں۔

المستفتی: منیر احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: مدرسہ کا ذمہ دار طالب علم کی تعلیم اور تربیت کی ذمہ داری لیتا ہے، اس کی جسمانی اور ذاتی نفع نقصان کی ذمہ داری نہیں لیتا ہے اور ایسے حالات میں اگر بچہ غائب ہوگیا ہے، تو مدرسہ کے ذمہ دار کے اوپر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے، صرف اتنی ذمہ داری ہوتی ہے کہ ماں باپ کو اطلاع کردے کہ تمہارا بچہ فلاں وقت سے غائب ہے۔ اور غائب شدہ بچہ کے ذمہ دار مدرسہ والے نہیں ہوتے ہیں؛ بلکہ اس کے ماں باپ اور اس کے سرپرست ہوتے ہیں، اس اعتبار سے مدرسہ کے ذمہ دار کا غائب شدہ بچہ کے سلسلہ میں دوڑ دھوپ نہ کرنے کی وجہ سے اس کے خلاف مقدمہ دائر کرنا شرعاً اور قانوناً درست نہیں ہے، اس کے باوجود ذمہ دار کے اوپر اغوا کا الزام لگا کر مقدمہ جو دائر کیا گیا ہے، اس میں اگرچہ مدرسہ کا نام کہیں سے کہیں تک نہیں ہے؛ لیکن ذمہ دار مدرسہ کو جو کچھ بھی دفاع کرنا پڑا وہ مدرسہ کا ذمہ دار ہونے کی وجہ سے کرنا پڑا ہے؛ اس لئے مدرسہ کے ارکانِ شوریٰ نے اگر اس کو محسوس کر کے ذمہ دار کی ذات پر یہ ذمہ داری ڈالنے کے بجائے مدرسہ پر ڈالی ہے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کے لئے بہتر صورت یہ تھی کہ صاحب خیر حضرات سے اس کام کے لئے خصوصی تعاون کی گزارش کی جاتی اور یہ پیسے مخصوص حضرات اپنی طرف سے ادا کردیتے اور مدرسہ کے اوپر یہ بار نہ پڑتا۔

عن كثير بن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن جده، عن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حراما.

(ترمذي شريف، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، المستدرك، كتاب الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز، جديد ٧/ ٢٥٢٣، قديم ٤/ ١٠١، رقم: ٧٠٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/صفر المظفر ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۵/۲/۲۶ھ

مدرسہ کی رقم سرکاری اسکیم شروع کرانے کے لئے بطور رشوت دینا

سوال [۸۵۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مسئلہ دریافت طلب ہے جواب سے مطلع فرما کر احسان فرمائیں۔ یوپی گورنمنٹ سے ایک اسکیم شروع ہوئی ہے، گورنمنٹ سے منظور شدہ ہے، مدارس کے پرائمری سیکشن کے طلبہ کو فی کس ۱۴۴/ روپیہ بطور وظیفہ سالانہ دینے کی اس سلسلہ میں لاعلمی کی وجہ سے بھی اہل مدارس سے رشوت لی گئی، اس میں تعداد زائد وظیفہ لانے کے لئے ذمہ داروں نے خود لکھ دی، تاکہ زائد رقم ان کو مل جائے، بہرکیف اب احساس ہورہا ہے کہ غلط کام ہوگیا، توبہ واستغفار کر رہے ہیں، آئندہ کے لئے احتیاط سے کام لیا جائے گا، اس کی تلافی کا جو طریقہ ہو اس سے مطلع فرما کر احسان فرمایا جائے، گورنمنٹ سے آئی ہوئی رقم کا لوٹانا اور بھی دشوار ہے آج کل کے ماحول میں اور اکگٹا ئزڈ کاغذ بھی گم ہوگیا ہے، دوسرا ملنے کے بھی رشوت مانگ رہے ہیں، کیا کیا جائے؟

المستفتی: حامد علی، مدرسہ ارشاد العلوم ٹانڈہ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حدیث شریف میں جھوٹ اور دھوکہ دہی کی سخت مذمت آئی ہے۔

قال النبي صلى الله عليه وسلم: الخديعة في النار. (صحيح البخاري، تعليقات، باب النجش، ومن قال: لا يجوز ذلك البيع، النسخة الهندية ١/ ١٨٧)

اس کی تلافی کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ جو رقم رشوت میں دی ہے وہ اگر مدرسے کی رقم ہے تو رشوت دینے والے ذمہ داران اپنی جیب سے بطور تاوان اتنی رقم مدرسہ کے خزانہ میں جمع کردیں۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/۱۶۱، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۵۲۵)

والأصل فيه: أن الشرط إذا كان مقيدا والعمل به ممكنا وجب مراعاته، والمخالفة فيه توجب الضمان. (عناية، كتاب الوديعة، زكريا ٨/ ٥١٩، كوئٹه ٧/ ٤٦٠، دارالفكر ٨/ ٤٩٤-٤٩٥)

اورسرکار کی طرف سے جوزائد رقم آتی ہے، اس کوسرکاری خزانہ میں واپس کردیں، لیکن اگر سرکاری خزانہ میں واپس کرنے کی صورت نہ بن سکے تو اس رقم کو فی کس ۱۴۴/ روپیہ کے حساب سے آئندہ سال کے جلسہ میں تقسیم کردیں؛ کیوں کہ طلبہ ہی کے نام سے آیا ہوا پیسہ ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ، قدیم ۱۴/ ۱۴۱، جدید ڈابھیل ۱۵/۴/ ۵۷)

اس کے بعد پھر اپنی غلطی پر نادم ہوکر اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرتے رہیں۔

وأما حكمها فوجوب الحفظ على المودع، وصيرورة المال أمانة في يده، ووجوب أدائه عند طلب مالكه. (هندية، كتاب الوديعة، الباب الأول، زكريا قديم ٤/ ٣٣٨، زكريا جديد ٣/ ٣٤٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۴/ شوال ۱۴۱۸ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۴۴۲)	۱۴/ شوال ۱۴۱۸ھ

الفصل السادس:

اشیائے مدرسہ کی منتقلی کے احکام

مدرسہ کی منتقلی سے متعلق چند سوالات کے جوابات

سوال [۸۵۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک بستی میں ایک مکتب کے لئے بستی والوں کی رضا مندی سے چک بندی کے ایام میں ایک بیگہ سے کچھ اوپر زمین چھوڑی گئی۔ ۱۹۷۰ء میں مکتب کی بنیاد رکھی گئی، دو تین مدرس کام کرنے لگے، رفتہ رفتہ مکتب میں ترقی ہوتی رہی، ابتداء میں اہل بستی کے مشورہ سے مقامی ایک صاحب مہتمم بنائے گئے تھے، چند سال بعد ہی مدرس اول مولانا صاحب پر اعتماد ہونے کے باعث سب نے متفقہ طور پر مولانا صاحب کو مہتمم بنا دیا اور پورے اختیارات مہتمم صاحب کو دے دیئے، تدریجی طور پر مکتب ترقی کرتا رہا، اعتماد میں مزید اضافہ ہوا، تو کمیٹی بھی تحلیل کردی گئی، مکتب کی ترقی برابر جاری رہی، یہاں تک کہ مکتب مدرسہ بن گیا، شعبہ تحفیظ القرآن الکریم میں فضل الٰہی سے خاص خدمت ہونے لگی، عربی سال ششم تک تعلیم ہوگئی، فللّٰہ الحمد...... پورا عملہ قناعت پسند اور مخلص ہے، مدرسہ میں توسیع کی ضرورت محسوس کی گئی، تو برابر کی زمین خریدی گئی، اب مزید زمین برابر میں چاروں طرف نہیں ہے، طلبہ کا رجوع متقاضی ہے کہ مدرسہ بڑا ہو، ایک عالم صاحب نے لوگوں سے زمینی چندہ کی اپیل کی تو خوشی خوشی زمینداروں نے ایک ایک، دو دو بیگہ کاشت کی زمین چندہ میں دینے کا وعدہ کرلیا، اس طرح کافی زمین موعود ہوگئی، تاکہ بڑا مدرسہ بستی سے الگ تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلہ پر بڑے روڈ کے قریب بنایا جائے اور قدیم مدرسہ کی عمارت کو مکتب مطبخ دفتر اور گودام کی حیثیت سے استعمال کیا جائے۔ چندہ دہندگان کو مطلع کردیا جائے کہ مدرسہ میں نام کی تبدیلی کے

ساتھ توسیع کی گئی ہے، اگر آپ قدیم نام سے بھی چندہ دیں گے تب بھی وہ جدید مدرسہ میں استعمال کیا جائے گا، اگر آپ کو یہ پسند نہیں تو چندہ نہ بھیجیں، آپ مختار ہیں، نیز پہلے عالم مہتمم صاحب چونکہ ضعیف ہوگئے، بیمار رہنے لگے، کئی بار فالج ہو چکا؛ اس لئے چاہتے ہیں دوسرے عالم شاب صالح کو مہتمم ناظم بنا دیں، تاکہ روز بروز ترقی ہوتی رہے، قدیم مہتمم صاحب بھی ان جوان صالح پر راضی ہیں، وہ جوان ہوس اقتدار نہیں رکھتے، بمشکل آمادہ ہوتے ہیں، یہ تفصیل جو عرض کی گئی ہے، شریعت مطہرہ اس بارے میں کیا کہتی ہے؟ فضل الٰہی سے اختلاف اور جھگڑے کا ہمارے یہاں دور تک بھی نام ونشان نہیں، طویل مدت میں کبھی بھی مدرسہ انتشار کا شکار نہیں ہوا۔ بحمد اللہ تعالیٰ۔

(۱) کیا مدرسہ کے نام اور مہتمم کی تبدیلی سے الگ الگ وقف کا حکم نہیں ہوگا؟

(۲) کیا قدیم مدرسہ کی عمارت، جدید مدرسہ کے مطبخ، دفاتر، کتب خانہ، مہمان خانہ وغیرہ میں استعمال کرنا اور قدیم مدرسہ کو جدید مدرسہ کے تابع بنانا درست ہوگا؟

(۳) جب اتنے فاصلہ پر جنگل میں مدرسہ بنے گا تو یقیناً چند سال میں وہاں مستقل بستی آباد ہو جائے گی، تو کیا وہ دوسری بستی کا مدرسہ نہیں کہلائے گا؟

المستفتی: محمد یونس

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) جتنی زمین مدرسہ کے لئے وقف ہے، اس کا حکم مدرسہ کے نام یا مہتمم کی تبدیلی سے الگ نہیں ہوگا؛ بلکہ ساری زمین ایک ہی مدرسہ کے ماتحت رہے گی۔

أراد المتولي إقامة غيره مقامه في حياته وصحته، إن كان له التفويض عاما صح. (درمختار مع رد المحتار، الوقف، مطلب للناظر أن يوكل غيره، زكريا ٦/ ٦٣٨، كراچی ٤/ ٤٢٥، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٦٠٣، مصري قديم ١/ ٧٥٥)

(۲) قدیم مدرسہ کی عمارت کو ضرورت کے پیش نظر جدید مدرسہ کے دفاتر اور مطبخ وغیرہ کے

لئے استعمال کیا جا سکتا ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ وہاں کوئی مکتب جاری رکھا جائے جو جدید مدرسہ کی ماتحتی میں چلتا ہو، نیز بستی والوں کی رضامندی اور ارباب حل وعقد کے مشورہ سے قدیم مدرسہ کو جدید مدرسہ کے تابع بنانا درست ہے۔

لأنه قال الشامي: مراعاة غرض الواقفين واجبة. الخ (شامي، الوقف، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة، زكريا ٦/ ٦٦٥، كراچى ٤/ ٤٤٥)

(۳) مدارس دینیہ بستیوں کے تابع نہیں ہوتے؛ کیوں کہ مدارسِ اسلامیہ ساری امت کی امانت ہیں اور ساری امت ان کی ذمہ دار ہے؛ البتہ قرب وجوار والے حضرات مدرسہ کے ساتھ خیر خواہی اور تعاون کے زیادہ ذمہ دار ہیں؛ لہٰذا آئندہ کسی بستی کے وہاں آباد ہونے سے مقصود میں کوئی خلل نہیں ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۸/ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۰۸۲)	۱۸/ ۳/ ۱۴۲۰ھ

مدرسہ کی آمدنی اسکول میں لگانا

سوال [۸۵۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج بتاریخ ۲۵/ مارچ ۱۹۹۳ء کو ایک جنرل میٹنگ دونوں مدرسوں کے بارے میں پورے گاؤں کی پردھان جی کی بیٹھک پر دن کے ۱۲/ بجے ہونی شروع ہوئی، جس میں دونوں اسکولوں کے عہدیدار موجود تھے، جناب صدر صاحب مہتمم مدرسہ نے اپنی بات رکھی کہ ایسا راستہ اختیار کیا جائے کہ دونوں اسکول چلتے رہیں، سبھی گاؤں والوں کی رائے کے مطابق یہ طے پایا کہ مدرسہ تعلیم القرآن کو جو بازار اور گاؤں سے امدادی آمدنی ہوگی، اس کا ایک ۱/۲ جونیر ہائی اسکول کلیان پور کو دینی ہوگی، بقیہ آمدنی (۱) زکوۃ (۲) فطرہ (۳) چرم قربانی (۴) بیرونی چندہ، یہ چاروں آمدنی تعلیم القرآن میں لگائی جائیں گی، پرستاؤ کا سمرتھن سبھی گاؤں والوں نے کیا، یادداشت کے لئے چند کلمے لکھ

دئے ہیں: (۱) دونوں اسکول چندے سے چل رہے ہیں، سرکار سے ایڈ کسی اسکول کو نہیں ملتی؟ (۲) زید کہتا ہے کہ ایسا پرستاؤ کرنا ناجائز ہے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ تعلیم القرآن کی جو بھی آمدنی ہوگی، چاہے بازار یا گاؤں سے ہو یا باہر سے جونیر ہائی اسکول میں لگانا شرعاً جائز نہیں ہے، تمام آمدنی مدرسہ تعلیم القرآن ہی میں لگانا لازم ہوگا؛ اس لئے کہ لوگوں نے مدرسہ کے لئے دی ہے نہ کہ ہائی اسکول کے لئے۔

قال النبي صلى الله عليه وسلم: المسلمون عند شروطهم. (صحيح البخاري، كتاب الإجارة، باب أجر السمسرة، رقم الباب: ١٤، سنن الترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

المسلمون عند شروطهم. (قواعد الفقه، أشرفي ديوبند ١٢١)

زید کا کہنا صحیح اور شریعت کے مطابق ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۲۸۱)

مسجد و مدرسہ کی مشترکہ رقم سے جنریٹر خریدنا

سوال [۸۵۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسجد اور مدرسہ کے ذمہ دار دونوں نصف نصف روپئے ملا کر جنریٹر خریدنا چاہتے ہیں اور جنریٹر کا استعمال مدرسہ والوں کے حق میں زیادہ رہے گا اور مسجد کے استعمال میں کم، تو اس سلسلہ میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد رضوان مقبرہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسجد اور مدرسہ کی مشترکہ رقم سے جنریٹر خریدنا درست ہے؛ البتہ جب جنریٹر کا استعمال مدرسہ کے حق میں زیادہ ہے بالمقابل مسجد کے، تو تیل کی قیمت اور خرید میں اسی تناسب سے پیسہ ادا کرنا لازم ہوگا۔

أما إذا اختلف الواقف أو اتحد الواقف، واختلفت الجهة بأن بنى مدرسة ومسجدا وعين لكل وقفا، وفضل من غلة أحدهما لا يبدل شرط الواقف، وكذا إذا اختلف الواقف لا الجهة يتبع شرط الواقف.

(البحرالرائق، کتاب الوقف، کوئٹہ ٥/ ٢١٦، زکریا ٥/ ٣٦٢، تنوير الأبصار مع الدر المختار، كتاب الوقف، مطلب في انقاض المسجد ونحوه، کراچی ٤/ ٣٦٠، زکریا ٦/ ٥٥١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۸۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۱۱/۱۴۳۴ھ

مسجد و مدرسہ کی رقم کو ایک دوسرے پر صرف کرنا

سوال [۸۵۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر کچھ لوگوں نے ایک زمین خریدی، اس میں مسجد و مدرسہ دونوں تعمیر کرنے کے ارادے سے اور دونوں کو ایک دوسرے کے تابع رکھنے کا ارادہ ہے، مسجد پہلے تعمیر ہو چکی ہے اور اب مدرسہ تعمیر ہو رہا ہے، تو کیا مسجد کا پیسہ مدرسہ میں اور مدرسہ کا پیسہ مسجد میں لگایا جاسکتا ہے؟ اور مسجد کے پیسوں کو مدرسین پر خرچ کیا جاسکتا ہے؟ نیز مدرسین میں بعض ناظرہ وغیرہ پڑھانے کے لئے ہیں اور بعض ہندی ماسٹر ہیں، تو کیا ماسٹروں پر بھی خرچ کیا جاسکتا ہے؟ جب کہ ہندی تعلیم دینی نہیں ہے۔ (احسن الفتاوی ٦/ ٤٤٦) سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دونوں ایک دوسرے کے تابع ہوں تو خرچ کیا جاسکتا ہے، مدلل تحریر فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر مدرسہ مسجد کے تابع ہے، یا مسجد مدرسہ کے تابع ہے اور لوگوں کو اس کا علم بھی ہے اور چندہ دینے والے مدرسہ میں نہ دینے کی صراحت بھی نہیں کرتے اور مسجد ومدرسہ دونوں کی رسید بھی ایک ہی ہے، تو اس رسید سے حاصل شدہ آمدنی مسجد و مدرسہ دونوں میں بلاامتیاز خرچ کرسکتے ہیں، اور ناظرہ قرآن پڑھانے والوں کی تنخواہ میں بھی دے سکتے ہیں اور اگر ضمنی طور پر ہندی پرائمری تک کی تعلیم دی جاتی ہے اور ایک دو ہی ماسٹر ہیں تو ان کی تنخواہ میں بھی وہ رقم خرچ کرسکتے ہیں۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۶/ ۴۴۶، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/ ۱۴۸، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۷۳)

اتحد الواقف والجهة وقل مرسوم بعض الموقوف عليه بسبب خراب وقف أحدهما، جاز للحاكم أن يصرف من فاضل الوقف الآخر عليه؛ لأنهما حينئذ كشيء واحد. (تنوير الأبصار مع الدر المختار، كتاب الوقف، مطلب في انقاض المسجد ونحوه، كراچی ٤/ ٣٦٠، زكريا ٦/ ٥٥١، وكذا في البحر الرائق، زكريا ٥/ ٣٦٢، كوئٹه ٥/ ٢١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ ۶/ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۸۸۷)

مسجد و مدرسہ کا پانی و لائٹ خارج مسجد و مدرسہ کو دینا

سوال [۸۵۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کسی مہتمم مدرسہ یا مسجد کو مسجد یا مدرسہ سے خارج مکان میں بجلی، پانی مدرسہ یا مسجد کی لائن میٹر سے دینے کا حق ہے یا نہیں؟ جب کہ خارج مکان میں خرچ ہونے والی بجلی یا پانی کا بل مسجد یا مدرسہ ہی ادا کرتا ہے، ایسا کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: فرحت حسین، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مہتمم اور متولی واقف اور چندہ دہندگان کی طرف سے بحیثیت وکیل کے امین ہیں اور امین کے لئے امانت میں اس طرح مالکانہ تصرف خیانت ہے جو کہ حرام ہے؛ لہٰذا اس صورت میں یہ دونوں پانی وبجلی کے بل کے ضامن ہوں گے۔

(مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۷/ ۹۹، جدید زکریا مطول ۱۰/ ۴۸۰، امداد الفتاوی ۲/ ۶۷۲)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– عن النبي ﷺ قال: آية المنافق ثلاث: إذا حدث كذب، وإذا وعد أخلف، وإذا أؤتمن خان. (صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب علامة المنافق ١/ ١٠، رقم: ٣٣)

ولو اشترى القيم بغلة المسجد ثوبا، ودفع إلى المساكين لا يجوز، وعليه ضمان. (هندية، كتاب الوقف، الباب الحادي عشر، الفصل الثاني زكريا قديم ٢/ ٤٦٢، جديد ٢/ ٤١٣، وكذا في فتاوى قاضي خان، جديد زكريا ٣/ ٢٠٨، وعلى هامش الهندية، زكريا ٣/ ٢٩٧)

الوكيل يقبض العين –إلى قوله– لأنه أمين محض. (هداية، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالخصومة والقبض، أشرفي ديوبند ٣/ ١٩٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ رمضان ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۲۴۵)

ایک مدرسہ کا غلہ دوسرے مدرسہ میں دینے کا حکم

سوال [۸۵۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مدرسہ کے سفیر اور استاذ ایک گاؤں میں غلہ کی وصولیابی کے لئے گئے اور غلہ اکٹھا کر کے ایک جگہ رکھ دیا اور صاحب مکان سے یہ کہہ کر چلے گئے کہ ہم اٹھا کر لے

جائیں گے، کئی مہینہ غلہ رکھا رہا، جب خراب ہونے لگا تو صاحب مکان نے مشورہ سے وہ غلہ ایک مدرسہ میں دے دیا، یہ سوچ کر کہ ضائع ہونے سے تو یہی اچھا ہے کہ مدرسہ میں دے دیا جائے، مدرسہ، مدرسہ سب ایک ہیں، چند مہینے کے بعد اس مدرسہ والے آئے اور معلوم ہو جانے پر کہ وہ غلہ فلاں مدرسہ میں دیا جا چکا ہے، صاحب مکان پر برس پڑے کہ یہ تم نے ناجائز کیا، جس مدرسہ کی نیت سے غلہ دیا تھا وہیں جانا چاہئے تھا، اس کے علاوہ میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

المستفتی: ساکنان بستی بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صاحب مکان پر یہ لازم تھا کہ جس مدرسہ کے لئے غلہ جمع کیا گیا ہے، اس مدرسہ والوں کو اطلاع کر دیتا؛ اس لئے کہ یہ غلہ اس کے پاس بطور امانت تھا، اور اگر اطلاع کرنے کی کوئی شکل نہیں تھی اور اس کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، جس کی وجہ سے مجبوراً غلہ دہندگان کے مشورہ سے دوسرے مدرسہ کو غلہ دے دیا ہے تو صحیح ہوا ہے، صاحب مکان پر کوئی تاوان لازم نہیں ہے۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه، عن جده، عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: ليس على المستعير غير المغل ضمان، ولا على المستودع غير المغل ضمان. (سنن الدارقطني، البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٣٦، رقم: ٢٩٣٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ / ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۲۶۸)

ایک مدرسہ کی رقم دوسرے مدرسہ میں لگانا

سوال [۸۵۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ایک مدرسہ کی کچھ رقم ہے، تو کیا دوسرے مدرسہ میں ضرورت کے مطابق اس کو لگا سکتے ہیں یا نہیں؟ جس مدرسہ کی رقم ہے وہ جاری ہے اور پیسہ بچت میں ہے۔

المستفتی: رحمت اللہ قاسمی سنبھل، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر دوسرے مدرسہ کا انتظام اور مہتمم سب کچھ الگ الگ ہیں، تو بلاعوض خرچ کرنا درست نہیں؛ بلکہ بطور قرض لے کر خرچ کر سکتے ہیں اور بعد میں قرض ادا کرنا لازم ہوگا، ورنہ آپس میں اختلاف اور فتنہ کا خطرہ ہو جاتا ہے؛ البتہ اگر اول مدرسہ میں اس رقم کی بالکل ضرورت نہیں ہے نہ فی الحال ضرورت ہے اور نہ ہی بعد میں ضرورت ہو سکتی ہے، تب دوسرے مدرسہ میں لگانے کی اجازت ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۱۲/ ۳۸۳، ڈابھیل ۱۵/ ۷۳)

اتحد الواقف والجهة، وقل مرسوم بعض الموقوف عليه بسبب خراب وقف أحدهما، جاز للحاكم أن يصرف من فاضل الوقف الآخر عليه؛ لأنهما حينئذ كشيء واحد. (الدر مع الرد، الوقف، مطلب في نقل انقاض المسجد ونحوه، زكريا ٦/ ٥٥١، كراچی ٤/ ٣٦٠، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٥٩٦، مصري قديم ١/ ٧٤٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۲ ؍ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۴۲۷)	۱۴۱۶/۴/۲۲ھ

مدرسہ بنانے کے نام پر وصول شدہ رقم کو دوسرے مدرسہ میں دینا

سوال [۸۵۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص محمد نعیم نے اپنی ذاتی رہائش کے لئے قطعہ زمین کا بیع نامہ کرایا، پھر اس بیع نامہ کے ذریعہ لوگوں سے یہ کہہ کر رقم وصول کی کہ یہ زمین میں نے مدرسہ کے لئے خریدی ہے؛ لہٰذا

لوگوں نے امدادی وزکاتی تعاون پیش کیا، اس شخص نے مزید دو آدمیوں کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ شامل کرلیا کہ زمین برائے مدرسہ خرید لی گئی ہے، تم بھی مدرسہ جاری کرنے میں معاون ہوجاؤ، ایک نے شخص مذکور کو معتمد سمجھتے ہوئے اپنے تعلقات میں سے چند ہزار سے تعاون دیا، دوسرے شخص نے کہا کہ جب تک مدرسہ کی عمارت تیار نہ ہو تم اپنے مکان میں مدرسہ قائم کرالو، چنانچہ ایک نام تجویز کر کے اس کے مکان میں مدرسہ جاری کردیا گیا، دو یا چند ماہ کے بعد معلوم ہوا کہ نہ مدرسہ کی کوئی زمین ہے اور نہ آئندہ زمین ملنے کا امکان ہے، یہ سب سوانگ اس لئے رچایا گیا ہے کہ کسی طرح مکان کی تعمیر ہوجائے؛ لہٰذا جس شخص کے مکان میں مدرسہ جاری کیا گیا تھا، اس نے مکان خالی کرالیا، مدرسہ بند ہوگیا، جس شخص نے چند ہزار روپئے جو وصول کر کے دئے تھے وہ بھی اس فریب کاری سے عاجز آکر علیحدہ ہوگیا، اور اس نے بقیہ دونوں شخصوں سے کہہ دیا کہ اب جو رقم زکوۃ کی رہ گئی ہے وہ فلاں مدرسہ کو دے دی جائے، اور جو امدادی رقم ہے اس کو فلاں مسجد کے حوالہ کردی جائے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس رقم کو مدرسہ اور مسجد میں صرف کیا جاسکتا ہے، جب کہ اس رقم کو وصول کرنے کی کوئی صحیح بنیاد نہیں ہے؟ والسلام بینوا توجروا۔

المستفتی: محمد ذاکر سرائے کھجور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زکوۃ کی رقم کو ایسے مدارس میں زکوۃ کے نام سے دینا درست ہے جن میں زکوۃ کی رقم صحیح مصرف میں صحیح طریقے سے صرف کی جاتی ہے۔

و للوكيل أن يدفع لولده الفقير وزوجته لا لنفسه إلا إذا قال ربها ضعها حيث شئت. الخ (الدرالمختار، کتاب الزكوة، زكريا ٣/ ١٨٨-١٨٩، كراچی ٢/ ٢٦٩، البحرالرائق، كوئٹه ٢/ ٢١١، زكريا ٢/ ٣٦٩)

اور امدادی رقم جن لوگوں سے لے کر جمع کی گئی ہے ان کی اجازت سے مسجد میں خرچ کرسکتے ہیں، ورنہ انہیں لوگوں کو واپس کردینا واجب ہے؛ کیوں کہ وہ رقم دینے والوں کی ملکیت سے خارج نہیں ہوئی ہے۔ (مستفاد: امدادالفتاوی ٢/ ٥٩٥)

عن أبي حرة الرقاشي –رضي الله عنه– عن عمه أن رسول الله ﷺ قال: لايحل مال امرئ مسلم، إلا بطيب نفس منه. (مسند أبي يعلى الموصلي، دارالكتب العلمية بيروت ۲/ ۹۱، رقم: ۱۵٦۷، مسند أحمد بن حنبل ۵/ ۷۲، رقم: ۲۰۷۱۴)

لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه، أي بأمر أو رضا عنه. الخ (مرقاة، إمداديه ملتان ٦/ ۱۱۸)

لو أن قوما بنوا مسجدا وفضل من خشبتهم شيء –إلى قوله– يكون الفاضل لهم يصنعون به ماشاؤوا. الخ (البحرالرائق، كتاب الوقف، فصل في أحكام المسجد، كوئٹه ۵/ ۲۵۱، زکریا ۵/ ۴۲۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ صفر ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۱۱۷)

ایک مدرسہ کی وقف شدہ اراضی کو دو مدرسوں پر تقسیم کرنا

سوال [۸۵۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہندہ نے بدرستگیٔ ہوش وحواس اپنی ایک اراضی کے لئے مرنے سے پہلے وصیت کی کہ میری یہ فلاں اراضی مدرسہ کو وقف ہے، چنانچہ مرحومہ کے انتقال کے بعد ورثاء نے وہ اراضی مدرسہ رحمانیہ کو وقف کردی اور ۱۹۷۰ء سے آج تک جس کو ۱۹/ برس کا عرصہ ہوگیا، مدرسہ رحمانیہ کا اس اراضی پر قبضہ ہے، اب مرحومہ کے وہی ورثاء چاہتے ہیں کہ اس اراضی کو دو مدرسوں پر تقسیم کردیں، ان دونوں مدرسوں میں سے ایک مدرسہ کا اس وقت جب مرحومہ کا انتقال ہوا تھا وجود بھی نہیں تھا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ وقف شدہ اراضی جو مدرسہ رحمانیہ کی ملک بن چکی ہے اور ۱۹/ برس سے آج تک مدرسہ کی کاشت میں ہے، کیا مرحومہ کے ورثاء کو یہ حق ہے کہ مرحومہ کی اس وقف شدہ آراضی کو دوسرے مدرسہ کو تقسیم کرکے دے دیں؟

المستفتی: عبد السلام ناظم مدرسہ رحمانیہ، ٹانڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر بوقت وصیت دوسرے مدرسہ کی طرف منتقل کرنے کی شرط نہیں لگائی ہے اور ورثاء نے موصی کی وصیت کے مطابق مدرسہ رحمانیہ کو وقف کر کے متولی کے قبضہ میں دے دیا ہے، تو بالاتفاق وقف کامل ومکمل ہوکر مدرسہ رحمانیہ کی ملکیت میں مذکورہ آراضی داخل ہوچکی ہے، آئندہ ورثاء اور متولی وغیرہ کو جب تک مدرسہ رحمانیہ چلتا رہے گا کسی دوسرے مدرسہ وغیرہ کی طرف منتقل کرنے کا حق نہیں ہوگا، ورنہ غرض واقف کی مخالفت کی وجہ سے منتقل کرنے والے گنہگار رہوں گے۔

أنهم صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة. (شامي، الوقف، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة، زكريا ٦/ ٦٦٥، كراچی ٤/ ٤٤٥، كوئٹه ٣/ ٤٦٤)

ملك العين الموقوفة يزول عن ملك المالك بقضاء القاضي بلزوم الوقف من غير أن ينتقل إلى ملك أحد. الخ (البحر الرائق، كوئٹه ٥/ ١٩١، زكريا ٥/ ٣٢٠)

فإذا تم ولزم لا يملك ولا يملك ولا يعار. الخ وفي الشامي: والوقف لا يمكن تمليكه. الخ (الدرالمختار، زكريا ٦/ ٥٣٩، كراچی ٤/ ٣٥١، كوئٹه ٣/ ٤٠٢)

الملك يزول، أي ملك الواقف فيصير الوقف لازما للاتفاق على التلازم بين اللزوم والخروج عن ملكه. الخ (شامي، الوقف، مطلب شرائط الوقف معتبرة إذا لم تخالف الشرع، زكريا ٦/ ٥٢٧، كراچی ٤/ ٣٤٣، كوئٹه ٣/ ٣٩٥)

البتہ اگر موصی نے بوقت وصیت کوئی شرط لگائی ہے، تو اس کا حکم دوسرا ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۶۷۷)

مدرسہ کی رقم سے مدرسہ کی زمین میں مسجد تعمیر کرنا

سوال [۸۵۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے مدرسہ میں مسجد نہیں تھی اور نماز کی پریشانی تھی، اس وجہ سے ہم نے مدرسہ کا ایک کمرہ توڑ کر مسجد کی تعمیر کرالی۔ اور ہم نے پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً مدرسہ کا پیسہ استعمال کرلیا اب مسجد تعمیر ہوچکی ہے، اورنماز شروع ہوگئی ،تو اس میں شرعاً کوئی قباحت تو نہیں ہے؟

المستفتی: عبدالصمد کاشی پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کی زمین پر مدرسہ کی رقم سے مسجد کی تعمیر شرعاً درست نہیں ہے؛ کیوں کہ زمین اور چندہ مدرسہ کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ اور وقف تام ہونے کے بعد اس میں اس طرح کا تصرف جائز نہیں؛ لہٰذا زمین کی قیمت اور تعمیر پر خرچ ہوئی رقم مسجد کے چندہ سے مدرسہ میں لوٹانا ضروری ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/ ۳۷۴، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۴۸۵)

یہ اس صورت میں ہے جب کہ مسجد کا نظام اور ذمہ داری مدرسہ والوں کے ہاتھ میں نہ ہو اور مسجد بھی خاص طور پر مدرسہ کی نہ ہو؛ بلکہ محلّہ والوں کی نماز کے لئے مسجد بنائی گئی ہو؛ لیکن اگر یہ مسجد مدرسہ میں بنی ہے اور مسجد و مدرسہ کے متولی ایک ہی ہیں اور آئندہ بھی دونوں کے اخراجات کی ذمہ داری ایک ہی پر ہو تو وہ مدرسہ ہی کی مسجد ہے، تو ایسی مسجد مدرسہ کی رقم سے مدرسہ کی زمین مین بنانا شرعاً جائز ہے؛ اس لئے کہ یہ مسجد بھی مدرسہ کی ضروریات کے دائرہ میں داخل ہے۔

وفي الدرالمختار: فإذا تم ولزم لا يملك، ولا يعار، ولا يرهن.

(الدرالمختار على الشامي، كتاب الوقف، زكريا ٦/ ٥٣٩، كراچی ٤/ ٣٥١، كوئٹه ٣/ ٤٠٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ محرم الحرام ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۴۶۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱/۲۵ھ

الفصل السابع: في الإجارة

مدرسے کی زمین میں ضروریاتِ مدرسہ کے لئے دوکان تعمیر کرنا

سوال [١١٨٥١]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ضلع بجنور، قصبہ شیر کوٹ بستی میں قریب ٨٠-٩٠ سال پرانا مدرسہ قائم ہے، جس کی مستقل لمبی چوڑی عمارت ہے، اس عمارت میں نیچے کے حصے میں بھی کمرے ہیں اور اوپر بھی کمرے بنے ہیں، پورب کی طرف کی عمارت میں نیچے دوکانیں تعمیر ہیں، جن کا کرایہ مدرسہ ہی وصول کرتا ہے، پچھّم کی طرف بھی عمارت کے نیچے حصے میں دوکانیں تعمیر ہوئی ہیں، اوپر کے حصے میں لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں، دکھن کی جانب نیچے کے حصے میں کمروں کے ٦-٧ دروازے صحن کی طرف کھلے ہوئے ہیں، مدرسہ کے صحن کی باؤنڈری بنی ہوئی ہے اور فرش صحن بھی، یہ مدرسہ بستی کے عالموں بزرگوں اور معزز لوگوں نے مل کر قائم کیا تھا، بستی کے معزز لوگ برابر اس کا انتظام کرتے چلے آرہے ہیں، مدرسہ کے قریب پہلے ایک چھوٹی مسجد قائم تھی جس کو بزرگوں نے دائیں بائیں بڑھا کر بستی کی جامع مسجد قائم کردی تھی، اب بھی یہ جامع مسجد ہی ہے، اس کی حد بندی بھی قائم کردی تھی، اس کے دروازے اور دیواریں پرانی قائم ہیں، اب جب کہ مدرسہ کی ایک لمبی چوڑی اوپر نیچے مستقل عمارت ہے اور دوکانیں بھی تعمیر ہیں، مدرسہ کی ضرورت کی وجہ سے مدرسہ کے ذمہ دار صحن میں دوکانیں تعمیر کرا کر اس کا کرایہ مدرسہ کے خرچ میں لگانا چاہتے ہیں، کچھ لوگ تنازعہ قائم کرکے اور مسجد کی ملکیت بتا کر تعمیر میں رکاوٹ ڈالنا چاہتے ہیں، اسی صحن سے جو دروازہ اوپر کی منزل پر جارہا ہے اس پر مدرسہ کا کمرہ بنا ہوا ہے، جس پر دار التحفیظ اور تجوید لکھا ہوا ہے، ایسی صورت میں کیا تعمیر میں رکاوٹ ڈالنا درست ہوگا؟ مدرسہ میں ضرورت کے مطابق برابر تعمیر کا سلسلہ چلا آرہا ہے، کسی کو آج تک تعمیر کے بارے میں کوئی اعتراض نہیں ہوا ہے۔

نوٹ: مدرسہ کے اسی صحن میں بزرگوں نے مسجد کی ضرورت کی وجہ سے پانی گرم کرنے کے

لئے سردیوں میں صرف کھوئی کے لئے ایک کولہولگوا دیا تھا، جب کہ یہ پورا صحن برابر بچوں کی تعلیم کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔

المستفتی: احقر شمیم الحسن، سکریٹری مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: ہمارے ہندوستان میں مکان اور دوکان وغیرہ جب کرایہ پر دئے جاتے ہیں تو کرایہ دار کو عملاً مالکانہ حیثیت حاصل ہوجاتی ہے، جب وقف شدہ زمین میں دوکان بنا کر کرایہ پر دے دی جائے گی تو وقف کے تقاضہ کے مطابق اس کی حیثیت مکمل طور پر باقی نہیں رہتی؛ بلکہ عملاً کرایہ داری کی ملکیت میں منتقل ہوجاتی ہے؛ اس لئے وقف شدہ میں دوکان یا مکان بنا کر کرایہ پر دینا درست نہیں، ہاں اس مسجد یا مدرسہ کی توسیع کردی جائے یا طلبہ کے لئے قیام گاہ بنا دیا جائے تو وقف کا تقاضہ مکمل طور سے باقی رہتا ہے؛ اس لئے جائز ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ وقف کی حیثیت اور ہے اور وقف کی ملکیت کی حیثیت بالکل دوسری ہے، وقف کا مطلب یہ ہے کہ اس کو بیچنا اور اس کا تبادلہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اور وقف کی ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ وقف کی آمدنی کے لئے اس کو بیچنا اور منافع کی غرض سے اس کو تبدیل کرنا اور آمدنی کے لئے اس کو کرایہ پر دینا جائز ہے۔ اور مذکورہ زمین کے بارے میں یہ وقف کی ملکیت ہے یا خود وقف شدہ ہے، کوئی صراحت نہیں ہے؛ اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوری زمین جس پر مسجد اور مدرسہ دونوں بنے ہوئے ہیں اور اس سے ملحقہ خالی زمین پوری کی پوری وقف ہے، نہ کہ وقف کی ملکیت ہے۔ اور وقف کی ملکیت ہونے کے لئے ثبوت ہونا چاہئے، نہ مسجد کے پاس اس سلسلہ میں کاغذی ثبوت ہے اور نہ ہی مدرسہ کے پاس؛ اس لئے یہ زمین وقف شدہ تسلیم کی جائے گی نہ کہ وقف کی ملکیت جس میں دوکانیں بنا کر کرایہ پر دینا درست نہ ہوگا۔ اور درسگاہ، کمرہ بنانا درست ہوگا؛ لہٰذا وقف شدہ زمین میں جو دوکانیں پہلے سے بن گئی ہیں، ان کو بھی مسجد اور مدرسہ میں شامل کر لینا چاہئے۔

قيم المسجد إذا أراد أن يبنى حوانيت في حد المسجد، أو في فنائه لا يجوز. (الفتاوى التاتارخانية، كوئٹه ٥/ ٨٦٠، زكريا ٨/ ١٧٩٨، رقم: ١١٥٦٣، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٩/ ١٣٧، رقم: ١١٣٨٢، هندية، زكريا قديم ٢/ ٤٦٢، جديد ٢/ ٤١٣، البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ٢٤٩، زكريا ٥/ ٤١٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رجمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۰۸۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۴/۶/۱۳ھ

مدرسہ کی رقم مسجد یا مسجد کی رقم مدرسہ کو بطور قرض دینا

سوال [۸۵۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسہ کے روپیہ کو قرض کے طور پر لے کر مسجد میں اور مسجد کے روپئے کو قرضہ لے کر مدرسہ میں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: محمد افتخار بہرائچی، متعلم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر قرض وصول ہونے کا مکمل اعتماد ہو اور اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو کمیٹی اور ذمہ داروں کے مشورہ سے مسجد کی رقم مدرسہ کو اور مدرسہ کی رقم مسجد کو بطور قرض دینے کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ۱/۴۹۱، ڈابھیل ۱۵/۴۷)

للمتولي إقراض مال المسجد بأمر القاضي. (شامي، كتاب القضاء، مطلب للقاضي اقراض مال اليتيم ونحوه، زكريا ٨/ ١١١، كراچى ٥/ ٤١٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رجمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۳۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۶/۱۰ھ

مدرسہ کے تہہ خانہ میں آمدنی کی خاطر ''کار پارکنگ'' بنانا

سوال [۸۵۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسجد سے متصل دینی مدرسہ (دارالاقامہ) کے لئے ایک صاحب خیر نے زمین خرید کر وقف کردی، جس پر فی الوقت تعمیری کام چل رہا ہے۔ مذکورہ مسجد کافی بڑی وسیع ہے، جمعہ اور ہفتہ واری تبلیغی اجتماع میں مجمع کثیر ہوتا ہے، مسجد کی انتظامی کمیٹی یہ چاہتی ہے کہ مدرسہ کی وقف شدہ زمین کا گراؤنڈ فلور (نچلا حصہ مسجد کے لئے چھوڑ دیا جائے، تاکہ اجتماعات اور جمعہ کے دن آئے ہوئے مصلیوں کو پارکنگ کی سہولت ہو۔ اور سڑک اور راستہ پر پارکنگ کی وجہ سے عوام کو تکلیف بھی نہ ہو۔ کیا مدرسہ کی انتظامی کمیٹی کو شرعاً اس بات کا حق ہوگا کہ وہ مدرسہ کی زمین کا نچلا حصہ پارکنگ کے لئے چھوڑ دے اور ہر ماہ اس پر کچھ اجرت لے لے، تاکہ مدرسہ کا کچھ فائدہ بھی ہوجائے اور مصلیوں اور عوام کو سہولت ہوجائے۔

ایسے ہی مدرسہ کا وضوخانہ، مسجد کے مصلیوں کے لئے استعمال کرنے کی اجازت ہوگی یا نہیں؟ شرعی اعتبار سے مدرسہ کی زمین مسجد کے کن کن کاموں میں استعمال ہوسکتی ہے؟ اور اس کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟ بینوا توجروا

المستفتی: محمد حنیف خان امام وخطیب جامع مسجد محمدی شاہ پورنگر وناظم مدرسہ الانصار شاہ پورنگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مذکورہ زمین مدرسہ ہی کے لئے وقف کی گئی ہے، تو وہ زمین مدرسہ کے مفاد میں ہی مستعمل ہونی ضروری ہے؛ لہٰذا اگر نیچے پارکنگ بنا دیں اور ملکیت مدرسہ کی رہے اور اس سے مدرسہ کو کرایہ کے ذریعہ سے آمدنی ہو اور اوپر کی منزلوں میں مدرسہ کی توسیع ہوتی رہے، تو ایسا کرنا شرعاً جائز اور درست ہے؛ لیکن اس میں مدرسہ کی انتظامیہ کی رضامندی بھی لازم ہے۔

وإذا أراد أن یبني فیها بیوتا لیستغلها بالإجازة –إلی– إن کانت

أرض الوقف متصلة ببيوت المصر يرغب في استئجار بيوتها، وتكون غلة ذلك فوق غلة الأرض، والنخيل كان له ذلك. (الفتاوى التاتارخانية، الفصل السابع في تصرف القيم، كوئٹه ٥/ ٧٤٦، زكريا ٨/ ٦٣، رقم: ١١٢١٥، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٩/ ٢٤، رقم: ١١٠١٩، البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ٢١٦، زكريا ٥/ ٣٦١، مجمع الضمانات ١/ ٣٣١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ذی قعدہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۸۵۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/ ۱۱/ ۱۴۳۳ھ

مدرسہ میں ووٹ ڈالنے کی مشین لگانا

سوال [۸۵۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارا مدرسہ اسلامیہ عربیہ مونڈھا ائمہ جو ایک طویل عرصہ سے خالص دینی تعلیم دیتا رہا ہے، اس میں نہ آج تک دینی تعلیم کے علاوہ کوئی تعلیم ہوئی ہے اور نہ سرکار سے آج تک اس کے لئے کوئی مدد لی گئی ہے، نیز یہ ہمارے گاؤں کے قبرستان کے احاطہ میں واقع ہے، اس صورت حال میں سیاسی انتخابات اس کے حدود میں کرانا جائز ہے یا نہیں؟ ہمیشہ کی روایت یہی رہی ہے کہ ووٹ سرکاری اسکول کی آراضی میں ڈالے جاتے تھے، یہ پہلی مرتبہ ہے کہ کچھ لوگ مدرسہ کے حدود میں ووٹ ڈلوانا چاہتے ہیں۔

المستفتی: مولانا مرغوب احمد، مہتمم مدرسہ اسلامیہ عربیہ مونڈھا ائمہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مدرسہ کا کوئی مفاد اس معاملہ میں وابستہ نہیں ہے، تو اہل مدرسہ سیاسی ذمہ داروں سے اپنا عذر پیش کردیں کہ مدرسہ صرف دینی تعلیم گاہ ہے؛ اس لئے سیاسی انتخاب مدرسہ میں نہ کیا جائے، کسی دوسری جگہ اس کا انتظام کیا جائے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۲/ ۲۱۳، جدید میرٹھ ۲۳/ ۱۳۲)

شرط الواقف كنص الشارع في وجوب العمل به، وفي المفهوم والدلالة. (قواعد الفقه، أشرفي ص: ۸۵، رقم: ۱۵۲) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۲۹۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۴/۱۴۱۵ھ

احاطۂ مدرسہ میں قربانی کرنے سے روکنا

سوال [۸۵۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مدرسہ کا ذمہ دار ہے، بکر زید کے مدرسہ کا تعاون کرتا ہے اور اس مدرسہ میں سالہا سال سے ایک سلسلہ چلتا آرہا ہے، وہ یہ کہ ہر سال قربانی کے موقع پر لوگوں کو احاطہ مدرسہ میں قربانی کرنے کی اجازت دے کر منتظمین مدرسہ اہل قربانی سے مدرسہ کے مستحق طلبہ کے لئے چرم قربانی وصول کرتے ہیں، چنانچہ اس مرتبہ بکر اس مدرسہ کے احاطہ میں اپنے بیسیوں جانور قربانی کرنا چاہتا ہے؛ لیکن وہ چرم قربانی مدرسہ کو دینا نہیں چاہتا، اس پر زید نے بکر کو احاطہ مدرسہ میں قربانی کرنے سے منع کر دیا، اب پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں زید کا بکر کو احاطہ مدرسہ استعمال کرنے کی اجازت نہ دینا شرعاً درست تھا یا نہیں؟

المستفتی: بندہ محمد فاروق ندوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کا احاطہ مدرسہ میں بکر یا دیگر لوگوں کو قربانی کرنے سے منع کر دینا صحیح اور درست ہے؛ اس لئے کہ قربانی کی اجازت دینے میں مدرسہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور پہلے جو اجازت دیتے تھے وہ اس وجہ سے تھا کہ مدرسہ کو کھال کا فائدہ ہوتا تھا، اور اب کھال کا فائدہ نہیں ہے؛ اس لئے اب اجازت نہ دینا صحیح ہے؛ کیوں کہ مدرسہ ذمہ دار کی ملکیت نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ ذمہ دار مدرسہ کا منتظم ہوتا ہے۔ اور منتظم کے لئے ہر معاملہ میں مدرسہ کا فائدہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

ویؤجر بأجر المثل، فلا یجوز بالأقل. (الدرالمختار مع رد المحتار، مطلب لا یصح ایجار الوقف بأقل من أجرة المثل، زکریا ٦/ ٦٠٨، کراچی ٤/ ٤٠٦، هندیة، زکریا قدیم ٢/ ٤١٩، جدید ٢/ ٣٨٧، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ٣/ ٥١٤، مصري قدیم ٢/ ٣٦٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۰۱۱/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۳/۱۴۳۴ھ

مدرسہ کی عمارت اسکول کے لئے کرایہ پر دینا

سوال [۸۵۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جامعہ عربیہ شمس العلوم کی عمارت جونیر ہائی اسکول کے لئے کرایہ پر دی جاسکتی ہے یانہیں؟ جب کہ چندہ دینے والوں نے دینی تعلیم کے لئے چندہ دیا تھا، کچھ درسگاہیں مستقل طور پر صرف ایک ایک آدمی نے قرآن حکیم کی تعلیم کے لئے تعمیر کرائیں، جن پر ان کے نام کی تختیاں بھی لگی ہوئی ہیں، جونیر ہائی اسکول متعلقہ مدرسہ شمس العلوم کو مدرسہ سے الگ کرنے کا فیصلہ مجلس شوریٰ مدرسہ ہذا نے کرلیا ہے، فی الوقت علیحدہ مستقل عمارت کا نظم دشوار ہے؛ لہٰذا ایسی صورت میں جونیر ہائی اسکول کو مدرسہ کی عمارت میں کرایہ پر لے کر چلایا جاسکتا ہے یانہیں؟ جب کہ بالغ لڑکے اور لڑکیاں مخلوط تعلیم حاصل کرتی ہیں؟

المستفتی: محمد یوسف قاسمی، خادم جامعہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب کہ چندہ دہندہ نے دینی تعلیم ہی کی شرط وغرض سے چندہ دیا ہے، یا درسگاہ بنادی ہے، تو ذمہ داران جامعہ عربیہ شمس العلوم پر واجب ہے کہ مذکورہ چندہ ودرسگاہوں کو دینی تعلیم ہی میں استعمال کریں، اور غرض واقف کے خلاف جونیر ہائی

اسکول یا یونیورسٹی وغیرہ کی دنیاوی تعلیم کی اعانت اور کرایہ پر دینا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہوگا، مدارس میں شریک ہونے والے سب گناہ کبیرہ اور خیانت کے مرتکب ہوں گے۔ اور جونیر کو کرایہ پر دینے میں عمارتوں کے جامعہ کے ہاتھ سے نکلنے اور دیگر ناجائز فائدہ اٹھانے کا بھی سخت خطرہ ہے۔

القضاء بخلاف شرط الواقف، كالقضاء بخلاف النص لقول العلماء: شرط الواقف كنص الشارع. الخ (الأشباه والنظائر، قديم ص: ۱۰۷، شامي، الوقف، مطلب في قولهم شرط الواقف كنص الشارع، زكريا ٦/ ٦٤٩، كراچی ٤/ ٤٣٣)

صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة. الخ (شامي، الوقف، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة، كراچی ٤/ ٤٤٥، زكريا ٦/ ٦٦٥)

نیز بالغ لڑکے ولڑکیوں کی مخلوط تعلیم دنیاوی کے لئے کرایہ پر دینے میں اعانت علی المعصیہ ہونے کی وجہ سے خود چندہ دہندہ اور درسگاہ وعمارت بنوانے والے کو بھی اس کی اجازت نہیں ہے۔

لقوله تعالیٰ: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ٢] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ ذیقعدہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۹۸۲)

مدرسہ میں بارات رکانا

سوال [۸۵۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک دینی مدرسہ ہے، جہاں قرآن کی تعلیم ہوتی ہے، حفظ وناظرہ کے بچے پڑھتے ہیں؛ لیکن کچھ مواقع ایسے آتے ہیں کہ بیاہ شادیوں میں مدرسہ کے اندر بارات کو ٹھہرایا جاتا ہے،

اس میں بارات کے لوگ غیر شرعی کام کرتے ہیں، جیسے جوتے سمیت اندر چلنا پھرنا، بیڑی سگریٹ پینا، جیتی گھٹکے کھانا، بے ہودہ باتیں کرنا، اندر بیٹھ کر تاش کھیلنا، ایک دوسرے کا فوٹو کھینچنا، کیا ایسی صورت میں بارات کو مدرسہ کے اندر ٹھہرانا درست ہوگا یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب تحریر فرمائیں، عین کرم ہوگا۔

المستفتی: امام مسجد عمران بیگ، مدرسہ ہٰذا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدود مدرسہ کے اندر وہ تمام منکرات جو سوال نامہ میں درج ہیں، مثلاً تاش کھیلنا، فوٹوں کھینچنا وغیرہ منکرات قابل نکیر ہیں، ایسی چیزوں سے مدرسہ کو پاک رکھنا ضروری ہے؛ لہٰذا جس بارات میں اس قسم کے خرافات ومنکرات ہوں، انہیں مدرسہ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اور اگر اس قسم کے خرافات نہ ہوں اور مدرسہ کے مصالح اس سے متعلق ہوں، نیز تعلیمی نقصان بھی نہ ہو تو اجازت ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/۲۱۳، جدید ڈابھیل ۱۵/۵۲۲)

عن جابر – رضي اللّٰه عنه – قال: نهى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عن الصورة في البيت، ونهى أن يصنع ذلك. (ترمذی شریف، باب ماجاء في الصورة، النسخة الهندية ١/ ٣٠٥، دارالسلام، رقم: ١٧٤٩)

وعن ابن عباس – رضي اللّٰه عنه – قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم من صور صورة عذبه اللّٰه حتى ينفخ فيها، يعني الروح، وليس بنافخ فيها. (ترمذي شريف، باب ماجاء في المصورين، النسخة الهندية ١/ ٣٠٥، دارالسلام، رقم: ١٧٥١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۳۵۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۵/۱۴۲۵ھ

مدارس عربیہ کی بالائی منزل پر جونیر کی تعلیم دینا

سوال [۸۵۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دینی عربی مدرسہ جس کا قیام دینی تعلیم کے لئے ہوا تھا، جس میں ابتداء ہی سے درجہ پنجم تک پرائمری تعلیم بھی تھی، عرصہ دراز کے بعد اس میں جونیر کی تعلیم کے لئے کچھ پیسہ نرائن دت تیواری جی کے ذریعہ سرکاری طور پر لے کر چند کمرے مدرسہ کی تیسری منزل پر بنا دئے گئے ہیں اور جونیر کی تعلیم شروع کردی گئی ہے، ان حالات میں زکوۃ، صدقات وغیرہ کی رقم حیلۂ تملیک کے بعد مذکورہ تعلیمات پر خرچ کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد یوسف قاسمی جامعہ عربیہ شمس العلوم، کاشی پور، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ حالات میں جونیر کی تعلیم کے لئے زکوۃ وصدقات کی رقم کا حیلۂ تملیک کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا، اس میں شریک ہونے والے سب خائن اور گنہگار ہوں گے؛ کیوں کہ حیلۂ تملیک صرف خالص دینی امور میں شدت ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا گیا ہے اور جونیر دینی امور میں شامل نہیں ہے۔ اور پرائمری دینی مدارس کے تابع ہے اور جونیر مستقل ہے۔

فذهب علمائنا رحمهم الله أن كل حيلة يحتال بها الرجل لإبطال حق الغير، أو لإدخال شبهة فيه، أو لتمويه باطل، فهو مكروهة، وفي العيون، وفي جامع الفتاوى: لا يسعه ذلك. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الحيل، الفصل الأول، زكريا ١٠/ ٣١١، رقم: ١٤٨٤٥، هندية، زكريا قديم ٦/ ٣٩٠، جديد ٦/ ٣٩٣)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۳۶)

گرام سماج کی زمین پر مدرسہ کی رقم سے دوکان بنانا

سوال [۸۵۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ایک آراضی جو قبرستان سے ملحق ہے؛ لیکن قبرستان میں شامل نہیں ہے، جس کے مقدم میں روڈ ہے؛ لہٰذا دیگر شخص اس پر قابض بھی نہیں ہوسکتا ہے، جس سے کوڑی وغیرہ کا کام لیا جارہا تھا، آج تک نہ تو اس میں کوئی قبر بنائی گئی ہے اور نہ ہی اس میں کسی کو دفن کیا گیا ہے، بطور تحقیق معلوم ہوا کہ آراضی گرام سماج کی ہے، جس میں مدرسہ کی رقم سے مفاد مدرسہ کو مدنظر رکھتے ہوئے دوکانوں کی بنیاد اندازی کردی گئی ہے، تو یہ شریعت کی روشنی میں جائز ہے یا نہیں؟

(۲) اور اس بنیاد پر مدرسہ کی رقم سے دوکانوں کی تعمیر کر کے مدرسہ کی ملکیت میں شامل کرنا کیسا ہے؟ جائز ہے یا نہیں؟

(۳) اور اسی جگہ پر بطور چندہ دوکانوں کا تعمیر کرنا اور ان دوکانوں کی آمدنی کو مدرسہ اور قبرستان میں خرچ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: شمشاد عالم، فیض العلوم موضع لانیا کھیڑ، پوسٹ بڈھن پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قبرستان سے ملحق زمین جو قبرستان میں شامل نہیں ہے اور تحقیقات سے معلوم بھی ہوگیا ہے کہ یہ گرام سماج کی زمین ہے، تو ایسی زمین میں مدرسہ کی رقم سے دوکانوں کی جو بنیاد رکھی گئی ہے، ان کا جواز گرام سماج کی اجازت پر موقوف ہے؛ کیوں کہ گرام سماج اس کا مالک ہے؛ لہٰذا گرام سماج اگر اجازت دے دے تو جائز ہوگا، ورنہ نہیں۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۸/۴۶۱)

نیز مدرسہ کی رقم سے دوکانوں کی تعمیر کرنا اس وقت جائز ہوگا، جب کہ چندہ دہندگان کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ اور گرام سماج کی اجازت بھی ہو۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ قدیم ۱۰/ ۲۳۶، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۵۹۵)

پھر مدرسے کی آمدنی کے پیش نظر بطور چندہ دوکانوں کی تعمیر کرانا بھی گرام سماج کی اجازت پر موقوف ہوگا، اگر گرام سماج اجازت دے دے تو اس کی آمدنی مدرسہ اور قبرستان میں خرچ کرنا جائز ہوگا۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ٨/ ٤٦١)

عن أبي حرة الرقاشي، عن عمه، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل مال رجل مسلم لأخيه، إلا ما أعطاه بطيب نفسه. (السنن الكبرى للبيهقي، باب أهل البغي إذا فاؤا ...... دارالفكر ١٢/ ٣٥٢، رقم: ١٧٢٢٤)

الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل، وقد أمره بالدفع إلى فلان، فلا يملك الدفع إلى غيره. (شامي، كتاب الزكوة، زكريا ٣/ ١٨٩، كراچی ٢/ ٢٦٩، شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ٢/ ٤٧٧، رقم المادة: ١٤٥٧)

صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة. (شامي، الوقف، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة۔ زكريا ٦/ ٦٦٥، كراچی ٤/ ٤٤٥)

شرط الواقف كنص الشارع في وجوب العمل به، وفي المفهوم والدلالة. (قواعد الفقه أشرفي، ص: ٨٥، رقم: ١٥٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٣ رمحرم الحرام ١٤٢١ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٤/ ٦٤١٥)

مسجد کے لئے مدرسہ سے قرض لینا

سوال [٨٥٢٠]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مسجد کا امام ہے اور مسجد کے اندر کام کرانے کی وجہ سے رقم مدرسہ سے بطور قرض لے کر وہ کام کرادیا، یا مدرسہ نے مسجد سے بطور قرض لے کر اینٹ یا روپیہ یا فرش یا دیوار وغیرہ میں صرف کردیا، تو اس صورت میں قرض لینا مسجد یا مدرسہ کو جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عمران الحق، خادم معارف القرآن، گڑھی بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر قرض وصول ہونے کا اعتماد ہو ضائع ہونے کا احتمال نہ ہو تو منتظمہ کمیٹی کے مشورہ سے مسجد کے لئے مدرسہ سے قرض لینا اور مدرسہ کے لئے مسجد سے قرض لینا درست ہے، تنہا امام کو حق نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱/ ۴۹۱، ڈابھیل ۱۵/ ۵۰۴)

للمتولي إقراض مال المسجد بأمر القاضي. (شامي، كتاب القضاء، مطلب للقاضي إقراض مال اليتيم و نحوه، زكريا ۸/ ۱۱۱، كراچی ۵/ ۴۱۷) **فقط واللہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ذیقعدہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۸۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۱۱/ ۱۴۲۳ھ

مدارس کی رقم تجارت کے لئے دینا

سوال [۸۵۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک کمپنی شہر کی مساجد ومدارس کو دعوت دیتی ہے، کہ آپ ہماری کمپنی میں حصہ داری کریں، اگر آپ (مساجد ومدارس کے ذمہ دار) ہماری کمپنی میں ایک لاکھ روپیہ سرمایہ لگاتے ہیں، تو کمپنی دو ماہ کے بعد ہر ماہ ۷ سے ۸/ ہزار روپئے منافع کی شکل میں دے گی، جس کا معاہدہ سات سال کا ہوگا، سات سال تک کمپنی ۸/ ہزار، ۷/ ہزار روپئے مہینہ کے حساب سے تقریباً ۸۴/ ہزار سے ۹۶/ ہزار روپئے تک کا منافع ایک سال میں ادا کرے گی، اس طرح سات سال میں ۵/ لاکھ ۸۸/ ہزار سے ۶/ لاکھ ۲۷/ ہزار روپئے تک کمپنی مساجد ومدارس کو ادا کرے گی اور مدارس ومساجد کا ابتداء میں جمع کیا ہوا اصل سرمایہ اپنی جگہ قائم رہے گا، اور اگر ان سات سال میں کمپنی کو نقصان ہوتا ہے، تو وہ نقصان صرف کمپنی برداشت کرے گی، اس نقصان میں سے مساجد ومدارس کو کوئی نقصان برداشت نہیں کرنا پڑے گا، تو کیا اس طرح

مساجد ومدارس کا کسی تجارتی کاروبار میں سرمایہ لگا کر منافع کمانا درست ہے؟ شریعت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی: مولوی محمد الطاف کرن احمد نگر، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مساجد ومدارس کی رقم متولی اور مہتمم کے پاس امانت ہوتی ہے اور امانت میں امین کی منشا کے خلاف تصرف کرنا جائز نہیں؛ لہٰذا مساجد ومدارس کی رقم تجارت کے لئے دے کر اس سے منافع حاصل کرنا جائز نہیں۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۱۵/ ۲۸۹، ڈابھیل ۱۵/۵۰۲)

ولا يجوز للقيم شراء شيء من مال المسجد لنفسه، ولا البيع له، وإن كان فيه منفعة ظاهرة للمسجد –إلى– ليس للمتولي إيداع مال الوقف والمسجد إلا ممن في عياله، ولا إقراضه، فلو أقرضه ضمن. (البحرالرائق، كتاب الوقف، كوئٹه ٥/ ٢٣٩، زكريا ٥/ ٤٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۲/۶۱۷۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۵/۲۶ھ

الفصل الثامن: في المشاهرة (تنخواہ)

کیا مہتمم مدرسین کے مقابلہ میں دوگنی تنخواہ لے سکتے ہیں؟

سوال [۸۵۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا دورحاضر میں مہتمم مدرسہ مدرس اعلیٰ سے دوگنی تنخواہ لے سکتا ہے، جب کہ وہ دن رات مدرسہ کے لئے جدوجہد کرے؟

المستفتی: عبداللہ عاصی، جامعہ اسلامیہ دارالعلوم قاضی باغ کاشی پور، ادھم سنگ نگر (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مدرسہ کا مہتمم مطلقاً مدرس اعلیٰ سے دوگنی تنخواہ نہیں لے سکتا؛ بلکہ اپنے کام اور خدمت کے بقدر جتنا مجلس شوریٰ نے مقرر کر دیا ہے اتنا ہی لے گا۔

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي بيروت ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٣، رقم: ٢٨٦٩، المستدرك للحاكم، كتاب الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز، بيروت ٧/ ٢٥٢٣، رقم: ٧٠٥٩، قديم ٤/ ١٠١)

إن للمتولي أجر مثل عمله، وفي الشامية: ليس للمتولي أخذ زيادة على ما قرره له الواقف. (درمختار مع الشامي، كتاب الوقف، مطلب فيما يسمى خدمة وتصديقا في زماننا، كراچی ٤/ ٤٥١، زكريا ٦/ ٦٧٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/۳/۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۵۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/۳/۱۴۲۱ھ

موجودہ دور میں تنخواہ میں زیادتی کا مطالبہ کرنا

سوال [۸۵۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مساجد کے ائمہ کرام اور مدارس کے معلمین کرام ان بے چاروں کو امامت وتعلیم کے بعد اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ کچھ اور کر کے اپنے اخراجات کی تکمیل کرسکیں؛ کیوں کہ انہیں اپنے کام کی تنخواہیں بہت کم ملتی ہیں؛ لہٰذا وہ اپنے گذارے اور اہل خانہ کے اخراجات کے لئے کیا شکل اختیار کریں، اگر یہ لوگ تنخواہ میں اضافہ کی مانگ کریں تو لوگ ان کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ اپنے منہ سے تنخواہ مانگتے ہیں، آج کل اس طرف سے بڑی غفلت برتی جارہی ہے، ہزار آٹھ سو روپیہ ماہانہ مشکل سے ملتا ہے، اس میں بھی ہفتہ دو ہفتہ کی تاخیر ہوجاتی ہے؛ لہٰذا شریعت کی رو سے آج کے اس مہنگائی کے زمانہ میں ان کی تنخواہ کیا ہونی چاہئے؟ شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟ اس کے مدنظر عوام الناس ان حضرات کو رمضان المبارک میں نذرانہ وہدیہ دیتے ہیں، تاکہ اس قلیل اور کم تنخواہ کی بھرپائی ہوسکے، تاکہ یہ بے چارے بھی اپنے اور اپنے اہل وعیال کے اخراجات کو پورا کرسکیں اور اطمینان اور سکون کی زندگی گذار سکیں؛ لیکن نیم ملا نے نئے نئے فتویٰ لے کر اس کی بھی مخالفت کی؟

المستفتی: منجانب اتحاد المسلمین گھر کون، ایم پی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: موجودہ زمانہ کی گرانی اور مہنگائی سب کے سامنے ہے، ہزار بارہ سو روپیہ، دو ہزار روپیہ ضروریات زندگی کے کسی ایک پہلو کو پورا کرنے کے لئے کافی نہیں، جس کے گھر میں دو چار بچے ہوں تو ہزار بارہ سو روپیہ کا دودھ تو یہی بچے پی لیتے ہیں؛ اس لئے مہنگائی اور گرانی کے اعتبار سے مدارس کے تمام مدرسین، ملازمین اور ائمہ مساجد کی تنخواہیں بڑھنی لازمی ہے، نیز جو اساتذہ باصلاحیت، محنتی اور تجربہ کار ہیں، ان کی تنخواہیں دوسروں کے مقابلہ میں نمایاں طور پر زائد ہونی چاہئیں، مدارس اسلامیہ کے ذمہ داروں کو اس

معاملہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سنت کو اپنانا چاہئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی طرح کا قانون بنایا تھا، ملاحظہ فرمائیے:

فلما توفي أبو بكر –رضي الله عنه– واستخلف عمر، فتحت عليه الفتوح، وجاء هم مال أكثر من ذلك، فقال: كان لأبي بكر –رضي الله عنه– في هذا المال رأي، ولي رأى آخر، رأي أبو بكر أن يقسم بالسوية، ورأيت أن أفضل المهاجرين والأنصار، ولا أجعل من قاتل رسول الله صلى الله عليه وسلم كمن قاتل معه، ففضل المهاجرين والأنصار، فجعل لمن شهد بدرا منهم خمسة آلاف، ومن كان له إسلام مع إسلامهم، إلا أنه لم يشهد بدرا أربعة آلاف أربعة آلاف، وللناس على قدر إسلامهم ومنازلهم.

(شرح معاني الآثار، كتاب وجوه الفيء، بيروت ۳/ ۲۲۸، رقم: ٥٣١٤)

فلما كان عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– وجاء الفتوح فضل، وقال: لا أجعل من قاتل مع غير رسول الله ﷺ كمن قاتل، ففرض لأهل السوابق والقدم من المهاجرين والأنصار ممن شهد بدرا أو لم يشهد بدرا أربعة آلاف درهم، وفرض لمن كان إسلامه كإسلام أهل بدر دون ذلك أنزلهم على قدر منازلهم من السوابق انتهى. وفي القنية: من باب ما يحل للمدرس والمتعلم كان أبوبكر –رضي الله عنه– يسوى بين الناس في العطاء من بيت المال، وكان عمر –رضي الله عنه– يعطيهم على قدر الحاجة، والفقه، والفضل، والأخذ بما فعله عمر –رضى الله عنه– في زماننا أحسن. (الأشباه والنظائر، قديم ۱۸۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رجمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۵۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۲۲ھ

شرط فاسد لگا کر تنخواہ بڑھانا

سوال [۸۵۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گذشتہ ایام ہمارے مدرسہ کی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس ہوا، اساتذۂ مدرسہ نے مجلسِ شوریٰ سے یہ درخواست کی کہ مسلسل بڑھتی ہوئی گرانی کے پیش نظر تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے، اس درخواست پر شوریٰ نے یہ قرارداد منظور کی کہ اساتذہ کی تنخواہوں میں مبلغ ۳۰۰/ روپئے کا اضافہ اس شرط پر کیا جاتا ہے کہ اساتذہ اپنی تنخواہوں کی دوتہائی رقم مدرسہ میں چندہ کر کے جمع کریں، مثلاً اگر کسی استاذ کی سالانہ تیس ہزار ہوتی ہے تو بیس ہزار روپئے جمع کرنا ضروری ہے، اس سے کم چندہ کرنے پر وہ اضافہ کی رقم کا مستحق نہیں ہوگا، جب کہ کسی مدرس کا تقرر چندہ کی شرط پر نہیں ہے؛ بلکہ صرف تعلیم وتدریس کے لئے ہے، نیز دستور مدرسہ میں چندہ کی ذمہ داری اربابِ انتظام کی ہے، تاکہ اساتذہ کی ذمہ داری صرف درس وتدریس رہے۔ آنجناب فرمائیں کہ یہ قرارداد از روئے شرع جائز ہے؟ اور کیا اساتذۂ مدرسہ مجلس شوریٰ سے یہ شرط ختم کرنے کی درخواست کرسکتے ہیں؟

المستفتی: اساتذہ مدرسہ رحمانیہ ٹانڈہ بادلی، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط کا سارامدار ذیل کی حدیث پاک پر ہے:

الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، وهكذا في المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي بيروت ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب

العلمية بيروت ٣/ ٢٣، رقم: ٢٨٦٩، المستدرك للحاكم، كتاب الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز، بيروت ٧/ ٢٥٢٣، رقم: ٧٠٥٩، قديم ٤/ ١٠١)

اسی حدیث پاک سے دینی اداروں کےقوانین مستنبط ہوتے ہیں۔سوال نامہ میں اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کوامر متردد فیہ کےساتھ معلق اورمشروط کیا گیا ہے، یہ شرط فاسد ہے، مذکورہ حدیث شریف کی روشنی میں مدارس اسلامیہ کےقوانین مستنبط ہوتے ہیں؛ لیکن اس حدیث میں شرط فاسداور ناجائزشرط لگانے کی ممانعت بھی موجود ہے؛ اس لئےمجلسِ شوریٰ نےتنخواہوں میں اضافہ کے لئے اساتذہ پرجو شرط رکھی ہے وہ ناجائز اورممنوع شرط ہے، اسے ختم کرنا ضروری ہے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ
۱۵/ربیع الاول ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۲۹۶/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۳/۱۶ھ

سائنس سےانٹر پاس اور ہندی کے مدرس کوگورنمنٹ سےتنخواہ دلانا

سوال [۸۵۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گورنمنٹ نے ان دینی مدارس کے لئے جوگورنمنٹ سےمنظورشدہ ہیں، ہرایسے مدرسہ کے لئے ایک مدرس کی تنخواہ تین ہزار روپیہ ماہوار دینے کا اعلان کیا ہے، جوسائنس سے انٹر پاس ہواور ہندی کا مدرس ہو،مذکورہ مدرس کوگورنمنٹ کی جانب سےتنخواہ دلانے میں کیا مضائقہ ہے؟ اگرمضائقہ ہےتو تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

المستفتی: مہتمم مدرسہ ضیاءالاسلام ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اکابردارالعلوم اورمظاہرعلوم اوراکابرشاہی کی ہدایت ہے کہ حکومت کی طرف سےکوئی تعاون نہ لیاجائے،اگر سرکاری تنخواہ کےساتھ مدرس رکھا جائے گا توبعد میں ممکن ہے کہ سرکار کی طرف سے مداخلت کا سلسلہ شروع ہوجائے، یہی مضائقہ

ہے، نیز ایک مضائقہ اور بھی ہے کہ سرکار کی طرف سے ایک مدرس کا اعلان ہے اور منجانب مدرسہ چار پانچ امیدوار کی شکل میں کھڑے ہیں، ان میں آپس میں اختلافات وتنازعات کا سلسلہ شروع ہوجائے ،بعض جگہ ایک جگہ کے امیدوار دو شخص ہوگئے اور دونوں کی برادری اور خاندانی دوفریق بن گئے اور ممبران شوریٰ میں بھی دوفریق ہوگئے ،جس کے نتیجہ میں ماحول میں ایک طوفان سا برپا ہوگیا، جانبین میں سخت گرما گرمی ہوگئی ،کئی مہینہ تک یہ سلسلہ جاری رہا، یہ دوسرا مضائقہ ہے؛ اس لئے منجانب سرکار تنخواہ دار ملازم مدرسہ میں نہ رکھا جائے۔ (مستفاد: امداد المفتیین / ۱۰۱۹)

قال اللہ تعالی: وَعَسَى اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَعَسَى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَكُمْ. [سورة البقرة، آیت: ۲۱۶] **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۵ / جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۳۸۵)	۱۴۲۵/۵/۲۵ھ

مدرسہ کے ناظم کا مدرس کی تنخواہ نہ دینا

سوال [۸۵۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مدرسہ کا ملازم ہے، مدرسہ کے ناظم کے پاس بجنور کے اجتماع میں جانے کے لئے چھٹی کی درخواست لے کر گیا، سات مہینے گذرنے کے بعد پہلی چھٹی کی درخواست ہے، جس پر ناظم مدرسہ نے سخت برہمی کا اظہار کیا، ناظم مدرسہ کی سخت کلامی سن کر زید نے اسی وقت استعفیٰ بھیج دیا، اب مدرسہ کے ذمہ زید کی آٹھ دن کی تنخواہ باقی ہے؟ ناظم مدرسہ نے تنخواہ دینے سے انکار کردیا ہے، از روئے شریعت بتائیے، زید کی تنخواہ مدرسے کے ذمہ واجب ہے یانہیں؟ تنخواہ نہ دینے کی صورت میں ناظم مدرسہ سے قیامت کے دن باز پرس ہوگی یانہیں؟ اور یہ حقوق العباد میں داخل ہے یانہیں؟

المستفتی: رئیس احمد، دڑھیال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس مدرسہ سے متعلق سوال لکھا گیا ہے، اس مدرسہ کا قانون اور ضابطہ کیا ہے؟ معلوم ہوجاتا تو بہتر تھا، اگر اس مدرسہ میں ملازم کے رکھنے اور علیحدہ ہونے سے متعلق کوئی قانون اور ضابطہ پہلے سے بنا ہوا نہیں تھا، تو مذکورہ ملازم سوال نامہ میں لکھی ہوئی آٹھ دنوں کی تنخواہ کا مستحق ہے، جن میں اس نے مدرسہ کی خدمت انجام دی ہے اور تنخواہ نہ دینے کی صورت میں ناظم مدرسہ سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے دربار میں باز پرس ہوگی۔ اور اگر اس مدرسہ میں اس بارے میں کوئی قانون اور ضابطہ بنا ہوا ہے، تو اسی ضابطہ کے مطابق حکم شرعی ثابت ہوگا۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ألا ! لا تظلموا، ألا ! لا تظلموا، ألا ! لا تظلموا إنه لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه. (مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٧٢، رقم: ٢٠٩٧١، دارقطني، البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٢، رقم: ٢٨٦٣)

المسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (ترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي بيروت ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠، دارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٣، رقم: ٢٨٦٩، المستدرك للحاكم، كتاب الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز، بيروت ٧/ ٢٥٢٣، رقم: ٧٠٥٩، قديم ٤/ ١٠١)

الأجير الخاص يستحق الأجرة إذا كان في مدة الإجارة حاضرا للعمل. (شرح المجلة، كتاب الإجارة، اتحاد بك ڈپو ديوبند ٦/ ٢٣٩، رقم: ٤٢٥)

الأجرة إنما تكون في مقابلة العمل. (شامي، كتاب النكاح، باب المهر، كراچی ٣/ ١٥٦، زكريا ٤/ ٣٠٧)

لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي.

(شامي، کتاب الحدود، مطلب في التعزیر بأخذ المال، کراچی ٤/ ٦١، زکریا ٦/ ١٠٦، البحرالرائق، کوئٹه ٥/ ٤١، زکیا ٥/ ٦٨، هندیة، زکریا قدیم ٢/ ١٦٧، جدید ٢/ ١٨١)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۳۹۸/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۵/۴ھ

مقررہ تنخواہ سے کم دینے کا حکم

سوال [۸۵۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مدرس کے تقرر کے وقت مہتمم مدرسہ سے ماہانہ تنخواہ سولہ سو طے ہوتی ہے، پھر رجسٹر میں درج کرنے کی باری آتی ہے تو تنخواہ پندرہ سو روپیہ لکھی جاتی ہے، جب اعتراض کیا گیا تو جواب ملا کہ آپ کو تنخواہ سے مطلب ہے؟ چنانچہ یہ تنخواہ سال کے اختتام پر تیرہ سو رمضان کی ڈبل کے اعتبار سے وصول ہو جاتی ہے، پھر دوسرا سال گذر جانے کے بعد جب اس تنخواہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے، تو مہتمم مدرسہ سے یہ جواب ملتا ہے کہ ہم چھوٹے ہیں، ہم نہیں دے سکتے جو رجسٹر میں موجود ہے وہی دے سکتے ہیں، اس کے علاوہ نہیں دے سکتے، تو کیا اس صورت میں مدرس دو سال کی تنخواہ کا یا ایک سال کی تنخواہ کا مستحق ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ارشاد قاسمی

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب آپس میں یہ شرط طے ہوگئی کہ سولہ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ رہے گی، تو وہ مدرس سولہ سو روپیہ ماہوار کا مستحق ہے۔ اور جو مقدار اس میں رہ گئی ہے وہ مدرس کا حق ہے، اس کی ادائے گی ذمہ دارانِ مدرسہ پر لازم ہے؛ اس لئے کہ آپس کی طے شدہ شرائط کی پابندی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق جانبین پر لازم ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۷/ ۲۸۴، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۴/ ۱۶۴، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۵۶۱)

المسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(ترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، وهكذا في البخاري، كتاب الإجارة، تحت ترجمة الباب، باب أجر السمسرة ١/ ٣٠٣، رقم الباب: ١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۶۹)

چندہ نہ کرنے کی صورت میں مدرس کو سابقہ تنخواہ نہ دینا

سوال [۸۵۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مدرسین حضرات دینی مدرسوں میں تعلیم دے رہے ہیں اور دیتے چلے آئے ہیں اور تعلیم دیتے رہیں گے؛ لہٰذا مدرس کو کمیٹی والے حضرات جب معلم کی حیثیت سے مدرسہ میں رکھتے ہیں تو مدرس سے کچھ شرائط رکھتے ہیں کہ ہماری یہ شرائط ہیں، مثلاً ٹائم کی پابندی کرنا یا چندہ کرنا یا کرانا، کہنا ضروری یہ ہے کہ کمیٹی والے حضرات نے مدرس کو رکھا جو شرائط اوپر کی عبارت میں درج ہیں وہ شرائط طے پائیں، ان شرائط میں مدرس صرف ایک شرط ادا کرسکا، چندہ کے بارے میں مدرس سے شروع میں پوچھا تھا کہ آپ کتنا چندہ کرسکیں گے؟ مدرس نے کہا تھا کہ میں صرف پینتالیس سو روپیہ کا چندہ کرسکتا ہوں، بہرحال مدرس نے صرف تعلیم ہی سہی وقت پر بچوں کو دیتے رہے، چندہ کسی مجبوری میں اگر نہ کرسکا یہاں تک کہ رمضان شریف میں ہر سال قرآن شریف نماز تراویح میں پڑھتا تھا، قرآن شریف بھی نہ پڑھا، کمیٹی نے مدرس کو رکھتے وقت یہ کہا تھا کہ اس وقت ہمارے پاس پیسہ نہیں ہے، رمضان میں چندہ ہوگا آپ کی تنخواہ مل جائے گی، کچھ آپ کریں گے اور کچھ ہم کریں، یا مدرس نے یہ بھی کہہ دیا کہ میں دس ہزار پندرہ ہزار کا چندہ دوں گا، وہ مجبوری میں ایسا گھرا کہ وہ چندہ بالکل نہ کرسکا، تو آیا اس

صورت میں مدرس کو تنخواہ کمیٹی دے یا نہ دے؟ کمیٹی کو تنخواہ روکنی جائز ہے یا ناجائز؟ مدرس کا دارومدار تنخواہ پر ہی ہے، چھ ماہ کی تنخواہ کمیٹی پر ہے، جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد عمران سرسواں دوراہہ کاشی پورروڈ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بوقت تقرر یہ کہنا کہ اس وقت مدرسہ میں پیسہ نہیں ہے رمضان میں چندہ بھی کرنا پڑے گا، جیسا کہ سوال نامہ سے واضح ہے، ۴۵۰۰ر کی ہمت ظاہر کی ہے یہ بھی سوال سے واضح ہے اور اس طرح کے شرائط اکثر مدارس کے اندر مدرسین کے تقرر کے وقت لگائے جاتے ہیں؛ لیکن اس طرح کے شرائط باوجودیکہ مدارس اسلامیہ میں متعارف ہیں؛ لیکن مدارس اسلامیہ کے اندر یہ بھی متعارف ہے کہ اگر کوئی شخص خاص مجبوری یا پریشانی کی وجہ سے چندہ نہ کرسکے تو اس کی اصل تنخواہ نہیں کاٹی جاتی، ہاں البتہ مدرسہ میں پیسہ نہ ہونے کی صورت میں تنخواہوں کی ادائے گی میں تاخیر ہوجاتی ہے؛ اس لئے سوال نامہ میں درج کردہ صورت میں مدرس چندہ نہ کرنے کی وجہ سے تنخواہ سے محروم نہ ہوگا، وہ پوری تنخواہ کا مستحق ہے؛ البتہ مدرسہ میں پیسہ نہ ہونے کی صورت میں کچھ تاخیر ہوسکتی ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاویٰ ۷/۲۸۴، امداد الفتاویٰ ۳/۳۶۱)

عن عبداللّٰه بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده أن رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي بيروت ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٢٣، رقم: ٢٨٦٩، المستدرك للحاكم، كتاب الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز، بيروت ٧/ ٢٥٢٣، رقم: ٧٠٥٩، قديم ٤/ ١٠١) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ربیع الاول ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۱۱۶)

مقررہ وقت میں کام کرنے پر تنخواہ کا استحقاق اور کوتاہی پر برطرف کرنا

سوال [۸۵۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک دینی تعلیمی ادارہ جس کے بعض مدرسین کی تنخواہ حکومت دے رہی ہے۔ اور بعض مدرسین کی تنخواہ مجلس منتظمہ بذریعہ عوامی امداد ادا کرتی ہے۔ سرکار کے ذریعہ تنخواہ پانے والے مدرسین میں ایک حافظ بھی ہے، جو قرآن پاک کو بھلا چکا ہے، ادارہ کے ناظم نے بارہا کوشش کی کہ وہ قرآن پاک کو پھر سے یاد کرلے؛ لیکن حافظ مذکور مسلسل آٹھ سالوں سے قرآن پاک کو پھر سے یاد کرلینے کی مہلت لیتا رہا، پھر بھی وہ اپنی یادداشت کو بحال نہ کرسکا، نتیجتاً مروجہ حفظ بے جان ہوکر رہ گیا ہے اور حافظ کی پیداوار لمبی مدت سے بند ہے، جب کہ ہندوستان جیسے آفت زدہ ملک میں حافظ کی پیداوار بہت ضروری ہے اور ہمارا قصبہ اور علاقہ دیندار حافظ سے محروم ہی ہے۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ حکومت حافظ کے عہدہ کے لئے رقم دیتی ہے اور شخص مذکور حافظ رہا نہیں اور اپنے عہدہ کو چھوڑنے کے لئے قطعی تیار نہیں ہے، مدرسین کی تقرری اور برخواستگی کا کلی اختیار ادارہ کے ناظم انتظامیہ کو حاصل ہے، مذکورہ عہدہ کو خالی کرا کر باصلاحیت حافظ کی بحالی کی غرض سے جب شخص مذکور کی برخواستگی کی کارروائی شروع کی جاتی ہے، تو لوگوں سے اپنی روزی روٹی کے لئے ہنگامہ کرواتا ہے اور ہتھیار اٹھانے کی دھمکی دیتا ہے، اس طرح دینی تعلیم کا ایک اہم شعبہ اس ادارہ میں زندہ نہیں ہو پا رہا ہے، تو کیا مذکورہ صورت میں حکومت کے ذریعہ حافظ کے عہدہ کے لئے ادارہ کو دی گئی رقم شخص مذکور کو دینا لینا شرعاً درست ہے؟

المستفتی: عبدالغفار سیتامڑی، بمعرفت سجاد حسین دارالعلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب وہ مفوضہ وقت میں کام کرے گا تو طے شدہ تنخواہ کا مستحق ہوجائے گا؛ لیکن ذمہ داری میں ناکامی کی صورت میں ذمہ داران مدرسہ کو برطرف

کرنے کا حق ہوسکتا ہے، مگر جب تک کام کرتا رہے گا تنخواہ مذکورہ کا مستحق رہے گا۔

عن عمرو بن يحيى المازني، عن أبيه أن رسول الله ﷺ قال: لا ضرر ولا ضرار. (موطا إمام مالك، كتاب القضاء، القضاء في المرفق، أشرفي ديوبند ٣١١)

لا يضر الرجل أخاه ابتداء ولا جزاء. الخ (الأشباه، قديم، ص: ١٣٩)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍رمضان ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۶۸۱)

مدارس ومساجد کے ملازمین کا سرکاری تنخواہ لینا

سوال [۸۵۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بہت سے اسکولوں، مدارس ومساجد کو تنخواہ سرکار دیتی ہے، اس کا لینا کیسا ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سرکار تو سود لیتی ہے، اور وہی سود تنخواہ میں ملا کر دیتی ہوگی، تو گویا سود لیا گیا پھر جب وہ اسکول ومدارس ومساجد والے اپنی واجبی ماہانہ تنخواہ لینے کے لئے متعلقہ سرکاری دفتر میں جاتے ہیں تو وہ ان سے رشوت لیتے ہیں، بغیر اس کے دیتے ہی نہیں، تو یہ رشوت دینا اور پھر اس میں سود کی رقم لینا جائز ہے یا نہیں؟ کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟

المستفتی: قمر الدین، مدرسہ قاسمیہ عربیہ جامع مسجد نگینہ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سرکاری تنخواہ مساجد ومدارس کے لئے لینا اس وقت جائز ہے جب کہ سرکاران لوگوں پر اپنا تسلط وغلبہ نہ جمائے۔ اور اگر تنخواہ لینے کے لئے سرکاری دفتروں میں رشوت وغیرہ دینی پڑتی ہے تو ایسی صورت میں ارتکاب حرمت کی وجہ سے لینا جائز نہ ہوگا۔ اور آج کل مدارس ومساجد کا سرکار سے ملحق کرنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ (مستفاد: نظام الفتاوی ۲/ ۳۷۵)

عن عبدالله بن عمرو قال: لعن رسول الله ﷺ الراشي والمرتشي. (سنن أبي داؤد، كتاب القضاء، باب في كراهية الرشوة، النسخة الهندية ۲/ ۵۰٤، دارالسلام، رقم: ۳۵۸۰، مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۱٦٤، رقم: ٦۵۳۲)

قال الفقيه أبو الليث: اختلف الناس في أخذ الجائزة من السلطان، قال بعضهم: يجوز ما لم يعلم أنه يعطيه من حرام، قال محمد رحمه الله تعالىٰ: وبه نأخذ ما لم نعرف شيئا حراما بعينه، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله تعالىٰ وأصحابه. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الثاني عشر في الهدايا و الضيافات، زكريا قديم ۵/ ۳٤۲، جديد ۵/ ۳۹٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۴۷۵)

پرائیویٹ فنڈ کا حکم

سوال [۸۵۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مدرسہ میں ملازم ہے اور تنخواہ سرکار سے ملتی ہے۔ اور قانوناً دس فیصد پرائیویٹ فنڈ کٹتا ہے اور فنڈ میں جمع ہوتا ہے، پھر سرکار اس دس فیصد پر مزید اضافہ کر کے دیتی ہے؛ لیکن زید اپنے اختیار سے مزید بیس یا پچیس فیصد پرائیویٹ فنڈ کٹواتا ہے اور سرکار اس پر بھی مزید اضافہ کے ساتھ رقم واپس دیتی ہے، تو سوال یہ ہے کہ دس فیصد جو قانوناً کٹتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ اور اپنے اختیار سے جو زیادہ کٹواتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ اور اس پر ملنے والی زائد رقم کا کیا حکم ہے؟ سود کے حکم میں داخل ہے یا نہیں؟ اور زید کا اپنے اختیار سے G.P.S زائد کٹوانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد طارق، مئو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسہ کے ملازم کی تنخواہ سے جو دس فیصد پرائیویٹ فنڈ کے نام سے سرکار کاٹ کراپنے پاس جمع کرتی ہے اوراس پر مزید اضافہ کر کے ریٹائرڈ ہوتے وقت دیتی ہے، یہ اضافہ شرعاً سود نہیں ہے؛ اس لئے اس کا لینا جائز ہے۔ اوراپنے اختیار سے جو کٹواتے ہیں، اس کی دوشکلیں ہیں:

(۱) تنخواہ کے پیسے اپنے اختیار سے قبضہ میں آنے کے بعد ازخود داخل کرے، اس پر ملنے والا اضافہ سود ہے، وہ جائز نہیں ہے۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ تنخواہ میں سے وہ حصہ اس کے ہاتھ نہیں آیا تو ملنے والا اضافہ جائز ہے؛ اس لئے کہ اس کے قبضہ میں آنے سے پہلے پہلے وہ مالک ہی نہیں ہوا ہے؛ اس لئے اصل اوراضافی دونوں قسم کی رقم پرائیویٹ فنڈ کے ہی حکم میں ہے، اس وجہ سے جائز ہے۔

(مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۱۵۲، پرائیویٹ فنڈ پرزکوۃ اور سود کا مسئلہ بحوالہ فتاوی عثمانی ۳/ ۳۰۷، ایضاح المسائل ص: ۱۰۷، کتاب المسائل ۲/ ۲۲۷) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵)

بلا اجازت مدرسے سے جانے والے کی تنخواہ کا حکم

سوال [۸۵۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مدرسہ میں استاذ تھا، اس نے ایک سال کے لئے رخصت بالوضع طلب کی؛ لیکن مدرسہ نے اس کی رخصت منظور نہیں کی؛ لیکن زید بلا منظوری ہی اپنی ضرورت سے چلا گیا؛ البتہ اسی دوران زید نے اسی مدرسہ کے لئے تقریباً ۷۰۰۰۰/ ہزار روپئے کا چندہ کیا، جس میں سے بقول زید آٹھ ہزار ایک سو اٹھاسی روپئے وصول نہ ہوئے اور پینتیس ہزار

روپئے یہ کہہ کر واپس لے لئے کہ مجھے ان کی ضرورت ہے، جب حساب ہوگا اس وقت دیکھا جائے گا، بعد ازاں مزید ۱۴۰۰۰/ ہزار روپئے قرض لئے، پھر جب اہل مدرسہ نے پینتیس ہزار روپئے کی واپسی کا مطالبہ کیا تو زید نے جواب دیا کہ ۲۴۰۰۰/ ہزار روپئے کا میرا انعام بنتا ہے۔ اور گیارہ ہزار سفر خرچ کے ہیں جو چندہ کی وصولیابی میں ہوا ہے، اس طرح پینتیس ہزار روپئے کا مطالبہ میری جانب نہیں ہے؛ لیکن زید سفر خرچ زبانی بیان کرتا ہے، تحریری طور پر نہیں دیتا، جب کہ مدرسہ کا تعامل سفر خرچ میں تحریری معتبر ہے، تاکہ رجسٹروں میں اندراج ہوسکے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) زید کا بلا اجازت مدرسہ سے جانا اور چندہ کی رقم میں انعام کا نفاذ و مطالبہ کیا زید کے لئے شرعی طور پر درست ہے؟ پھر کیا مہتمم کے لئے اس انعامی رقم کا دینا اور زبانی سفر خرچ منظور کرنا شرعاً درست ہے؟ لہٰذا زید پینتیس ہزار روپئے کے مطالبہ کی نفی جس شکل میں کرتا ہے، کیا وہ قابل تسلیم ہے؟

(۲) آٹھ ہزار ایک سو اٹھاسی کی رقم کس پر واجب الاداء ہے، زید پر یا چندہ دہندگان پر جیسا کہ زید کہتا ہے کہ یہ رقم مجھے ابھی وصول نہیں ہوئی ہے؛ لیکن زید اہل مدرسہ کو ان حضرات کا پتہ دینے پر آمادہ نہیں ہے؟

المستفتی: ڈاکٹر عبدالرؤف محلّہ دائم پورہ، ٹانڈہ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب زید مدرسہ سے اجازت لئے بغیر ایک سال سے غائب ہوگیا، تو اس درمیان زید مدرسہ سے تنخواہ کا مستحق نہیں اور اس دوران جو اس نے ۷۰۰۰۰/ ہزار کا چندہ کیا ہے، وہ پوری رقم مدرسہ میں جمع کردینا لازم ہے، اس کے بعد جتنے دن اس نے مدرسہ کا کام کیا ہے، اتنے دنوں تک کے لئے مدرسہ اس کو اجرت مثل دے گا اور اجرت مثل سے زائد کچھ بھی نہیں ملے گا، ہاں البتہ سارا پیسہ مدرسہ میں داخل ہونے کے بعد مدرسہ کی شوریٰ یا اس کے قائم مقام کمیٹی مدرسہ کی مصلحت ومفاد کو پیش نظر رکھ کر اس کی تنخواہ

کے ساتھ کچھ انعام بھی دے تو اس کی گنجائش ہے۔ لیکن شوریٰ وکمیٹی کی منظوری واجازت کے بغیر جائز نہیں ہے، نیز جب کہ زید اجازت ومنظوری کے بغیر سفر میں چلا گیا ہے، تو وہ سفر خرچ کا مستحق نہیں ہے، ہاں البتہ شوریٰ یا کمیٹی اپنے مشورہ سے کوئی مناسب خرچ مدرسہ کی مصلحت کی بنا پر متعین کرے، تو اس کی گنجائش ہوسکتی ہے؛ اس لئے کہ مدرسہ کے ضوابط وقوانین کا مدار عرف اور ان شرائط پر ہے جو شوریٰ وکمیٹی نے متعین کی ہیں۔

عن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، هكذا في البخاري، كتاب الإجارة، تحت ترجمة الباب، أجر السمسرة، النسخة الهندية ١/ ٣٠٣، رقم: الباب: ١٤)

(۲) اور زید کا آٹھ ہزار ایک سو اٹھاسی کے بارے میں یہ کہنا کہ اتنی رقم وصول نہیں ہوئی یہ زید کی تنخواہ اور کارکردگی میں سے کاٹ کر اس وقت تک روک لیا جائے گا، جب تک کہ وہ پیسہ لاکر داخل دفتر نہ کردے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح:	کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ	۱۵/ ذیقعدہ ۱۴۲۱ھ
۱۵/۱۱/۱۴۲۱ھ	(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۵۸)

مدرس کی تقرری کے بعد بلاعوض نگرانی پر مجبور کرنے کا حکم

سوال [۸۵۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مدرسہ میں مدرس ہے اور درجہ حفظ میں بچوں کو پڑھاتا ہے، جب کہ زید مغرب کے بعد اور عشاء کے بعد اور فجر سے پہلے فجر کے بعد نگرانی کبھی کبھی نہیں کرتا ہے اور

کبھی کرتا ہے۔اور بکر اس مدرسہ کا صدر مدرس ہے اور بار بار کہتا ہے کہ درجہ حفظ کے بچوں کے استاذ کو ان تینوں وقت کی پابندی ضروری ہے، جب کہ تقرر کے وقت ان تینوں وقت کی کوئی بات نہیں ہوئی ہے، اس پر زید کہتا ہے کہ میرا احسان ہے کہ یہ وقت مدرسہ میں دے رہا ہوں، ورنہ میری اس وقت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، بکر کا کہنا ہے کہ ان تینوں وقت کی پابندی ضروری ہے، زید کا کہنا ہے کہ میری یہ ذمہ داری نہیں ہے، اس مسئلہ میں مدرسہ کا کیا اصول ہے وضاحت فرمائیں؟ کیا زید کو ان تینوں اوقات کی پابندی ضروری ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد عبداللہ ٹھا کردوارہ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب تقرر کے وقت تینوں اوقات کی نگرانی کرنے کا کوئی تذکرہ اور صراحت نہیں ہے، تو ان اوقات کی نگرانی پر مجبور کرنا ناانصافی ہے اور ہمارے مدرسہ شاہی میں اصول یہ ہے کہ حفظ کے اساتذہ مغرب سے عشاء تک اور فجر کے بعد نگرانی کرتے ہیں؛ لیکن اس کا الگ سے انہیں معقول معاوضہ دیا جاتا ہے؛ اس لئے اگر آپ کے مدرسہ میں کوئی ایسا اصول نہیں ہے اور تینوں اوقات کی نگرانی بھی کرانا چاہتے ہیں، تو پھر آپ کو انہیں الگ سے الاؤنس دینا چاہئے اور مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط کا دار ومدار درج ذیل حدیث پر ہے:

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي بيروت ۱۷/ ۲۲، رقم: ۳۰، سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب

العلمية بيروت ۳/ ۲۳، رقم: ۲۸٦۹، المستدرك للحاكم، كتاب الأحكام، مكتبه نزار مصطفى الباز، بيروت ۷/ ۲۵۲۳، رقم: ۷۰۵۹، قديم ٤/ ۱۰۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰؍صفر ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳٦/ ۷۹۱۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۲/۱۴۲۴ھ

حج کو جانے والے مدرس کے لئے رخصت بالوضع کا حکم

سوال [۸۵۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص مدرسہ کا ملازم ہے اور فریضۂ حج کے لئے سفر میں جارہا ہے، اس صورت میں رخصت اس کو مدرسہ دے گا یا بالوضع رخصت استاذ لے گا، تفصیل کے ساتھ شریعت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمادیا جائے۔

المستفتی: عبدالرحمٰن، ٹانڈہ رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: ایک دفعہ حج کو جانے کے لئے منجانب مدرسہ رخصت دینا متعارف ہے؛ اس لئے رخصت منجانب مدرسہ سمجھی جائے گی اور جن مدارس میں رخصت کی صراحت نہ ہو ان کو بھی عرف کی وجہ سے انہیں مدارس پر قیاس کیا جائے گا، جن میں منجانب مدرسہ حج فرض کی رخصت دی جاتی ہے؛ لہٰذا حج فرض کی رخصت کو رخصت بالوضع قرار نہ دیا جائے۔ اور مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط اس حدیث سے مستنبط ہیں۔

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲)

ومنها: البطالة في المدارس كأيام الأعياد ويوم عاشوراء، وشهر رمضان في درس الفقه لم أرها صريحة في كلامهم، والمسئلة على وجهين، فإن كانت مشروطة لم يسقط من المعلوم شيء، وإلا فينبغي أن يلحق ببطالة القاضي إمام يترك الإمامة لزيارة أقربائه في الرساتيق أسبوعا، أونحوه، أو لمصيبة، أو لاستراحة لا بأس به، ومثله عفو في العادة والشرع.
(الأشباه والنظائر، قديم ۱/ ۱۰۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/۱۱/۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۳۹۳/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/۱۱/۱۴۲۲ھ

گورنمنٹ سے روپیہ لے کر مدرسین کو تنخواہ دینا

سوال [۸۵۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حکومت تعلیمی امداد کے نام پر جو روپئے مدرسہ کو دیتی ہے اور جسے عرف عام میں ایڈ کہا جاتا ہے، اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور کیا اس کے عدمِ جواز کی دلیل صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ چونکہ یوپی کے مدارس ایڈ نہیں لیتے، مثلاً مدرسہ شاہی مرادآباد، مظاہر علوم سہارنپور، دارالعلوم دیوبند وغیرہ ایڈ نہیں لیتے؛ اس لئے ہمیں بھی لینا جائز نہیں ہے، جب کہ صحیح صورت حال یہ ہے کہ ایڈ لینے سے قبل ہمارے علاقہ کے مدارس میں اتنی قلیل اور معمولی تنخواہ ہوتی تھی جو کسی طرح بھی کافی اور تسلی بخش نہیں کہی جاسکتی، اس کے برعکس مذکورہ بالا مغربی مدارس میں اس وقت بھی تنخواہیں انتہائی مناسب اور اطمینان بخش ہوتی تھیں، جس کے سبب ایک مدرس ہر طرف سے فارغ البال ہوکر یکسوئی کے ساتھ کام کرتا، ادھر کچھ سالوں سے یہ مشرقی مدارس سرکار سے ایڈ لینے لگے ہیں، جس کے طفیل مدرسین کے اندر فرائض منصبی کو بحسن خوبی انجام دینے کے لئے ایک گونہ سکون میسر ہوگیا ہے اور بڑی حد تک دینی تعلیم کی

طرف سے پرانی بےتوجہی دور ہوگئی ہے، لوگ شوق سے اپنے بچوں کو پڑھانے بھی لگے ہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایڈ لینا، اسی طرح مدرسہ کے لئے مصرف میں خرچ کرنا اوراس سے مدرسین کوتنخواہ دینا جائز ہے یانہیں؟

المستفتی: ظہیرالحق نعمانی، کوپا گنج اعظم گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگرحکومت مدرسہ میں کسی بھی وقت دخل نہ دینے کاوعدہ کرے اورارباب مدرسہ کوبھی اس بارے میں اطمینان ہو،تو گورنمنٹ سے ایڈ لینا اوراس کو تنخواہوں اوردوسری ضروریات میں صرف کرنادرست اور جائز ہے، ورنہ احتراز لازم ہے۔ (مستفاد: امدادالفتاوی ۴/ ۷۷، کفایت المفتی قدیم ۷/ ۱۰۱، جدید زکریا مطول ۱۰/ ۴۷۹، فتاوی مظاہرعلوم ۱/۴۷۱، نظام الفتاوی ۲/۳۷۴)

قال الفقیه أبو اللیث: اختلف الناس في أخذ الجائزة من السلطان، قال بعضهم: یجوز ما لم یعلم أنه یعطیه من حرام، قال محمد رحمه الله تعالیٰ: وبه نأخذ ما لم نعرف شیئا حراما بعینه، وهو قول أبي حنیفة رحمه الله تعالیٰ وأصحابه. (هندیة، کتاب الکراهیة، الباب الثاني عشر في الهدایا و الضیافات، زکریا قدیم ٥/ ٣٤٢، جدید ٥/ ٣٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ
۲/۵/۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۲۱۴/۲۴)

بمد تعمیر رقم کوتنخواہ میں استعمال کرنا

سوال [۸۵۳۶]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مدرسہ میں صدر مدرس اورمعاون صاحب نے ناظم مدرسہ کی اجازت کے

بغیر بمد تعمیر رقم کو تنخواہ میں استعمال کرلیا، ناظم صاحب کے استفسار پر ان لوگوں نے غلطی کا اقرار کیا، معافی کے طالب ہیں، ایسی صورت میں حکم شرعی کیا ہے؟ بینوا توجروا

المستفتی: فیض الحسن، ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر تعمیر کی رقم کو مد تنخواہ میں خرچ کر دیا ہے، تو ایسی صورت میں مذکورہ صدر مدرس اور معاون کو تصرف میں خائن شمار کیا جائے گا؛ لیکن چونکہ مد تعمیر اور تنخواہ دونوں از قبیل امداد ہیں اور مذکورہ صدر مدرس اور معاون نے اپنی ذات میں خرچ نہیں کیا ہے؛ بلکہ ایک مصرف کی چیز کو دوسرے مصرف میں خرچ کرنے میں بدنظمی اور بددیانتی کا ثبوت دیا ہے؛ اس لئے اپنی جیب سے تاوان ادا کرنا لازم نہ ہوگا، ہاں البتہ ناظم صاحب اور اعلیٰ ذمہ داروں کو انہیں صدارت اور معاونت سے سبکدوش کرنے کا حق ہے؛ لیکن جب وہ معافی کے طلب گار ہیں تو ”**التائب من الذنب کمن لا ذنب له**“. **الحديث** (ابن ماجة، أبواب الـزهد، باب ذكر التوبة، النسخة الهندية/ ۳۱۳، دارالسلام، رقم: ۴۲۵۰) کی رو سے انہیں در گذر کر دینا چاہئے، نیز یہ بھی لازم ہے کہ مد تنخواہ میں سے اتنی رقم جتنی تنخواہ میں خرچ کی گئی ہے مد تعمیر میں منتقل کردی جائے، تاکہ دینے والے کی غرض کے مطابق مقصد میں خرچ ہوسکے۔ ”البحر الرائق“ کی ذیل کی عبارت سے یہ مسئلہ مستفاد ہوتا ہے:

ولو جمع مالا لينفقه في بناء المسجد، فأنفق بعضه في حاجته، ثم رد بدله في نفقة المسجد لا يسعه أن يفعل ذلک، فإذا فعله وكان يعرف صاحبه ضمن له بدله، أو استاذنه في صرف عوضه في المسجد، وإن كان لا يعرفه، رفع الأمر إلى القاضي ليأمره بإنفاق بدله فيه، وإن لم يمكنه الرفع إليه قالوا: نرجوا له في الاستحسان الجواز إذا أنفق مثله في المسجد يخرج عن العهدة فيما بينه وبين الله تعالىٰ. (البحرالرائق، كتاب الوقف، فصل في أحكام المساجد، زكريا ۵/ ۴۲۰، كوئٹه ۵/ ۲۵۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ ۳۰ رجمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ (الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۹۸)	الجواب صحیح: احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ ۱۴۲۱/۵/۳۰ھ

غیر حاضری کی تنخواہ کا حکم

سوال [۸۵۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عمر ایک مسجد میں امامت اور اسی مسجد میں مکتب میں مدرس ہے، تقریباً دو سال سے ذمہ دار مکتب ان کی تدریسی ذمہ داری سے مطمئن نہیں ہیں، گذشتہ شعبان میں سالانہ امتحان کے نتیجہ کے بعد مکتب کے مدرس کو علیحدہ کردیا گیا، عمر (امام صاحب) اس کے بعد چالیس روز کے لئے جماعت میں چلے گئے اور عید کے بعد امام صاحب عمر نے اپنے دوبارہ مکتب میں مدرس ہونے کے لئے کچھ لوگوں کو ہموار کیا، لوگوں نے جب محسوس کیا کہ اگر ان کو مدرس نہ بنایا گیا تو ہم لوگوں میں اختلاف ہوجائے گا؛ لہٰذا امام صاحب عمر کو پھر نئی شرائط کے ساتھ مدرس کے طور پر تقرر کرلیا گیا؛ لیکن عمر امام صاحب تقریباً ڈیڑھ ماہ جو بقول ذمہ دار مکتب مکتب سے علیحدگی کے تئیں ان ایام کی تنخواہ کا مطالبہ کررہے ہیں، جب کہ مہتمم صاحب ان سے یہ کہہ رہے ہیں کہ میں تو ان کو شعبان میں علیحدہ کر چکا ہوں؛ لہٰذا دوبارہ تقرر کی مدت تک کی تنخواہ مکتب ادا نہیں کرے گا، اس تنخواہ کے سلسلہ میں کیا مسئلہ ہے؟ کیا ان کو دی جائے یا نہیں؟

المستفتی: امداد حسین ڈپٹی گنج، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارس، مکاتب، مساجد کی ملازمت کے شرائط آپس کی تراضی سے جو طے ہوجائیں وہی معتبر ہیں۔ اوران کا ضابطہ اوراصول اس حدیث پاک سے ثابت ہے:

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

معلوم ہوا کہ یہ بات حدیث سے ثابت ہے۔ واضح رہے کہ مدرسہ سے مذکورہ امام کو علیحدہ کردیا گیا ہے، اس کے بعد وہ جماعت میں چلا گیا ہے، اور پھر نئی تقرری کے بعد جماعت میں جانے کے درمیان کی غیر حاضری کی مدت کی تنخواہ کا مطالبہ کرنا یہ ان کی طرف سے ناجائز مطالبہ ہے، ذمہ داران اس مدت کی تنخواہ دینے کے مکلّف نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ رشوال ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۷۹۸)

مدرس کے ایام مرض کی تنخواہ ومجلسِ شوریٰ کی شرعی حیثیت

سوال [۸۵۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گزارش خدمت عالیہ میں یہ ہے کہ ہمارے یہاں ایک دینی قومی مدرسہ ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اس کا ایک دستور بن جائے جو خلاف شرع نہ ہو؛ اس لئے چند سوالات درج ذیل ہیں، ان کے کافی شافی شرعی احکام بتا کر عنداللہ ماجور ہوں۔ سوالات یہ ہیں:

(۱) مدرسہ کے کسی عامل کو اس کی بیماری کی وجہ سے غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ کا شرعاً استحقاق ہوگا یا نہیں؟

(۲) متفقہ طور پر یا اکثریت سے کسی کو ایسے حالات کی تنخواہ دی جائے تو یہ شرعاً درست ہوگا یا نہیں؟

(۳) کہیں کہیں ایک مہینہ یا ڈیڑھ مہینہ کی تنخواہ دینے کا دستور بنایا تو یہ جائز ہوگا یا نہیں؟

(۴) مجلس شوریٰ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(۵) مالیات میں ان کو کہاں تک تصرف کا حق حاصل ہے؟

(۶) مجلس شوریٰ عنداللہ ماجور یا ماخوذ یا جوابدہ ہوگی یا نہیں؟

نوٹ:- حتی الامکان جلد جواب مل جائے تو عین نوازش ہوگی۔ گستاخی معاف فرمائیں۔

المستفتی: بندہ عبداللطیف، خادم مدرسہ مرکز العلوم، ضلع کریم گنج، آسام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) مہتمم چندہ دہندگان کی طرف سے وکیل ہوتا ہے اور وکیل کو جس تصرف کی اجازت دی جائے اس میں تصرف کرسکتا ہے، اس کے علاوہ میں نہیں، اگر چندہ دہندگان کی طرف سے صراحتاً یا دلالۃً اختیار ثابت ہوجاتا ہے اور تقرر کے وقت ملازم کے ساتھ یہ شرط ٹھہرائی گئی ہے، تو ایام بیماری کی تنخواہ مہتمم کو دینا اور ملازم کو لینا دونوں جائز رہے گا، ورنہ نہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/۳۴)

(۲) سوال نمبر ۱ر کے جواب کی شرائط کے ساتھ گنجائش ہے ورنہ نہیں۔

(۳) چندہ دہندگان کی رضا سے ایسا قانون بنالینا درست ہے۔

الوكيل إنما يستفيد التصرف من الموكل وقد أمره بالدفع إلى فلان فلا يملك الدفع إلى غيره. (شامي، كتاب الزكوة، مطلب في زكوة ثمن المبيع وفاء كراچی ۲/ ۲۶۹، زكريا ۳/ ۱۸۹)

شرط الواقف كنص الشارع في وجوب العمل به، وفي المفهوم والدلالة. (قواعد الفقه، أشرفي ديوبند/ ۸۵، رقم: ۱۵۲)

أنهم صرحوا بأن مراعاة غرض الواقفين واجبة. (كتاب الوقف، مطلب مراعاة غرض الواقفين واجبة، كراچی ۴/ ۴۴۵، زكريا ۶/ ۶۶۵)

(۴) مجلسِ شوریٰ کو اقتدار اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہے، تفسیر ''البحر المحیط'' میں ''شاورہم فی الامر'' الآیۃ کے تحت لکھا ہے کہ شوریٰ شریعت اور دین کے قواعد اور بنیادی اصولوں میں سے ہے، جو امیر یا ذمہ دار اہل علم اور اہل دین سے مشورہ نہ لے اس کو معزول کرنا واجب ہے، یہ بالاتفاق مسئلہ ہے۔

(۵) مالیات میں جواب نمبر: ۱ر کی شرائط کے مطابق اختیار حاصل ہوگا۔

(۶) جواب نمبر ۱ر کی شرائط کی موافقت میں کوئی مواخذہ نہیں، مخالفت میں عنداللہ مواخذہ ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰ر شوال ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۲۶۹)

علالت کے زمانہ کی تنخواہ

سوال [۸۵۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں مدرسہ میں فراہمی مالیہ کے سلسلہ میں اصول وضابطہ مدرسین کے لئے یہ ہے کہ اگر رمضان میں کوئی مدرس اطراف مدرسہ میں وصولی کا کام کرتا ہے، تو اپنی تنخواہ کا بارہ گنا کرنے پر ڈبل تنخواہ کا مستحق ہوتا ہے، مزید پر پانچ فیصد کا انعام اور غیر معروف جگہ پر ڈبل تنخواہ پانے کے لئے اپنی تنخواہ کا دس گنا کرنا لازمی ہے، مزید پر پانچ فیصد کا انعام، مدرسہ ہذا میں دو بھائی ملازم ہیں، دونوں بھائیوں نے اپنی محنت سے مدرسہ کا ایک میدان بنایا، اتفاق سے ایک سال رمضان میں ایک بھائی کی طبیعت شدید خراب ہوئی، سفر کرنا ممکن نہ رہا، تو مہتمم صاحب کے حکم سے دوسرے بھائی نے اپنے اور بھائی کے علاقہ میں مکمل کام کیا، مہتمم مدرسہ ہذا نے یہ حکم فرمایا کہ بیمار بھائی کے علاقہ میں آپ رسید انہیں کے نام سے بنائیں اور بقلم لکھ کر اپنا نام لکھ دیں، تاکہ تنخواہ وانعام ان بیمار بھائی کے نام پر چڑھے اور ان کو احساس نہ ہو؛ کیوں کہ علاقہ انہیں کا بنایا ہوا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، بوقت حساب ایک پرانے مدرسہ کے ملازم محرر صاحب کا کہنا ہے کہ ایسا نہیں ہوگا؛ بلکہ جس نے کام کیا ہے صرف اس کو تنخواہ وانعام ملے گا، بیمار کو کچھ نہ ملے گا؛ کیوں کہ دونوں کو ملنے کی صورت میں ایک ہزار روپئے مدرسہ سے زائد جاتے ہیں۔ اور ایک کو ملنے کی صورت میں کم جاتے ہیں۔ بتلایئے محرر صاحب کا مہتمم صاحب کے سامنے یہ اشکال صحیح ہے، جب کہ یہ سب کچھ مہتمم صاحب کی صواب دید سے ہوا؟ اور شوریٰ کی طرف سے مہتمم صاحب بااختیار ہیں، شرعاً قانوناً معاملۃً رہنمائی فرماکر ممنون فرمائیں۔

المستفتی: صدر مدرس محمد سلیمان مصباح الظفر، ڈھکہ حسن پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اکثر مدارسِ اسلامیہ کا یہ دستور ہے کہ بیمار ملازم کو اس کی

تنخواہ دی جاتی ہے؛ لہٰذا جو بھائی بیمار ہوگئے، ان کو مدرسہ کی جانب سے صرف تنخواہ ملے گی، مزید رقم یا انعام کچھ بھی نہیں ملے گا اور دوسرے بھائی جو پورا کام کئے ہیں ان کو تنخواہ مزید رقم اور انعام سب ملیں گے، اور بیمار بھائی کے علاقہ سے جتنی رقم لائے ہیں سب میں پانچ فیصد کے حساب سے اس کارکن بھائی کو ملے گا اور محرر صاحب کا یہ اشکال کہ بیمار بھائی کو تنخواہ پر مزید رقم اور انعام دینے پر مدرسہ کا پیسہ زائد جائے گا جس کا وہ مستحق نہیں بجا ہے، انعام اور مزید رقم صرف اسی شخص کو ملے گی جو رقم لایا ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۵/ ۲۶۵، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۲۶۵)

إن العقد وقع على عملها فلا تستحق الأجر بعمل غيرها كمن استاجر أجيرا ليعمل بنفسه، فأمر غيره فعمل لم يستحق الأجرة. (بدائع الصنائع، كتاب الإجارة، باب استحقاق الأجرة، زكريا ديوبند ٤/ ٧١)

قال: الأجرة لا تجب بالعقد، وتستحق بإحدى معاني ثلاثة: إما بشرط التعجيل، أو بالتعجيل من غير شرط، أو باستيفاء المعهود عليه. (هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٩٤)

أمور المسلمين محمولة على الصلاح والسداد ما أمكن. (بدائع الصنائع، كتاب الصلح، فصل في الشرائط التي ترجع إلى المصالح، زكريا ٥/ ٥٢)

عن كثير بن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني عن أبيه، عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۸۲)

بیماری کے ایام میں گھر پر رہتے ہوئے تنخواہ لینے کا حکم

سوال [۸۵۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک ادارہ میں کام کرتا ہے اور مدت مدیدہ تک خدمات انجام دیتے رہے، مگر اب پیر میں چوٹ لگ جانے اور ہڈی ٹوٹ جانے کی وجہ سے کام سے معذور ہوگئے، جس کی وجہ سے ایک ماہ کی رخصت باتنخواہ حسب دستورادارہ ناظم ادارہ کی منظوری پر دی گئی، اس کے بعد دستور ادارہ کے مطابق مجلس شوریٰ نے دو ماہ کی رخصت باتنخواہ کی منظوری کا مشورہ دیا اوران کو دونوں مہینوں کی تنخواہ دی گئی، دستورادارہ میں شوریٰ کواختیار ہے کہ کسی ملازم ادارہ کو بوجہ بیماری یا کسی معذوری کی بنا پر رخصت باتنخواہ کی منظوری کا مشورہ دے دے، مگر اس میں اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ کتنی مدت تک ایسی منظوری دی جاسکتی ہے؛ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ از روئے شرع ایسے شخص کو جوادارہ کے کارمفوضہ سے معذور ہوگیا ہو، کب تک رخصت باتنخواہ دی جاسکتی ہے؟ اور جواس شخص کوتنخواہ دی گئی، اس کا دینا درست تھا یانہیں؟

المستفتی: محمد عبدالرحمٰن، مجلس دعوۃ الحق ہردوئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: آپ کے مدرسہ کا جوقانون ودستور ہے اس کے مطابق عمل ہوگا؛ لہٰذا جتنے ایام کی رخصت بیماری باتنخواہ دئے جانے کا قانون ہے یا مجلسِ شوریٰ جتنے ایام کی رخصت منظور کرے ان کی تنخواہ لینا شرعاً جائز اور درست ہے؛ اس لئے مجلسِ شوریٰ کے مشورہ سے پچھلی جوتنخواہ دی جاچکی ہے وہ شرعاً جائز اور درست ہے۔ اور آئندہ کے لئے مجلس شوریٰ جو درحقیقت مدارسِ اسلامیہ کے حق میں مجلسِ قانون ساز ہے، اس کے مشورہ کے مطابق عمل کرنا جائز ہوگا۔ اور مدارسِ اسلامیہ کے حق میں قوانین وضوابط، بخاری وترمذی کی اس حدیث شریف سے مستنبط ہوتے ہیں:

عن عبداللہ بن عمرو بن عوف المزني عن أبيه، عن جده أن رسول

الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.
(سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، صحيح البخاري، كتاب الإجارة، تحت باب أجر السمسرة ١/ ٣٠٣، رقم الباب: ١٤)

بخلاف ما إذا لم يقدر لكل يوم مبلغا، فإنه يحل له الأخذ، وإن لم يدرس فيهما للعرف. (شامي، كتاب الوقف، مطلب في استحقاق القاضي والمدرس الوظيفة في يوم البطالة، کراچی ٤/ ٣٧٢، زكريا ديوبند ٦/ ٥٦٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍محرم الحرام ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۰۰۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/۱/۱۴۲۲ھ

اطلاعی نوٹس ۱۵؍ یوم قبل نہ دینے کی صورت میں تنخواہ کاٹ لینے کا حکم

سوال [۸۵۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل مدارسِ عربیہ میں جو مدرسین دینی وملی خدمات انجام دیتے ہیں، اراکین مدرسہ کسی مدرس کو مدرسہ سے سبکدوش کرتے ہیں، تو اس مدرس کو بذریعہ نوٹس علیحدگی کم از کم ۱۵/ یوم یا ایک مہینہ قبل اطلاعی نوٹس دیتے ہیں، یا وہ خود علیحدہ ہوتا ہے، تو نوٹس برطرفی کا خود دیتا ہے، تاکہ اراکین انتظام کرلیں، اس کے برخلاف کرنے پر مدرسہ والے مدرس کی ۱۵؍ یوم یا ایک ماہ کی تنخواہ کاٹ لیتے ہیں (دیتے نہیں ہیں) یا مدرس کو ۱۵؍ یوم کی تنخواہ دیتے ہیں، اس صورت میں مدرس کو ۱۵؍ یوم یا ایک ماہ کی تنخواہ لینا یا کمیٹیٔ مدرسہ کا مدرس کی تنخواہ کاٹ لینا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اسی طرح اگر بغیر اطلاعی نوٹس دئے ہوئے علیحدہ ہوتا ہے یا علیحدہ کیا جاتا ہے، تو اس پر قانوناً چارہ جوئی کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: حافظ محمد شاکر، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جب آج کل مدارس میں نوٹس علیحدگی کے سلسلہ میں ایک ماہ یا پندرہ دن پہلے اطلاع دینا مشروط اور معروف ہے تو قاعدہ ''المعروف کالمشروط'' کے ہونے کی وجہ سے ذمہ دارانِ مدرسہ کے لئے طے شدہ شرط کے مطابق تنخواہ کا دے دینا اور کاٹ لینا دونوں جائز ہے۔ (امداد الفتاوی ۳/ ۳۴۹، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/ ۲۲۳، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۵۳۲)

طے شدہ شرط کے خلاف قانونی چارہ جوئی جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ مدارس کے قوانین کا اعتبار عرف اور شرائط پر ہے؛ لہٰذا اسی کے مطابق عمل درآمد کرنا لازم ہوگا۔

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (رسم المفتي قديم ۳۸، قواعد الفقه، اشرفي ديو بند، ص: ۷٤، رسائل ابن عابدين، ثاقب بك ڈبو ديوبند ۱/ ٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۲۸؍ شعبان ۱۴۱۵ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۶۴)

نصفِ شعبان میں معزولی کی وجہ سے رمضان کی تنخواہ کے استحقاق کا مسئلہ

سوال [۸۵۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مدرس نے پورے تین سال ایک مدرسہ میں کام کیا، ہر رمضان المبارک کی تنخواہ کام پر ڈبل وصول کی، پھر تیسرے سال جب سالانہ امتحان ہوجاتا ہے، تو پندرہ شعبان کو معزولی کی اطلاع یہ کہہ کر دی جاتی ہے کہ آپ کے اندر خامی ہے، پھر پورے شعبان کی تنخواہ دی جاتی ہے، جب کہ مہتمم مدرسہ سے درمیان سال میں مدرس خود کہہ دیتا ہے کہ تحقیق کر لیجئے، پھر معزول ہوجانے کے بعد دوسرے مدرسہ میں کام شروع کردیتا ہے، تو کیا مدرس شرع کے اعتبار سے رمضان کی سنگل تنخواہ کا مستحق ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ارشاد قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پندرہ شعبان کومعزولی کی صورت میں رمضان کی تنخواہ بھی دینا اگر اس مدرسہ کے قانون میں ہے تو رمضان کی تنخواہ کا استحقاق ہے۔ اور اگر مدرسہ کے قانون میں نہیں ہے، تو رمضان کی تنخواہ کا استحقاق نہیں؛ اس لئے کہ مدارس اسلامیہ کے قوانین وضوابط کا مدارس آپس کی شرائط کے مطابق ہے جو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے:

عن عبداللّٰہ بن عمرو بن عوف المزني أن رسول اللّٰہ ﷺ قال: –إلی قوله– والمسلمون علی شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول اللّٰہ ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲، صحيح البخاري، كتاب الإجارة، تحت باب أجر السمسرة ۱/ ۳۰۳، رقم الباب: ۱٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۶۹۷۰/۳۵)

پندرہ شعبان کومعزول مدرس رمضان کی تنخواہ کا مستحق کب؟

سوال [۸۵۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مدرس نے پورے تعلیمی سال از شوال تا شعبان پڑھایا، پھر سال کے اختتام پر جب سالانہ امتحان ہوجاتا ہے تو دس شوال تک کے دستخط تعطیل کئے جاتے ہیں، پھر پندرہ شعبان کومعزولی کی اطلاع دے کر پورے شعبان کی تنخواہ دی جاتی ہے، نیز اس سے قبل کام پر رمضان کی ڈبل تنخواہ اور نہ کرنے پر سنگل تنخواہ دی جاتی تھی، تو کیا اصول شرع کے اعتبار سے مدرس کو رمضان کی سنگل تنخواہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ارشاد قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: شعبان سے دس شوال تک دستخط کرالینے کا قانون یا مصلحت کیا ہے، ہم کو سمجھ میں نہیں آیا؛ البتہ پندرہ شعبان کو معزولی کی اطلاع دے کر پورے شعبان کی تنخواہ دے دینا اگر وہاں کے قانون وضابطہ کے مطابق ہے، تو یہ جائز ہے۔ اور رمضان کی تنخواہ کے بارے میں اگر وہاں کا قانون یہ ہے کہ شعبان کے معزول شدہ ملازم کو رمضان کی بھی تنخواہ ملے گی تب تو اس قانون کے مطابق رمضان کی تنخواہ کا استحقاق ہے۔ اور اگر وہاں کا قانون ایسا نہیں ہے، یا قانون میں اس طرح کی صراحت نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اس مدرس کو رمضان کی تنخواہ نہیں ملے گی؛ اس لئے کہ رمضان میں اس مدرس نے اپنا تقرر دوسرے مدرسہ میں کرالیا ہے، جیسا کہ استفتاء نمبر۲ر سے واضح ہے، ایسی صورت میں وہ حقیقتاً وحکماً دونوں اعتبار سے اس مدرسہ کا مدرس ہی نہیں رہا؛ اس لئے رمضان کی تنخواہ کا استحقاق بھی نہیں ہے۔

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲، صحيح البخاري، كتاب الإجارة، تحت باب أجر السمسرة ۱/ ۳۰۳، رقم الباب: ۱٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۹۷۱)

اضافی رقم کے حقدار ملازم ہیں نہ کہ مستعفی؟

سوال [۸۵۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: بارہ مدرسین جامعہ ہذا نے ایک درخواست تنخواہ کے اضافہ کے بارے میں انتظامیہ کو دی، ایک ماہ کے بعد پھر ایک درخواست دی کہ ہماری گرانی کو مدنظر رکھتے ہوئے اضافہ اگر سو روپیہ نہ کیا گیا تو ہم لوگ چھ صفر المظفر سے خدمت تعلیم سے قاصر رہیں گے، نائب مہتمم حاجی جمیل احمد صاحب نے کہا کہ تم لوگ تعلیم شروع کردو پرسوں تمہارا اضافہ جو کچھ کمیٹی کرے گی سامنے آجائے گا، مدرسین نے انکار کردیا اور کہا کہ جب نتیجہ سامنے آئے گا تب ہی کام کریں گے، حاجی صاحب نے یہ بھی کہا کہ اگر کام نہیں کروگے تو مشاہرہ کاٹوں گا، یہاں مدرسہ میں ہر سال اضافہ ہوتا ہے، اور اضافہ جب بھی ہو شوال سے شمار ہو کر اگلا پچھلا سب ملتا ہے، اضافہ پچاس روپیہ ہوا اور ان مشروط درخواست دہندگان کو چھ صفر المظفر سے الگ کردیا گیا، مدرسین کا کہنا ہے کہ ہم کو نتیجہ نو صفر کو سنایا گیا، ۹/صفر تک تنخواہ مع اضافہ دے دی جائے، جو حکم شرع ہو مطلع کیا جائے، تاکہ اسی حساب سے مشاہرہ دے دیا جائے۔ فقط والسلام

المستفتی: محمد شفیع غفرلہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مدرسین کا مشروطا استعفیٰ ۶/صفر کا ہے اور فیصلہ نامہ ۹/ صفر کو سنایا گیا ہے، تو اگر نو صفر تک مدرسین نے خدمت کی ہے تو شرعاً ان کو ۹/صفر تک کی تنخواہ ملے گی۔ اور اگر خدمت نہیں کی ہے تو ان ایام کی تنخواہ کے حق دار نہیں ہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۴۸)

نیز مستعفی ہونے والے حضرات اضافہ کے مستحق نہیں ہیں؛ کیوں کہ جو اضافہ کیا جاتا ہے وہ آئندہ کام کرنے والوں کے لئے ہوتا ہے، اگرچہ پچھلا بھی ملتا ہو، نیز اضافہ جو کیا گیا وہ ان کی درخواست کے خلاف کیا گیا ہے؛ اس لئے یہ اضافہ شرعاً ان کے حق میں نہیں ہوگا۔

عن عبداللّٰہ بن عمرو بن عوف المزني عن أبیه عن جده أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: الصلح جائز بین المسلمین إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون علی شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.

(سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

الأجرة إنما تكون بمقابلة العمل. (شامي، كتاب النكاح، باب المهر، كراچی ٣/ ١٥٦، زكريا ٤/ ٣٠٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ رصفر المظفر ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۱۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶ رصفر المظفر ۱۴۱۱ھ

مستعفی کی ایک ماہ کی تنخواہ ضبط کرنے کا حکم

سوال [۸۵۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک مدرسہ میں پڑھا رہا تھا، اس نے ایک سال کے بعد استعفیٰ دے دیا، جب استعفیٰ دیا تو ذمہ دارانِ مدرسہ نے یہ کہہ کر ایک ماہ کی تنخواہ ضبط کر لی کہ ہمارے ضابطے اور قانون میں یہ لکھا ہوا ہے کہ استعفیٰ دینے سے ایک ماہ قبل اطلاع ضروری ہے، ورنہ ایک ماہ تنخواہ نہیں دی جائے گی۔ اور اب استعفیٰ دیتے وقت قانونچہ کھول کر دکھایا بھی واقعی لکھا بھی ہے؛ لیکن زید کا کہنا ہے کہ حضور والا بندہ اس ضابطہ کا پابند اس وقت ہوسکتا جب آپ نے بوقت تقرری یہ سارے ضابطے سامنے رکھ دیتے، جس ضابطہ کا علم نہیں اس کا مکلّف نہیں، اگر اس کا علم ہوتا تو بجائے ذیقعدہ کے استعفیٰ دینے کے شوال ہی میں دیتا؛ کیوں کہ دوسری جگہ جانے کی بات رمضان ہی سے چل رہی تھی، آنجناب سے درخواست ہے کہ زید اس تنخواہ کا حقدار ہے یا نہیں؟ فتویٰ مطلوب ہے، ورنہ اسلاف واکابر کا تقویٰ سامنے ہے، جو بغیر تنخواہ کے بھی دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

المستفتی: محمد ارشد بیگ قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط اس حدیث

شریف کی رو سے صحیح اور درست ہیں: **عن كثير بن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني عن أبيه عن جده أن رسول الله ﷺ قال: الصلح جائز بين المسلمين إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما.** (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲)

اور دارالعلوم دیوبند، مدرسہ شاہی مرادآباد اور ان کے ذیلی مدارس جوان مدارس کے اصول پر چل رہے ہیں، ان سب میں یہ ضابطہ اور دستور موجود ہے کہ اگر کوئی مدرس یا ملازم مستعفی ہوکر جانا چاہتا ہے، تو ایک مہینہ پہلے اطلاع دے دے اور پوری تنخواہ اس کو مل جائے گی۔ اور اگر اچانک استعفیٰ دے کر جاتا ہے، تو ایک مہینہ کی تنخواہ روک لی جائے گی، اسی طرح اگر مدرسہ اچانک برطرف کردیتا ہے تو منجانب مدرسہ ایک مہینہ کی مزید تنخواہ مل جائے گی، تاکہ حدیث پاک ''لاضرر ولاضرار'' کی رو سے کسی کو نقصان نہ پہنچے، اور کسی بھی مدرسہ میں تقرری منظور کر لینے کا مطلب یہی ہے کہ اس کے سارے قوانین وضوابط کے ماتحت رہ کر ملازمت قبول کی گئی ہے؛ لہٰذا جب رمضان سے دوسری جگہ کی بات چیت چل رہی ہے اور اس کی کوئی اطلاع نہیں کی اور ذیقعدہ میں جاکر اچانک مستعفی ہوتا ہے، تو مدرسہ کو ضابطہ کے مطابق ایک مہینہ کی تنخواہ روک لینے کا حق ہے۔

عن عمرو بن يحيى المازني، عن أبيه، أن رسول الله ﷺ قال: لا ضرر ولا ضرار. (موطا إمام مالك، كتاب القضاء، القضاء في المرفق، أشرفي ديوبند/ ۳۱۱، سنن ابن ماجة، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره، النسخة الهندية/ ۱۶۹، دارالسلام، رقم: ۲۳۴۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۹۵۱)

جمعہ کے دن کی تعطیل کو رخصت میں شمار کرنا

سوال [۸۵۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک دینی مدرسہ میں مدرس ہے، مدارس میں جمعہ کی تعطیل رہتی ہے، زید نے جمعرات کی رخصت اتفاقیہ طلب کی، مدرسہ کے مہتمم صاحب نے جمعرات و جمعہ دو دن کی رخصت لگائی، جب کہ زید مدرسہ میں جمعہ کی شام کو واپس آ گیا اور ہفتہ کے دن صبح کو تدریسی فرائض انجام دیئے، مدرسہ میں زید کی جمعہ کے دن کسی قسم کی کوئی ذمہ داری بھی نہیں ہے، یا ہفتہ کو رخصت کی درخواست دلوائی اور جمعہ کے دن صبح سے مدرسہ سے سفر پر چلا گیا اور ہفتہ کی شام کو واپس آ گیا، ان دونوں صورتوں میں جمعہ رخصت اتفاقیہ میں شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: حسین سعدی، چلہ امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ میں ہر جمعہ کو مدرسہ کی تعلیم وتدریس بند رہتی ہے؛ اس لئے جمعہ کے دن کی تعطیل مدارسِ اسلامیہ میں متعارف اور معروف ہے، اسی وجہ سے دارالعلوم دیوبند مظاہر علوم سہارنپور، مدرسہ شاہی مرادآباد اور ندوۃ العلماء لکھنو ان ام المدارس میں جمعہ کا دن تعطیل ہی میں شمار ہوتا ہے، اس دن مدرس پر کوئی پابندی نہیں رہتی ہے؛ اس لئے ان مدارس میں ضابطہ یہ ہے کہ اگر جمعرات کو ایک دن کی چھٹی لے کر جائیں تو حفظ وناظرہ کے مدرس کو جمعہ کی شام کو حاضر ہونا پڑتا ہے؛ اس لئے کہ جمعہ کی شام کو بچوں کی تعلیم ہوتی ہے اور درجہ عربی وفارسی کے مدرسین کو سنیچر کی صبح کو حاضر ہونا ضروری ہوتا ہے، ان کا کام سنیچر کی صبح سے شروع ہوتا ہے۔ اور اگر سنیچر کی رخصت لے رکھی ہے تو جمعہ کے دن کا کوئی محاسبہ نہیں ہوتا، ہر مدرس سنیچر کی چھٹی لے کر جمعہ کو جا سکتا ہے، اس میں ایک ہی دن کی رخصت شمار ہوتی ہے، اگر اس کے باوجود ذمہ دار کی طرف سے جمعہ کی رخصت بنائی جائے تو یہ بیجا سختی اور تعدی وظلم ہے۔ اور اگر جمعرات اور سنیچر کی رخصت لے رکھی ہے تو جمعہ بھی اس رخصت کے درمیان شامل ہوتا

ہے اور تین دن کی رخصت شمار ہوجائے گی۔ سوال نامہ میں یہ تیسری شکل نہیں ہے؛ لہٰذا جس مدرسہ سے متعلق سوال کیا جارہا ہے اگر یہ مدرسہ جواب میں ذکر کردہ ام المدارس کے تابع ہے اور ان ہی مدارس کے اصول پر چل رہا ہے، تو سوال نامہ میں ذکر کردہ دونوں صورتوں میں جمعہ کے دن کو شامل کرنا تعدی وظلم کے دائرہ میں شامل ہے۔ اور اگر مذکورہ مدرسہ ام المدارس کے اصولوں پر نہیں ہے اور اس مدرسہ کے الگ اصول وضوابط ہیں، تو ان کو تحریر کریں اس کے بعد ان کے اعتبار سے جواب لکھا جائے گا۔

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين -إلى قوله- والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

أما لو شرط شرطا تبع، كحضور الدرس أياما معلومة في كل جمعة، فلا يستحق المعلوم إلا من باشر خصوصا إذا قال من غاب عن الدرس قطع معلومه، فيجب اتباعه. (شامي، كتاب الوقف، مطلب في الغيبة التي يستحق بها العزل عن الوظيفة وما لا يستحق، كراچی ٤/ ٤١٩، زكريا ٦/ ٦٣١)

المعروف بالعرف كالمشروط شرطا. (قواعد الفقه، أشرفی ديوبند، ص: ١٢٥)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم شعبان ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۰۷۴/۳۸)

غیر حاضری کے ایام کو حاضری کے ایام کا بدل قرار دے کر تنخواہ اصول کرنا

سوال [۸۵۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: زید ایک سرکاری مدرسہ میں ملازم ہے، سرکاری تنخواہ پاتا ہے، سرکار کی طرف سے جن ایام میں چھٹی رہتی ہے، مدرسہ میں ان ایام میں پڑھائی ہوتی ہے، زید مدرسہ میں حاضر ہوکر درس دیتا ہے، اب زید کسی وجہ سے پڑھائی اور حاضری کے ایام میں غیر حاضر ہوجاتا ہے، تو کیا اس کے لئے جائز ہے کہ اس غیر حاضری کو ان ایام کا (جن میں سرکاری چھٹی تھی مگر اس نے مدرسہ میں حاضر ہوکر درس دیا تھا) بدل قرار دے کر اس غیر حاضری کے ایام میں رجسٹر حاضری میں دستخط کرے اور ان دنوں کی تنخواہ لے؟

المستفتی: محمد عبداللہ ساکن ڈھکیا، ضلع امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سوال کا مطلب یہ ہے کہ سرکاری چھٹی اتوار کو ہوتی ہے اور مدرسہ میں جمعہ کو چھٹی ہوتی ہے۔ اور سرکاری قانون کے اعتبار سے جمعہ کو حاضر رہنا اور مدرسہ کے ضابطے کے اعتبار سے اتوار کو حاضر رہنا چاہئے، چونکہ دینی مدرسہ کی تعلیم اتوار میں بند نہیں رہتی ہے؛ بلکہ جمعہ کو بند رہتی ہے، تو اس سلسلے میں اگر اربابِ مدرسہ نے اس بات پر اتفاق کر کے ضابطہ بنالیا ہے کہ اتوار کو تعلیم ہوا کرے گی اور جمعہ کو تعلیم نہیں ہوا کرے گی اور سرکار سے تنخواہ لینے کے لئے اتوار کے بدلے جمعہ کو دستخط ہوجایا کریں گے، ہفتہ میں کل چھ دن حاضری ہوجایا کرے گی، اور سرکار سے فی الجملہ ایک دن کی چھٹی اور چھ دن کی حاضری کی تنخواہ لی جائے گی، اس طرح اتفاق کر لینے سے مدرس کی تنخواہ جائز اور درست ہوجائے گی، جیسا کہ ایڈ کے مدارس میں ہوتا ہے، اس لئے کہ مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط اس حدیث کے پیشِ نظر ہیں۔

الصلح جائز بين المسلمين -إلى قوله- والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۲/۲/۱۴۲۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۴۷۳/۳۸)	۱۲/۲/۱۴۲۹ھ

غیر عالم کا حکومت سے عالم کی تنخواہ لینا

سوال [۸۵۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک دینی تعلیمی ادارہ جس کے بعض مدرسین کی تنخواہ حکومت دے رہی ہے۔ اور بعض مدرسین کی تنخواہ مجلس منتظمہ ادا کرتی ہے، سرکار کے ذریعہ تنخواہ پانے والے مدرسین میں ایک مولوی کے عہدہ پر کام کرنے والے ہیں، جو فاضل کی سندر کھتے ہیں، ان کی سند جعلی ہے، ان کے پاس علمی صلاحیت بھی نہیں ہے، مدرسہ کے ناظم نے عوامی رائے کے خلاف دوستی نبھانے کے لئے شخص مذکور کو مدرسہ میں بحال کیا، نتیجہ یہ ہے کہ مدرسہ میں درس وتدریس کے کام میں بہتری نہیں ہو پا رہی ہے، اب غور طلب بات یہ ہے کہ حکومت مولوی کے عہدہ کے لئے رقم دے رہی ہے اور شخص مذکور مولوی ہے نہیں، تو کیا مذکورہ صورت میں حکومت کے ذریعہ مولوی کے عہدہ کے لئے ادارہ کو دی گئی رقم شخص مذکور کو لینا شرعاً جائز ہے؟

المستفتی: سجاد حسین، دار العلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسلام میں دھوکہ بازی جائز نہیں ہے، مگر مولوی صاحب کو طے شدہ تنخواہ ایام کارکردگی کی ملنی چاہئے؛ البتہ دھوکہ دہی سے بچنے کے لئے ذمہ دار پر تنخواہ کی شرط کے افراد فراہم کرنا لازم ہے۔

عن عمرو بن يحيى المازني، عن أبيه، أن رسول الله ﷺ قال: لا ضرر ولا ضرار. (موطا إمام مالك، كتاب القضاء، القضاء في المرفق، أشرفي ديوبند/ ٣١١، سنن ابن ماجة، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره، النسخة الهندية/ ١٦٩، دارالسلام، رقم: ٢٣٤١، الأشباه قديم: ١٣٩، جديد ١/ ٢٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ رمضان ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶۸۲/۳۱)

غیر حاضری کے دن کی دستخط کر کے تنخواہ وصول کرنا

سوال [۹۴۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زید اسکول سے غیر حاضر رہتا ہے اور دوسرے دن آ کر گذشتہ کل کے دستخط کر دیتا ہے جو اس کے حاضر رہنے کی دلیل ہوتی ہے، اس کے ناجائز ہونے پر کوئی شک نہیں، کیا اس طرح کرنے سے اس کی تنخواہ میں حلت وحرمت یا اشتباہ کے اعتبار سے کچھ فرق پڑے گا۔ اور اگر وہ غیر حاضری ہی رہنے دیتا ہے، تو کیا پھر بھی اس کی تنخواہ متاثر ہوگی؛ اس لئے کہ تنخواہ پورے ایک مہینہ کی ملتی ہے۔

المستفتی: محمد فیاض عالم، مرکز المعارف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ سینٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کبھی کبھی اسکول سے غیر حاضر رہتا ہے اور دوسرے دن جا کر گذشتہ کل کے بھی دستخط کر دیتا ہے، تو اس کے لئے غیر حاضری کے ایام پر دستخط کے ذریعہ حاضری لگانا اور پھر ان ایام کی تنخواہ لینا جائز نہیں ہے، نیز دستخط کئے بغیر بھی ان ایام کی تنخواہ لینا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ من جانب سرکار غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ کا مستحق نہیں قرار دیا جاتا ہے۔

قال في الشامية: بخلاف غيرهما من أيام الأسبوع حيث لا يحل له أخذ الأجر عن يوم لم يدرس فيه مطلقا، سواء قدر له أجر كل يوم أو لا. (شامي، كتاب الوقف، مطلب في استحقاق القاضي والمدرس الوظيفة في يوم البطالة، كراچی ٤/ ٣٧٢، زكريا ٦/ ٥٦٨)

وقال عليه السلام: من غش فليس مني. (مسلم شريف، كتاب الإيمان، باب قول النبي صى الله عليه وسلم من غشنا فليس منا، النخسة الهندية ١/ ٧٠، بيت الأفكار، رقم: ١٠٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ صفر ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۴۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۲/۵ھ

مدرس وامام کے لئے ایامِ تعطیل کی تنخواہ لینے کا حکم

سوال [۸۵۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کسی دینی عربی مدرسہ میں مدرس ہو اور وہ کسی دوسری ریاست کا رہنے والا ہو، اگر وہ اپنے خاص کام کے لئے مدرسہ سے ایک ماہ کی چھٹی لے کر اپنے وطن جائے، اب وطن سے واپس آنے پر اس ماہ کی تنخواہ یہ مدرس لے سکتا ہے یا نہیں؟ یا اس ماہ کی چھٹی کی تنخواہ مدرسہ یا مدرسہ کے کارکنان حضرات اپنے پاس سے اس مدرس کو دے سکتے ہیں یا نہیں؟ شرعی حکم کیا ہے؟ یہی صاحب کسی مسجد میں امامت کرتے ہوں اور وہاں سے ایک ماہ کی چھٹی لے کر چلے جائیں، اور ان کی غیر موجودگی میں اتنے وقت امامت کی ذمہ داری مؤذن صاحب نے نبھائی ہو تو ان حالات میں چھٹی میں گذر ہوئے ماہ کی تنخواہ امام صاحب کو دی جائے یا مؤذن صاحب کو ملنی چاہئے، شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: محمد اعظم لال مسجد سرائے ترین سنبھل، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مساجد اور مدارس کے قوانین وضوابط کا مدار اس حدیث پاک پر ہے:

عن عبداللّٰه بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده، أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول اللّٰه ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

اس حدیث میں اس کی وضاحت ہے کہ مسلمان اپنے معاملات میں ان شرائط وضوابط کے پابند ہیں جو معاملہ کرتے وقت آپس میں طے ہوتے ہیں اور جو مدارس ومساجد کے پہلے سے

بنے ہوئے قوانین وضوابط ہیں، امام ومدرس کو رکھتے وقت وہ خود بخود ان قوانین کے پابند ہوجاتے ہیں؛ لہٰذا اگر مذکورہ مدرسہ میں مدرس کو ایک مہینہ کی چھٹی ملتی ہے، تو پورے مہینے کی تنخواہ کا مستحق ہے۔ اور اگر پندرہ دن کی چھٹی ملتی ہے تو پورے مہینے میں سے پندرہ دن کی تنخواہ اس کو ملے گی باقی پندرہ دن کی تنخواہ وضع ہوجائے گی، اسی طریقہ سے جس مسجد میں امامت کرتے ہیں، اس کا تعامل اور اس مسجد کی طرف سے کیا مراعات ہیں، اس پر عمل کیا جائے گا، اگر کبھی مہینہ بھر امام کے غائب رہنے کی صورت میں تنخواہ وضع نہیں ہوئی ہے، تو امام کو مسجد سے جو ماہانہ ملتا تھا وہ ملنا چاہئے۔ اور امام کی عدم موجودگی میں موذن کا نماز پڑھا دینا اس کا عام رواج ہے، اس سے امام کی تنخواہ مؤذن کو نہیں ملتی ہے، اس طرح تبرعاً نماز پڑھانے کا تعامل مساجد کے اندر چل رہا ہے؛ اسی لئے امام کی تنخواہ مؤذن کو نہیں ملے گی۔

إمام يترك الإمامة لزيارة أقربائه في الرساتيق أسبوعا، أو نحوه، أو لمصيبة، أو لاستراحة لابأس به، ومثله عفو في العادة، والشرع وهذا مبني على القول بأن خروجه أقل من خمسة عشر يوما بلا عذر شرعي لا يسقط معلومه. (شامي، كتاب الوقف، مطلب فيما إذا قبض المعلوم وغاب قبل تمام السنة، شامي، كراچی ٤/ ٤١٨، زكريا ٦/ ٦٣٠)

إن النائب لا يستحق شيئا من الوقف؛ لأن الاستحقاق بالتقدير ولم يوجد ويستحق الأصيل الكل إن عمل أكثر السنة، وسكت عما يعينه الأصيل للنائب كل شهر في مقابلة عمله، والظاهر أنه يستحق لأنها إجارة. (شامي، مطلب مهم في الاستنابة في الوظائف، كراچی ٤/ ٤٢٠، زكريا ٦/ ٦٣١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۸۰۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/ ۵/ ۱۴۲۴ھ

سرکار سے مدرسین کا غیر حاضری کے ایام کی تنخواہ لینا

سوال [۸۵۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بہار کے کچھ مدارس سرکار سے ملحق ہیں، ملحقہ مدارس کے اساتذہ مدرسہ میں تعلیم نہیں دیتے اور مدرسہ بھی اکثر نہیں جاتے ہفتہ میں مہینہ میں دو چار دن مدرسہ میں جاکر رجسٹر حاضری بنا لیتے ہیں اور فارم بھروا کر گاؤں گھر کے لڑکے لڑکیوں کا بورڈ سے امتحان دلواتے رہتے ہیں، عوام جب تعلیم پر زور دیتی ہے تو اساتذہ کہتے ہیں کہ ہم آپ لوگوں سے تنخواہ نہیں لیتے ہیں، ہمیں سرکار تنخواہ دیتی ہے، آپ کو کیا مطلب، بایں طور بورڈ کے مدرسہ میں تعلیم بالکل نہیں؛ بلکہ طلبہ بالکل نہیں ہیں، نہ گاؤں کے نہ باہر کے، کمرے سب خالی پڑے ہیں، جب کہ سرکار تعلیم دینے کے لئے تنخواہ دیتی ہے، بایں صورت بغیر کام کئے ہوئے صرف جھوٹی حاضری بھر کر تنخواہ لینا اور کھانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد راشق الہدیٰ، ساکن لادھ کیسیا، سمستی پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: سرکار کی جانب سے مدرسین کو تنخواہ پڑھانے کے عوض ملتی ہے؛ لہٰذا مدرسین جتنے دن حاضر ہوکر باقاعدہ بچوں کو پڑھائیں وہ صرف انہیں دنوں کی تنخواہ کے مستحق ہیں، غیر حاضری کے ایام کی حاضری لگا کر ان دنوں کی تنخواہ وصول کرنا جائز نہیں ہے۔

الأجرة لا تملک بنفس العقد، ولا يجب إيفاء ها إلا بعد استيفاء المنفعة. (تاتارخانية ١٥/ ١٤، برقم: ٢١٩٥٠)

الأجرة إنما تكون بمقابلة العمل. (شامي، كتاب النكاح، باب المهر كراچی ٣/ ١٥٦، زكريا ٤/ ٣٠٧)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يحل لمسلم أن يأخذ مال أخيه بغير حق. (مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧١)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من غشنا فليس منا. الحديث (صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: من غشنا فليس منا، النسخة الهندية ١/ ٧٠، بيت الأفكار، رقم: ١٠١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۴۳)

ایامِ رخصت کی تنخواہ کا مسئلہ

سوال [۸۵۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے ایک مدرس سفر حج پر تشریف لے گئے ہیں، تقریباً دو ماہ مدرسہ سے رخصت پر رہیں گے، جب کہ تمام مدرسین وملازمین کی ایک ماہ کی رخصت اتفاقیہ و بیماری بھی منظور ہے، علاوہ ازیں موصوف کے سفر پر جانے کی وجہ سے ایک زائد مدرس کا بھی بندوبست کرنا پڑا ہے، اس سلسلے میں مسئلہ کیا ہے؟ ایام حج کی تنخواہ مدرسہ کو دینی ہوگی یا نہیں؟ یا جو بھی شریعت اسلامیہ کا حکم ہو تحریر فرمادیں۔

المستفتی: محمد طاہر القاسمی، مدرسہ احیاء العلوم صدیقیہ پٹلو کر سہارنپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حج چونکہ اسلام کے اساسی اور بنیادی فرائض میں سے ہے؛ اس لئے اہم اور بڑے اداروں میں اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے منجانب مدرسہ حج فرض کی ادائے گی کے نام سے ایک مرتبہ رخصت دی جاتی ہے، جیسا کہ دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ شاہی وغیرہ کا دستور ہے۔ اور مدارس اسلامیہ کے قوانین وضوابط کا مدار اس حدیث شریف پر ہے کہ:

عن عمرو بن عوف المزني عن أبيه عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين ، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲)

اب آپ اپنے مدرسہ کے قوانین وضوابط دیکھیں کہ اس میں کیا حکم ہے؟ اگر سفر حج کے متعلق کوئی صراحت نہیں تو آئندہ کے لئے قانون بنانا چاہئے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۸۶۲)

تعطیل کلاس میں تنخواہ کا استحقاق کب؟

سوال [۸۵۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے کسی مدرسہ میں تدریس کے لئے ملازمت طے کی، فرائض وتنخواہ اور جملہ امور سب مقرر ہوگئے، مدرس ابتدائے سال سے اپنے وقت پر کام میں لگ گیا، بعد چند ایام کچھ باتیں پیش آئیں، جن کے متعلق مہتمم اور مدرس میں کچھ گفت وشنید ہوئی، دوران گفتگو مدرس نے کہا کہ فلاں طریق کار میں معاہدے سے انحراف ہو رہا ہے، آپ اس پر عمل درآمد کریں اور کرائیں، مہتمم نے کہا کہ ابھی ہم آپ کو ایک سال تک آزمائیں گے، یعنی آپ کے مطالبات کا معاہدے کے مطابق حق بجانب ہونا ہم کو مسلم ہے، مگر ان کی تکمیل ایک سال بعد ہوگی، جب کہ قالاً یا حالاً آزمائش پر طے شدہ امور کو معلق کرنے کا کوئی اشارہ تک پہلے نہیں ہوا تھا، کیا اس طرح ایام عمل کے دوران بے گمان شرط لگانا اور طے شدہ امور کو غیر مذکور وغیر معہود شرائط پر معلق کرنا درست ہے، جب کہ مدرس خود مقامی باشندہ ہے اور چھوٹے بڑے ہر

ایک کو معلوم ہو، نیز اب مدرس اپنے تئیں یہ سوچ رہا ہے کہ جو وعدے ہوئے تھے نہ ہی پورے کیے گئے نہ آئندہ ان کی بظاہر کوئی توقع ہے، ان حالات میں وہ موجودہ تعلیمی سال (۵/شوال تا ۲۵/شعبان) کی مدت پوری کر کے تحریراً یا مشافہۃً مہتمم سے اپنی برطرفی کا اظہار کردینا چاہتا ہے، واضح رہے کہ تعطیلات میں چندہ کی وصولی اس کے ذمہ لازم نہیں کی گئی تھی، یہ امر تاہنوز سب کو مسلم ہے، اس کو صرف شعبہ عربی وفارسی کی تاسیس اور اس کی مکمل نگرانی وذمہ داری کے لئے لایا گیا تھا، کیا وہ حسب دستور مدرسہ آئندہ امتحان سالانہ سے فراغت کے بعد دوبارہ کام پر لگنے سے ایک ماہ قبل اطلاع کردے تو وہ رمضان کی تنخواہ کا شرعاً مستحق ہوگا یا نہیں؟ یعنی ایام تعطیل ایام تعلیم کے ساتھ ملحق اور ان کے تابع ہیں یا نہیں؟ اس تعلق سے کوئی بات اس سے قبل نفیاً یا اثباتاً ہوئی بھی نہیں ہے، بوضاحت مدلل جواب عنایت فرمائیں، کتب فقہیہ کے حوالوں سے جواب دیں۔

المستفتی: محمد عنایت اللہ چھتی بازار مہولی، کبیر نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر صراحتاً سارے شرائط مقرر نہیں ہوئے؛ لیکن مدرسہ کے قواعد معروف ومدون ہیں، تو وہ بھی مثل مشروط کے ہیں، اب اگر ایک سال کی آزمائش قوانین مدرسہ میں سے ہے تو اس کی پابندی لازم ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۹/۳۰۴)

(۲) تعطیلات رمضان ایام تعلیم کے اس وقت تابع ہوں گی، جب کہ آئندہ سال بھی آپ اسی مدرسہ میں تدریسی خدمت انجام دیں؛ لیکن جب آپ کا ارادہ اس سال مدرسہ چھوڑ دینے کا ہے، تو اس صورت میں آپ رمضان کی تنخواہ کے مستحق نہ ہوں گے، یہی مدارس کے اندر معروف ومشروط ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۲/ ۲۲۶، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۵۲۵، رحیمیہ قدیم ۹/ ۳۰۵، جدید زکریا ۹/ ۳۰۲)

لأن المعروف كالمشروط. (الأشباه والنظائر، قديم: ١٥٢، جديد زكريا ١/ ٢٧٨، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١٢/ ٥٤، البناية أشرفيه ديوبند ٥/ ٤٨١، قواعد الفقه أشرفي ١٢٥، رقم: ٣٣٤)

فحيث كانت البطالة معروفة في يوم الثلثاء والجمعة، وفي رمضان والعيدين يحل الأخذ. (شامي، الوقف، مطلب في استحقاق القاضي والمدرس الوظيفة في يوم البطالة كراچی ٤/ ٣٧٢، زكريا ٦/ ٥٦٨، سكب الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٥٨٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ۶/ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۲۸۶)

مدرسہ کے ملازم کا ایام تعطیل کی تنخواہ لینا

سوال [۸۵۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک دینی مدرسہ میں غیر مستقل ملازم ہے، ۶/ ذی الحجہ تک کام کرتا ہے، ۷/ ذی الحجہ سے تعطیل عید الاضحیٰ ہو جاتی ہے، ۱۷/ ذی الحجہ کو مدرسہ کھلنے کے دن ۱۰/ بجے دفتر میں حاضر ہو کر رجسٹر حاضری مدرسین پر دستخط کر کے فوراً ہی چلا جاتا ہے، جب کہ مدرسہ کا وقت صبح ۸/ تا ۱۱/ بجے ہے۔ اور تعطیل کے بعد وقت پر حاضر ہونا لازم ہے، پھر ۱۸/ تا ۲۰/ ذی الحجہ کی رخصت بوضع تنخواہ حاصل کرتا ہے (مدرسہ میں غیر مستقل ملازم کو رخصت بوضع تنخواہ ہی کا حق ہے) ۲۱/ ذی الحجہ کو جمعہ پڑتا ہے اور پھر ۲۲/ ذی الحجہ کو استعفیٰ نامہ ارسال کر دیتا ہے۔ مطلوب یہ ہے کہ ۷/ ذی الحجہ تا ۲۱/ ذی الحجہ تنخواہ ذمہ داران مدرسہ پر واجب الاداء ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ مدرسہ میں ایام تعطیل کلاں کی تنخواہ غیر مستقل ملازم کو نہیں دی جاتی ہے، باقی ایام تعطیل کی تنخواہ دے دی جاتی ہے، بشرطیکہ مدرسہ کھلنے والے دن وقت پر حاضر ہوا ہو۔

المستفتی: نظام الحق مہتمم ادارہ محمودیہ محمدی کھیری، لکھیم پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے قوانین اور ضوابط کا مدار ذیل کی حدیث پاک پر ہے:

الصلح جائز بين المسلمين، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲)

اسی حدیث پاک سے دینی اداروں کے قوانین مستنبط ہوتے ہیں، آپ کے مدرسہ میں تحریری طور پر رخصت سے متعلق جو قانون دستور مدرسہ میں درج ہے، اسی کے مطابق عمل کرنا چاہئے، اگر ملازم ایام تعطیل کی تنخواہ کا مستحق ہوتا ہے، تو دینا چاہئے اور نہیں ہوتا ہے تو نہیں دینا چاہئے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۰ر محرم الحرام ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۲۰۲/۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۱/۱۴۲۵ھ

تعطیل کلاں میں تنخواہ کا استحقاق

سوال [۸۵۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے گھر میں کوئی اولاد نہ تھی، ہم نے دوسری شادی کی اور منت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اولاد سے نواز دیا تو چلہ لگاؤں گا، الحمد للہ لڑکی بعدہ لڑکا، دونوں سے اللہ تعالیٰ نے نواز دیا، میں ایک مکتب میں مدرس ہوں، میں نے مہتمم صاحب سے اپنی منت کا تذکرہ کیا اور کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی منت پوری کرلوں، مہتمم صاحب نے اجازت مرحمت فرمادی اور میں نے چلہ پورا کرلیا، اب چلہ کے زمانہ کا مشاہرہ وجہ نزع بن گیا، مہتمم صاحب فرمارہے ہیں کہ چونکہ اولاد کے لئے آپ نے منت مانی ہے، بوضع مشاہرہ چلہ پورا کرنا چاہئے، اگر آپ نے مشاہرہ لے لیا تو وقت مدرسہ کا ہوجائے گا، آپ کی منت پوری نہ ہوگی، ہم چاہتے ہیں کہ مشاہرہ مجھے ملے؛ کیوں کہ چلہ میں جانے والوں کو مدرسہ مشاہرہ دیتا ہے؛

اس لئے آپ حضرات سے درخواست ہے کہ فیصلہ تحریر فرمادیں، کیا مجھے مشاہرہ لینا جائز ہے؟ اگر جائز ہوتو مطالبہ کروں ورنہ خاموش ہو جاؤں؟

المستفتی: محمد ملیح مدرس مدرسہ اسلامیہ دارالعلوم فرقانیہ، مہراج گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں آپ کے مدرسہ ومکتب کا جو قانون وقاعدہ مروج ومشہور ہواسی کے مطابق عمل ہوگا، بعض مدارس میں سالانہ کچھ ایام کی رخصت اتفاقیہ کا قانون ہوتا ہے، ان ایام کے بقدر رخصت لینے پر تنخواہ نہیں کاٹی جاتی، اگرآپ کے مدرسہ ومکتب میں یہ قانون ہے، تو ان ایام کے بقدر تنخواہ کا استحقاق ہے، اس سے زائد کا نہیں، نیز اس کے بعد تمام سال ضرورت پڑنے پر جو رخصت لی جائے گی اس رخصت کے ایام کی تنخواہ کا بھی استحقاق نہیں رہے گا۔ اور سوال نامہ میں جو مدرسہ کی جانب سے چلہ کی بات کہی گئی ہے تو چلہ میں جانے پر مشاہرہ اسی وقت ملے گا، جب کہ مدرسہ ازخود اپنی خوشی سے بھیجے، اس میں نذر کا چلہ داخل نہیں ہوسکتا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۴۹، فتاوی رحیمیہ قدیم ۹/ ۳۰۳، فتاوی محمودیہ قدیم ۶/ ۳۱۱، جدید ڈابھیل ۱۵/ ۵۳۵، احسن الفتاوی ۷/ ۲۸۳)

بخلاف ما إذا لم يقدر لكل يوم مبلغا، فإنه يحل له الأخذ، وإن لم يدرس فيهما للعرف، بخلاف غيرهما من أيام الأسبوع حيث لا يحل له أخذ الأجر عن يوم لم يدرس فيه مطلقا، سواء قدر له أجر كل يوم أو لا. الخ

(شامي، كتاب الوقف، مطلب استحقاق القاضي والمدرس الوظيفة في يوم البطالة، کراچی ٤/ ٣٧٢، زكريا ٦/ ٥٦٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۳۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/ ۴/ ۱۴۲۱ھ

مدارسِ اسلامیہ میں ایامِ تعطیل کی تنخواہوں کا حکم

سوال [۸۵۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں ماضی قریب میں ایک ملکی ہنگامہ کی زد میں آکر دیگر ضروریات زندگی کے تعطلات کے ساتھ ساتھ مدارسِ اسلامیہ بھی بند ہوگئے، چنانچہ ہمارا مدرسہ ۲۵/ ذیقعدہ کو بالکل بند کردیا گیا، پھر ۳/صفر کو کھولا گیا، اب بحمداللہ بدستور تعلیم جاری ہے، ایام تعطیل کی تنخواہوں سے متعلق اختلاف واقع ہوا، مدرسین طالب ہیں اور ذمہ داران عدم عمل کی وجہ سے مانع ہیں، دستور اساسی میں اس بارے میں کوئی تصریح نہیں اور نہ ہی عقد اجارہ کے وقت کوئی بات طے شدہ ہے اور نہ ہی اطراف وجوانب کے مدارس میں کوئی قانون منضبط ہے؛ لہٰذا برائے کرم حسب شرع فیصلہ فرمادیں، نیز تنخواہ نہ ملنے کی صورت میں ذی الحجہ کے اندر جو ایام دستوری چھٹی کے ہیں، ان کی تنخواہ الگ ملے گی یا نہیں؟

المستفتی: سبحان اللہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں چونکہ ملازمین ومدرسین کی جانب سے کوئی تعدی نہیں ہے، نیز عقد اجارہ کے وقت بھی کوئی بات طے نہیں ہوئی اور نہ ہی آپ کے مدرسہ کے دستور اساسی میں اس قسم کی کوئی بات موجود ہے، تو عرف کے مطابق وہ لوگ تنخواہ کے مستحق ہوں گے، اگرچہ آپ کے اطراف کے مدارس میں اس کے بارے میں کوئی قانون منضبط نہیں ہے؛ لیکن ہمارے یہاں مرادآباد میں ۱۹۸۰ء کے فساد کے موقع پر بڑے بڑے مدارس مثلاً مدرسہ شاہی، امدادیہ، جامع الہدیٰ وغیرہ تقریباً دو تین ماہ بند رہے؛ لیکن ملازمین ومدرسین کی تنخواہیں وضع نہیں کی گئیں؛ بلکہ برابر تنخواہیں دی گئیں، نیز ''امدادالفتاوی'' (۳/ ۳۴۹) سے یہی مستفاد ہوتا ہے۔ اور تقریباً تمام مدارس میں ایسا ہی دستور ہے۔

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (شرح عقود رسم المفتي، قديم ص: ۹۵،

قواعد الفقه، أشرفي ديو بند/ ٧٤، رسائل ابن عابدين، ثاقب بك ڈپو ديوبند/ ٤٤)

وقول الفقهاء: المعروف بالعرف كالمشروط شرطا. (قواعد الفقه، أشرفي ديوبند/ ١٢٥، إمداد الفتاوى ٣/ ٣٤٩)

نیز ذی الحجہ کے اندر جو ایام دستوری چھٹی کے ہیں، ان کی تنخواہ دینے کا چونکہ عام مدارس کا دستور ہے، جو بمنزلہ شرط کے ہے؛ لہٰذا اس کی تنخواہ کے ملازمین ومدرسین مستحق ہوں گے، اگر اہل چندہ کی رضا قالاً یا حالاً معلوم ہوجائے تو چندہ سے دیا جاسکتا ہے، ورنہ موجرا پنے پاس سے دے گا۔ اور عدم اشتراط کی صورت میں ان ایام کی تنخواہ کا استحقاق نہیں ہوگا۔ (مستفاد: امدادالفتاوی ۳/۳۴۸)

فحيث كانت البطالة معروفة في يوم الثلاثاء والجمعة، وفي رمضان والعيدين يحل الأخذ. (شامي، الوقف، مطلب في استحقاق القاضي والمدرس الوظيفة في يوم البطالة، كراچى ٤/ ٣٧٢، زكريا ٦/ ٥٦٨، سكب الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٢/ ٥٨٩)

لأن المعروف كالمشروط. (الأشباه قديم/ ١٥٢، جديد زكريا ١/ ٢٧٨، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١٢/ ٥٤، البناية، أشرفيه ديوبند ٥/ ٤٨١، قواعد الفقه، اشرفي ديوبند/ ١٢٥، رقم: ٣٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۹ /جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۰۹۳)	۱۴۱۵/۶/۲۹ھ

مدرسے کی چھٹیوں میں پڑھانے کی اجرت اور تعطیل کلاں کی تنخواہ کا حکم

سوال [۸۵۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) مدارسِ اسلامیہ میں انتظامیہ کمیٹی کی جانب سے کچھ چھٹی منظور ہوتی ہیں، جنہیں اتفاقیہ واحتیاجیہ کہا جاتا ہے، اگر کوئی مدرس وغیرہ منظور شدہ چھٹیوں سے زائد حاصل کر

لیتا ہے تو جزو زائد کی تنخواہ کاٹ لی جاتی ہے؛ لیکن اگر مدرس وغیرہ پوری چھٹیاں حاصل نہیں کر پاتا؛ بلکہ کچھ باقی رہ جاتی ہیں، تو بقایا کا مدرس کو کچھ نہیں دیا جاتا، آیا یہ طریقہ اسلامی تعلیمات وشرعی احکامات کے مطابق ہے کہ زائد ہونے پر رقم وضع کر لی جائے اور باقی باندہ کا کچھ نہ دیا جائے؟ کیا ناظم مدرسہ اپنے اس رویہ کے باعث حق العبد میں ماخوذ ہوگا یا نہیں؟

(۲) تعطیل کلاں کی تنخواہ کا حق دار مدرس کب ہوتا ہے؟ زید کا کہنا ہے کہ اگر مدرس سالانہ امتحان تک مدرسہ کی خدمت پر مامور رہتا ہے، تو وہ تعطیل کلاں کی تنخواہ کا حق دار ہوگا، ورنہ نہیں؛ لیکن خالد کا کہنا ہے کہ اگر مدرس تعلیمی سال کے نصف تک مدرسہ کی خدمت کرتا رہا تب بھی وہ آنے والی تعطیل کلاں کی تنخواہ کا واجبی حق دار ہے، صحیح قول کس کا ہے؟ واضح فرمائیے گا، اگر ارکان مدرسہ اس میں کوتاہی کریں تو کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد صابر خان، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے تمام قواعد وضوابط اس حدیث شریف سے مستنبط ہیں:

عن عبداللہ بن عمرو بن عوف المزني، عن أبیه، عن جده، أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال: الصلح جائز بین المسلمین، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون علی شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحکام، باب ما ذکر عن رسول اللہ ﷺ في الصلح بین الناس، النسخة الهندیة ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲)

اب اس حدیث شریف کی روشنی میں مذکورہ سوالات کے جوابات اس طرح ہوں گے کہ منظور شدہ چھٹیوں میں سے باقی رہنے پر کچھ نہ دینا اور زائد چھٹیوں پر تنخواہ وضع کر لینا آپ کے یہاں کے اداروں کے اصول وضوابط پر مبنی ہے، اگر وہاں کے اداروں میں منظور شدہ چھٹیوں میں باقی رہنے پر کچھ نہیں دیا جاتا اور زائد چھٹیوں پر تنخواہ وضع کر لی جاتی ہے، تو اسی پر عمل

ہوگا۔اورچھٹی باقی رہنے پر مدرس کوکسی طرح کا استحقاق نہ ہوگا۔اور اگر باقی چھٹیوں پر ان ایام کی تنخواہ دینے کا قانون ہے،تو ایسی صورت میں مدرس ان ایام کی تنخواہ کا شرعاً مستحق ہوگا۔ پہلی صورت میں نہ دینے پر ناظم مدرسہ حق العبد میں ماخوذ بھی نہ ہوگا۔اور دوسری صورت میں نہ دینے سے ذمہ دار اور ناظم حق العبد میں ماخوذ ہوگا۔

(۲) اگر تعطیل کلاں سے قبل مدرس کو مدرسہ سے علیحدہ نہیں کیا گیا،تو ایسی صورت میں مدرس تعطیل کلاں کی تنخواہ کا مستحق ہے؛ کیوں کہ مدارس اسلامیہ میں مدرسین کا تقرر مکمل سال کے لئے ہوتا ہے۔اور اگر مدرس کو تعطیل کلاں سے قبل مدرسہ سے علیحدہ کردیا گیا یا تقرر کے وقت اس بات کی وضاحت کردی گئی تھی کہ آپ کا اور ہمارا معاملہ صرف شعبان تک ہے، تو ایسی صورت میں مدرس تعطیل کلاں کی تنخواہ کا مستحق نہیں ہوگا؛ کیوں کہ آپس کی شرائط کی پابندی مسلمانوں پر لازم ہے۔

لأن أمور المسلمين محمول على الصلاح والسداد. (بدائع الصنائع، كتاب الصلح، فصل في الشرائط التي ترجع إلى المصالح، زكريا ديوبند ٥/ ٥٢) **فقط واللہ** سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۸۰)	۱۵/ ۶/ ۱۴۲۲ھ

رمضان کی تنخواہ کا حکم

سوال [۸۵۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ادارہ والے یا مدرسہ والے مدرسین وملازمین حضرات کو رمضان المبارک کی تعطیلات کی جو تنخواہ دیتے ہیں اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جو حضرات مستعفی ہونا چاہتے ہیں وہ اس کے مستحق ہوں گے یا نہیں؟ اور ان کی تین شکلیں ہیں: (۱) ایک تو وہ حضرات ہیں جو شعبان میں مستعفی ہوتے ہیں (۲) وہ حضرات جو پندرہ رمضان یا ۲۵؍ رمضان کو مستعفی ہونے کی اطلاع دیتے

ہیں (۳) وہ حضرات ہیں جو شوال میں ایک ہفتہ یا دو ہفتہ پڑھا کر رمضان کی تنخواہ لے کر اپنا استعفیٰ منظور کروائے بغیر چلے جاتے ہیں، یا تنخواہ لے کر تو نہیں جاتے مگر بغیر انتظامیہ کی منظوری کے دوسری جگہ جا کر خدمت میں لگ جاتے ہیں اور پھر رمضان کی تنخواہ کا مطالبہ فرماتے ہیں، حالانکہ مدرسہ کا قانون ہے کہ جن حضرات کو مستعفی ہونا ہے وہ ایک مہینہ قبل اطلاع دیں، تو اس صورت میں کون حضرات رمضان المبارک کی تنخواہ کے مستحق ہو سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد عابد غلام محمد کیسر پوری، خادم مدرسہ مفتاح العلوم موڑ اسا، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدارسِ اسلامیہ کے قوانین وضوابط منقول اور منصوص نہیں ہیں، ہاں البتہ ترمذی شریف کی اس حدیث کی رو سے مدارس کے قوانین وضوابط صحیح اور درست ہیں، حدیث شریف یہ ہے:

عن عبدالله بن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الصلح جائز بين المسلمين ، إلا صلحا حرم حلالا، أو أحل حراما، والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲)

اس حدیث شریف کی روشنی میں سارے قوانین جائز اور درست ہیں۔ سوال نامہ میں لکھی ہوئی تینوں شکلیں مدرسہ کے ذمہ دار سے معلوم کریں، ان کے یہاں جو دستور اور ضابطہ بنا ہوا ہے اس کے مطابق یہ تینوں شکلیں ضابطہ اور دستور کے کس کالم میں اترتی ہیں، دیکھ لیں، پھر ان ہی کالم کے مطابق ان شکلوں پر عمل کرنا چاہئے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۱۰۰۰۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۴/۶ھ

❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۲۵/ کتاب البیوع

۱/ باب البیع الصحیح

مالِ متقوم وغیر متقوم، بیع باطل اور فاسد کی تعریف

سوال [۸۵۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مال کی تعریف، نیز مالِ متقوم وغیر متقوم کی واضح تعریف کیا ہے؟ نیز بیع باطل وفاسد کی جامع مانع تعریف اور فرق دونوں کے درمیان کیا ہے؟ ان سب کو جامع مانع اور واضح الفاظ میں پیش فرمادیں۔

المستفتی: حسیب الرحمٰن گوری نو ادا، فرخ آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: مال: اس کو کہتے ہیں جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو اور بوقت ضرورت جمع کر کے رکھا جا سکتا ہو۔

المراد بالمال: ما يميل إليه الطبع، ويمكن إدخاره لوقت الحاجة.

(شامي، البيوع، مطلب في تعريف المال والملك والمتقوم، كراچی ٤/ ٥٠١، زكريا ٧/ ١٠، وهكذا في البحرالرائق، زكريا ٥/ ٤٣٠، كوئٹه ٥/ ٢٥٦، معجم لغة الفقهاء، كراچی ٣٩٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٥/ ٢٧، ٣١/ ٦٠، ٣١/ ٢٧٩، ٣٦/ ٣١، الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنيشنل ديوبند ٤/ ١١٢/ دارالفكر ٥/ ٣٣٠٥)

اور مالِ متقوم: اس کو کہتے ہیں جس سے مسلمان کو نفع اٹھانا ممکن ہو اور مسلمان کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہو۔

المتقوم: ما يمكن إدخاره مع الإباحة، فإن المتقوم هو المال المباح

الانتفاع به شرعا. (شامي، البيوع، مطلب في تعريف المال والملك والمتقوم، زكريا ۷/ ۱۰، ۲۳۵، كراچی ٤/ ۵۰۱، ٥/ ٥٠، معجم لغة الفقهاء، كراچی ۳۹۷، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٥/ ٢٧، ٣٦/ ٣٤، الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنيشنل ديوبند ٤/ ١٢٥، دارالفكر ٥/ ٣٣٢١)

اور مالِ غیر متقوم: اس کو کہتے ہیں کہ مسلمان کے لئے جس سے فائدہ اٹھانا بالکل جائز نہیں ہوتا ہے اور اس کی بیع قطعاً باطل ہو جاتی ہے۔

وبطل بيع مال غير متقوم، أي غير مباح الانتفاع به، كخمر وخنزير. (درمختار، البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في تعريف المال زكريا ۷/ ۲۳۵، كراچی ٥/ ٥٠، زكريا ۷/ ۲٤١، ٢٤٢، كراچی ٥/ ٥٥، معجم لغة الفقهاء، كراچی ۳۹۷، الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنيشنل ديوبند ٤/ ١٢٥، دارالفكر ٥/ ٣٣٢١)

نیز بیع باطل وہ ہے کہ جس کے صلب عقد میں فساد آیا ہو۔ اور بیع فاسد وہ ہے کہ صلب عقد میں تو فساد نہ آیا ہو؛ بلکہ خارج عقد اور صفات میں فساد آیا ہو، جیسا کہ جب مبیع میتہ یا خنزیر ہو تو رکن بیع یعنی عین مبیع میں فساد آیا ہے؛ اس لئے باطل ہے۔ اور دریا سے مچھلی پکڑنے سے قبل فروخت کرنا اور ہوا میں اڑتے پرندہ کو پکڑنے سے قبل فروخت کرنا اس میں عین مبیع میں فساد تو نہیں ہے، مگر خارج مبیع میں فساد ہے اور وہ مبیع کا غیر مقدور التسلیم ہونا ہے، اس لئے فاسد ہے۔

ظاهره أن الفاسد بيع السمک، وأنه يملک بالقبض، وفيه أن بيع ما ليس في ملكه باطل كما تقدم؛ لأنه بيع المعدوم، والمعدوم ليس بمال فينبغي أن يكون بيعه باطلا، وأن يكون الفاسد هو بيع العرض؛ لأنه مبيع من وجه، وإن دخلت عليه الباء. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في البيع الفاسد، زكريا ۷/ ٢٤٨، كراچی ٥/ ٦٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍ محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۱۳۶)

نیلامی کا حکم

سوال [۸۵۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ نیلامی میں بولی خرید وفروخت کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: سید عادل حسن سید کالونی، جے پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: نیلام سے خریدوفروخت کرنا شرعاً جائز ہے۔(مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/۳۷، جدید زکریا مطول ۱۱/۹۰، امداد الفتاوی ۳/۱۲۱)

عن أنس بن مالک، أن رسول الله ﷺ باع حلسا وقدحا، وقال: من يشترى هذا الحلس والقدح، فقال رجل: أخذتهما بدرهم، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: من يزيد على درهم؟ من يزيد على درهم؟ فأعطاه رجل بدرهمين، فباعهما منه. (سنن الترمذي، البيوع، باب ماجاء في من يزيد، النسخة الهندية ۱/ ۲۳۱، دارالسلام، رقم: ۱۲۱۸، سنن أبي داؤد، كتاب الزكوة، النسخة الهندية ۱/ ۲۳۲، دارالسلام، رقم: ۱٦٤۱، سنن النسائي، البيوع، النسخة الهندية ۱/ ۱۸۹، دارالسلام، رقم: ٤٥۱٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ر صفر ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۹۹)

امریکہ سے ٹیلی ویزن پر خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۵۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کے جدید ترقی یافتہ دور میں ایک شخص امریکہ سے ٹیلی فون پر کہتا ہے، ہندوستانی

تاجر سے کہ آج سونے کا یہاں بھاؤ یہ ہے، بولو تم کو لینا ہے؟ ہندوستانی تاجر بولتا ہے کہ آپ کے بتلائے ہوئے بھاؤ پر میرا دو کیلو ہو گیا ہے، پھر کچھ ٹائم بعد یا ایک دو روز بعد وہ امریکی کہتا ہے کہ آج سونے کا بھاؤ یہ ہے تم کو لینا ہے، ہندوستانی تاجر کہتا ہے کہ میرے خریدے ہوئے سونے آپ کے بتائے ہوئے بھاؤ پر فروخت کردیں، یہ خرید وفروخت کیسی ہے یہ سونے کا ہی معاملہ نہیں ہے؛ بلکہ قریب قریب منقولی چیزیں اسی طرح سے بیچی اور خریدی جاتی ہیں، ابتلاء عام ہے اور اس میں کوئی جھگڑا نہیں ہے اور نہ سنا گیا ہے، ویسے یہ شکل وکیل کی سی ہو جاتی ہے: البتہ وکیل بول کر متعین نہیں کیا جاتا ہے؛ بلکہ ٹیلی فون پر اسی طرح گفتگو ہوتی ہے، جیسے لکھا گیا ہے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) **ما إذا وكل رجلا غائبا، وأخبره رجل بالوكالة يصير وكيلا، سواء كان المخبر عدلا أو فاسقا، أخبره من تلقاء نفسه أو على سبيل الرسالة صدقه الوكيل في ذلك أو كذبه.** (فتاوى عالمگيرى، كتاب الوكالة، الباب الأول زكريا قديم ۳/ ۵۶۱، جديد ۳/ ۴۷۷)

(۲) **والأصل فيه أن الجهالة اليسيرة تتحمل في الوكالة كجهالة الوصف استحسانا؛ لأن مبنى التوكيل على التوسعة؛ لأنه استعانة.** (هداية، الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء، أشرفي ۳/ ۱۸۱)

(۳) **الملك يثبت للموكل خلافه عن الوكيل ابتداء وهو الصحيح.** (عالمگيرى قديم ۳/ ۵۶۷، جديد ۳/ ۴۸۳)

(۴) **وإذا دفع الوكيل بالشراء الثمن من ماله وقبض المبيع فله أن يرجع به على الموكل؛ لأنه انعقدت -إلى قوله- فإن هلك المبيع في يده قبل حبسه هلك من مال الموكل ولم يسقط الثمن؛ لأن يده كيد الموكل.** (هداية، باب الوكالة بالبيع والشراء، أشرفي ۳/ ۱۸۲-۱۸۳)

مذکورہ عبارات سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں: عبارت نمبر ۱؍ سے غائب شخص کو وکیل بنانا اور ٹیلی فون کی خبر کا معتبر ہونا مسئلہ وکالت میں ثابت ہوتا ہے۔
عبارت نمبر ۲؍ سے مسئلہ وکالت میں بمقابلہ بیع کے زیادہ جہالت برداشت کی جاتی ہے۔
عبارت نمبر ۳، ۴؍ سے وکیل کا اپنی طرف سے ثمن ادا کر کے مبیع پر قبضہ کر لینا اور موکل کے لئے ملکیت ثابت ہونا واضح ہوتا ہے، نیز نمبر ۱؍ سے وکیل بالشراء، وکیل بالبیع دونوں کا بحالت غیوبت جائز ہونا ثابت ہوتا ہے؛ اس لئے مذکورہ دلائل کی روشنی میں بشرط عدم منازعت مذکورہ معاملہ جائز ہے، تاہم اس مسئلہ میں دوسرے مفتیان کرام کی طرف بھی رجوع کر لیجئے۔
فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ شعبان المعظم ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۱۹۰۱)

مسلمانوں کا غیر مسلموں سے خرید وفروخت کرنا

سوال [۸۵۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید جو عالم اور مدبر ہے، مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے کہ مسلم قوم کا بھلا اسی میں ہے کہ مسلمان جو چیز خریدیں مسلمان دوکانداروں سے ہی خریدیں، یہ بہت ضروری ہے، بکر جو سیاسی آدمی ہے، وہ کہتا ہے کہ ''اگر ایسا کیا گیا تو یہ بڑی غلطی ہوگی اور اس سے فرقہ واریت بڑھے گی، ہمارے بزرگوں نے اس طرح کی جو غلطیاں کی تھیں، ان کا نتیجہ ابھی تک مسلمان بھگت رہے ہیں، اس قسم کی مزید غلطیاں مسلمانوں کو لے ڈوبیں گی''۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس بارے میں شریعت مطہرہ کی روشنی میں فیصلہ فرمائیں۔ علماء کو مسلمانوں کے ہر مسئلے میں رہنمائی فرمانا چاہئے، کیا ہمارے اکابر علماء نے اس بارے میں کوئی رائے دی ہے؟ اگر ہو تو حوالہ دے کر عند اللہ راہ صواب دکھائیں۔ بینوا توجروا

المستفتی: محمد ذکی ساکن محلہ سیف خان سرائے سنبھل، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسلمانوں پر شرعاً یہ لازم نہیں ہے کہ وہ صرف مسلمان دوکانداروں ہی سے خریدا کریں؛ بلکہ اپنی ضرورت کی چیزیں بلاکراہت غیر مسلم دوکانداروں سے بھی خرید سکتے ہیں جو لوگ منع کرتے ہیں وہ بلاتحقیق منع کرتے ہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۹۶/۳)

وكذا إسلام البائع ليس بشرط لانعقاد البيع ولا لنفاذه، ولا لصحته بالإجماع، فيجوز بيع الكافر وشراؤه -إلى قوله- ولنا عمومات البيع من غير فصل بين بيع العبد المسلم من المسلم، وبين بيعه من الكافر فهو على العموم. الخ (بدائع الصنائع، البيوع، فصل في شرائط ركن البيع، كراچی ٥/ ١٣٥، زكريا ٤/ ٣٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ رصفر ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱٦٦٨)

مشتری کا مبیع کو استعمال کرنے کے بعد فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۵٦۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی اسٹیل کی ایک دوکان ہے، جس میں وہ برتن وغیرہ بیچتے ہیں؛ لیکن کبھی کبھی ضرورت کے وقت عارضی طور پر ان برتنوں کو استعمال بھی کر لیتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ بیچتے وقت کیا زید پر یہ صراحت ضروری ہے کہ میں نے تھوڑا بہت استعمال کیا ہے؟ براہ کرام جواب سے نوازیں۔

المستفتی: عبد المجید کیرالا، متعلم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کا اپنی دوکان کے برتن استعمال کرنا اور اس کے بعد

خریدار کو صحیح صورت حال بتائے بغیر اس کو نیا برتن بتا کر فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ مستعمل اشیاء کی قیمت بازار میں نئی اور غیر مستعمل چیزوں کے مقابلہ میں کم ہوتی ہے، نیز اس طرح فروخت کرنا ایک قسم کی دھوکہ دہی بھی ہے؛ لہٰذا صحیح صورت حال بتا کر ہی مستعمل برتنوں کو فروخت کرنا چاہئے۔

عن عقبة بن عامر قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: المسلم أخو المسلم، ولا يحل لمسلم باع من أخيه بيعا فيه عيب، إلا بينه له. (ابن ماجة، البيوع، باب من باع عيبا فليبينه، النسخة الهندية ١٦٢، دارالسلام، رقم: ٢٢٤٦، المستدرك للحاكم، كتاب البيوع، مكتبه نزار مصطفى الباز، جديد ٣/ ٨١٦، قديم ٢/ ٨/ رقم: ٢١٥٢)

لايحل كتمان العيب في مبيع أو ثمن؛ لأن الغش حرام. (شامي، البيوع، باب خيار العيب، مطلب في جملة ما يسقط به الخيار، زكريا ٧/ ٢٣٠، كراچی ٥/ ٤٧)

عن أبي هريرة -رضي الله عنه- أن رسول الله صلى الله عليه وسلم مر برجل يبيع طعاما، فسأله كيف تبيع؟ فأخبره، فأوحى إليه أن أدخل يدك فيه، فأدخل يده فيه، فإذا هو مبلول، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ليس منا من غش. (أبو داؤد شريف، البيوع، باب النهي عن الغش، النسخة الهندية ٢/ ٤٨٧، دارالسلام، رقم: ٣٤٥٢، وهكذا في صحيح مسلم، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم من غشنا فليس منا، النسخة الهندية ١/ ٧٠، بيت الأفكار، رقم: ١٠٢)

كل ما أوجب نقصان الثمن في عادة التجار، فهو عيب. (هداية، البيوع، باب خيار العيب، أشرفي ٣/ ٤٠، مختصر القدوري، ص: ٧٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٥/ ٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/۲/۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۹۱۳/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۲/۱۴۳۱ھ

کیا حرام مال میں تعدی پائی جاتی ہے؟

سوال [۸۵۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حضرات فقہاء کی تصریحات کے مطابق اگر کسی کی آمدنی حرام ہو تو اس سے مسلمانوں کو خرید وفروخت کا معاملہ کرنا ممنوع ہے، اس کے بالمقابل حضرت امام کرخیؒ کی تصریح کے مطابق حرام مال کی کسی جہت سے تعیین کے بغیر اگر کوئی چیز خریدی جائے تو اس چیز میں حرمت سرایت نہیں کرے گی اور اس کا استعمال جائز ہوگا۔ **کما في الشامية، و أيضا في فتاوی علماء نا العامة.**

سوال یہ ہے کہ امام کرخیؒ کی تصریح کے مطابق خرید کردہ شئ میں حرمت سرایت نہیں کرے گی، کیا مشتری جو حرام مال ادا کر رہا ہے اس سے بھی حرمت کی خباثت ختم ہو جائے گی، اگر نہیں تو بائع حاصل شدہ نفع مع اصل فروخت کردہ چیز کی قیمت کے ساتھ کیا کرے؟ دانستہ اور غیر دانستہ دونوں شکلوں کا حکم کیا یکساں ہوگا؟ نیز ہمارے شہر بمبئی میں اس سے بچنا بہت دشوار ہے، خصوصاً شوروم، بڑی دوکانیں، ہوٹلیں وغیرہ ان ہی حضرات سے آباد رہتے ہیں، خلاصی کی شکل کیا ہے؟

المستفتی: بندہ عبد الرشید عفی عنہ نعمانی، دار الافتاء والارشاد اندھری ایسٹ بمبئی، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب ایک مسلمان کے پاس حلال اور حرام دونوں مخلوط پیسے موجود ہیں اور وہ شخص خریداری کے وقت حرام یا حلال پیسے کی تعیین کئے بغیر پیسہ ادا کرتا ہے، تو وہ پیسہ بائع کے لئے اپنے مال کے عوض میں لینا بلا تردد جائز اور حلال ہے۔ اور بائع کے حق میں وہ پیسہ حلال ہے، اگر مشتری نے حرام پیسہ دیا ہے، تو گنہگار مشتری ہوگا بائع نہیں ہوگا، اب رہی یہ بات کہ حرام پیسہ کے عوض میں مشتری نے جو پاک مال خریدا ہے، اس میں بھی حرمت سرایت کر جائے گی یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب اس نے کسی قسم کی

صراحت کئے بغیر مطلقاً مال خریدا ہے اور پیسہ کی ادائے گی میں حرام مال دیا ہے، تو اس کی وجہ سے مشتری گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا؛ لیکن مشتری کے پاس جو مال آیا ہے، وہ اس کے لئے حلال ہے اور امام کرخیؒ ہی کے قول پر فتویٰ ہے۔ اور دوسری طرف بائع کے پاس اپنے حلال مال کے عوض میں جو بھی پیسہ حرام مال کی صراحت کے بغیر مطلقاً پہنچا ہے، وہ پیسہ بائع کے حق میں حلال ہوگا، اس لئے کہ اگر بائع کو مشتری کا حال معلوم نہیں ہے تو بلا تردد اس کے حق میں حلال ہے۔ اور اگر بائع کو مشتری کا حال معلوم ہے کہ اس کے پاس حلال وحرام دونوں طرح کا پیسہ ہے، تو مشتری نے جب حرام کی صراحت نہیں کی ہے؛ بلکہ بلا صراحت کے مطلقاً پیسہ پیش کر دیا ہے، تو ایسی صورت میں شریعت نے بائع کو اس کا مکلّف بنایا ہے کہ مشتری مسلمان ہے، اس نے اپنا حلال مال ہی دیا ہوگا؛ لہٰذا بائع کے حق میں وہ پیسہ حلال ہوگا، ہاں البتہ اگر مشتری پیسہ کی ادائے گی کے وقت اس کی صراحت کر دیتا ہے کہ میں آپ کو حرام اور خبیث پیسہ دے رہا ہوں تو بائع کے لئے اپنے حلال مال کے بدلہ میں اس کا پیسہ لینا جائز نہیں ہے، ایسی صورت میں اس پیسہ کی حرمت بائع کے حق میں بھی سرایت کر جائے گی، ورنہ بائع کے حق میں سرایت نہیں کرے گی۔

رجل اكتسب مالا من حرام، ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه: إما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولا، ثم اشترى منه بها، أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها، أو اشترى قبل الدفع بها ودفع غيرها، أو اشترى مطلقاً ودفع تلك الدراهم، أو اشترى بدراهم أخر ودفع تلك الدراهم –إلى قوله– وقال الكرخيؒ: في الوجه الأول والثاني لا يطيب، وفي الثلاث الأخيرة يطيب، وقال أبوبكرؒ: لا يطيب في الكل، لكن الفتوىٰ الآن على قول الكرخيؒ دفعا للحرج عن الناس. (شامي، كتاب البيوع، باب المتفرقات، مطلب إذا اكتسب حراما، ثم اشترى على خمسة أوجه، زكريا ۷/ ۴۹۰، كراچی ۵/ ۲۳۵، وهكذا في الهندية، زكريا قديم ۳/ ۲۱۵، جديد ۳/ ۲۰۱)

أهدى إلى رجل شيئا أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية، ولا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل. (هندية، كتاب الكراهية والاستحسان، الباب الثاني عشر في الهدايا و الضيافات، زكريا قديم ٥/ ٣٤٢، جديد ٥/ ٣٩٦، وهكذا في البناية أشرفيه ديوبند ١٢/ ٢٠٩، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٨/ ٧٣، رقم: ٩٦١٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۲۳۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۷/۳/۱۴۲۸ھ

زمین فروخت کرنے کے بعد رجسٹری نہ کرانا

سوال [۸۵۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم نے تقریباً دوسال پہلے ایک جگہ جس کے مالک نجمی خاتون اور رئیس احمد تھے، خریدی، قیمت چھ لاکھ روپئے طے ہوئی، وہ ہم نے ساری کی ساری ادا کردی، آپسی مشورہ سے یہ بات طے پائی کہ رجسٹری بعد میں کرالیں گے، ثبوت کے طور پر ایک ایگریمنٹ لکھا گیا۔ ۱۲/۱ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو اس میں لکھا گیا کہ اب اس جگہ کے مالک محمد عاصم ہیں، ہم نے نجمی خاتون و رئیس احمد یہ جگہ چھ لاکھ روپئے میں انہیں بیچ دی ہے، اور ساری رقم وصول کرلی ہے، اب انہیں محمد عاصم کو اختیار ہے کہ یہ اپنے نام سے رجسٹری کرائیں یا کسی اور کے نام سے رجسٹری کرائیں، میں رجسٹری ان کو کردوں گا، یہ معاہدہ باقاعدہ ۱۰۰/ روپئے کے اسٹامپ پر طے پایا۔ اب ہم نے اس جگہ کو بیچنے کی آواز لگائی ہے اور تقدیر سے ایک گراہک سے سات لاکھ ساٹھ ہزار میں سودا طے ہوگیا، اب جب ہم نے اس سودے کی اطلاع حاجی رئیس احمد کو دی کہ ہم نے اس جگہ کا سودا کرلیا ہے، آپ اس کی رجسٹری کرادیجئے، تو حاجی رئیس احمد نے برجستہ یہ کہا کہ مجھے ایک لاکھ روپئے دو میں جب رجسٹری کروں گا، پھر ہم نے ان سے بات کی کہ آپ رجسٹری کرادیں تو

انہوں نے یہ کہا کہ میں کسی کے نام کی رجسٹری نہیں کراؤں گا، میں تمہیں بیچ ہی نہیں رہا اور میں تمہیں فائدے کے ساتھ پیسے واپس کردوں گا، اس مکان پر قبضہ محمد عاصم کا ہے اور مکان کی چابیاں بھی محمد عاصم کے پاس ہیں۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ شریعت کی رو سے اس جگہ کا مالک کون ہے؟ اگر وہ حاجی رئیس اس جگہ کو دوبارہ خریدنا چاہتے ہیں تو مجھے وہ فائدہ دیں جو میرا گراہک سے طے ہوگیا ہے، اس بارے میں شریعت کیا کہتی ہے؟

المستفتی: محمد عاصم، محلّہ تکیہ بدھا شاہ، کسرول، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں جب محمد عاصم نے نجمی خاتون اور رئیس احمد سے زمین خریدی اور محمد عاصم نے طے شدہ قیمت چھ لاکھ روپئے ادا کرکے اس پر قبضہ بھی کرلیا ہے، تو ایسی صورت میں مذکورہ زمین محمد عاصم کی ملکیت میں جائز طریقہ سے منتقل ہوگئی ہے؛ لہٰذا نجمی خاتون اور رئیس احمد کا کوئی واسطہ اس زمین کے ساتھ نہیں رہا ہے؛ اس لئے پکی رجسٹری کے وقت دستخط کے لئے بلانے پر وعدہ کے مطابق جاکر دستخط کردینا شرعی طور پر ان پر لازم ہے، الگ سے پیسہ مانگنا جائز نہیں ہے۔ اور اس طرح کا پیسہ لینا حرام کا پیسہ ہوگا۔

ولنا أن ركن البيع صدر من أهله مضافا إلى محله، فوجب القول بانعقاده. (هداية، كتاب البيوع، أشرفي ٣/ ٢١)

وإن ذكر البيع من غير شرط، ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع، ويلزمه الوفاء بالوعد؛ لأن المواعدة قد تكون لازمة، فتجعل لازمة لحاجة الناس. (فتاوى قاضيخان، البيع، باب البيع الفاسد، فصل في الشروط المفسدة، زكريا جديد ٢/ ٩٩، وعلى هامش الهندية ٢/ ١٦٥، مجمع الضمانات ١/ ٢٤٣، شامي، مطلب في البيع بشرط فاسد، زكريا ٧/ ٢٨١، كراچی ٥/ ١٨٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٦/ ١٦٤، ٩/ ٢٤٧، ٤٤/ ٩٦)

إذا قبض البائع الثمن وهو مما يملك به، فإنه يكون إذنا بالقبض دلالة. (شامي، زكريا ۷/ ۲۸۷)

باع شيئا وخلى بينه وبين المشترى صار المشترى قابضا حتى لو هلك يهلك من ماله. (الفتاوى السراجية، ص: ۴۳۸)

وإذا قبض المشترى المبيع برضا بائعه صريحا أو دلالة ولم ينهه البائع، ملكه أي يملك عينه وهو الصحيح المختار، وإذا ملكه تثبت كل أحكام الملك، فيكون المشتري خصما لمن يدعيه، ولو باعه كان الثمن له.

(شامي، مطلب في الشرط الفاسد إذا ذكر بعد القعد أو قبله، زكريا ۷/ ۲۸۷، كراچی ۵/ ۸۸)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ربیع الاول ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۴۸)

خریدار کا بائع کی اولاد کو رجسٹری پر دستخط کرنے کے عوض کچھ دینے کا حکم

سوال [۸۵۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے والد صاحب کا ایک مکان تھا جواب بھی ہے، انہوں نے اپنی زندگی میں آدھا مکان اپنے ایک ملنے والے کے ہاتھ بیچ دیا تھا، منہ زبانی طور پر جس کی کوئی لکھت پڑھت نہیں ہوئی تھی، اس مکان کو بیچے ہوئے لگ بھگ چوبیس سال ہوگئے، میرے والد کا انتقال بھی بائیس سال پہلے ہوگیا، میں اپنے گھر کی سب سے چھوٹی بیٹی ہوں؛ لہٰذا اب وہ رجسٹری کروا رہے ہیں اس مکان کی، میرے دستخط ہونے ہیں، میرا ان سے کوئی مطالبہ نہیں ہے، اگر وہ اپنی خوشی سے مجھے کچھ پیسے دینا چاہیں تو وہ میرے لئے جائز ہیں یا نہیں؟ ویسے میں بہت غریب ہوں اور پندرہ سال سے مستقل بیمار بھی ہوں، شریعت کے دائرے میں بتائیں ان سے پیسے لینا جائز ہے؟

المستفتیة: ثریا سخاوت کھاری کنواں، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: آپ کے لئے ایمان داری اور دیانت داری کی بات یہ ہے کہ بلاکسی لالچ اور طمع کے رجسٹری پر دستخط کردیں نیت صحیح کی وجہ سے عنداللہ آپ کو اس کا اجر ملے گا اور اس دستخط کی وجہ سے آپ کی بیماری اور غربت کی وجہ سے اگر وہ اپنی جانب سے بخوشی بطور مدد کے کچھ دے دیں تو ان کی طرف سے ایک تبرع ہوگا۔

عن أبي سعيد الخدري –رضي الله عنه– عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: أيما مسلم كسا مسلما ثوبا على عرى، كساه الله من خضر الجنة، وأيما مسلم أطعم مسلما على جوع، أطعمه الله من ثمار الجنة، وأيما مسلم سقى مسلما على ظمأ، سقاه الله عز وجل من الرحيق المختوم. (أبو داؤد، باب في فضل سقى الماء، النسخة الهندية ١/ ٢٣٦، دارالسلام، رقم: ٦٨٢)

لا يجوز لأحد من المسلمين أخذ مال أحد بغير سبب شرعي. (البحرالرائق، كتاب الحدود، فصل في التعزير، زكريا ٥/ ٦٨، كوئٹه ٥/ ٤١، شرح المجلة، رستم مكتبه اتحاد ١/ ٦٢، رقم المادة: ٩٧، قواعد الفقه، اشرفي، ص: ١١١، رقم: ٢٦٩، هندية، زكريا قديم ٢/ ١٦٧، جديد ٢/ ١٨١، شامي، زكريا ٦/ ١٠٦، كراچی ٤/ ٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ شعبان ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۳)

خریدار کا ادائے قیمت پر کمیشن کا مطالبہ

سوال [۸۵۶۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مال خریدنے کے سودے میں کسی خریدار نے یہ طے کیا کہ مال کی رقم ادا کرنے پر ہم ایک یا

دو فیصد کمیشن یا مدت لیں گے، تو اس طرح کا لین دین شرعی اعتبار سے کیسا ہوگا؟

المستفتی: محمود ابن جمال الدین جی تیلی، محلّہ تیلیان کا ڈرا، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: خریدار کا قیمت ادا کرتے وقت کمیشن یا مدت لینے کا کیا مطلب ہے؟ بہرصورت جو آپس میں خریداری کا معاملہ کرتے وقت طے ہوا تھا، اسی طے شدہ معاملہ کے مطابق لین دین لازم ہے، اس کی خلاف ورزی جائز نہیں۔

عن عمرو بن عوف المزني عن أبيه عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: ...... والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢)

وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع، ولا خيار لواحد منهما. (هداية، كتاب البيوع، اشرفي ٣/ ٢٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٠/ ربیع الثانی ١٤٣٢ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٩/ ١٠٣٥٥)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٠/٤/١٤٣٢ھ

بیع میں کس جگہ کا اعتبار ہے؟

سوال [٨٥٦٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (١) دو شخصوں نے رامپور میں بیٹھ کر بریلی کی ایک زمین کے متعلق بیع وشراء کی اور فی گز کے اعتبار سے ثمن مقرر کیا؛ لیکن رامپور اور بریلی میں زمین کی پیمائش کا گز مختلف ہے، یعنی رامپور کا گز ٣٣/ انچ اور بریلی کا ٣٦/ انچ کا ہے۔ دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ فروخت شدہ زمین کس گز سے ناپ کر دی جائے گی، بریلی کے گز سے یا رامپور کے گز سے؟

(۲) اگر بائع نے مشتری کو رامپوری گز سے زمین کی پیمائش کی اور مشتری نے رامپور و بریلی کے گز کے فرق کو نہ جانتے ہوئے رامپوری گز کے لحاظ سے ثمن ادا کیا، تو اب بائع کو زمین پوری کرنی واجب ہے، جب کہ فروخت شدہ زمین سے متصل بائع کی زمین موجود ہے، یا گز کے تفاوت سے جو زائد رقم پہنچی ہے اس کی واپسی ضروری ہے؟

(۳) اگر بائع نے مسئلہ جاننے کے بعد نہ زمین پوری کی اور نہ ہی زائد رقم واپس کی، تو اس کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: محمد فاروق رامپوری، مدرس مدرسہ عربیہ حیات العلوم پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲-۳) حضرات فقہاء نے ایسی شکل میں مکان عقد کا اعتبار کیا ہے۔ اور جب دونوں نے رامپور میں رہ کر عقد کیا ہے، تو رامپوری گز کا اعتبار کیا جائے گا، بشرطیکہ بوقت عقد رامپوری اور بریلی کے گز کا کوئی ذکر نہ کیا گیا ہو؛ لہٰذا مذکورہ صورت میں بائع کا رامپوری گز کے لحاظ سے زمین دینا اور مشتری کا اسی حساب سے ثمن ادا کرنا صحیح اور درست ہے۔

باع عينا من رجل بأصفهان بكذا من الدنانير، فلم ينقد الثمن حتى وجد المشتري ببخاري يجب عليه الثمن بعيار أصفهان، فيعتبر مكان العقد. الخ (شامي، البيوع، مطلب يعتبر الثمن في مكان العقد، زكريا ۷/ ۵۹، كراچی ٤/ ٥٣٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٥/ ٤١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ ؍ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۱۴۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/ ۴/ ۱۴۱۳ھ

مشترکہ طور پر سامان خریدنے کی صورت میں کس پر کتنی قیمت واجب ہے؟

سوال [۸۵۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: میں نے ایک سامان نو روپیہ میں خریدا ہے، اس سامان میں تین آدمی ساجھی ہیں، ایک آدھے کا ساجھی ہے اور ایک تہائی کا اور ایک نویں حصہ کا، جس شخص سے سامان خریدا ہے، اس کو پیسہ دینا ہے، اب جو آدھے کا ساجھی ہے اس نے اپنے ساجھے کی پوری قیمت یعنی ساڑھے چار روپیہ دے دئے ہیں اور تہائی کے ساجھی نے بھی اپنے ساجھے کی پوری قیمت تین روپیہ دے دی ہے اور نویں حصہ کے ساجھی نے بھی اپنے نویں حصہ کا ایک روپیہ دے دیا ہے، پیسوں کا جوڑ ساڑھے آٹھ روپیہ ہوتا ہے، پچاس پیسہ کی کمی ہوتی ہے، کوئی ساجھی اپنے حصہ کی قیمت سے زیادہ پیسے دینے پر تیار نہیں ہے، احقر کو اس کے جواب سے نوازیں۔

المستفتی: حافظ ضیاء الاسلام، مدرس مدرسہ بدر العلوم گنگوار حسن پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب ساڑھے چار روپیہ آدھے کے ساجھی نے آدھا لے لیا اور ایک تہائی کے ساجھی نے اپنا ایک تہائی تین روپیہ میں لے لیا ہے اور نویں حصہ کے ساجھی نے ایک روپیہ میں اپنا نواحصہ لے لیا ہے، تو کل پیسوں کا جوڑ ساڑھے آٹھ روپیہ ہوتا ہے اور پچاس پیسہ کا ذمہ داران تینوں میں سے کوئی نہ ہوگا اور سامان میں سے بھی تینوں کے حصہ میں ساڑھے آٹھ ہی جا سکتے ہیں باقی نصف حصہ سامان کا بھی باقی ہے؛ لہٰذا پچاس پیسہ اس پر واجب ہوگا جو نویں حصہ میں سے بچا ہوا نصف حصہ لینا چاہتا ہے۔ اور اگر یہ نصف کوئی نہیں لیتا ہے تو بائع کا ہے، نیز یہ خریداری میں داخل نہیں ہوا ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ر صفر ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/۳۳۱۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۴/۲/۱۵ھ

خریدار کا زمین خالی کرانے کے لئے چھپ کر فصل کاٹ لینا

سوال [۸۵۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ایک شخص نے دوسرے شخص سے ایک کھیت خریدا اور کھیت کی کل قیمت ادا کردیا؛ لیکن کھیت ایک تیسرے آدمی کے قبضہ میں تھا، جس کی اس میں فصل لگی ہوئی تھی، خریدار نے کھیت خالی کرانا چاہا؛ لیکن قابض شخص خالی نہیں کر رہا تھا، تو خریدار نے چندآدمیوں کے درمیان کہا کہ اس کھیت سے جو شخص جتنی فصل چاہے کاٹ لے جائے، پھر رات کو چھپ کر فصل خریدار نے کاٹ لی، تو فصل کٹوانا شرعاً کیسا ہے؟ کیا وہ خریدار اپنا کھیت خالی کرانے کے لئے ایسا کر سکتا ہے یا وہ شرعاً چوری کرنے والا ہوگا؟ اور فصل کاٹتے وقت بہت سے لوگ اس کے حمایتی تھے، اس میں ایک مولانا صاحب بھی تھے، تو کیا وہ لوگ بھی شرعاً گنہگار رہوں گے؟ اور مولانا صاحب کی امامت کیسی ہے؟

المستفتی: مولانا حامد علی نئی بازار، تمبور سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب خریدار نے وہ زمین بائع سے خرید لی تو خریدار اس زمین کا مالک ہوگیا؛ اس لئے فصل لگانے والے آدمی کو کھیت خریدار کے حوالہ کردینا چاہئے تھا اور خریدار سے اس کی رقم وصول کرلینا چاہئے تھا، یا فصل لگانے والا کھیتی کاٹ کر زمین واپس کردیتا، نیز خریدار کو اپنی زمین پر قبضہ کرنے کے لئے فصل لگانے والے پر دباؤ ڈالنا درست ہے؛ لیکن رات میں چھپ کر فصل کاٹنا درست نہیں ہے۔ اور جن لوگوں نے رات میں چھپ کر فصل کاٹنے کی حمایت کی ہے وہ گنہگار ہوئے، ان سب کو توبہ کرنا چاہئے اور مولانا کی امامت درست ہے۔

وكذا إذا كان فيها زرع؛ لأن ملك المشتري مشغول بملك البائع، فكان عليه تفريغه وتسليمه. (هداية، كتاب البيوع، أشرفي ۳/ ۲٦، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٤/ ۱۱، زكريا ٤/ ۲۹۳، البحر الرائق، زكريا ٥/ ٥٠١، كوئٹه ٥/ ۳۰۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ شوال ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۱۶۴)

فرضی بل کے ذریعہ سرکاری گرفت سے بچنا

سوال [۸۵۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید امریکہ سے سامان منگاتا ہے اور سامان کی قیمت تحریر کے ذریعہ سے وہاں بھیجتا ہے، نقد رقم وہاں نہیں جاسکتی ہے اور اس چیز کا تحریری بل کے ذریعہ سے ہندوستان میں بیچنا ضروری ہے، اس کے بغیر وہ رقم امریکہ نہیں بھیج سکتا ہے، تو زید امریکہ سے سامان آجانے کے بعد ہی عمرو کو بغیر تحریری بل کے مثلاً دوسو روپیہ میں فروخت کیا اور دوسو روپیہ لے لئے؛ لیکن امریکہ رقم بھیجنے کے لئے بل ضروری ہے، تو زید نے خالد سے یوں کہا کہ تم مجھے فرضی دوسو روپیہ کا بل بنادو کہ میں نے تم کو دوسو روپیہ میں فلاں سامان فروخت کیا ہے، خالد نے فرضی دوسو روپیہ کا بل بنادیا، لیکن خالد دوسو روپیہ کا بل بنا کر زید سے ۲۵/ روپیہ لیتا ہے کہ میں بل کی وجہ سے انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس ادا کروں گا، تو زید کا فرضی بل بنانے کی وجہ سے ۲۵/ روپیہ خالد کو دینا جائز ہے یا نہیں؟ مع الدلائل تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد سعید پالنپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس مسئلہ میں اولاً یہ بات قابل تنقیح ہے کہ زید نے عمرو کو مال بیچتے وقت ہی اس سے بل کیوں نہیں بنوایا؟ اس میں کیا مصلحت ہے؟ اگر زید کو بل کی ضرورت تھی تو وہ عمرو ہی سے مال بیچتے وقت بل بنواتا؛ البتہ اگر اس طرح کا معاملہ ہو چکا ہے اور عمرو سے بل بنوانے میں دشواری ہے تو اپنے حق کی حفاظت اور نقصان سے بچنے کے لئے جعلی بل بنوانا بضرورت گنجائش ہوگی اور بل بنوانے والے نے اگر انکم ٹیکس کے عنوان سے زید سے رقم طلب کی تو زید کے لئے اس رقم کو دینا بھی درست ہوگا۔

لا بأس بالرشوة إذا خاف على دينه، تحته في الشامية عبارة المجتبى لمن يخاف، وفيه أيضا، دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه

وماله ولاستخراج حق له، ليس برشوة، يعني في الدافع. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ۹/ ۶۰۷، كراچی ۶/ ۴۲۳-۴۲۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ رشوال ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۰۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵ رشوال ۱۴۱۰ھ

حکومت کے قانون کے خلاف نیپال میں جا کر غلہ بیچنا

سوال [۸۵۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہندوستان میں بہت سے حضرات ایسے ہیں جو ہندوستان میں رہ کر اپنا غلہ ہندوستان کے بجائے نیپال میں بیچتے ہیں؛ اس لئے کہ نیپال میں غلے کی قیمت زیادہ لگتی ہے اور مہنگا فروخت ہوتا ہے؛ لیکن انڈیا حکومت اس پر پابندی لگاتی ہے اور پولیس وغیرہ کے ذریعہ سے روکتی ہے، اس کے باوجود لوگ ان سے چھپ کر اپنے غلہ کی سپلائی نیپال ہی میں کرتے ہیں اور بعض حضرات پولیس والوں کو کچھ رقم دے دیتے ہیں، جس سے وہ خوش ہو کر اس کام کی اجازت دے دیتے ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ان حضرات کا نیپال میں اپنا مال سپلائی کر کے نفع حاصل کرنا از روئے شرع درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: نیاز احمد متعلم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب ہندوستان میں نیپال کے مقابلہ میں غلہ کی افراط ہے اور غلہ کے مالک کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ جہاں سے نفع زیادہ حاصل ہو اپنا غلہ وہیں لے جا کر فروخت کرے؛ اس لئے نیپال لے جا کر جنہوں نے زیادہ نفع حاصل کیا ہے وہ ان کے لئے بلا تردد حلال اور جائز ہے؛ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ حکومت کے قوانین اور گرفت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا بھی لازم ہے، اس کا خیال ضروری ہے۔

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ۱۹۵]

ولا يمنع الشخص من تصرفه في ملكه إلا إذا كان الضرر بجاره ضررا بينا، فيمنع من ذلک. (الدرالمختار مع الشامي، كتاب القضاء، باب كتاب القاضي إلى القاضي، مطلب اقتسموا دارا، وأراد كل منهم فتح باب لهم ذلك، زكريا ۸/ ۱۵۲، کراچی ۵/ ٤٤٧)

القياس في جنس هذه المسائل أن من تصرف في خالص ملكه لا يمنع ولو أضر بغيره لكن ترک القياس في محل يضر بغيره ضررا بينا. (شامي، البيوع، باب المتفرقات، مطلب ربغ فى داره وتأذى الجيران، زكريا ۷/ ٤٩٢، کراچی ٥/ ٢٣٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ربیع الاول ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۲۷۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۳/۴ھ

وکیل کا فعل مؤکل کے فعل کے حکم میں ہوتا ہے

سوال [۸۵۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید جو شہر لکھنؤ کا رہنے والا ہے، وہ دبئ کی شہزادیوں کا نوکر تھا، پھر زید کو اس پر مامور کیا گیا کہ وہ دبئ سے کپڑے لے کر بمبئ سے سلوا کر دے جو اس کی مزدوری ہوگی، اس کو دی جائے گی، چنانچہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ وہ دبئ سے کپڑا لے کر بمبئ آیا اور سلوا کر پیش کیا، تو ان شہزادیوں نے کہا: مہنگا سلوا کر لائے ہو اور تمہاری غلطی نہیں ہے، تم بمبئ کے تاجروں کے فریب میں آگئے ہو، الغرض اس طرح اس کو روپئے نہ ملے اور سارا مال ان شہزادیوں نے منگوالیا، تو اب تفصیل طلب مسئلہ یہ ہے کہ یہ روپئے کس کے ذمہ عائد ہوں گے؟ اور قرضدار کی موت کون مرے گا، زید یا شہزادیاں اور قصوروار کون ہوں گے؟ دلیل کی روشنی میں جواب سے نوازیں۔

المستفتی: حبیب احمد دبئ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سائل اپنے بیان میں سچا ہے تو زید شہزادیوں کی طرف سے محض وکیل ہے اور وکیل کا فعل موکل کے فعل کے حکم میں ہوتا ہے۔ اور مذکورہ صورت میں چونکہ زید شہزادیوں سے رقم وصول کرنے سے قاصر ہے؛ اس لئے قرض دار کی موت مرنے والی شہزادیاں ہی ہوں گی، جب کہ غبن فاحش نہ ہو۔

کما استفید من الهداية: الوكيل بالشراء يجوز عقده بمثل القيمة وزيادة يتغابن الناس في مثلها. (هداية، كتاب الوكالة، باب الوكالة بالبيع والشراء، أشرفي ديوبند ۳/ ۱۸۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ محرم ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۹۸۳)

فروختگی کا وکیل بنانا

سوال [۸۵۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید اپنی ایک زمین بیٹی کے نام چھوڑ کر مر گیا، بیٹی نے بیچنے کی بھاگ دوڑ سے بچنے کے لئے زبانی طور پر بلاکسی شرط کے بھائی پر بھروسہ کر کے بھائی کو بیچنے کا اختیار دیا، تین سال قبل بھائی اس طور پر راضی ہوا کہ میں اس کو اپنے طور پر بیچ دوں گا اور تم کو پچاس ہزار روپیہ مل جائے گا، اس پر وہ راضی ہوگئی، اب بیٹی کو پیسہ کی ضرورت ہے اور بھائی نہ زمین بیچتا ہے اور نہ ہی پچاس ہزار روپیہ دیتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ پچاس ہزار روپیہ زمین فروخت ہونے کے بعد ہی ملے گا، چاہے جس وقت فروخت ہو اور جس قیمت میں فروخت ہو، اب اس زمین کی قیمت پچاس ہزار سے کہیں زیادہ ہوگئی ہے، اب بھائی اس وجہ سے مؤخر کر رہا

ہے کہ قیمت اور بڑھ جائے اس میں اس کے بھائی کا نفع ہے، تو ایسی صورت میں دونوں بھائی بہنوں کے لئے کیا حکم ہے؟ جواب سے نوازیں۔

المستفتی: عبدالرؤف گونڈوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسا معاملہ کرنا درست ہے کہ فروختگی کی ذمہ داری سونپی جائے اور وہ یہ کہے کہ تم کو اتنا پیسہ دوں گا اور جتنے میں چاہوں فروخت کروں گا، گویا ایسا ہوگیا کہ پچاس ہزار روپئے میں وہ زمین بھائی نے خریدی ہے، اس کو بیچ کر جو زائد نفع حاصل ہوگا وہ بھائی کے لئے جائز ہوگا؛ لیکن گاہک ملنے کے بعد زیادہ تاخیر کی اجازت نہیں ہے، اگر بھائی زیادہ تاخیر کرتا جارہا ہے اور بہن کو پیسوں کی پریشانی ہے تو بہن کو حق ہے کہ زمین واپس لے لے، پھر از خود یا کسی غیر کے ذریعہ فروخت کرواکے اپنی ضرورت پوری کرلے، نیز مذکورہ معاملہ میں پچاس ہزار روپیہ دینے کی مدت صاف طور پر متعین نہیں ہے؛ اس لئے مدت کی جہالت اتنی برداشت کی جاسکتی ہے جتنے میں فریقین میں اختلاف نہ ہو، اور اتنی جہالت جس کی وجہ سے فریقین میں اختلاف پیدا ہوجائے عقد بیع میں جائز نہیں۔ اور یہاں زیادہ تاخیر کی جہالت اختلاف کا سبب بن گئی ہے؛ لہٰذا بھائی پر لازم ہے کہ بہن کی رضامندی سے فوری فروخت کردے۔ اور اگر فوری فروخت کرنا نہیں جانتا تو بہن کی زمین اس کے حوالہ کردے، ورنہ گنہگار ہوگا۔

ولو باع إلى هذه الآجال، ثم تراضيا بإسقاط الأجل قبل أن يأخذ الناس في الحصاد –إلى قوله– ولنا: أن الفساد للمنازعة وقد ارتفع قبل تقرره، وهذه الجهالة في شرط زائد لا في صلب العقد، فيمكن إسقاطه.

(هداية، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد ٣/ ٦١)

وقد يكون الفساد لمخافة تنازع، ولا يكون فيه شيء آخر يوجب الإثم، فذلك إن لم يقع فيه التنازع جاز عندي ديانة. (فيض الباري، كتاب

البیوع، باب من آجر أمر الأمصار علی ما یتعارفون، مکتبة الرشید، کوئٹہ ۳/ ۲۵۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ رجب ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۸۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۷/۵ھ

بائع مبیع کی قیمت وکیل سے کم لے تو کیا حکم ہے؟

سوال [۸۵۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اسکوٹر پارٹس کی ایک کمپنی ہے، اس سے اگر کوئی عام شخص اسکوٹر خریدے تو اس کو پورے سو روپے میں دے گا، اور اگر اس کا خاص آدمی خریدے تو اس کو سو روپے کی رسید دے گا اور دس پرسینٹ چھوٹ ہوگی، اب اگر یہ خاص آدمی کسی عامی کا وکیل ہے اور اسکوٹر خرید کر موکل کے لئے لایا اور سو روپے کی رسید موکل کو دکھا کر پورے پیسہ لے لئے؛ لیکن موکل کو اس بات کی خبر نہیں ہوتی ہے کہ اس کو دس پرسینٹ کی چھوٹ ہے اور مجھ سے زیادہ لے رہا ہے۔ اور نہ اس کو (وکیل کو) ہاتھوں ہاتھ ملتا ہے؛ بلکہ ایک مدت متعینہ کے بعد کمپنی اس کو دس پرسینٹ کا حساب کر کے دے گی، تو بیع کی یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: مولوی عبدالواحد، معلم مدرسہ فیض التبلیغ ج، پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں درج شدہ صورت میں نفسِ عقدِ شراء اور عقدِ وکالت دونوں درست اور صحیح ہیں؛ لیکن وکیل سے رقم کی جو مقدار کی کمی کی گئی ہے وہ موکل کے حق میں ہوگی؛ لہٰذا وکیل کے لئے موکل سے سو روپے کی رسید دکھا کر سو روپے اصول کرنا جائز نہیں ہوگا، وکیل پر واجب ہے کہ دس روپے موکل کو واپس کر دے اور ۹۰/ روپے وصول کرے، ورنہ دس روپے وکیل کے لئے حرام ہوں گے۔

وإن حط البائع عن الوكيل بعض الثمن فإنه يحطه عن الموكل –إلى قوله– ولو وهب البائع بعض الثمن عن الوكيل يظهر ذلك في حق الموكل حتى لم يكن للوكيل أن يرجع على الموكل بذلك القدر. (هندية، كتاب الوكالة، قبيل الباب الثالث في الوكالة بالبيع، زكريا قديم ٣/ ٥٨٨، جديد ٣/ ٤٩٩، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ١٥٥، زكريا ٧/ ٢٦٣، هكذا في الشامي، زكريا ٨/ ٢٥٠، كراچی ٥/ ٥١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۲۵۴)

مستحق نکل آنے والی زمین کا حکم

سوال [۸۵۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے ایک زمین عمرو کو فروخت کی ۱۹۹۸ء میں۔ اور عمرو نے خرید کر رجسٹری کروائے بغیر اس زمین پر ایک مکان تعمیر کرلیا ۲۰۱۰ء میں جب حکومت سے سروے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ زمین زید کی نہیں؛ بلکہ اس کا آدھا حصہ حکومت کا ہے، جس پر راستہ آرہا ہے۔ اور آدھا حصہ ایک عیسائی کی زمین ہے اور زید کی زمین اس کے پڑوس میں ہے اور اس وقت عمرو کہہ رہا ہے کہ زید نے مجھے دھوکہ دیا ہے؛ اس لئے وہ مجھے زمین اور اس پر تعمیر شدہ مکان کی قیمت ادا کرے اور زید کہہ رہا ہے کہ مجھ سے غلط فہمی ہوگئی تھی، البتہ میں زمین کی قیمت واپس کروں گا، مکان کی نہیں، تو اب معلوم یہ کرنا ہے کہ زید عمرو کو زمین کی کون سی قیمت واپس کرے گا ۱۹۹۸ء کی یا ۲۰۱۰ء کی؟ اور زمین پر تعمیر شدہ مکان کی قیمت کا کون ذمہ دار ہے؟ نیز عمرو کا رجسٹری نہ کروانا اور تحقیق نہ کروانا بھی غلطی میں شمار ہوگا یا نہیں؟ جواب سے نوازیں۔

المستفتی: سید اللہ الغالب، مدرسہ عربیہ تعلیم القرآن اپہلی اندورا، چکمگلور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں زید پر زمین کی ۱۹۹۸ء کی قیمت عمر وکو لوٹانا واجب ہے، نیز مذکورہ زمین پرتعمیر کردہ مکان کی موجودہ قیمت بھی اسی کے ذمہ عمروکو دینا لازم ہے۔اورعمرو رجسٹری اور تحقیق نہ کرنے کے باوجود دونوں قیمتوں کا مستحق رہے گا۔اور اس کی ایک متبادل شکل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ زید عیسائی کوراضی کرکے اس زمین کی جو بھی قیمت بنتی ہو وہ قیمت عیسائی کوادا کردے یا زید کی جو زمین ہے عیسائی کو وہی زمین تبادلہ میں دے دے، اوراس سلسلہ میں ایک سرکاری کاغذ بھی ایسا بنالیا جائے جس کی وجہ سے بعد میں کوئی نزاعی شکل نہ بن سکے۔

شری دارا وبنی فیها، فاستحقت رجع بالثمن وقیمة البناء مبنیا علی البائع إذا سلم النقض إلیه یوم تسلیمه، وتحته في الشامیة: متعلق بقیمة، فلو سکن فیه وانهدم بعضه أو زادت قیمته یرجع علیه بقیمة البناء یوم التسلیم. (شامي، کتاب البیوع، باب الاستحقاق، زکریا ۷/ ۴۴۹، کراچی ۵/ ۲۰۵)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍رجب ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۱۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/ ۷/ ۱۴۳۱ھ

پریس والوں کا پوری قیمت وصول کرکے کچھ اشتہار کم دینا

سوال [۸۵۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید کتابت اور چھپائی کا کام کرتا ہے اور جتنے اشتہار یا کتابچے وغیرہ قیمت مقررہ پر چھاپنے طے ہوتے ہیں ان سے دو چار یا آٹھ دس کم دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اتنے عدد تو عام طور پر پریس میں خراب ہو ہی جاتے ہیں اور قیمت طے شدہ ہی لیتا ہے، تو کیا یہ فعل

اس کا درست ہے؟ اور اگر بعد میں جتنے اشتہار کم چھپتے ہیں ان کی قیمت واپس کردے، تو کیا یہ معاملہ درست ہوجائے گا؟

المستفتی: (مفتی) اسرار احمد نجیب آباد، بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جی ہاں چھپائی میں کچھ کاغذ ضرور خراب ہوجاتے ہیں؛ اس لئے جتنی تعداد خراب ہوجائے اتنی کم دے کر پوری قیمت لینا پریس والوں کے لئے جائز ہے؛ اس لئے کہ خراب ہوجانا مشاہدہ میں ہے اور جتنے اشتہار کم چھپے ہیں ان کی قیمت واپس لینا اس شرط پر جائز ہے کہ جب اتنے خراب نہ ہوئے ہوں۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: لا ضرر ولا ضرار. (سنن ابن ماجة، الأحكام، باب من بنى في حقه ما يضر بجاره، النسخة الهندية ١/ ١٦٩، دارالسلام، رقم: ٢٣٤١، المعجم الكبير للطبراني ٢/ ٨٦، رقم: ١٣٨٧، الأشباه، قديم: ١١٨، جديد زكريا ١/ ٢٥٠، قواعد الفقه ١٠٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ / ذیقعدہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۳۵۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/ ۱۱/ ۱۴۲۰ھ

سپلائر کا کارخانہ دار سے سامان خرید کر دوکاندار کو کم قیمت میں فروخت کرنا

سوال [۸۵۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک کارخانہ دار نے اپنے یہاں کا مال تیار کیا ہوا ایک سپلائر کے ہاتھ بیچ دیا، اس سپلائر نے خریدنے کے بعد وہ مال مارکیٹ میں جاکر ایک دوکاندار کے ہاتھ بیچ دیا، جتنے میں کارخانہ دار سے خریدا تھا اس سے پچاس روپئے کم میں بیچ دیا، اب کارخانہ دار کو اطلاع ملی کہ میرے یہاں کا مال مارکیٹ میں فلاں دوکاندار کو پچاس روپئے کم میں بیچا، وہ مال تقریباً ۲۰/ یا ۲۵/ ہزار عدد تھا، جس کے پچاس روپئے سے ۱۰/ یا ۱۲/ لاکھ روپئے بیٹھتے ہیں، اب کارخانہ دار دوکاندار کو

اپنے گھر بلاتا ہے اور آدمیوں کو بھی جمع کرتا ہے اور سب کے سامنے یہ کہتا ہے کہ اس دوکاندار نے ہمارا مال پچاس روپئے کم میں سپلایر سے خریدا ہے، اب یہ رقم ہمیں چاہئے، اس میں کافی لوگ جمع تھے، اب یہ فرمائیں علماء دین یہ کہ ۱۰/ یا ۱۲/ لاکھ روپئے کی رقم ان آدمیوں کا کارخانہ دار کو دلانا جائز ہے یا نہیں؟ اور ان کا اس رقم کو لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: حاجی فرزند صاحب سرائے ترین سنبھل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دوکاندار نے سپلایر سے خریدا ہے، دوکاندار کا معاملہ سپلایر سے ہے کارخانہ دار سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، جیسا کہ سوال نامہ سے واضح ہو رہا ہے۔ اور سوال نامہ سے یہ بھی واضح ہے کہ کارخانہ دار نے دوکاندار سے کوئی معاملہ نہیں کیا ہوا ہے؛ بلکہ سارا معاملہ دوکاندار اور سپلایر کے درمیان میں ہے؛ اس لئے سپلایر نے جتنے میں دوکاندار کو دیا ہے، دوکاندار کو اتنے میں خریدنے کا حق ہے، اب اگر سپلایر نے کارخانہ دار سے ادھار خرید کر دوکاندار کے ہاتھ کم قیمت میں نقد بیچا ہے تو اس نقصان کا ذمہ دار سپلایر ہے، دوکاندار نہیں؛ اس لئے دوکاندار سے کسی قسم کے مطالبہ کا حق نہیں۔ اور سارا مطالبہ سپلایر سے ہوگا۔

الثمن المسمى هو الثمن الذي يسميه ويعينه العاقدان وقت البيع بالتراخي، سواء كان مطابقا بقيمته الحقيقية أو ناقصا عنها، أو زائدا عليها.
(شرح المجلة، رستم مكتبه اتحاد ١/ ٧٣، رقم المادة: ١٥٣، مجلة الأحكام العدلية ١/ ٣٣، رقم المادة: ١٥٣)

يجوز للمشتري أن يزيد في الثمن، ويجوز للبائع أن يحط من الثمن، وأن يزيد في المبيع ويلتحق بأصل العقد، ويتعلق الاستحقاق بجميع ذلك. الخ (تبيين الحقائق، كتاب البيوع، باب التولية، زكريا ٤/ ٤٤٢، إمداديه ملتان ٤/ ٨٣، مختصر القدوري، باب المرابحة والتولية، ص: ٨١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ رجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۳۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۷/ ۱۴۳۴ھ

مبیع کو انعام کے ساتھ فروخت کرنا

سوال [۸۵۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عبدالحلیم تجارت کرتا ہے، جس میں کچھ ایسی صورتیں درپیش ہیں جو مشکل کا باعث ہیں، مثلاً میٹھی سپاری کا ایک پورا پیکٹ جس کی قیمت ۲۲/ روپئے ہے، جس کے اندر ۶۰/ پاؤج ہوتے ہیں، میٹھی سپاری کے ہر پاؤج کی فروخت پچاس پیسے ہے، اس حساب سے پورے پیکٹ کے منافع ۸/ روپئے ہیں، اس پیکٹ کی قیمت جتنی پہلے تھی اتنی ہی اب ہے؛ لیکن قبل ازیں پاؤج میں انعامات نہیں ہوتے تھے، مگر اب سپاری میں بغیر کسی کمی کے انعام کے طور پر کچھ چیزیں رکھ دی ہیں، مثلاً پنسل، قلم اور گھڑی، سائیکل وغیرہ اور کمپنی کی طرف سے یہ اعلان ہے کہ کمپنی صرف مال کے پیسے لے رہی ہے اور انعام فری میں دئے جا رہے ہیں، کیا ایسی حالت میں ان جیسی اشیاء کی خرید وفروخت شریعت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالحلیم مجاشاہ قلندر لہر پور، سیتاپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب کمپنی کی طرف سے یہ اعلان ہے کہ وہ صرف سپاری کی پیکٹ کے پیسے لے رہی ہے اور انعامات اپنی جیب خاص سے دے رہی ہے، تو ایسی صورت میں یہ بیع جائز ہوگی؛ لیکن ایسے معاملہ میں کسی حد تک قمار کا شبہ رہتا ہے؛ اس لئے یہ معاملہ کم سے کم کراہت تنزیہی کے درجے میں ہوگا؛ البتہ اگر خریدنے والے کی نیت صرف انعام حاصل کرنا ہو اور سپاری کی خریداری ضمنی طور پر ہو تو پھر یہ شکل جائز نہ ہوگی۔ (مستفاد: جواہر الفقہ، قدیم ۲/ ۳۴۵، جدید زکریا ۴/ ۵۲۶، جدید فقہی مسائل ۴/ ۲۷۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ رجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۴۵۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/ ۷/ ۱۴۲۵ھ

اسکیم کے تحت پنکھے کی خرید وفروخت

سوال [۸۵۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک سوال پیش خدمت ہے، جس کے لئے فتویٰ عنایت کریں کہ کام کرنے کے لئے کہاں تک گنجائش ہے، اگر اس کام میں مسئلہ کے مطابق رخصت ہوتو تحریر فرمائیں کام یہ ہے کہ ہم بجلی سے چلنے والے پنکھے جن کی قیمت مبلغ چار سو پانچ روپیہ فی عدد ہوتی ہے، ایک اسکیم کے تحت پانچ روپیہ روزانہ جمع کر کے ۸۰؍دن میں کل چار سو پانچ روپیہ فیس ممبری وصول کرتے ہیں، اپنی اس اسکیم کے مطابق ہفتہ یا پندرہ دن میں ایک عدد پنکھا بطور انعام بذریعہ قرعہ اندازی کسی بھی ایک ممبر کو دے دیتے ہیں، یہ سلسلہ اسکیم مکمل ہونے تک چلتا رہتا ہے، اسکیم کی مدت مکمل ہونے پر تمام ممبران کو پنکھے دے دیئے جاتے ہیں، دوران اسکیم بھی اگر ممبر کو ضرورت ہوتو نصف رقم جمع ہوجانے کے بعد بھی پنکھا دے دیا جاتا ہے (یہ بات تعلقات اور بھروسہ پر مبنی ہے، جو قیمت اسکیم میں رکھی گئی ہے، وہی قیمت نقد پنکھے کی بھی ہے، حق کسی کا نہیں مارا جاتا، قسط جمع کرنے کے بعد روزانہ خاص محنت بھی کی جاتی ہے۔

المستفتی: منور علی، شیر کوٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: متعدد وجوہ سے یہ اسکیم ناجائز اور حرام ہے (۱) یہ عقود شرعیہ میں سے کسی میں بھی پوری طرح داخل نہیں، نہ بیع میں نہ سلم میں، نہ ہبہ میں، نہ شرکت میں۔ (۲) جو رقم قسطوں میں جمع ہوتی ہے وہ تمام ممبران کی مساوی ملکیت ہے، قرعہ اندازی میں تمام ممبران کی ملکیت کا بلا معاوضہ ایک شخص کو مالک بنایا جاتا ہے۔ (۳) دیگر ممبران راضی بھی نہیں ہوتے اور ہوں تو مجبوراً؛ کیوں کہ ہر ایک کی تمنا ولالچ رقم جمع کرنے میں یہی ہے کہ قرعہ میں میرا نام نکل آئے اور یہ امر متردد فیہ ہے جو شرعاً قمار میں داخل ہے۔ (۴) شرکت میں اس لئے داخل نہیں کہ اس میں نفع ونقصان میں سب کا برابر شریک ہونا شرط ہے جو یہاں

نہیں ہے؛ لہٰذا یہ معاملہ ہرگز ناجائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ، قدیم ۶/ ۱۴۲، جدید زکریا ۹/ ۴۶۶، کفایت المفتی قدیم ۸/ ۱۲۲، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۱۰۷-۱۰۸، امداد الفتاوی زکریا ۴/ ۱۶۲، فتاوی محمودیہ، قدیم ۴/ ۲۵۴، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۳۳۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍محرم الحرام ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۴۲۶)

عقد کے وقت ثمن میں جہالت نہ ہو تو عقد صحیح ہے؟

سوال [۸۵۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا کسی غیر مسلم سے کاروبار چلتا ہے، اس طرح کہ مثلاً زید نے کسی غیر مسلم کو کوئی چیز فروخت کی، دو سو روپئے قیمت طے ہوئی؛ لیکن وہ غیر مسلم یوں کہتا ہے کہ ان غیر مسلموں کے یہاں مدت دراز سے یہی قانون بنا ہوا ہے، اگر نقد روپیہ لوگے تو ۲۵؍ پرسینٹ رقم کم ملے گی۔ اور اگر ایک ماہ بعد لوگے تو بیس پرسینٹ کم رقم ملے گی۔ اور دو ماہ بعد لوگے تو دس پرسینٹ کم ملے گی اور تین ماہ بعد لوگے تو پانچ پرسینٹ کم ملے گی، تو زید نے یہ طے کرلیا کہ ایک ماہ بعد ۲۰؍ پرسینٹ کم پر دے دیں، یہ معاملہ طے ہوگیا؛ لیکن وہ غیر مسلم ایک ماہ پورا ہونے پر رقم نہیں دیتا ہے، مطالبہ پر یوں کہتا ہے کہ دو ماہ پورے ہونے پر ۱۰؍ پرسینٹ کم پر لے لینا، تو اس طرح مدت کے بڑھ جانے پر زید کے لئے دس پرسینٹ بڑھا کر لینا جائز ہے یا نہیں؟ حالانکہ اس نے ۲۰؍ پرسینٹ کم پر معاملہ طے کیا تھا اور اس طرح کا معاملہ بھی درست ہے یا نہیں؟ مع الدلائل بحوالہ کتب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد سعید، پالن پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت ہذا میں اگر عقد کے وقت ثمن میں کوئی

جہالت نہ تھی اور یہ بات طے کر لی گئی تھی کہ ایک مہینہ بعد بائع کو اتنی رقم دی جائے گی، تو یہ معاملہ درست اور منعقد ہوگیا، البتہ اگر مشتری وقت پر ثمن نہ ادا کرے تو مزید مہلت دینے کی وجہ سے طے شدہ ثمن سے زیادہ لینا درست نہ ہوگا؛ بلکہ اتنی ہی رقم لی جائے گی جتنی ابتداء عقد میں طے ہوئی تھی، یہ بات یاد رہے کہ فیصدی کے ذریعہ اس طرح رقم طے کرنا کہ اصل ثمن مجہول رہے جائز نہیں ہے؛ اس لئے اس طرح کا معاملہ کرتے وقت اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

قال في النهر: ولو كان البدل مثليا، فباعه به وبعشرة، أي عشر ذلك المثلي، فإن كان المشترى يعلم جملة ذلك صح وإلا، فإن علم في المجلس خير وإلا فسد. (شامي، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، زكريا ٧/ ٣٥٢-٣٥٣، كراچی ٥/ ١٣٥، النهر الفائق، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤٥٦، تبيين الحقائق، مكتبه إمداديه ملتان ٤/ ٧٤، زكريا ٤/ ٤٢٤)

كل قرض جر نفعا فهو ربا حرام. (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ١٠٢، رقم: ٢٣٠) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ رشوال ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۰۱۱)

پیکنگ شدہ ڈبوں کی وزن کئے بغیر خرید وفروخت کرنا

سوال [۸۵۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آج کل مارکیٹوں میں جو بیوعات ہوتی ہیں، ان کی مختلف صورتیں ہیں: ایک صورت تو یہ ہے کہ مشتری ایک کیلو یا دو کیلو کی پیکٹ خریدتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مشتری خرید وفروخت مجازفۃ کرتا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ دوکاندار مشتری کے کسی وکیل کے سامنے اشیاء تولتا ہے، ان تمام صورتوں میں اگر دوکاندار مشتری کے سامنے اشیاء نہ بھی تولے تو بھی اس کے جواز میں کسی کو کوئی کلام نہیں۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ مشتری دوکاندار کو ایک چٹ دے دیتا ہے جس کے مطابق دوکاندار اشیاء تول کر مشتری کے گھر بھجوا دیتا ہے، جس میں مشتری کی جانب سے کوئی وکیل بھی نہیں ہوتا اور مشتری وزن کا اعادہ نہیں کرتا ہے۔

پانچویں صورت یہ ہی ہے کہ مشتری جب دوکان جاتا ہے تو دوکاندار نے پہلے سے اشیاء تول کر رکھی ہوتی ہیں اور سابقہ وزن کی بنیاد پر مشتری اشیاء لے لیتا ہے اور وزن کا اعادہ نہ دوکان میں کرتا ہے نہ گھر جا کر کرتا ہے، حالانکہ ''بہشتی زیور'' میں اس طرح کے اشیاء کے استعمال کرنے کو ناجائز لکھا ہے۔ اور تمام متون سے بھی یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ آخری دو صورتیں اگر واقعی ناجائز ہیں تو کیا ان کے جواز کی کوئی صورت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ کیوں کہ آج کل اس طرح کی بیوعات میں تو عوام وخواص مبتلا ہیں۔ از راہ کرم جواب باصواب سے مطلع فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔ جزاک اللہ

المستفتی: محمد بن احمد حسین پٹنی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مشتری کے سامنے کیل کرنا اور تولنا یا مشتری کا گھر لا کر کے کیل کرنا اور تولنا اس صورت میں لازم ہوتا ہے کہ جب خریدار کو بائع اور دوکاندار پر اعتماد نہ ہو اور آج کل کے زمانہ میں کیل کی ہوئی چیزیں اور تلی ہوئی چیزیں جو پیکنگ شدہ خرید وفروخت ہوتی ہیں، ان پر اعتماد ہوتا ہے؛ اس لئے مشتری کے سامنے تولنا یا کیل کرنا یا مشتری کا گھر لا کر کے تولنا یا کیل کرنا لازم نہیں ہے۔ اور ''بہشتی زیور'' میں جو لکھا ہوا ہے، اسی طرح تمام متون میں جو لکھا ہوا ہے، ان سب کا مدار اسی پر ہے کہ جب مشتری کو بائع پر اعتماد نہ ہو یا مفضی الی المنازعت ہو اور یہاں نہ کوئی عدم اعتماد ہے اور نہ مفضی الی المنازعت ہے۔ اور

سوال نامہ میں جتنی شکلیں رائج شدہ لکھی گئی ہیں وہ سب جائز ہیں۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۳/ ۴۹۹-۴۹۷، انوار رحمت، ص:۲۸۱، جامع الفتاوی ۳/ ۱۵۸)

فالذي يتبين أن المشتري إن اعتمد على كيل البائع جاز له أكله بدون إعادة الكيل، سواء كان بحضرته أو بغيبته. (فيض الباري ۳/ ۲۲۰)

وقيد بقوله: ''غير الدراهم والدنانير" ...... كبيع التعاطي، فإنه لا يحتاج في الموزونات إلى وزن المشتري ثانيا؛ لأنه صار بيعا بالقبض بعد الوزن، قنيه وعليه الفتوى، خلاصة، عبارة البحر: وهذا كله في غير بيع التعاطي أما هو فقال في القنية: ولا يحتاج الخ، وظاهر قوله، وهذا كله أنه لا يتقيد بالموزونات بل التعاطي في المكيلات والمعدودات كذلك.

(شامي، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، مطلب في تصرف البائع في المبيع قبل القبض، زكريا ۷/ ۳۷۳، كراچى ۵/ ۱۵۰، قديم ص: ۱۵۴)

فصل في تعارض العرف مع الشرع، فإذا تعارضا قدم عرف الاستعمال. (الأشباه والنظائر، زكريا ص: ۲۷۴، قديم: ۱۵۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۸۵۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۱۱/۲۱ھ

بنجر زمین کو آباد کرنا

سوال [۸۵۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک زمین جو کہ نہر کے کنارے ہے، جو بنجر پڑی ہوئی تھی، زید نے اس کو اپنے نام پٹواری سے کرالیا، کچھ قیمت دے کر، واضح رہے کہ وہ زمین کسی کی ملکیت میں نہیں تھی، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا شرعی اعتبار سے اس پر زید کی ملکیت درست ہے؟

المستفتی: عبد الرحمٰن سول لائن، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بنجر زمین جس پر کسی کی ملکیت نہ ہو اسے جب کوئی شخص آباد کرلے اور آباد کرنے کے بعد حکومت کی اجازت سے اپنے نام کاغذات بنالے، تو وہ زمین اس کی ملکیت ہوجاتی ہے۔ اور بورڈ کی طرف سے جو علاقہ کا پٹواری ہوتا ہے، اس پٹواری کے ذریعہ سے اگر نام کرالیا جائے تو وہ صحیح اور درست ہوجاتا ہے؛ لہٰذا سوال نامہ میں زید نے جو زمین آباد کرکے پٹواری کے ذریعہ اپنے نام کروالیا ہے وہ شرعی طور پر درست ہے، زید اس کا مالک ہے۔

عن عائشة –رضي الله عنها– عن النبي ﷺ قال: من أعمر أرضا ليست لأحد فهو أحق، قال عروة: قضى به عمر في خلافته. (صحيح البخاري، كتاب الحرث والمزارعة، باب من أحيى أرضا مواتا، النسخة الهندية ١/ ٣١٤، رقم: ٢٢٧٧، ف: ٢٣٣٥)

فالملک في الموات يثبت بالإحياء بإذن الإمام عند أبي حنيفة، وعندهما يثبت بنفس الإحياء وإذن الإمام ليس بشرط. (بدائع الصنائع، كتاب الأراضى، زكريا ٥/ ٢٨٤، إمداديه ملتان ٦/ ١٩٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۶۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۱/۱۴۲۶ھ

سرکاری افتادہ زمین کی خرید وفروخت کی شرعی حیثیت

سوال [۸۵۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ممبئی کی آراضی سے متعلق ویسے تو بہت سے مسائل ہیں، فی الحال شخصی ملکیت والی آراضی سے متعلق حکم شرعی مطلوب ہے۔ چنانچہ ممبئی کے بعض علاقوں میں متعین شخص یا چند افراد (کمپنی) کی بڑی بڑی آراضی ہیں، سرکاری ریکارڈ میں ان کے مالک ہونے کے تمام

ثبوت وشواہد موجود ہیں، قانوناً ان کے خلاف کسی کا دعویٰ بھی نہیں ہے؛ لیکن ان آراضی کا حال یہ ہے کہ فی الحال ان پر سیکڑوں بلکہ بعض جگہ ہزاروں مکانات تعمیر ہو چکے ہیں، جن میں ہر قوم و مذہب کی ہزاروں فیملیاں رہائش پذیر ہیں، اور بہت سی جگہ مسجد، مدرسہ اور مکاتب بھی قائم ہیں۔ موجودہ صورت حال کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں؛ البتہ ان میں ایک بڑا اور ظاہری سبب یہ ہے کہ پرکھوں، باپ داداؤں کی زمینیں تھیں اور اکثر وبیشتر بے قیمت تھیں؛ لہٰذا ان کی طرف توجہ نہیں تھی؛ بلکہ بہت سے لوگوں کو تو حکومت کی طرف سے بتایا گیا تو انہیں پتہ چلا کہ یہ ساری زمین ان کے آباءواجداد کی تھیں اور اب وہ ان کے مالک ہیں، چنانچہ خالی زمینیں دیکھ کر آہستہ آہستہ لوگ قبضہ کرنے لگے اور بستیاں بس گئیں۔ اور بعض جگہ ایسا ہوا کہ بغرض حفاظت دربان اور واچ مین رکھے گئے تھے، انہوں نے مالکوں کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معمولی معمولی رقم لے کر لوگوں کو جھونپڑے بنانے کی اجازت دے دی۔ اور اس طرح یہ دربان لکھپتی کروڑ پتی بن گئے اور خالی زمینیں بستیوں میں تبدیل ہو گئیں، چونکہ اس قسم کی جھوپڑ پٹیاں، سیاستدانوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں، کیوں کہ عموماً یہی لوگ ووٹ دینے جاتے ہیں، سیاسی جلسوں میں شریک ہوتے ہیں، ورنہ امیر طبقہ بلکہ اب تو متوسط طبقہ بھی عموماً ان جھمیلوں میں نہیں پڑتا، اس لئے ایسی بستیوں میں بنیادی ضروریاتِ زندگی لائٹ، پانی وغیرہ فراہم کر دی جاتی ہیں۔ اور کبھی کبھار راستہ کی اصلاح ومرمت ہوتی رہتی ہے۔ ان میں اکثروں کے راشن کارڈ نہیں بن پاتے؛ البتہ کچھ لوگ غلط سلط معلومات کی بنیاد پر راشن کارڈ بنا لیتے ہیں، جو عموماً اصلی نہیں ہوتے؛ بلکہ نقلی ہوتے ہیں، ان کے پاس مکانات کے فوٹو پاس نہیں ہوتے، ان کے ایڈریس پر بہت سے اہم سرکاری دستاویزات بھی نہیں بن پاتے ہیں۔ الغرض حکومت کی نگاہ میں بھی یہ لوگ حقیقی مالکان کی حیثیت نہیں رکھتے؛ لیکن ان کو ہٹانا بہت مشکل ہوتا ہے؛ کیوں کہ ساری سیاسی جماعتیں اور ہیومن رائٹس کی تنظیمیں، غریبوں کے حقوق کی جنگ لڑنے کھڑی ہو جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات مالکان، سیاستدانوں اور افسروں سے ساز باز کر کے کسی بہانے بستی میں آگ لگوا دیتے ہیں، تا کہ ان کی زمینیں خالی ہو جائیں، اب تک اس طرح کے کئی واقعات رونما ہو چکے ہیں۔

الغرض ان حالات سے نمٹنے کے لئے حکومت مہاراشٹر نے ایک اسکیم پاس کی ہے، جس کو S.R.A اسکیم کہتے ہیں۔ حکومت کا مقصد اس اسکیم سے قابضین اور مالکان دونوں کو فائدہ پہنچانا ہے، چنانچہ قابضین کو مکان مل جائے گا اور مالکان کی اراضی خالی ہوکر ان کے قبضہ میں آجائے گی؛ البتہ اس اسکیم سے متعلق کچھ ضوابط اور چند شرائط ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) S.R.A اسکیم میں اسی شخص کو فلیٹ مل سکتا ہے جس کے پاس ۱۹۹۵ء سے پہلے کا کوئی بھی سرکاری ثبوت اس مکان سے متعلق موجود ہو، مثلاً لائٹ بل ہو یا فوٹو پاس ہو وغیرہ۔ ۱۹۹۵ء کے بعد سے رہائش پذیروں کو اس اسکیم سے فلیٹ نہیں مل سکتا۔

(۲) اگر رہائشی مکان ہے تو خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو یا کتنا ہی چھوٹا ہو، اس کے بدلہ میں 269 اسکوائر فٹ ہی کا مکان ملے گا۔ واضح رہے کہ پہلے 225 اسکوائر فٹ کا قانون تھا، جواب بدل کر بڑھ گیا ہے۔

(۳) اگر دوکان ہے تو اگر 100 اسکوائر فٹ کی ہے تو بدلہ میں بلڈنگ کے اندر 100 اسکوائر فٹ کی دوکان ملے گی۔ اور اگر 100 اسکوائر فٹ سے بڑی ہے، خواہ کتنی ہی بڑی ہو تو اسے 225 اسکوائر فٹ کی دوکان ملے گی۔

واضح رہے کہ مالکان آراضی کو اپنی آراضی باقاعدہ S.R.A اسکیم میں پاس کروانی ہوتی ہے جس کے لئے وقت اور مال دونوں بڑی مقدار میں خرچ ہوتا ہے، بغیر پاس کرائے یہ کام نہیں ہوسکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مالکان آراضی کو لاکھوں روپۓ خرچ کرکے S.R.A اسکیم میں اپنی زمین پاس کروانی ہوتی ہے، پھر جتنے بھی قابضین ہیں سب کو ضابطہ کے مطابق مکانات اور دوکانیں مفت دینی ہوتی ہیں، ان سب کے لئے بلڈنگیں تعمیر کرنے کے بعد جو زمین خالی بچ جائے وہ مالکان کو ملتی ہے؛ البتہ اس کے عوض میں حکومت کی طرف سے مالکانِ آراضی کو F.S.I بڑھ کر ملتی ہے، مثلاً اگر مکمل خالی زمین پر ایک لاکھ اسکوائر فٹ کا کام قانوناً ہوسکتا تھا؛ لیکن S.R.A اسکیم کی وجہ سے زمین کا کچھ حصہ کم ہوگیا، تو اس کے بدلہ حکومت ایک لاکھ اسکوائر فٹ کے بجائے دو لاکھ

اسکوائر فٹ بنانے کی اجازت دیتی ہے،اس طرح کافی حد تک تلافی ہو جاتی ہے؛لیکن بہر حال اس طرح بھی مالکین پر کافی بوجھ آتا ہے اور مجبوراً اور بادلِ نخواستہ مکانات بنا کر دینے پڑتے ہیں۔ اور بعض تو ہمت ہی نہیں کر پاتے؛ کیوں کہ ان جھونپڑے والوں کو دینے کے لئے اتنی مقدار میں بلڈنگیں بنانی پڑیں گی کی ان کی تعمیر پر کروڑوں روپئے کی لاگت آئے گی،جس کی وہ ہمت نہیں کر پاتے اور بالآخر زمین یونہی پڑی رہتی ہے۔

الغرض مسطورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں درج ذیل سوالات کے جوابات مطلوب ہیں:

(۱) کیا شخصی ملکیت کی زمین پر قبضہ کرکے مکان ودوکان بنانا جائز ہے؟ اس طرح سے تعمیر شدہ مساجد ومدارس اور مکاتب قرآنیہ کا کیا حکم ہے؟

(۲) کیا شخصی ملکیت کی زمین پر قابض اول سے خریدنے کی اجازت ہے، اسی طرح دوسرے تیسرے نمبر پر خریدنے کا کیا حکم ہے؟ نیز ان جیسے مکانات اور دوکانوں سے حاصل ہونے والے منافع کا کیا حکم ہے؟

(۳) اگر قابض یا خریدار، امام مسجد ہو، خواہ وہ اس میں رہائش پذیر ہو، یا کرائے پر دے کرکے کرایہ حاصل کررہا ہو، اور باوجود علم کے اس سے باز نہ آتا ہو، تو اس کی امامت کا کیا حکم ہے؟

(۴) S.R.A ڈیولپمینٹ اسکیم کے تحت ملنے والے مکانات لینا جائز ہے یا ناجائز؟

نوٹ:- واضح رہے کہ ایسی زمینوں پر بسے ہوئے اکثر لوگوں کے پاس رہنے کے لئے یہی مکان ہوتا ہے؛ اس لئے ان لوگوں کی بازآبادکاری کے لئے حکومت کی S.R.A اسکیم ہے، اگرچہ بہت سے لوگوں نے بڑی جگہیں بھی قبضہ میں کر رکھی ہیں اور اس پر تعمیرات کرکے اچھی خاصی آمدنی حاصل کررہے ہیں۔ فقط والسلام

المستفتی: عبدالرشید عفی عنہ نعمانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہندوستان کی جائیداد، ان کی نوعیت اور ان کی حیثیت سے متعلق کافی غور وخوض کرنے کے بعد یہ بات سامنے آئی ہے کہ ہندوستان کی جائیداد جن

پر مالکان کے علاوہ دوسروں کا قبضہ ہے، وہ کل تین قسموں پر ہیں: (۱) صحرائی جائیداد: ۱۹۴۷ء سے پہلے انگریزی حکومت نے یہ قانون بنایا تھا کہ جس جائیداد پر کسی کسان نے ۱۲؍سال تک تسلسل کے ساتھ کھیتی کی ہو کسان اس زمین کا مالک ہو جائے گا، مگر یہ قانون لازمی اور جبری نہیں تھا؛ بلکہ اختیاری تھا، اس بارے میں اس زمانہ کے علماء نے یہ فتوی صادر کیا تھا کہ چونکہ زمین پر حکومت کے استیلاء اور تغلب کے ذریعہ سے قبضہ نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ کسان کو مالک بننے کا ایک اختیاری قانون ہے۔ اور کسان اگر مالک کو واپس کر دے اور مالک اپنی ملکیت میں رکھے تو کسان و مالک پر قانونی طور پر کوئی دار و گیر نہیں ہے؛ اس لئے سرکاری قانون کے باوجود شرعاً کسان ان زمینوں کے مالک نہیں ہوں گے، ان کو دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنے کا حق نہیں ہے، جیسا کہ ''امداد الفتاویٰ'' وغیرہ میں اس کی صراحت موجود ہے، پھر ۱۹۴۷ء سے دوسرا دور آیا جس میں انگریزی حکومت کے خاتمہ کے بعد کانگریس کا راج آیا ہیں۔ اور کانگریس راج آنے کے بعد صرف تین سال نہیں گزر پائے تھے کہ ۱۹۵۰ء میں کانگریس نے خاتمہ زمینداری کا اعلان کیا، جس میں حکومت ہند نے زمینداروں کی زمینوں پر استیلاء اور تغلب حاصل کر لیا اور ساری زمینیں زمینداروں سے لے کر کسانوں کو دے دیں، کسی کو معمولی کوڑیوں کا معاوضہ بھی دیا اور کسی کو نہیں دیا، گویا کہ حکومت نے جبریہ طور پر زمینداروں کی زمینوں پر استیلاء حاصل کر کے کسانوں کو مالک بنا دیا، اس بارے میں علماء کا فتویٰ یہ جاری ہوا کہ سرکار کے استیلاء اور تغلب کے ذریعہ سے کسانوں کو جو جائیدادیں ملی ہیں، اس سے کسان ان زمینوں کے مالک بن چکے ہیں۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۷/ ۱۷۸-۱۸۰، میرٹھ ۲۵/ ۳۵۱-۳۵۴)

اس وضاحت کے بعد اصل سوال کا جواب حسب ذیل تفصیل سے واضح ہوگا وہ زمینیں جن کے بارے میں مالکوں کی طرف سے کوئی روک تھام نہیں ہے، یا ایسی افتادہ زمین جن کے مالکوں کا اتا پتا نہیں ہے، یا سرکاری افتادہ زمین ہے، یا کسی شہر اور آبادی کے متصل بہتے دریا

نے کاٹ کر کے ایک طرف کی زمین کو دوسری طرف پہنچا دیا ہے، تو ایسی زمینوں پر غریب لوگوں کا قبضہ ہوتا چلا جاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے مکانات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور غریبوں کے اس طرح کے قبضہ پر نہ مالکوں کی طرف سے کوئی روک ٹوک ہوتی ہے، نہ سرکار کی طرف سے کوئی پابندی ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ ایسی جگہ آباد ہو کر شہر کی طرح گلی کوچوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے، نیز ایسا بھی ہوتا ہے کہ چالاک قسم کے لوگ اس طرح کی زمینوں پر پہلے اپنا قبضہ جما لیتے ہیں، اس کے بعد جو غریب لوگ بسنے والے ہوتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں معمولی پیسوں میں فروخت کر دیتے ہیں اور فروختگی کا کوئی ذیلی کاغذ بھی بنا لیتے ہیں، پھر اس میں سرکاری طور پر میونسپلٹی کی سڑکیں بن جاتی ہیں اور بجلی پانی کا انتظام بھی سرکار کی طرف سے ہو جاتا ہے، پھر اس کے بعد وہاں کے بسنے والوں کے لئے ذیلی کاغذات تیار ہو جاتے ہیں، اور مسلم آبادی ہو تو اس میں مسجدیں بھی بن جاتی ہیں اور مسجد کا رجسٹریشن بھی ہو جاتا ہے، جیسا کہ ہمارے مرادآباد میں جامع مسجد سے متصل دریا کے کنارے پر لاکھوں کی آبادی اسی طرح بسی ہوئی ہے اور اس میں متعدد مسجدیں بھی بن گئی ہیں اور اسی طرح بمبئ میں دسیوں مقامات پر اس طرح کی آبادیاں بسی ہوئی ہیں، اور بھی دیگر شہروں میں اس طرح کی نوعیت کی آبادیاں بکثرت ہیں اور ایسی آبادیوں کو اکھاڑ کر ختم کرنا نہ مالکوں کے بس کی بات ہے اور نہ ہی حکومت ان کے بارے میں خاص توجہ دیتی ہے، اب اس طرح کی آبادیوں پر سرکار کا تغلب دو طرح کا ہوتا ہے:

(۱) اگر سرکاری افتادہ زمین ہے جن پر ان غریبوں نے قبضہ کر رکھا ہے اور سرکار کو وہاں اپنا کوئی ترقیاتی پروگرام چلانا ہے، تو ان پر تغلب حاصل کر کے وہاں کے بسنے والوں کو بے گھر کر کے اپنے قبضہ میں لے کر سرکار اپنا کام کرتی ہے۔

(۲) بعض سرکاری افتادہ زمین جن پر غریبوں کا قبضہ ہے یا ان زمینوں کا کوئی مالک ہے جن کی طرف سے اب تک کوئی روک تھام نہیں ہوئی اور سرکار نے روڈ بنا دیا ہے، بجلی پانی کا انتظام کر دیا ہے، اور وہاں کے بسنے والوں کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا ہے اور وہاں کی مردم

شماری کر کے سرکاری طور پر وہاں کے لوگوں سے الیکشن کے زمانے میں ووٹ بھی لیا جاتا ہے، تو گویا کہ اگر سرکاری زمین ہے، تو سرکار نے ان غریبوں کو عملاً ان زمینوں کا مالک بنا دیا ہے۔ اور اگر ان زمینوں کا کوئی مالک رہا ہو تو سرکار نے اس عمل کے ذریعہ سے مالکوں کی زمین پر تغلب حاصل کرلیا ہے۔ اور تغلب حاصل کر کے وہاں کے بسنے والوں کو ان زمینوں کا مالک بنا دیا ہے، تو ایسی صورت میں خاتمہ زمینداری کے بعد کسانوں کو جس درجہ کی زمینوں کی ملکیت حاصل ہوگئی ہے، اسی درجہ کی ان جگہوں پر بسنے والوں کو بھی اپنے اپنے قبضہ کی زمینوں پر ملکیت حاصل ہوچکی ہے اور ان آبادیوں میں جو مسجدیں بن چکی ہیں، ان مسجدوں کو شرعی حیثیت حاصل ہوجائے گی۔ احقر نے یہ تحریر اپنی سمجھ کے اعتبار سے لکھی ہے، اس لئے دوسرے علماء سے بھی اس سلسلے میں رابطہ قائم کرنا مناسب ہوگا۔ اور احقر نے جن جزئیات کے پیش نظر مذکورہ حکم لکھا ہے ان میں سے چند جزئیات حسب ذیل ہیں:

إن الاستيلاء عبارة عن الإقتدار على محل مطلقا على وجه يتمكن من الانتفاع في الحال، ومن الإدخار في المآل والاقتدار بهذه الصفة لا تكون إلا بعد الإحراز، ثم بعد إحرازهم ارتفعت العصمة، فورد الاستيلاء حينئذ على مال مباح لا على مال محظور –إلى قوله– فإن قلت: لا نسلم أن المال مباح بأصل الخلقة، قلت: هو مباح لقوله تعالى:﴿خَلَقَ لَكُمْ مَا فِيْ الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ (البناية، باب استيلاء الكفار، اشرفيه ۷/ ۱۸۸، نعميه ۹/ ۲٤٤)

قال أبوحنيفة، ومالک رحمهما الله: الكفار إذا استولت على أموال المسلمين ملكوها. (تفسير مظهري، زكريا ۹/ ۲٤۰)

ولو استولى أهل الحرب على أموالنا وأحرزوها بدارهم ملكوها عندنا. (هندية، الباب الخامس في استيلاء الكفار، زكريا جديد۲/ ۲٤۱، قديم ۲/ ۲۲۵)

أما المال غير المعصوم، فإنه يجوز الاستيلاء عليه، وإن كان مملوكا. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٤/ ۱۵۸)

وإن غلبوا على أموالنا وأحرزوها بدارهم ملكوها. (شامي، زكريا ٦/ ٢٦٧، كراچی ٤/ ١٦٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۳/۱۷ھ

کیا جلسہ کے موقع پر بالعوض کھانا کھانا بیع ہے؟

سوال [۸۵۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مہتمم صاحب مدرسہ کے سالانہ جلسہ کے موقع پر لوگوں کی دعوت کرکے ان کے لئے کھانا تیار کرتے ہیں، دعوت نامہ کا ماحصل یہ ہے کہ: جناب.............فلاں تاریخ کو فلاں مدرسہ کا سالانہ جلسہ کیا جارہا ہے، آپ اس جلسے میں تشریف لاکر مدرسہ کو زیادہ سے زیادہ امداد دے کر جلسہ کو کامیاب بنانے میں مدد فرمائیں، اتنے بجے شروع ہوکر اتنے بجے ختم ہوگا، جلسہ کے دن جلسہ گاہ کو چاروں طرف سے گھیر کر گیٹ میں کاؤنٹر بنا کر آنے والوں سے پیسہ لیا جاتا ہے، جب اختتام جلسہ کا وقت قریب ہوجاتا ہے، تو ایک منادی ندا کرتا ہے کہ جن لوگوں نے کاؤنٹر سے رسید حاصل نہیں کی ہے، اب حاصل کرلیں، کھانے کا وقت قریب آگیا ہے۔ (یعنی رسید حاصل کئے بغیر نہیں کھا سکتا) اب سوال یہ ہے کہ اس صورت واقعہ کو اصطلاح فقہاء میں کیا کہا جائے گا؟ ''للہ'' تو نہیں کیوں کہ کھانے کے عوض روپئے حاصل کررہے ہیں، اور روپئے کے عوض کھانا کھارہے ہیں، تو معلوم ہوا کہ یہ بیع ہے، مہتمم صاحب نے تمول مال کے لئے تجارت کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے، مگر اس میں قابل غور ایک بات ہے کہ بیع کے صحیح ہونے کے لئے مبیع اور ثمن کا مقدار معلوم ہونا شرط ہے، وہ یہاں مفقود ہے؛ اس لئے معاملہ صحیح نہیں ہوا، نیز حاصل شدہ روپیہ حلال نہیں ہوا، آپ مفتیان کرام کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق تحقیق سے فتویٰ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: ابوالکلام، محمد عبدالرشید

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جس دعوت نامہ کا ماحصل پیش کیا گیا ہے، اس میں امداد کا لفظ مذکور ہے، جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ذمہ دار کی طرف سے کھانے کا انتظام ان ہی لوگوں کے لئے ہے جو مدرسہ کو امداد پیش کریں گے۔ اور جو لوگ امداد پیش نہیں کریں گے ان کے لئے کھانے کا نظم منجانب مدرسہ نہیں کیا گیا ہے، اب اگر تعاون کی مقدار مساوی نہ ہو؛ بلکہ ہر ایک اپنے صوابدید پر جو دینا چاہے دیدے تو اسے بیع وشراء سے تعبیر نہیں کیا جائے گا اور اگر سب کے تعاون کی مقدار مساوی ہو تو پھر اس کو بیع وشراء سے تعبیر کیا جائے گا۔ رہی بات جہالت مبیع کی تو عرف ورواج کی بنا پر یہ جائز ہے، کتب فقہ میں اس کی نظیر موجود ہے۔

ویخرج على هذا كثير من السائل في عصرنا، فقد جرت العادة في بعض الفنادق الكبيرة، أنهم يضعون أنواعا من الأطعمة في قدور كبيرة، ويخيرون المشتري في أكل ماشاء بقدر ماشاء، ويأخذون ثمنا واحدا معينا من كل أحد، فالقياس أن لا يجوز البيع لجهالة الأطعمة المبيعة وقدرها؛ ولكنه يجوز؛ لأن الجهالة يسيرة غير مفضية إلى النزاع، وقد جرى بها العرف والتعامل. (تكملة فتح الملهم، كتاب البيوع، البيع بالتعاطي، أشرفيه ديوبند ١/ ٣٢٠، وهكذا نووي على مسلم ٢/ ٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸ر محرم الحرام ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۶۵۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۱/۱۴۲۶ھ

مکمل قیمت کی وصولیابی سے قبل بیوہ کا اپنی زمین میں نماز سے روکنا

سوال [۸۵۸۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم نے ایک مسجد کی جگہ ایک بیوہ سے خریدی اور یہ طے کیا کہ ایک مہینے کے بعد پورے

پیسے دے دیں گے اور کچھ پیسے پہلے دے دیئے اوراس وقت اس کی اجازت سے وہاں نماز پڑھنے لگے؛ لیکن ہم لوگ بجائے ایک مہینے کے دومہینے تک وہاں نماز پڑھتے رہے اور دومہینے کی مہلت اور لے لی گئی۔ اور وہاں نماز پڑھتے رہے اور چھوٹی چھوٹی دیواریں بنادی گئیں، اب وہ عورت پھر پیسے لینے آئی؛ لیکن ابھی تک اس کے پیسے نہیں دئے۔ اوراب پانچ سال گذر چکے ہیں اور پیسے نہیں دیئے ہیں اوروہ عورت برابر یہی کہتی ہے کہ یہاں نماز مت پڑھو۔ اورگالیاں وغیرہ بکتی ہے، ایسی حالت میں اس جگہ نماز پڑھی جائے یا نہ پڑھی جائے ،اور نماز ہوگی یانہیں؟ جواب بالتفصیل اور باصواب سے نوازیں۔

المستفتی: عبداللہ مقام کربلا، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں درج شدہ صورت میں مذکورہ جگہ پرنماز پڑھنا اس وقت تک غیر مقبول اور مکروہ تحریمی ہوگی جب تک بیوہ عورت کو زمین کی پوری قیمت ادانہ کردیں۔

قال تاج الشريعة: أما لو أنفق في ذلك مالا خبيثا، ومالا سببه الخبيث والطيب فيكره؛ لأن الله تعالى لا يقبل إلا الطيب، فيكره تلويث بيته بمالا يقبل. الخ (شامي، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة، مطلب كلمة لا بأس دليل على أن المستحب غيره الخ- كوئٹه ١/ ٤٨٧، كراچی ١/ ٦٥٨، زكريا ٢/ ٤٣١)

ومدرسة السليمانية في دمشق ...... والوقف يثبت بالشهرة، فتلك المدرسة خولف في بناء ها شرط وقف الأرض الذي هو كنص الشارع، فالصلاة فيها مكروهة تحريما فى قول وغير صحيحة له في قول آخر. الخ (شامي، كتاب الصلاة، مطلب في الصلاة في الأرض المغصوبة، كوئٹه ١/ ٢٨، كراچی ١/ ٣٨٦، زكريا ٢/ ٤٥)

الضرر يزال، ومنها لو غصب أرضا فبنى فيها أو غرس، فإن كانت قيمة الأرض أكثر قلعها وردت وإلا ضمن له قيمتها. (الأشباه والنظائر، قديم ١٤٤)

نیز مذکورہ بیوہ کو ہر وقت حق ہے کہ قیمت وصول کرنے کی غرض سے وہاں نماز پڑھنے سے روک دے۔فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍رجب ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر:۲۴/۸۱۰)

مشتری اول کا پوری رقم دینے سے قبل مشتری ثانی کو فروخت کرنا

سوال [۸۵۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے بکر سے زمین خریدنے کے متعلق بات چیت کی اور زید نے بکر کو بیعانہ دیا، زمین کی قیمت ۲۰؍لاکھ میں سے ۵؍لاکھ دے دیا، چار مہینے کے وقت کے ساتھ اس مدت کے دوران ایک تیسرے شخص نے اس زمین کو خریدنا چاہا، تو کیا زید تیسرے شخص کو وہ زمین نفع کے ساتھ فروخت کرسکتا ہے؛ حالانکہ زید نے بکر کو پوری قیمت ادا نہیں کی اور اس مدت کے دوران بکر زید سے اپنی زمین واپس لے سکتا ہے؟

المستفتی: محمد فاروق، راجونگر، منڈولی، دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید نے جب بکر سے ایجاب وقبول کے ساتھ خرید لیا ہے اور بیعانہ کے طور پر کچھ رقم بھی دے دی ہے، تو ایسی صورت میں زید مشتری اول کے لئے پوری رقم پیمنٹ کرنے سے پہلے مذکورہ زمین کو نفع کے ساتھ بیچنا اور فروخت کرنا درست ہے اور اس مدت کے دوران بکر کو زید سے اپنی زمین واپس لینے کا حق نہیں ہے۔

أن يكون الثمن حالا، فإن كان مؤجلا فلا يثبت حق الحبس؛ لأنه سقط بالتأخير. (الفقه الإسلامي وأدلته، الهدى ديوبند ٤/ ١٧٨، تاتارخانية، زكريا ٨/ ٢٤٢، رقم: ١١٧٧٨)

وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع، ولا خيار لواحد منهما إلا

من عیب أو عدم رؤیة. (تاتارخانیة، زکریا دیوبند ۸/ ۲۲۲، رقم: ۱۱۷۱٤، هدایة، کتاب البیوع، اشرفي دیوبند ۳/ ۲۰/ الجوهرة النیرة، إمدادیه ملتان ۱/ ۲۲٦، دارالکتاب دیوبند ۱/ ۲۲۰، ملتقی الأبحر، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۱۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۵۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/۴/۱۴۳۴ھ

جائیداد پر قبضہ کرنے سے پہلے مشتری کا بائع کو وکیل بالبیع بنانا

سوال [۸۵۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے خالد سے کہا کہ مجھے زمین کی ضرورت ہے اور میں آپ کے توسط سے زمین خریدنا چاہتا ہوں، خالد نے ایک تیسرے شخص بنام بکر سے ایک اراضی سولہ سورو پیہ بیگہ کے حساب سے خریدی اور خریدتے وقت بکر سے کہہ دیا کہ یہ زمین میری ہوگئی، اب اگر اس کو کوئی تیسرا شخص تم سے خریدے تو تم اس کو فروخت کر دینا اور جو نفع ہوگا وہ میرا ہوگا، اب خالد نے وہ زمین زید کو خریدنے کے لئے توجہ دلائی اور زید نے اس کو بکر سے ۱۹/ سورو پیہ بیگہ کے عوض خریدا، اب یہ ۳/ سورو پیہ بیگہ کا نفع جو ہے، وہ خالد لینا چاہتا ہے، جب کہ خالد بکر سے خریدتے وقت نہ تو کوئی بیعانہ دیا اور نہ ہی زمین کا کوئی پیسہ بطور ثمن ادا کیا، تو کیا خالد کو اس طرح درمیان میں نفع لینا حلال ہے اور خالد کا یہ فعل کیسا ہے؟

المستفتی: محمد حنیف فتح پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خالد کا بکر سے زمین خرید کر پھر بکر کو زید کے ہاتھ فروخت کرنے کا وکیل بنانا اور بکر کا ۱۶/ سو کی زمین کو آپس کی تراضی سے ۱۹/ سو روپئے میں زید کے ہاتھ فروخت کردینا اور تین سو روپئے کا نفع خالد کا اپنی ملکیت کرلینا جائز اور درست ہے اور اس موقع پر اگر خالد نے کوئی جھوٹ بولا ہے تو اس کا گناہ الگ سے ہوگا۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ٦٦)

ويجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف –رحمهما الله.
(هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، أشرفي ديوبند ٣/ ٧٤، تاتارخانية، زكريا ٨/ ٢٦٦، رقم: ١١٨٦٢)

وأما بيع الأعيان غير المنقولة قبل قبضها كبيع الأرض والضياع، والنخيل، والدور، ونحو ذلك من الأشياء الثابتة التي لا يخشى هلاكها، فإنه يصح. (كتاب الفقه على المذاهب الأربعة، كتاب البيع، مبحث التصرف في المبيع قبل قبضه، دارالفكر بيروت ٢/ ٢٣٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ / جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۰/ ۴۰۴۸)

قبضہ سے پہلے زمین کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۵۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید زمین کی خرید وفروخت کا معاملہ کرتا ہے، جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زمین کے مالک کے پاس جا کر معاملہ طے کرتا ہے کہ مثلاً ایک بیگہ زمین ایک لاکھ روپیہ میں طے کرتا ہے اور یہ قیمت اس کو ادا نہیں کرتا؛ بلکہ وہ اس دوران دوسرا گاہک تلاش کر کے ڈیڑھ لاکھ روپے میں اس کو بیچ دیتا ہے اور زمین کے مالک سے رجسٹری اسی کے نام کرا دیتا ہے، اب اس کے بعد زید مشتری سے ڈیڑھ لاکھ روپے لے کر ایک لاکھ بائع کو دے دیتا ہے اور پچاس ہزار خود رکھ لیتا ہے، تو اب کیا زید کے لئے یہ پچاس ہزار روپے کا منافع لینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد حاکم چاند پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کا قبضہ سے پہلے زمین کو فروخت کر دینا جائز اور

درست ہے؛ اس لئے کہ زمین مکان وغیرہ اشیائے غیر منقولہ ہیں اور ایسی اشیاء اور جائیداد کی خرید وفروخت مکمل ہونے کے لئے ایجاب وقبول کے ساتھ سودا اور معاملہ طے کر لینا کافی ہے، باقاعدہ وہاں جاکر اپنا سامان ڈال دینا، یا چہار دیواری وغیرہ بنا دینا لازم نہیں؛ لہٰذا معاملہ طے ہو جانے کے بعد خریدار کے لئے دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا اور اس پر نفع حاصل کرنا جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: انوار رحمت/۲۶۳-۲۶۴)

ویجوز بیع العقار قبل القبض. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ديوبند ۳/ ۷۴، تاتارخانية زكريا ۸/ ۲۶۶، رقم: ۱۱۸۶۲)

أما بيع الأعيان غير المنقولة قبل قبضها كبيع الأرض، والضياع والنخيل، والدور، ونحو ذلك من الأشياء الثابتة التي لا يخشى هلاكها، فإنه يصح. (الفقه على المذاهب الأربعة، كتاب البيع، مبحث التصرف في المبيع قبل قبضه، دارالفكر بيروت ۲/ ۲۳۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/۶/۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۸۶۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/۶/۱۴۲۶ھ

متعینہ بکنگ شدہ زمین کو منافع کے ساتھ فروخت کرنا

سوال [۸۵۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایک اچھی کمپنی میں اونچے عہدہ پر فائز تھا، تنخواہ بھی اچھی خاصی تھی، کچھ رقم جمع ہونے پر میں نے اپنا ایک ذاتی مکان رہنے کا سوچ کر بکنگ کروایا، فی الوقت ماں باپ کے ساتھ رہتا ہوں، بکنگ میں آدھی رقم بھر دی ہے، کام شروع ہونے پر قسطوں میں رقم بھرنی تھی، اچانک پچھلے مہینے ایک ایسے (موذی مرض) میں مبتلا ہو گیا کہ مجھے مجبوراً ملازمت چھوڑنی پڑی، اب آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں اور اس موذی مرض کا خرچ تقریباً چار لاکھ رقم ہاتھ میں نہ ہونے پر قرض لینا پڑا (بغیر سودی)۔

مجبوراًوہ مکان جس کا کام شروع نہیں ہوا، اگر اسے بیچتا ہوں تو بھری ہوئی رقم سے زیادہ پیسے آرہے ہیں، تو کیا شرعی اعتبار سے مجھے منافع لینے کا حق ہے، ابھی فی الوقت میں کافی پریشان ہوں، گھر اور بیماری کے خرچ سے۔

اگر بالفرض اچھی حالت میں بھی لوگ ایسا کاروبار کرتے ہیں جس کے بکنگ کے وقت کم دام ہوتے ہیں۔ اور اگر کام شروع ہوتا ہے تو دام بڑھ جاتا ہے، اس طرح اگر کاروبار کریں تو شرعی اعتبار سے اس کی گنجائش ہے؟ دونوں سوالوں کی نوعیت الگ ہے، برائے کرم مفصل جواب دیں۔ عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: معرفت مولانا محمد اشفاق صاحب چیتا کیمپ، ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جس زمین کو آپ نے اپنے نام سے بکنگ کرالیا ہے اور اس جگہ کی باقاعدہ تعیین بھی ہوگئی ہے، اور آپ نے قسطوں میں رقم بھی بھرنی شروع کردی ہے، تو اس جگہ پر آپ کو مالکانہ حقوق حاصل ہوگئے ہیں؛ اس لئے اس زمین پر تعمیر کا کام شروع ہو یا نہ ہو بہرصورت آپ کے لئے اس زمین کو منافع کے ساتھ فروخت کرنے کی شرعاً اجازت ہے۔

ويجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف –إلى قوله– ولهما أن ركن البيع صدر من أهله في محله ولا غرر فيه؛ لأن الهلاك في العقار نادر بخلاف المنقول، والغرر المنهي عنه غرر انفساخ العقد، والحديث معلول به عملا بدلائل الجواز. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ديوبند ٣/ ٧٤)

إذا اشترى دارا أو عقارا فوهبها قبل القبض من غير البائع يجوز عند الكل، ولو باع يجوز في قول أبي حنيفة وأبي يوسف. (تاتارخانية، زكريا ٨/ ٢٦٦، رقم: ١١٨٦٢)

وأما بيع الأعيان غير المنقولة قبل قبضها كبيع الأرض والضياع،

والنخيل، والدور، ونحو ذلك من الأشياء الثابتة التي لا يخشى هلاكها، فإنه يصح. (الفقه على المذاهب الأربعة، كتاب البيع، مبحث التصرف في المبيع قبل قبضه، دارالفكر بيروت ۲/ ۲۳٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۳۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۶/۲۵ھ

قبضہ سے قبل زمین کوفروخت کرنا

سوال [۸۵۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں ایک اچھی کمپنی میں اونچے عہدہ پر فائز تھا، تنخواہ بھی اچھی خاصی تھی، کچھ رقم جمع ہونے پر میں نے اپنا ایک مکان رہنے کا سوچ کر بکنگ کروایا، فی الوقت ماں باپ کے ساتھ رہتا ہوں، بکنگ میں آدھی رقم بھردی ہے، کام شروع ہونے پر قسطوں میں رقم بھرنی تھی، اچانک پچھلے مہینے ایک ایسے موذی مرض میں مبتلا ہوگیا کہ مجھے مجبوراً ملازمت بھی چھوڑنی پڑی، اب آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں اوراس موذی مرض کا خرچ تقریباً چارلاکھ رقم ہاتھ میں نہ ہونے پر قرض لینا پڑا (بغیر سودی)

مجبوراً وہ مکان جس کا کام شروع نہیں ہوا، اگراسے بیچتا ہوں تو بھری ہوئی رقم سے زیادہ پیسے آرہے ہیں، تو کیا شرعی اعتبار سے مجھے منافع لینے کا حق ہے، ابھی فی الوقت میں کافی پریشان ہوں، گھر اور بیماری کے خرچ سے۔

اگر بالفرض اچھی حالت میں بھی لوگ ایسا کاروبار کرتے ہیں جس کے بکنگ کے وقت کم دام ہوتے ہیں۔ اور اگر کام شروع ہوتا ہے تو دام بڑھ جاتا ہے، اس طرح اگر کاروبار کریں تو شرعی اعتبار سے اس کی گنجائش ہے؟ دونوں سوالوں کی نوعیت الگ ہے، برائے کرم مفصل جواب دیں۔ عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: یعقوب کولسہ والا، میمن کالونی ممبئی، جوگیشوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیع کے صحیح ہونے کے لئے مبیع کا موجود اور مقدور التسلیم ہونا شرط ہے۔

وبیع ما لیس في ملکه لبطلان بیع المعدوم، وماله خطر العدم (قوله لبطلان بیع ...... إذ من شرط المعقود علیه أن یکون موجودا مالا متقوما مملوکا في نفسه...... یکون مقدور التسلیم. (درمختار مع الشامي، زکریا ۷/ ۲٤٦، کراچی ٥/ ٥٨)

لہٰذا یہ دونوں صورتیں بیع کی نہیں ہیں، وعدۂ بیع ہے اور وعدۂ بیع سے بیع مکمل نہیں ہوتی۔ اور جو رقم پیشگی جمع کی ہے اس کی حیثیت بیعانہ کی رقم کی ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ صرف اتنی رقم کا لینا جائز ہوگا جتنی جمع کی، زائد رقم لینا درست نہیں، دونوں صورتوں میں حکم یہی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح: مقصود	حررہ: العبد شعیب احمد بستوی غفرلہ
۲۵/ ۵/ ۱۴۲۸ھ	مظاہر علوم سہارنپور ۲۵/ ۵/ ۱۴۲۸ھ

محترم المقام جناب حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

استفتاء کا جواب حضرت والا نے عنایت فرمایا تھا؛ لیکن مستفتی نے مظاہر علوم سہارنپور سے فتوی منگایا جو بالکل حضرت کے جواب سے مختلف ہے، حضرت والا سے مکرر رجوع کرتے ہیں، ساتھ ہی مظاہر علوم کا فتویٰ ارسال خدمت ہے، اس فتوے کی حیثیت کسی خاص صورت سے ہے؟ امید کہ حضرت والا زحمت فرما کر خلجان کو دور فرما کر مشکور فرمائیں، تضاد کو رفع فرمائیں۔

سوال [۸۵۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ میں ایک اچھی کمپنی میں اونچے عہدہ پر فائز تھا، تنخواہ بھی اچھی خاصی تھی، کچھ رقم جمع ہونے پر میں نے اپنا ایک مکان رہنے کا سوچ کر بکنگ کروایا، فی الوقت ماں باپ کے ساتھ رہتا ہوں، بکنگ میں آدھی رقم بھردی ہے، کام شروع ہونے پر قسطوں میں رقم بھرنی تھی، اچانک پچھلے مہینے ایک ایسے موذی مرض میں مبتلا ہوگیا کہ مجھے مجبوراً ملازمت چھوڑنی پڑی،

اب آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں اور اس موذی مرض کا خرچ تقریباً چار لاکھ رقم ہاتھ میں نہ ہونے پر قرض لینا پڑا بغیر سودی۔

مجبوراً وہ مکان جس کا کام شروع نہیں ہوا، اگر اسے بیچتا ہوں تو بھری ہوئی رقم سے زیادہ پیسے آرہے ہیں، تو کیا شرعی اعتبار سے مجھے منافع لینے کا حق ہے، ابھی فی الوقت میں کافی پریشان ہوں، گھر خرچ اور بیماری کے خرچ سے۔

اگر بالفرض اچھی حالت میں بھی لوگ ایسا کاروبار کرتے ہیں جس کے بکنگ کے وقت کم دام ہوتے ہیں۔ اور اگر دام شروع ہوتا ہے تو دام بڑھ جاتا ہے، اس طرح اگر کاروبار کریں تو شرعی اعتبار سے اس کی گنجائش ہے؟ دونوں سوالوں کی نوعیت الگ ہے برائے کرم مفصل جواب دیں۔ عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: یعقوب کولسہ والا، میمن کالونی ممبئی، جوگیشوری

محترمی مزاج گرامی　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کا سوال اور مظاہر کا لکھا ہوا فتوی اور مدرسہ شاہی کا لکھا ہوا جواب سب پر نظر ثانی کی گئی، اور ہم نے اس سلسلے میں مرادآباد اور دہلی میں ذکر کردہ معاملات کی شکلیں اختیار کرنے والوں سے متعلق بڑے بڑے پلاٹنگ کرنے والوں سے رابطہ قائم کرکے اس کی مختلف صورتیں اور شکلیں معلوم کی ہیں، ہمارے جواب کے ذیل میں جس شکل اور نوعیت کے متعلق حکم شرعی لکھا گیا ہے وہ الحمد للہ صحیح ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍شعبان ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۴۰۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۸/۱۴ھ

ادھار خریدی ہوئی زمین میں مالک کی اجازت سے کھیتی کرنے کا حکم

سوال [۸۵۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: عامر کے پاس ایک زمین ہے، اب اس زمین کو عامر سے خالد نے تین لاکھ کے عوض میں خرید لیا؛ لیکن خالد نے عامر کو تین لاکھ کے بجائے ڈھائی لاکھ روپیہ پیمنٹ میں دے دیا اور پچاس ہزار روپئے روک لئے اور عامر نے اس ایک بیگہ زمین میں سے آدھا بیگہ نام کرادی خالد کے اور آدھا بیگہ رہنے دی؛ حالانکہ اس نصف بیگہ کے کچھ پیسے جا چکے ہیں، کچھ باقی ہیں، اب عامر نے خالد کو پوری زمین استعمال کے لئے دے دی ہے، تو کیا خالد کے لئے اس پوری زمین پر عامر کی اجازت سے کھیتی کرنا جائز ہے، جب کہ خالد نے ابھی کچھ پیسے نہیں دیئے ہیں؟

المستفتی: محمد عمر نیو ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب تین لاکھ روپئے میں پوری زمین خرید لی ہے اور آدھے کی رجسٹری کردی اور باقی آدھے بیگہ کی رجسٹری کو پچاس ہزار کی ادائے گی کی وجہ سے موقوف رکھا گیا ہے؛ لیکن اس کا بھی قبضہ دے کر استعمال کی اجازت دے دی گئی ہے، تو خریدار کے لئے پوری زمین کو استعمال کرنا اس سے فائدہ اٹھانا بلا شبہ جائز اور درست ہے۔

فإن كان مؤجلا فلا يثبت حق الحبس؛ لأنه سقط بالتأجيل. (الفقه الإسلامي وأدلته، القسم الثالث العقود حق حبس المبيع أو احتباسه، هدى انٹرنیشنل دیوبند ٤/ ١٧٨)

وإن كان الثمن مؤجلا لم يكن له حق الحبس. (تاتارخانية، زكريا ديوبند ٨/ ٢٤٢، رقم: ١١٧٧٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ / ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۱۸)

خرید وفروخت کی ایک شکل کا حکم

سوال [۸۵۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں : زید کو ایک لاکھ روپیہ کی ضرورت ہے، عمرو اس کو قرض اس طرح دیتا ہے کہ ایک لاکھ روپیہ نقد کے بجائے ایک لاکھ روپیہ کی کوئی چیز دے گا اور وہ چیز ڈیڑھ لاکھ میں زید کو فروخت کرے گا اور زید ایک سال میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ عمرو کو لوٹائے گا، تو کیا یہ سود ہے؟ کیا اس طرح کا حیلہ درست ہے؟

المستفتی: محمد زبیر، احمد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جو طریقہ بیان کیا گیا ہے، وہ ہیر پھیر کا ہے۔ اور چیز کی فروختگی کی ظاہری شکل جو بیان کی گئی ہے وہ شکل تجارت کی ہے کہ زید کو عمرو نے قرض نہیں دیا؛ بلکہ شریعت کے مطابق عمرو نے زید کے ہاتھ سامان فروخت کیا ہے اور عمرو کو اختیار ہے کہ ایک لاکھ روپیہ کی قیمت کی چیز ڈیڑھ لاکھ میں فروخت کرے۔ اور سوال نامہ میں جو یہ کہا گیا ہے کہ زید ڈیڑھ لاکھ روپیہ لوٹا دے گا؛ اس لئے نہیں کہ زید نے ڈیڑھ لاکھ روپئے لئے؛ بلکہ ڈیڑھ لاکھ روپئے سامان کے عوض میں اس کی قیمت لوٹائے گا، اور اس طرح ادھار میں زیادہ قیمت کے ساتھ سامان کا فروخت کرنا جائز ہے۔

أن يأتي الرجل المحتاج إلى آخر ويستقرضه عشرة دراهم، ولا يرغب المقرض في الإقراض طمعا في فضل لاينالہ بالقرض، فيقول: لا أقرضك، ولكن أبيعك هذا الثوب إن شئت باثنى عشر درهما، وقيمته في السوق عشرة ليبيعه في السوق بعشرة، فيرضى به المستقرض، فيبيعه كذلك، فيحصل لرب الثوب درهمان، وللمشتري قرض عشرة...... قال في الفتح: ولا كراهة فيه إلا خلاف الأولى. (شامي، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في بيع العينه، كراچی ٥/ ٢٧٣، زكريا ٧/ ٥٤١، هندية، كتاب البيوع، الباب العشرون في البياعات المكروهة، زكريا قديم ٣/ ٢٠٨، جديد ٣/ ١٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/۱۱/۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۱۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/۱۱/۱۴۲۷ھ

خریدار پر دین مہر ادا کرنا لازم نہیں اور فروختگی کے بعد ورثاء کو حق اعتراض نہیں

سوال [۸۵۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مسماۃ مقصود النساء نے اپنے بیٹے کی شادی کے وقت زر مہر معجّل مبلغ دوسو روپیہ زبانی اقرار دی، محمد جان نے زر مہر مبلغ دوسو روپیہ بذریعہ دستاویز اقرار نامہ ۲۶/جولائی ۱۹۱۲ء کو دو ثلث کوٹھہ محمد جان نے ۱۹۶۱ء میں انواری بیگم، کشوری بیگم کو فروخت کر دیا تھا، جو مہر شوہر پر واجب الاداء ہیں۔ دریافت طلب مسئلہ ہے:

(۱) اگر ورثاء رفیع النساء یہ مہر طلب کریں تو؟ (۲) آیا خریدار پر دین مہر ادا کرنا واجب ہے؟ (۳) نیز محمد جان نے جس وقت یہ دو ثلث کوٹھہ فروخت کیا تو ان کی اولاد جوان تھی، کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ فریدالدین پر مہر ادا کرنا واجب ہے کہ نہیں؟

المستفتی: یوسف خان، محلّہ چاہ غوری، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب خریدار نے مبیع کا ثمن ادا کر دیا ہے، تو خریدار سے احمد جان اور اس کے ورثاء وغیرہ کا کوئی تعلق نہیں رہا، نیز دین مہر خریدار پر لازم نہیں ہے؛ بلکہ شوہر کا چھوڑا ہوا مال ہو تو اس میں سے ادا کیا جائے گا، اگر مال نہیں ہے، تو کسی اور پر واجب نہیں ہوگا؟ نیز جب بوقت فروختگی جوان اولاد تھی، انہوں نے اس وقت دعویٰ نہیں کیا ہے، اب اتنی طویل مدت گذرنے اور مشتری کے تصرف کے بعد دعویٰ کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں۔

لو باع عقارا وابنه أو امرأته حاضرة تعلم به وتصرف المشتري فيه زمانا، ثم ادعى الابن أنه ملكه؛ ولم يكن ملك أبيه وقت البيع اتفق مشايخنا على أنه لا تسمع مثل هذه الدعوة. الخ (البحر الرائق، كتاب الخنثى، مسائل شتى، كوئٹه ۸/ ۴۸۳، زکریا ۹/ ۳۵۴، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ۲۲۲، زکریا

دیوبند ۷/ ٤٥٦، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ٤/ ٤٨٣، قدیم ٢/ ٧٣٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۳۵۸)

مکان کی فروختگی کی قیمت وصول ہونے کے بعد مالک کا کوئی حق باقی نہیں رہتا

سوال [۸۵۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد جان ولد احمد بخش، محلّہ چاہ غوری امروہہ نے ایک کوٹھہ منجملہ ایک مکان جس میں ۱۹/ کڑی اور آگے کھپریل پڑی تھی، تقریباً ایک دس گز مربع یہ مکان محمد جان نے مسما تان کشوری بیگم، انوری بیگم کو بتاریخ ۱۱/ ۱۰/ ۱۶، جلد نمبر ا/ جلد نمبر ۹۲۲، صفحہ نمبر: ۳۹۷/ ۳۹۱/ پر اندراج ہے، مبلغ چار سو روپیہ میں فروخت کر دیا، بوقت فروختگی محمد جان کی اولاد محمد نبی، محمد شیبہ، نسیم، فاطمہ جوان تھے، خریداری کے بعد دونوں مسما تان نے علیحدہ علیحدہ کوٹھے کی شکل میں دو کوٹھری بنوالیں، اب ہوتا یہ ہے کہ اس میں سے ایک کوٹھی نصف حویلی مسماۃ انوری بیگم نے ۸۲/ ۵/ ۱۸/ سکندری خاتون زوجہ یوسف خان کو مبلغ: ۴۵۰۰/ روپئے میں قطعی بیعانہ فروخت کر دیا، اس کے بعد نصف حصہ مسماۃ کشوری بیگم نے تاریخ ۸/ ۹/ ۱۲ کو مبلغ: ۲۰۰۰/ روپئے میں سکندری خاتون کو قطعی بیعانہ فروخت کر دیا، محمد جان یہ مکان ۱۹۶۱ء میں فروخت کرنے کے بعد تقریباً ۱۹۷۸ء میں مر گئے تھے۔ دریافت طلب مسئلہ ہے: (۱) محمد جان جو مکان ۶۱/ ۱۰/ ۱۷ کو فروخت کیا اور بعد میں انوری بیگم کشوری بیگم نے سکندری خاتون کو فروخت کیا، اس مکان میں سے محمد جان کی لڑکی نسیم فاطمہ سکندری خاتون سے تہائی طلب کرتی رہی ہے، آیا شرعاً سکندری خاتون کو اس میں سے تہائی دینا چاہئے یا نہیں؟

المستفتی: محمد یوسف خان محلّہ چاہ غوری، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ واقعہ کے سلسلے میں رمضان المبارک میں بہت

واضح سوال نامہ آیا تھا، نیز بہت سے مفتیان کرام کے دئے ہوئے جوابات بھی منسلک تھے، جو ہمارے رجسٹر میں درج ہیں، یہاں سے ۲۳ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ میں سوال نامہ، اور اقرار نامہ کے مطابق مدلل ومبرہن جواب دیا جا چکا ہے، جس کا ۲۳/۲۵۴ ہے، پھر ۱۲ رمحرم الحرام ۱۴۰۸ھ میں سائل کی طلب پر اقرار نامہ کی موافقت وانطباق کی تائید میں تصدیق نامہ بھی لکھا جا چکا ہے، جس کا ۲۳/۴۴۴ ہے، وہ سب کاغذات سامنے رکھے جائیں تو مزید فتویٰ کی ضرورت نہیں، تاہم موجود سوال نامہ زیادہ واضح بھی نہیں ہے، شرعی حکم یہی ہے کہ جب محمد جان نے مذکورہ مکان فروخت کر دیا اور اس کا ثمن بھی وصول کر لیا تو بعد میں خود محمد جان اور اس کے ورثاء میں سے نسیم، فاطمہ وغیرہ کسی کو کسی طرح بھی اس مکان سے حصہ داری کا دعویٰ کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔

فإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع. (الجوهرة النيرة، كتاب البيوع، ملتان ۱/ ۲۲٦، دارالكتاب ديوبند ۱/ ۲۲۰، هداية، أشرفي ديوبند ۳/ ۲۰، تاتارخانية زكريا ۸/ ۲۲۲، رقم: ۱۱۷۱٤)

وفي البناية: مع شرط النفاذ وهو الملك أو الولاية لزم البيع، ولا خيار لواحد. الخ (بناية شرح هداية، قديم ۳/ ۱۱، جديد أشرفيه ديوبند ۸/ ۱۱)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ رمحرم الحرام ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۴۶۸)

والد کے مکان فروخت کرنے کے بعد اولاد کا دعویٰ معتبر نہیں

سوال [۸۵۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مقصود النساء زوجہ احمد بخش ساکن امروہہ محلّہ چاہ غوری دوسوستر گز میں ایک مکان چھوڑ کر مر گئی، اولاد میں مقصود النساء نے ایک لڑکا محمد جان اور ایک لڑکی صابرہ خاتون

چھوڑیں، اب ہوتا یہ ہے کہ محمد جان نے اپنے بڑے لڑکے کی شادی میں اپنی بہو انوری بیگم بنت فضل کریم خان کے نام ۶-۱۴۱ر گز زمین اور حویلی کا نصف حصہ مبلغ پانچ سو روپیہ میں بیعانہ کردیا، اس کے بعد تیس گز زمین سرپرست نابالغ محمد شبیہ کا بن کر محمد جان نے اسرارالحق کو .... 1.9.47 کے بذریعہ بیعانہ سے مسماۃ انوری بیگم زوجہ محمد نبی نے اور محمد جان نے اپنی زمین ساڑھے گیارہ گز ملا کر یہ بھی اسرارالحق کو...... 10.1.50 میں بیعانہ کردیا، اس کے بعد انوری بیگم زوجہ محمد نبی نے نصف حصہ حویلی 10.9.47 کے مالکانہ حقوق سے یہ بھی اسرارالحق کو 18.12.50 میں بیعانہ کردیا، اب یہ جائیداد فروخت کرنے کے بعد ایک سو دس ۱۱۰ گز جگہ تقریباً رہ گئی جس کو محمد جان نے کشوری بیگم انوری بیگم بنت فرحت اللہ کے ہاتھ بذریعہ بیعانہ مبلغ چار سو روپیہ میں جس کا بہی ار جلد: ۹۲۲ صفحہ نمبر ۳۹۱/۹۲/۱۳ اندراج رجسٹری ہے فروخت کردیا، اس میں سے ۵۵ر گز جگہ انوری بیگم زوجہ محمد شیبہ سے 18.5.82 کو بذریعہ بیعانہ مبلغ چار ہزار پانچ سو روپیہ میں سکندری خاتون نے خرید لی، ۵۵ر گز جگہ مسماۃ کشوری بیگم زوجہ محمد نبی سے 12.9.86 کو بذریعہ بیعانہ مبلغ ۱۲۰۰۰ر روپیہ میں سکندری خاتون نے خرید لی، نیز اس میں ایک ایک گوٹھہ دونوں مسماتان کا بنا ہوا ہے، صابرہ خاتون نے اپنی اولاد میں شیدا علی رضا علی مرتضی علی انوری بیگم، کشوری بیگم ولد فرحت اللہ چھوڑیں، محمد جان تقریباً 1978 میں مر گئے تھے، اور صابرہ خاتون تقریباً 1980 میں مر گئیں تھیں۔

دریافت طلب مسئلہ یہ ہے: (ا) صابرہ خاتون کی اولاد سکندری خاتون سے صابرہ خاتون کی تہائی کا حق مانگ رہی ہے، سکندری خاتون نے جو مسماتان انوری بیگم وکشوری بیگم سے محمد جان کا فروخت کیا ہوا مکان جو 1961 کے بیعانہ کے ذریعہ سے سکندری خاتون نے خرید کیا ہے، کیا اس میں سے شرعی طور صابرہ خاتون کے ورثاء کو تہائی ملے گی یا نہیں؟

(۲) اسرارالحق صاحب نے جو مکان بذریعہ بیعانہ محمد جان سے .10-18.1250 47-150-711 میں خرید کیا ہے اور یہ مکان پورا ایک تھا، تو اس میں سے اسرارالحق کو بھی تہائی دینی پڑے گی یا صرف سکندری خاتون کو ہی یہ تہائی دینی پڑے گی شرعی طور پر؟

المستفتی: یوسف چاہ غوری، امروہہ

سوال [۸۵۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بوقت انتقال مسماۃ مقصود النساء نے تقریبا دوسوسترہ گز زمین بنا ہوا ایک منزل مکان واقع محلّہ چاہ غوری امروہہ میں چھوڑا۔ اور مرتے وقت دو اولا د لڑکا محمد جان اور لڑکی صابرہ خاتون چھوڑیں، محمد جان نے یہ مکان قسطوں میں فروخت کردیا، صابرہ خاتون بوقت فروختگی اپنی تہائی کی دعویدار نہیں ہوئیں اور کبھی زندگی میں بھی اظہار نہیں کیا، اب یہ مکان جب کہ محمد جان نے کسی کوفروخت کیا اور جن لوگوں نے یہ مکان محمد جان سے خریدا تھا، انہوں نے کسی دوسرے اشخاص کوفروخت کردیا،اب صابرہ خاتون کی اولا دصابرہ خاتون کے مرنے کے بعد صابرہ خاتون کی تہائی طلب کررہی ہے، اولا دصابرہ خاتون کے نام شیداعلی، رضاعلی، مرتضی علی، افسری بیگم، انوری بیگم، کشوری بیگم۔ دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ محمد جان تقریبا ۱۹۷۵ء اورصابرہ خاتون ۱۹۸۰ء میں مرگئے۔ (۱) آیا ان کوتہائی دی جائے گی یانہیں؟ یہ تہائی کیا خریدار پر واجب الاداء ہے؟ (۲) محمد جان نے یہ مکان کسی کوفروخت کیا اوران خریداروں نے دوسرے اشخاص کوفروخت کردیا۔

المستفتی: یوسف خان چاہ غوری، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مختلف وجوہ کی بنا پر صابرہ خاتون کی اولاد ورثاء کا دعوی قضاءً مسموع نہیں ہوگا۔ (۱) محمد جان نے زندگی بھر مالکانہ تصرف کرتے ہوئے مختلف قسطوں میں فروخت کرڈالا اور صابرہ خاتون نے باوجود بلا جبر وخوف کے دعویٰ نہیں کیا، یہاں تک کہ محمد جان کا انتقال ہوگیا، تو بعد کا دعویٰ شرعاً مسموع نہیں ہوگا۔

رجل تصرف في أرض زمانا، ورجل أخر يرى تصرفه فيها، ثم مات المتصرف ولم يدع الرجل حال حياته، لا تسمع دعواه بعد وفاته. الخ

(شامي، كوئٹه ٥/ ٥٢٤، كراچی ٦/ ٧٤٢، زكريا ١٠/ ٤٦٧-٤٦٨)

(۲) صابرہ خاتون مدعیہ نے جب اپنی زندگی میں مطالبہ نہیں کیا، تو ان کی وفات کے بعد ورثاء کا دعویٰ شرعاً مسموع نہیں ہوگا۔

وفی الحامدية عن الولوالجية: رجل تصرف زمانا في أرض، ورجل آخر يرى الأرض والتصرف ولم يدع ومات على ذلك لم تسمع بعد ذلك دعوى ولده، فترك على يد المتصرف. الخ (شامي، كتاب الخنشى مسائل شتى، مطبوعه كوئٹه ٥/ ٥٢٤، كراچی ٦/ ٧٤٢، زكريا ١٠/ ٤٦٨)

(۳) جب بوقت فروختگی اعزہ واقارب سکوت اختیار کریں اور کسی قسم کا اقدام نہ کریں، تو بعد کا دعویٰ مسموع نہیں ہوگا۔

باع عقارا أو حيوانا أو ثوبا وابنه وامرأته أو غيرهما من أقاربه حاضر يعلم به، ثم ادعى الابن مثلا أنه ملكه لا تسمع دعواه. (الدرالمختار، كوئٹه ٥/ ٥٢٤، كراچی ٦/ ٧٤٢، زكريا ١٠/ ٤٦٧-٤٦٨، البحرالرائق، كوئٹه ٨/ ٤٨٣، زكريا ٩/ ٣٥٤، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٢٢، زكريا ديوبند ٧/ ٤٥٦، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٤٨٣، قديم ٢/ ٧٣٩)

(۴) اگر اجنبی بھی بوقت بیع وتسلیم مبیع خاموش رہے اور مشتری خرید کر اپنا تصرف شروع کردے، تو بعد کا دعوی قابل قبول نہیں ہوتا اور اسی پر فتویٰ بھی ہے۔

الأجنبي سكوته ولو جارا لا يكون رضا إلا إذا سكت الجار وقت البيع والتسليم، وتصرف المشتري فيه زرعا وبناء، فحينئذ لا تسمع دعواه على ما عليه الفتوى قطعا للأطماع الفاسدة. الخ (الدرالمختار، كوئٹه ٥/ ٥٢٥، كراچی ٦/ ٧٤٣، زكريا ١٠/ ٤٦٩-٤٧٠)

(۵) سوال نامہ سے ظاہر ہورہا ہے کہ صابرہ خاتون نے بوقت بیع جبر وتشدد نہ ہونے کے باوجود کسی طرح کی پیشکش نہیں کی، جس کو ہبہ سکوتی بالقرائن کی دلیل قرار دیا جاسکتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۴۶۹)

(۶) بیعانہ واقرار نامہ میں صاف وضاحت موجود ہے کہ ہر قسم کے موانع سے پاک وصاف ہے، جس کی تفصیل بیعانہ میں موجود ہے؛ لہٰذا ان تمام وجوہات کی بنا پر صابرہ خاتون کے ورثاء کا دعویٰ مخدوش اور غیر مسموع ہوگا۔ بالفرض اگر واقع میں صابرہ خاتون کا

حق تھا اور وہ مظلوم رہی ہے، جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، تو آخرت میں ملے گا، دنیا میں ورثاء کو دعویٰ کا حق نہیں ہوگا۔

قالوا: إن الحق لا يسقط بالتقادم كما في قضاء الأشباه، فلا تسمع الدعوى في هذه المسائل مع بقاء الحق للآخرة. الخ (شامي، مطبوعه كوئٹه ٥/ ٥٢٤، كراچی ٦/ ٧٤٣، زكريا ١٠/ ٤٦٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍صفر ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۳۵)

والدہ کا حالت صحت میں اپنی جائیداد بیچنا

سوال [۸۵۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہماری والدہ کا ایک مکان ہے، وہ فروخت ہورہا ہے، ہمارے والدصاحب بھی حیات ہیں اور ایک ہم سے چھوٹا بھائی ہے اور چار بہنیں حیات ہیں، والدہ اس مکان کی قیمت میں سے ہمیں کچھ بھی دینا نہیں چاہتیں، تو کیا میں حق دار ہوں یا نہیں؟ شرعاً اولاد کو اس طرح محروم کردینا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد ساجد شمسی، گوکل داس انٹر کالج طویلہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفيق: اگر آپ کی والدہ بحالت صحت وہوش وحواس صحیح ہونے کی حالت میں فروخت کررہی ہیں اور اس کی رقم کو اپنی مرضی سے کہیں بھی خرچ کردیتی ہیں تو شرعاً آپ کی والدہ کو اختیار رہے۔

المالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء. (بيضاوي، رشيديه دهلي ١/ ٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍شعبان ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۴۲۲)

بائع کا زمین پر قبضہ دینے کے بعد اس کے ورثاء کا بیچنے سے انکار کرنا

سوال [۸۶۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے ایک پلاٹ خریدا، جس کا بیعانہ کرالیا اور پھر دوسرا پلاٹ اسی سے متصل اسی مالک سے خریدا اور اصل مالک بکر نے اس پر قبضہ بھی کرادیا، یعنی اس کی حد بندی کرادی اس خرید وفروخت کا تحریری شکل میں کوئی ثبوت نہیں، ہاں بکر کے کچھ قریبی رشتہ دار جو اس ملکیت میں بھی شامل تھے، ان کو معلوم تھا کہ بکر نے یہ پلاٹ بھی زید کو دے دیا ہے، ابھی زید نے مکمل روپیہ ادا نہیں کیا تھا کہ بکر کا انتقال ہوگیا، انتقال کے بعد جب زید روپیہ لے کر بکر کی بیوی کے پاس پہنچا (کیوں کہ اولاد نہیں ہے) تو بکر کی بیوی نے کہہ دیا کہ ہم پلاٹ نہیں دیں گے، اب سوال یہ ہے کہ کیا اگر کچھ روپیہ بکر کی زندگی میں دے دیا گیا تھا، تو پلاٹ پر کس کا حق ہے؟ اور اگر اس پلاٹ کا روپیہ بالکل نہیں پہنچا تو کیا حکم ہے؟ یا اگر زید کے پاس گواہ ہیں، تو کیا مسئلہ ہوگا، اگر گواہ نہیں ہیں تو کیا مسئلہ ہوگا، بکر نے جو حد بندی کرائی تھی وہ آج بھی باقی ہے اور اسی شکل میں موجود ہے، جواب تحریر فرمادیں۔

المستفتی: محمد شاکر لکھیم پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں جب زید اور بکر میں ایجاب وقبول ہوگیا اور مالک بکر نے زید کو زمین پر قبضہ بھی دلادیا، تو اب زید زمین کا مالک بن گیا، خواہ اس نے پوری رقم بکر کو ادا کی ہو یا نہ کی ہو اور زمین بکر کی ملکیت سے نکل گئی؛ لہٰذا بکر کی وفات کے بعد اس کی بیوی کا یہ کہنا کہ ہم پلاٹ نہیں دیں گے بدمعاملگی وبدعہدی ہوگی؛ لہٰذا بقیہ پیسہ وصول کر کے رجسٹری کرادینی چاہئے، ورنہ بدمعاملگی ووعدہ خلافی کا گناہ ہوگا۔

إذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع. (هداية، كتاب البيوع، أشرفي ديوبند ۳/ ۲۰/ الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ۱/ ۲۲۶، دارالكتاب ديوبند ۱/ ۲۲۰،

تاتارخانية زكريا ٨/ ٢٢٢، رقم: ١١٧١٤، ملتقى الأبحر دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١٠)

وفي الهندية: إذا استوفى الثمن وسلم المبيع أو سلم بغير قبض الثمن الخ ليس له أن يسترده ليحبسه بالثمن. (هندية، الباب الرابع في حبس المبيع بالثمن الخ، زكريا قديم ٣/ ١٥، جديد ٣/ ١٨)

ولا يشترط القبض بالبراجم؛ لأن معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفا وعادة وحقيقة. (بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣٤٢)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ ؍ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۵۷۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳؍۴؍۱۴۲۹ھ

کیا پھٹی بوریوں سے گرنے والا کھاد دوکان دار استعمال کرسکتا ہے؟

سوال [۸۶۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کھاد کی دوکان میں بہت سی بوریوں کے پھٹ جانے سے کھاد گرتا ہے اور بوریوں کے سلنے سے بھی کھاد گرتا ہے، جب دوکان بہاری جاتی ہے، تو دس بیس کیلو ہر قسم کا کھاد ملا کر جمع ہوجاتا ہے، تو اس کھاد کا استعمال صاحب دوکان کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ابوبکر، فیض آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر خریدار کو وزن کرکے دیا جاتا ہے تو جمع شدہ کھاد شرعاً دوکاندار کی ملکیت ہے جو عبارت ذیل سے مستفاد ہے:

إذا اجتمع للدهانين ما يقطر من الأوعية في إنائه، فإن كان يسيل من خارج الأوعية يطيب له؛ لأنه ليس للمشتري؛ لأن ما انفصل عنها لا يدخل

البيع، وإن سال من الداخل، أو من الداخل والخارج جميعا، أو لا يعلم ينظر . الخ (البحرالرائق، كتاب اللقطة، كوئٹه ٥/ ١٥٣، زكريا ديوبند ٥/ ٢٥٧، هندية، زكريا قديم ٢/ ٢٩٣، جديد ٢/ ٣٠٢، فتاوى قاضي خان، جديد زكريا ٣/ ٢٨٢، وعلى هامش الهندية، زكريا ٣/ ٣٩٣، تاتارخانية، زكريا ٧/ ٤٢٠، رقم: ١٠٧٩٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۷۱۸)

دوکان دار کا کم قیمت لینا

سوال [۸۶۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص بازار میں کچھ خریداری کرنے کے واسطے گیا اور اس نے مثلاً ایک سو روپیہ کا سودا خریدا، تو دوکاندار نے اسے ایک روپیہ واپس کردیا، یعنی ننانوے روپئے کاٹے، ایک روپئے کی چھوٹ کردی، تو اس چھوٹ کو کیا کہیں گے، یہ ایک روپیہ چھوٹ کا جائز بھی ہے یا نہیں؟ اسی طرح اگر کوئی ایک ہزار روپیہ کا سودا خریدے تو اسے دوکاندار دس روپیہ چھوٹ کر دیتا ہے، چاہے وہ ادھار خریدے چاہے نقد، بہت سے لوگ اسے سود اور بیاج کہتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ برائے مہربانی اس کا جواب مکمل ومدلل ومفصل نوازیں، عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد آصف ہلدوانی، پان بھنڈار لین ۷؍ آزادنگر، ضلع نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال نامہ میں درج شدہ طریقے سے بیچنے والے کا ثمن میں کمی کردینا شرعاً جائز اور درست ہے، وہ سود نہیں ہے۔

ويجوز للبائع أن يزيد للمشتري في المبيع، ويجوز أن يحط عن الثمن . الخ (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة و التولية، اشرفي ديوبند ٣/ ٧٥)

والحط منه، أي صح حط البائع بعض الثمن ولو بعد هلاک المبیع.
الخ (مجمع الأنهر، باب المرابحة والتولية، فصل في بيان البيع قبل قبض المبيع، قديم ۳/ ۸۱، جديد دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱۱۵، درمختار كراچی ۵/ ۱۵٤، زكريا ۷/ ۳۷۹)
فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ رجب المرجب ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۸۲۰)

قصاب کا چرم قربانی بازاری بھاؤ سے کم قیمت پر خریدنا

سوال [۸٦۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بقرعید کے موقع پر چرم قربانی میں ایسا ہوتا ہے کہ، جو لوگ قربانی کرنے والے ہوتے ہیں، ان سے قریشی حضرات جو مزدوری پر گوشت نکالنے والے ہوتے ہیں، اپنی مزدوری کم طے کرتے ہیں، اس لالچ میں کہ اس قربانی کے جانور کا چمڑا تھوڑے روپئے میں مالک لوگوں سے خرید لیں گے باوجود کہ ان قریشیوں کو پتہ ہوتا ہے کہ اس چمڑے کی قیمت زیادہ ہے؛ لیکن قربانی کرنے والوں سے تھوڑے پیسے میں خرید لیتے ہیں، جس سے غریب محتاج اور مدارس دینیہ کا بہت بڑا نقصان ہوتا ہے، آیا چمڑا اس طرح خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد احمد ٹھاکردوارہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب مالک کم پیسہ میں فروخت کر رہا ہے، تو قصاب کو کم پیسہ میں لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

البيع ينعقد بالإيجاب والقبول إذا كانا بلفظى الماضي. (وقوله:) رضيت بكذا، وأعطيتک بكذا. الخ (هداية، كتاب البيوع، أشرفي ديوبند ۳/ ۱۸،

الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٢٢٥، دارالكتاب ديوبند ١/ ٢١٩، تاتارخانية، زكريا ٨/ ٢١٢-٢١٣، رقم: ١١٦٧٢-١١٦٧٣، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٤)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۷۷۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/ ۱۲/ ۱۴۱۴ھ

زائد قیمت کے چاول کے ساتھ کم قیمت والے چاول بیچنا

سوال [۸۶۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے عمر کو دس کوئنٹل چاول بیچے، جس میں ایک کوئنٹل کی قیمت ۹۰۰؍ روپئے ہیں، اور عمر نے ان دس کوئنٹل چاولوں کے اندر پانچ کوئنٹل چاول ملائے جن کی قیمت پانچ سو روپئے کوئنٹل ہے اور زید کو چاول فروخت کرتے وقت یہ بھی معلوم ہے کہ عمر ان چاولوں کو ملا کر بیچے گا، تو کیا زید کے لئے یہ چاول بیچنا صحیح ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل ومدلل جواب تحریر فرمائیں۔ فقط

المستفتی: ظہیر الاسلام، متعلم مدرسہ رحمانیہ ٹانڈہ بادلی، ضلع رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کا عمر کے ہاتھ یہ جانتے ہوئے فروخت کرنا کہ وہ اس چاول میں ردی قسم کا چاول ملا کر اعلیٰ قسم کا ظاہر کر کے فروخت کرے گا، تو یہ زید کے لئے شرعاً جائز ہے، زید پر کوئی الزام نہیں؛ بلکہ گنہگار عمر ہی ہوگا؛ کیوں کہ فاعل مختار عمر ہے نہ کہ زید۔

ولا معصية فيه وإنما المعصية بفعل المستاجر وهو مختار، فينقطع نسبته عنه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ٩/ ٥٦٢، كراچی ٦/ ٣٩٢)

إذا اجتمع المباشر والمتسبب أضيف الحكم إلى المباشر. الخ
(الأشباه والنظائر، قديم، ص: ۲۳۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ ؍رجب المرجب ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۳۳۶)

کرایہ دار کے مکان خالی نہ کرنے پر اسی کے ہاتھ کم قیمت پر بیچنا

سوال [۸۶۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید، بکر کا مکان کرایہ پر لیتا ہے اور یہ شرط طے پاتی ہے، کہ جب آپ کو ضرورت ہوگی تو خالی کردوں گا، چند سال بعد جب بکر زید سے مکان خالی کرنے کو کہتا ہے تو بکر دو تین سال بعد خالی کرنے کو کہتا ہے اور عذر یہ کرتا ہے کہ میں نے زمین لے لی ہے، اس کو بنالوں گا پھر آپ کا مکان خالی کردوں گا؛ لیکن اس میعاد کے بعد بھی وہ خالی نہیں کرتا اور مکان مالک کا انتقال ہوجاتا ہے، اس کے بعد اس کے وارث پھر مکان خالی کرنے کو کہتے ہیں اور زید خالی کرنے کو راضی نہیں ہوتا۔ اور مجبوراً اس کے وارث اس مکان کو بیچنے کا ارادہ کرتے ہیں؛ لیکن کوئی گاہک اس کو اس حال کے ساتھ کہ اس میں کرایہ دار کا قبضہ ہے، راضی نہیں ہوتا اس وجہ سے مجبوراً مکان زید ہی کے ہاتھ فروخت کرنا پڑتا ہے اور قیمت بھی قبضہ کے دباؤ میں اصل قیمت سے کافی کم طے ہوتی ہے، اس حال میں یہ خرید وفروخت کیسا ہے؟ شریعت کی روشنی میں مطلع فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: مختار حسین مقبرہ روڈ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اس طرح دباؤ میں آکر اگر کرایہ دار کے ہاتھ کم قیمت میں فروخت کرتا ہے تو شرعاً خرید وفروخت صحیح ہوجائے گی؛ لیکن کرایہ دار سخت ترین گنہگار بھی ہوگا؛ اس لئے کہ اس نے غیر کی ملکیت کو اس کی مرضی کے خلاف بکوایا ہے۔

عن عمر بن يحيى المازني عن أبيه، أن رسول الله ﷺ قال: لا ضرر

ولا ضرار. (مؤطا إمام مالك، كتاب القضاء، القضاء في الرفق، أشرفی دیوبند/ ۳۱۱)

لا ضرر ولا ضرار. الخ (قواعد الفقه، أشرفي ديوبند ١٠٦، شرح المجلة، اتحاد بك ڈپو ديوبند ١/ ٢٩، المادة: ١٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ صفر ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۵۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۰/ ۲/ ۱۴۱۲ھ

کتے کے جھوٹے آٹے کی بیع کا حکم

سوال [۸۶۰۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کتے نے آٹے کو جھوٹا کر دیا، اب اس آٹے کو بیچ کر اس روپیہ سے دوسرا آٹا یا اور کوئی چیز خرید کر کھانا جائز ہے یا نہیں؟ نیز کتے کا جھوٹا فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: تجمل حسین مدھوبنی، متعلم مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جہاں پر کتے نے منہ لگایا وہاں سے الگ کر کے باقی آٹا کھانے کے کام میں لگانا جائز اور درست ہے۔ اور جس حصہ پر منہ لگایا ہے، اس کو فروخت کر کے اس کے پیسہ سے دوسرا آٹا خرید کر کھانا بھی جائز ہے، مگر احتیاط کی بات یہ ہے کہ خریدار سے بتلا دے کہ خود کھانے کے علاوہ دوسرے کام میں لائے۔

المخلوط من العذرة بالتراب بمنزلة زيت خالطته النجاسة حيث يجوز بيعه والانتفاع به كالاستصباح ونحوه. الخ (بناية، كتاب الكراهية، فصل في البيع، قديم ٤/ ٢٥٦، جديد أشرفيه ديوبند ١٢/ ٢٠١، شامي، زكريا ٩/ ٥٥٢، كراچی ٦/ ٣٥٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٠/ ١٠٢، المحيط البرهاني، المجلس العلمي بيروت ٨/ ١٠٢، رقم: ٩٦٨٧، تاتارخانية، زكريا ١٨/ ٢٣٥، رقم: ٢٨٦١٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱؍ محرم ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۸۳۳)

اولاد نے والد کے ساتھ رہ کر جو کمائی کی وہ کس کی ملک ہے؟

سوال [۸۶۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں ایک مکان کا مالک تھا، اس مکان کو میرے دولڑکوں نے میری مرضی سے فروخت کردیا اوراس پیسہ سے دوسرا مکان دونوں لڑکوں نے اپنے نام سے خرید لیا، اب اس مکان میں میرا اور میری بیوی ولڑکی کا حصہ نکلتا ہے؟ ازروئے شرع تحریر فرمائیں، نیز باپ بیٹے سب ایک ساتھ رہتے تھے اور سب باپ کے زیر تحت تھے۔

المستفتی: حمید اللہ سنبھل، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جب دونوں لڑکے آپ کے زیر تحت رہ کر کام کرتے ہیں، تو آپ کی اور دونوں کی ساری کمائی شرعاً آپ کی ملکیت میں ہوگی، اگرچہ لڑکوں نے خریدتے وقت اپنا نام کرالیا ہو شرعاً اس میں آپ کے بعد آپ کے تمام ورثاء کا حق شامل ہوگا۔ اور زندگی میں آپ خود مالک ہیں۔

والأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء، فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له. الخ (شامي، كتاب الشركة، فصل في الشركة الفاسدة، مطلب اجتهاد في دار واحدة واكتسبا الخ، كراچی ٤/ ٣٢٥، زكريا ٦/ ٥٠٢، هندية، الباب الرابع في شركة وجوه و شركة الأعمال، زكريا قديم ٢/ ٣٢٩، جديد ٢/ ٣٣٢)

إذا عمل رجل في صنعة هو وابنه الذي في عياله فجميع الكسب لذلک الرجل، وولده يعد معينا له، وكذا إذا أعانه ولده الذى في عياله عند غرسه شجرة، فتلک الشجرة للأب لا يشاركه ولده فيها. (شرح المجلة، اتحاد بكڈپو ديوبند ٢/ ٤٧١، رقم: ١٣٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۶۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۲/۳/۲۶ھ

دودھ کی بالائی مشین کے ذریعہ نکال کر فروخت کرنا

سوال [۸۶۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ہمارے یہاں دودھ میں سے بالائی نکالنے کا کاروبار ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ دودھ والے ہمارے پاس اپنا دودھ لے کر آتے ہیں اور ہم اس دودھ سے مشین کے ذریعہ بالائی نکال لیتے ہیں۔ اور اس کی قیمت دودھ والوں کو ادا کردیتے ہیں، اس کے بعد وہ لوگ اپنا دودھ واپس لے جاتے ہیں اور وہ لوگ اس دودھ کو کسی بھی طرح استعمال کریں اس سے ہمیں کوئی مطلب نہیں، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا اس طرح بالائی نکال کر اس کو فروخت کرنا یا اور کوئی مکھن وغیرہ بنا کر فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: زاہد علی ولد محمد جابر علی ہوٹل والے بڑی مسجد کے پاس محلّہ کھتاڑی رامنگر، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دودھ کی بالائی مال متقوم اور مال مرغوب فیہ ہے، اس کو مشین کے ذریعہ الگ کر کے خریدنا اور فروخت کرنا شرعاً جائز اور درست ہے، اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

ما من شأنه أن ترغب إليه النفس، وهو المال. البيع لغة مبادلة شيء مرغوب فيه بمثله. الخ (شامی، کتاب البیوع، مطلب في تعريف المال والملك، کراچی ٤/ ٥٠٢، زکریا دیوبند ٧/ ١١- ١٢)

ہاں البتہ دودھ والوں پر لازم ہے کہ بالائی نکالے ہوئے دودھ کو فروخت کرتے وقت خریدار کے سامنے صاف طور پر ظاہر کردیں کہ اس دودھ میں سے بالائی نکال لی گئی ہے۔ اور اگر دودھ والے بوقت فروختگی اس کا اظہار نہ کریں تو عنداللہ سخت گنہگار اور دھوکہ باز ثابت ہوں گے۔ اور خریدار کو واپس کرنے اور رجوع بالنقصان کا حق حاصل ہوگا۔

عن أبي هريرة -رضى الله عنه- قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الغرر. الحديث (مسلم شريف، کتاب البيوع، باب بطلان بيع الحصاة والبيع الذي فيه غرر، النسخة الهندية ٢/ ٢، بيت الأفكار، رقم: ١٥١٣)

عن عقبة بن عامر -رضي الله عنه- قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: المسلم أخو المسلم، ولا يحل لمسلم باع من أخيه بيعا فيه عيب إلا بينه له. (سنن ابن ماجة، أبواب التجارات، باب من باع عيبا فليبينه، النسخة الهندية/ ۱٦۲، دارالسلام، رقم: ۲۲٤٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/شعبان ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۲۳۲۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۸/۲ھ

فوٹو فریم بنا کر فروخت کرنا

سوال [۸٦۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فریم بنانا جائز ہے یا نہیں؟ چونکہ اگر میں یہ کام کرنا چاہوں تو ہر طرح کے اچھے برے یعنی فوٹو وغیرہ بھی لوگ فریم کرائیں گے، اس کے بارے میں تشفی کرنی ہے۔ فقط

المستفتی: محمد تحسین سہسپوری، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر آپ کا ارادہ فوٹو کی خصوصیت کا نہیں ہے یا صرف جائز چند چیزوں کے لئے ہے، تو "**الأمور بمقاصدها**" کے تحت یہ کام جائز ہے، بعد میں جو لوگ جائز کام میں استعمال کریں ان کے لئے جائز اور جو ناجائز کام میں استعمال کریں ان کے لئے ناجائز، آپ پر کوئی گناہ نہیں۔

القاعدة الثانية: الأمور بمقاصدها...... وذكر قاضيخان في فتواه: أن بيع العصير ممن يتخذ خمرا إن قصد به التجارة فلا يحرم، وإن قصد به لأجل التخمير حرم، وكذا غرس الكرم على هذا. الخ (الأشباه والنظائر قديم، ص: ۵۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/صفر ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۴۹۳)

غیر مسلم کو قرآن شریف فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قرآن پاک کو کبھی کبھی ہندو فروخت کرتا ہے اور وہ پاک ہے یا ناپاک ہے، کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے؛ لہٰذا اس کے بارے میں شرعی مسئلہ کیا ہے؟ حدیث وقرآن کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ اور مسلم پرسنل لاء کی طرح اس پر بھی عمل ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا۔

المستفتی: محمد طاہر انصاری، گرام وپوسٹ بڑامدن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر غیر مسلم تاجر قرآن کریم کی عظمت اپنے دل میں رکھتا ہو اور قرآن کریم کو غسل یا وضو کرکے پکڑتا ہو، ورنہ غلاف سے پکڑتا ہو تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اس کو امام محمدؒ نے جائز قرار دیا ہے۔

قال الله تعالى: لَا يَمَسُّهُ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ. [الواقعة: ۷۹]

ويمنع النصراني (في الشامية، في بعض النسخ: الكافر) من مسه وجوزه محمد إذا اغتسل. الخ (درمختار مع الشامي، كتاب الطهارة، قبيل باب المياه، كوئٹه ۱/ ۱۱۹، كراچی ۱/ ۱۷۸، زكريا ديوبند ۱/ ۳۲۱)

لا يمس المصحف (الكافر) ما لم يغتسل، وهذا قول محمد. (حلبي كبير، أشرفيه ديوبند/ ۴۹۷)

لیکن قرآن کریم کو بے حرمتی سے محفوظ رکھنا ہم پر ضروری ہے؛ اس لئے جب بھی بے حرمتی کا خطرہ ہوگا تو کافر کو اس سے روکا جائے گا اور مسلم پرسنل لاء کو بھی اس وقت آواز اٹھانی ہوگی۔

عن عبدالله بن عمر –رضي الله عنه– عن رسول الله ﷺ أنه كان ينهى أن يسافر بالقرآن إلى أرض العدو مخافة أن يناله العدو. الحديث. وتحته في الشرح: فيه النهي عن المسافرة بالمصحف إلى أرض الكفار

للعلة المذكورة في الحديث، وهي خوف أن ينالوه فينتهكوا حرمته.
(صحيح مسلم مع الشرح، كتاب الأمارة، باب النهي أن يسافر بالمصحف إلى أرض الكفار، النسخة الهندية ٢/ ١٣١، بيت الأفكار، رقم: ١٨٦٩)

والحاصل: مما سبق أن وقوع المصحف بأيدى الكفار إنما يمنع منه إذا خيف منهم إهانته، أما إذا لم يكن مثل هذا الخوف فلابأس بذلك.
(تكملة فتح الملهم، مسألة تعليم الكافر القرآن، أشرفيه ديوبند ٣/ ٣٨٦)

وتكره المسافرة بالقرآن الكريم إلى دارالحرب صونا عن وقوعه في أيدي الكفرة واستخفافه. (البحرالرائق، باب الحيض، كوئٹه ١/ ٢٠٢، زكريا ١/ ٣٥١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١١ر رمضان المبارک ١٤٠٧ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٢٣/ ٢٢٧)

آیاتِ قرآنیہ والے کیلنڈر غیر مسلم کو فروخت کرنے کا حکم

سوال [٨٦١١]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گزارش خدمت عالیہ میں یہ ہے کہ کیلنڈر کے اندر جو کلام پاک کی آیت لکھ کر اسکو ہندو اور مسلمان دونوں فروخت کرتے ہیں، اس کو اس طرح فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر ناجائز ہے تو اس پر بھی کیوں نہیں مسلم پرسنل لاء کی طرح پابندی لگائی جاتی، حضور والا سے گزارش ہے کہ جلد از جلد جواب سے نوازیں گے۔

المستفتی: محمد طاہر انصاری پوسٹ بڑامدن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر غیر مسلم کے دل میں قرآن کریم کی عظمت ہو اور اس کی طرف سے اس بات کا اطمینان ہو کہ وہ اس کی بے ادبی اور بے حرمتی نہیں کرے گا، اور وہ

غسل یا وضو کر کے پکڑتا ہے، تو اس کے لئے اس کی گنجائش ہے۔ اور غیر مسلم کا غسل ووضو شرعاً معتبر ہے، جب کہ ارکان غسل ووضوادا کر کے غسل یا وضو کرے۔

كما في البحر: لعدم اشتراط النية في الوضوء، لايبطل وضوءه. الخ

(البحرالرائق، كتاب الطهارة، باب التيمم، كوئٹه ١/ ١٥١، زكريا ١/ ٢٦٤)

اور کیلنڈر وغیرہ میں آیات کا حصہ زیادہ ہو تو بھی مسلم وغیر مسلم سب کے چھونے کے لئے طہارت ضروری ہے۔

كما في الشامي: الأظهر والأحوط القول الثالث، أي كراهته في التفسير دون غيره لظهور الفرق، فإن القرآن في التفسير أكثر منه في غيره، وذكره فيه مقصود استقلالا لا تبعا فشبهه بالمصحف أقرب من شبهه بقية الكتب. الخ (شامي، كتاب الطهارة، قبيل باب المياه، نعمانيه ١/ ١١٩، كراچی ١/ ١٧٧، زكريا ديوبند ١/ ٣٢٠) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۱۱؍رمضان ۱۴۰۷ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۲۲۷)

سرکار کی طرف سے بینڈ شدہ کتاب کی فروختگی کا حکم

سوال [۸۶۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں کتابوں کا کاروبار کرتا ہوں، جس میں کچھ کتابیں ایسی ہیں جن کو ہمارے ملک میں بیچنے کی اجازت نہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا میں ان کتابوں کو بلیک کر سکتا ہوں؟

المستفتی: محمد عمران ارشد میرٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بلیک کرنے سے آمدنی حرام نہیں ہوتی؛ لیکن جان ومال کے تحفظ کے خاطر ایسے کاروبار کا نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ١٩٥]

طاعة الإمام فيما ليس بمعصية فرض. (درمختار، كتاب الجهاد، باب البغاة، مطلب في وجوب طاعة الإمام، زكريا ٦/ ٤١٦، كراچی ٤/ ٢٦٤)

أن الرجل يمنع من التصرف في ملكه إذا كان تصرفه يضر بجاره ضررا فاحشا؛ لأن درء المفاسد عن جاره أولى من جلب المنافع لنفسه. (شرح المجلة، اتحاد بکڈپو دیوبند ١/ ٣٢، رقم المادة: ٣٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۰۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۴/۱۴ھ

مسلم شخص کا غیر مذہبی فوٹو کی کتابیں فروخت کرنا

سوال [۸۶۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دریافت طلب امر یہ ہے کہ مسلمان دوکاندار اپنی دوکان پر غیر مذہبی کتابیں جن میں فوٹو بھی ہوں فروخت کرسکتا ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا

المستفتی: قاری حسیب الرحمٰن سیوہارہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر فوٹو کی بیع مقصود نہ ہو تو غیر مذہبی کتابوں کی فروختگی میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی، قدیم ۹/ ۲۳۵، جدید زکریا مطول ۱۱/۱۱۲)

إنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار –إلى قوله– وإنما المعصية بفعل المستاجر وهو مختار، فينقطع نسبته عنه فصار كبيع الجارية ممن لايستبرئها أو يأتيها من دبر، وبيع الغلام من لوطي. الخ (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ٩/ ٥٦٢، كراچی ٦/ ٢٩٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۷۱۹)

لہوولعب کی چیزیں بنانے اور بیچنے کا حکم

سوال [۸۶۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) وہ تمام اشیاء جو مسلمان بچے لہوولعب کے طور پر استعمال کرتے ہیں، ان کا بنانا اور خریدنا کیسا ہے؟ مثلاً پتنگ، ڈمرو وغیرہ حرام ہے یا مکروہ یا حلال؟

(۲) وہ تمام اشیاء جو غیر مسلموں کے بچے بطور لہوولعب استعمال کرتے ہیں، ان کا بنانا کیسا ہے؟ مثلاً گھنٹی ہے جو غیر مسلم کے بچے استعمال کرتے ہیں، ان کا بنانا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: جمیل احمد قاسمی، بستوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ اشیاء کا بنانا اور ان کی تجارت اور خرید وفروخت حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے؛ اس لئے کہ معصیت کا تعلق فاعل مختار کے فعل کے ساتھ ہوا کرتا ہے، اور حضرت امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک تعاون علی المصعیۃ کی وجہ سے ناجائز ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ۲]

وجاز تعمير كنيسة وحمل خمر ذمي بنفسه، أو دابته بأجر، وتحته في الشامية: إنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار. الخ (الدرالمختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ۹/ ۵۶۲، كراچی ۶/ ۳۹۱)

من حمل لذمي خمرا بأجر طاب له عنده، وعندهما يكره للإعانة.

(الدرالمنتقى، كتاب الكراهية، قديم ۲/ ۵۲۹، جديد دارالكتب العلمية بيروت ۴/ ۱۸۶-۱۸۷)

لہٰذا احتیاط اس میں ہے کہ ان چیزوں سے اپنے آپ کی حفاظت کریں۔

(۲) تعاون علی المصعیۃ کی وجہ سے درست نہیں ہے۔ کما مر۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵ر محرم الحرام ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۰۹۳)

مانجھے کی آمدنی کا حکم

سوال [۸۶۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید مانجھے کا کام کرتا ہے، آیا مانجھے کی کمائی جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر اس کمائی کے پیسہ سے زید ولیمہ کرے یا نذر و نیاز کرے تو اس کے یہاں کھانا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کا نذر و نیاز کرنا قبول بارگاہ ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: لیاقت حسین فلاح عام سوسائٹی بلاری، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مانجھے فی نفسہ ممنوع نہیں؛ البتہ مانجھے کے ڈورے سے جو امر ممنوع کا ارتکاب کرے گا وہی گنہگار رہوگا؛ اس لئے مانجھے کی آمدنی حرام نہ ہوگی۔

إنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار. الخ (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ۹/ ۵٦۲، كراچى ٦/ ۳۹۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸ر محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۱۴۰)

پوجا پاٹ اور نذر و نیاز میں استعمال ہونے والی اشیاء کی خرید و فروخت کا حکم

سوال [۸۶۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ۱۹۰۵ء میں ہمارے پرنانا نے ایک دوکان، قرآن دینی کتابیں عطر وغیرہ کی کھولی، پھر اس دوکان کو ہمارے نانا جو سند یافتہ وکیل ہیں، انہوں نے سنبھالا وکالت کا عہدہ؛ اس لئے قبول نہیں کیا کہ اس میں جھوٹ بولنا پڑے گا، دوکان میں آہستہ آہستہ شرک وبدعات کی چیزیں یعنی مندروں میں مورتیوں کے پوجا پاٹ کے لئے استعمال ہونے والی اشیاء (ہلدی،

گنگوتم، سندور، گلاب وغیرہ) اسی طرح درگاہوں اور تعویذات، منتروں کے لئے استعمال کی جانے والی چیزوں (ڈوریاں، تختیاں وغیرہ) کی بھی خرید وفروخت شروع ہوئی، اس وقت دوکان نانا کے بیٹوں (ماموں) کے ہاتھ میں ہے، تجارت بڑھ گئی ہے، تقریباً ۱۵/آدمی کام کرتے ہیں، اصل تجارت اس وقت دوکان میں شرک وبدعات کے لئے استعمال ہونے والی چیزیں ہی ہیں، قرآن، دینی کتابیں، عطر وغیرہ کی تجارت بھی ہے، مگر برائے نام بہت کم، معلوم یہ کرنا ہے کہ ایسی دوکان چلانا جس سے شرک و بدعات کو تقویت پہنچتی ہو (جب کہ یہی ایک دوکان ہی ذریعہ معاش نہیں؛ بلکہ دوسری اچھی تجارت کپڑے کی بھی ہے؛ اس سے اچھی آمدنی ہورہی ہے، ایسی دوکان کا چلانا کیسا ہے؟ کیا دوکان کے کاروبار کو بندر کردیں، دوسری تجارت کریں جو بھی شریعت کا حکم ہو تحریر فرمادیں۔

المستفتی: محمد طارق، رحمت پالہ ویلور، تمل ناڈو

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جن چیزوں کی فروختگی کا ذکر کیا گیا ہے وہ چیزیں دوسرے کاموں میں بھی آسکتی ہیں؛ لہٰذا ان چیزوں کا فروخت کرنا فی نفسہ جائز اور درست ہے۔ اور دوکانوں سے خرید کر جو لوگ غلط جگہ استعمال کریں گے وہ خود گنہگار ہوں گے۔ اور جو لوگ غلط جگہ استعمال نہ کرکے صحیح اور جائز جگہ استعمال کریں گے، ان پر کوئی گناہ نہ ہوگا؛ اس لئے بیچنے والے تاجروں پر کوئی وبال نہیں اور سارا وبال غلط استعمال کرنے والوں کے سر پر ہوگا۔ اور مذکورہ دوکانوں کی آمدنی جائز اور درست ہوگی، ہاں اگر دوکاندار خود غلط جگہ استعمال کرنے میں شریک ہوتا ہے اور دوسروں کو ترغیب دیتا ہے، تو دوکاندار بھی گنہگار ہوگا، مگر پیسہ بہرحال حلال ہوگا۔

لایکرہ بیع الزنانیر من النصراني والقلنسوۃ من المجوسي؛ لأن ذلک إذلال لھما. (شامي، کتاب الحظر والإباحۃ، باب الاستبراء وغیرہ، زکریا ۹/ ۵۶۲، کراچی ۶/ ۳۹۲، ھندیۃ، زکریا قدیم ۵/ ۳۴۶، جدید ۵/ ۴۰۱، مجمع الأنھر،

مصري قديم ۲/ ۵۳۰، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٨٨، تبيين الحقائق، مكتبه إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٤-٦٥)

وجاز بيع عصير عنب ممن يعلم أنه يتخذه خمرا؛ لأن المعصية لا تقوم بعينه بل بعد تغيره. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ۹/ ٥٦٠-٥٦١، كراچی ٦/ ٣٩١، تبيين الحقائق، زكريا ٧/ ٦٣، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، الأشباه والنظائر، قديم، ص: ٥٣)

وجاز إجارة بيت بسواد الكوفة ...... لا بغيرها على الأصح ...... ليتخذ بيت نار، أو كنيسة، أو بيعة، أو يباع فيه الخمر، وتحته في الشامية: هذا عنده أيضا؛ لأن الإجارة على منفعة البيت، ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم، ولا معصية فيه، وإنما المعصية بفعل المستاجر، وهو مختار، فينقطع نسبته عنه. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ۹/ ٥٦٢، كراچی ٦/ ٣٩٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍شعبان ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۶۹۳/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۸/۲ھ

پوجا میں استعمال ہونے والے پیتل کے چراغ بنانا

سوال [۸۶۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں شہر میں پیتل کے ظروف کا کاروبار ہوتا ہے، چراغ بھی پیتل کے بنائے جاتے ہیں، یہ چراغ عموماً ہندو صاحبان اپنی پوجا کے کام میں لاتے ہیں، کبھی کبھی ان سے چراغاں یا آرائش کا کام بھی لیا جاتا ہے، یہ تحریر فرمائیے کہ پیتل کے چراغ بنا کر فروخت کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ چراغوں کے کام سے کمائی ہوئی دولت حلال ہوگی یا حرام؟

المستفتی: حکیم محمد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر پوجا کے علاوہ دوسرے جائز کام میں بھی مستعمل ہوتا ہے اور محض اپنی تجارت کی غرض سے فروخت کیا جاتا ہے، تو ''**الأمور بمقاصدها**'' کے تحت تجارت اور آمدنی دونوں حلال ہوں گی۔ اور اگر پوجا کرنے والوں ہی کے لئے بنایا جاتا ہے اور فروخت کیا جاتا ہے، تو اعانت علی المعصیت کی بنا پر ناجائز ہوگا۔

وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ٢]

الأمور بمقاصدها، وتحته في الأشباه: أن بيع العصير ممن يتخذه خمرا إن قصد به التجارة، فلا يحرم وإن قصد به لأجل التخمير حرم. الخ

(الأشباه والنظائر، قديم ٥٣، وهكذا في الشامي، زكريا ٩/ ٣٦١، كراچی ٦/ ٣٩١، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ٧/ ٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۱۸۷)

گھنٹی، ترشول، اوم، چراغ وغیرہ آرڈر پر بنانا

سوال [۸۶۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک کارخانہ دار ہے اور پیتل کے سامان کا کارخانہ ہے، اس وقت کارخانہ میں جو آرڈر ہے، اس میں غیر مسلموں کے پوجا پاٹ کے عدد کا آرڈر ہے، جیسے گھنٹی، ترشول، اوم، چراغ وغیرہ، اس میں کسی میں بھی کسی جاندار کی تصویر نہیں ہے، تو اس طرح کے یہ سامان بنانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: انور خورشید نئی بستی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گھنٹی مندروں کے علاوہ دوسری جگہ بھی استعمال ہوتی

ہے؛ اس لئے ان کی عبادت کے ساتھ خاص نہیں ہے، اسی طرح ترشول، ان کی عبادت کی چیز نہیں ہے؛ بلکہ ان کے اپنے پاس رکھنے کا شعار ہے اور چراغ بھی ان کے ساتھ خاص نہیں ہے، کہیں بھی استعمال ہوسکتا ہے؛ اس لئے ان چیزوں کا بنانا اور ان کی تجارت جائز اور درست ہے۔ اور اوم ان کی مذہبی شعار ہے اور ان کے یہاں اوم ایسا ہے جیسا کہ ہمارے یہاں بسم اللہ، اس کو نہ بنانا بہتر ہے، اگر اس کو بنا کر قیمت لیتے ہیں تو قیمت بالکل حرام نہیں ہے؛ بلکہ مکروہ ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۷/ ۳۰۹)

وجاز تعمير كنيسة، قال في الشامية: قال في الخانية: ولو آجر نفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها لابأس به؛ لأنه لا معصية في عين العمل.

(شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ۹/ ۵۶۲، كراچی ۶/ ۳۹۲، فتاوی قاضی خان، زكريا جديد ۲/ ۲۰۵، وعلى هامش الهندية ۲/ ۳۲۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۸/ ۱۵۸، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ۸/ ۷۰، رقم: ۹۶۰۷، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ۱۸/ ۱۶۷، رقم: ۲۸۳۷۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ رجب ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۰۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲؍ ۷؍ ۱۴۲۷ھ

مانع حمل دواؤں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ کوئی ایسی گولی یا کیپسول جو اسقاط حمل کے لئے استعمال کی جاتی ہو اس کا فروخت کرنا شرعاً جائز ہے کہ نہیں؟ مفصل جواب سے آگاہ کریں۔

المستفتی: نعیم الدین محلّہ مذکھڑی دانوں کوٹھی والی مسجد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر یہ گولی بنانے والے اور تجارت کرنے والے کا مقصد صرف یہی ہے کہ بوقت شدت ضرورت کام آسکے، مثلاً حمل کی وجہ سے عدت یا شیرخوار بچہ کی ہلاکت کا خطرہ ہے اور حمل میں جان پڑنے سے قبل استعمال کی جاتی ہے، تو ''الأمور بمقاصدها'' (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ٦٢، رقم: ٥١) کے تحت بنانا اور استعمال کرنا اور تجارت کرنا سب جائز ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/۱۱۷)

لیکن اگر بدکار زناکار عورتوں کے کام کے لئے ہے یا اکثر خریدار رنڈیاں ہوتی ہیں، تو تعاون علی المعصیت کی وجہ سے بنانا تجارت کرنا اور خریدنا سب حرام ہے۔

قوله تعالى: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ٢]

لیکن پیسہ حلال رہے گا؛ کیوں کہ پیسہ مال کا بدلہ ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍محرم الحرام ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/۴۵۶)

زمین کی بقیہ قیمت کی ادائیگی موجودہ وقت کے اعتبار سے ہوگی یا خرید کے؟

سوال [۸۶۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمد آصف نے ایک زمین بیچی جو کہ سوا چار بیگہ تھی، عبدالرب صاحب نے خریدی، مگر قیمت صرف چار بیگہ کی ادا کی ہے اور باقی کے بارے میں کہا تھا کہ دے دیں گے، مگر ۲۲؍سال کا عرصہ ہوگیا، کئی بار مطالبہ کے بعد اب وہ قیمت دینے پر راضی ہوگئے ہیں؛ اس لئے دریافت یہ کرنا ہے کہ بقیہ قیمت ۲۲؍سال پہلے کے اعتبار سے لی جائے گی یا یہ کہ موجودہ بھاؤ کے اعتبار سے؟ ۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ عبدالرب نے ۲۲؍سال تک جو زمین جوتی ہے اور اس سے غلہ حاصل کیا ہے، یہ کس کا تھا؟ اب ۲۲؍سال کے غلہ کی قیمت اصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد آصف جگر کالونی مسجد، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جوصورت بیان کی گئی ہے، اس میں عبدالرب کے لئے ۲۲؍سال پہلے کی قیمت کے حساب سے اس زمین کا روپیہ دینا ہوگا، جس کا ابھی تک روپیہ ادانہیں کیا ہے، موجودہ زمانہ میں زمین کی جو قیمت ہے اس کے اعتبار سے نہیں دیا جائے گا اور جو کچھ عبدالرب نے زمین سے غلہ حاصل کیا ہے وہ سب عبدالرب کا ہی مانا جائے گا؛ البتہ عبدالرب پر ۲۲؍سال تک زمین کے اس حصہ کا جس کی قیمت ادانہیں کی ہے کرایہ ادا کرنا لازم ہوگا۔ اور یہ کرایہ وہاں کے عرف اور معیار کے اعتبار سے ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مالک زمین کی طرف سے بدستور مطالبہ جاری رہا اور اس نے زمین کی قیمت ادانہیں کی؛ بلکہ قیمت ادا کئے بغیر اس کی جتائی کرتا رہا۔

وحاصل ما مر أنه على قول أبي يوسف المفتى به لا فرق بين الكساد والانقطاع، والرخص، والغلاء في أنه تجب قيمتها يوم وقع البيع. (شامي، كتاب البيوع، مطلب مهم في أحكام النقود إذا كسدت أو انقطت، زكريا ۷/ ۵۵-۵۶، كراچی ٤/ ۵۳٤)

ومن بنى أو غرس في أرض غيره بغير إذنه، أمر بالقلع والرد ...... ولو زرعها يعتبر العرف، فإن اقتسموا الغلة أنصافا أو أرباعا اعتبر، وإلا فالخارج للزارع، وعليه أجر مثل الأرض. (درمختار على الشامي، كتاب الغصب، زكريا ۹/ ۲۸۳-۲۸٤، كراچی ٦/ ۱۹٤-۱۹۵، تنقيح الفتاوى الحامدية ۲/ ۱۵٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍صفر ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۶۲۲/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۲/۱۶ھ

پھل آنے سے قبل بور آنے کے بعد باغوں کی خرید وفروخت

سوال [۸۶۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ہمارے یہاں امروداورآم کے باغ ہیں، ان کوپھل آنے سے پہلے بیچ دیا جاتا ہےاورہم اس انتظار میں رہتے ہیں کہ پھل آئے تو خریدیں، جب تک سب باغ پک جاتے ہیں اور کچھ باغات ایسے ہیں کہ ان کے ساتھ دوسری کھیتی بھی کر سکتے ہیں، ان دونوں باغوں میں سے کونسا باغ کس وقت اورکس حالت میں خریدنا اور بیچنا جائز ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ کومدلل فرمائیں۔

المستفتی: منجانب اہل ککرالہ، بدایوں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پھل آنے سے قبل بورآنے کے بعد درختوں کواوراق سمیت خریدلیا جائے تو جائز ہے، اس سے قبل جائز نہیں؛ لہٰذا بورآنے سے قبل نہ خریدا کریں اوردرختوں کومع زمین کے کرایہ پر لینے کوبعض فقہاء نے منع فرمایا ہے۔

والحیلة في جوازه باتفاق المشایخ: أن یبیع الکمثری أول ما تخرج مع أوراق الشجر، فیجوز فیها تبعا للأوراق. الخ (شامي، کتاب البیوع، مطلب في بیع الثمر والزرع والشجر مقصودا، زکریا ۷/ ۸۵، کراچی ٤/ ٥٥٥، مجمع الأنهر، مصري قدیم ۲/ ۱۷، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۲٦، البحرالرائق، زکریا ٥/ ٥٠٢، کوئٹه ٥/ ٣٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰/ ۱۲/ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۵۰٦٦)

باغات کی فروختگی میں جواز کی متبادل شکل

سوال [۸٦۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یوپی میں باغات کودوسال کے لئے فروخت کیا جاتا ہے، اور یہ پیسوں کے عوض

ہوتا ہے، تو باغات میں پھل آنے سے پہلے پہلے ان کی فروختگی جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں تو اس کی متبادل شکل کیا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: باغات کے پھلوں کو پھل آنے سے قبل فروخت کرنا جائز نہیں ہے، یہ معاملہ شرعی طور پر فاسد ہوتا ہے، اور اس کے جواز کی متبادل شکل یہ ہے کہ صرف پھلوں کا معاملہ نہ کیا جائے؛ بلکہ زمین سمیت پورے باغ کا معاملہ کیا جائے، مثلاً ایک سال دو سال کے لئے زمین سمیت باغ کرائے پر دے دیا جائے اور کرایہ دار کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ باغ کی زمین میں کچھ بو کر فائدہ اٹھائے اور مالک کا اس میں کوئی حق نہ ہوگا۔ (مستفاد: انوار رحمت ۱۷۹-۱۸۰)

عن جابر بن عبدالله –رضي الله عنه– قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن المحاقلة، والمزابنة، والمعاومة. الحديث (صحيح مسلم، البيوع، باب النهي عن المحاقلة والمزابنة، النسخة الهندية ٢/ ١١، بيت الأفكار، رقم: ١٥٣٦)

أما النهي عن المعاومة: وهو بيع السنين، فمعناه أن يبيع ثمرة الشجرة عامين، أو ثلاثة، أو أكثر، فيسمى بيع المعاومة، وبيع السنين، وهو باطل بالإجماع؛ ولأنه بيع غرر؛ لأنه بيع معدوم ومجهول، وغير مقدور على تسليمه. (نووي ٢/ ١٠)

إن استأجر أرضا على أن يكر بها أو يزرعها أو يسقيها وزرعها صح؛ لأنه شرط يقتضيه العقد، وهو ملائم له فلا يفسد العقد. (البحرالرائق، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، كوئٹه ٨/ ٢٤، زكريا ٨/ ٤٣، وهكذا في الدر مع الرد، زكريا ٩/ ٨٢، كراچى ٦/ ٦٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۴۵۹)

زمین مع باغ ٹھیکہ پر دینا

سوال [۸۶۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی ملکیت میں کاشت کا کھیت ہے، جس میں آم کا باغ ہے، باغ میں آم بھی آتے ہیں، زید اس کھیت کو واسطے کاشتکاری معہ آم کے باغ کے کسی کو۲-۳/سال کے لئے ٹھیکے پر دینا چاہتا ہے۔ اور۲-۳/سال کی رقم بھی پہلے ہی لینا چاہتا ہے، برائے کرم بتائیں بیع درست ہونے کی صورت کیا ہوگی؟ جواب مرحمت فرمائیں۔

المستفتی:عبدالحمید راعینی، ساہنپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زمین ٹھیکہ پر لے لینا درست ہے، اس کے بعد جو پھل آئیں گے، وہ بھی درست ہوں گے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ۴/۱۷۴، ڈابھیل ۱۶/ ۵۸۱)

إذا استأجر أرضا على أن يكر بها، ويزرعها، أو يسقيها ويزرعها صح؛ لأنه شرط يقتضيه العقد، وهو ملائم له فلا يفسد العقد. (البحر الرائق، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، زكريا ۸/ ۴۳، كوئٹه ۸/ ۲٤، الدر مع الرد، زكريا ۹/ ۸۲، كراچی ٦/ ٦٠) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/۷/۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۴/ ۶۲۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۷/۱۴۲۰ھ

باغ مع زمین ایک سال یا کئی سال کے لئے فروخت کرنا

سوال [۸۶۲۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک باغ ہے چھ بیگہ کا، وہ باغ جوان ہے، بہار آئی ہے؛ لیکن ہم باغوں کا کام نہیں

کرتے؛اس لئے باغوں میں بیماری بہت زیادہ ہوتی ہے،تھوڑی سے لاپرواہی سے تمام باغ خراب ہوجاتا ہے، ایسی صورت میں ان لوگوں کو جو باغوں کا کام کرتے ہیں، ان کو دو سال کے لئے بہار مع زمین بیچ سکتے ہیں یانہیں؟ زمین کسی قدر کاشت کے قابل ہے؟

المستفتی: مرادالدین چودھریان، سہسپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ صورت میں دو سال کے لئے باغ کی بہار مع زمین کے بیچ سکتے ہیں، جب کہ خریدنے والے کو اس باغ کی زمین میں مکمل طریقہ سے تصرف کرنے کا اختیار دے دیا جائے، نیز لوگوں کے تعامل اور ابتلائے عام کی وجہ سے مع زمین کے ایک سال یا چند سال کے لئے فروخت کرنے کی گنجائش ہوگی۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۴۷)

ومن استأجر أرضا على أن يكر بها، ويزرعها، ويسقيها، فهو جائز.
(هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، أشرفي ۳/ ۳۰٦، البحرالرائق، زكريا ۸/ ٤۳، كوئٹه ۸/ ۲٤، شامي، زكريا ۹/ ۸۲، كراچى ٦/ ٦۰)

وفي القنية: استأجر أرضا سنة على أن يزرع فيها ماشاء، فله أن يزرع فيها زرعين ربيعيا أو خريفيا. (البحرالرائق، كتاب الإجارة، باب مايجوز من الإجارة، ومـا يكون خلافا فيها، كوئٹه ۸/ ۱۰، زكريا ۸/ ۱۸، هندية، زكريا قديم ٤/ ٤۷۱، جديد ٤/ ٥۱۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ربیع الاول ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۲۲۴)

کیروسین کی خرید وفروخت

سوال [۸٦۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا کاروبار مٹی کا تیل (کیروسین) کا ہے، میں ایک ماہ میں ایک لاکھ سے دو لاکھ تک کا

کیروسین فروخت کرتا ہوں، مجھے لیٹر میں تین سے چار روپئے نفع ملتا ہے، یہ کیروسین فروخت کرنا سرکاری قانون کی رو سے سرکاری گناہ بنتا ہے، میں سرکاری افسروں کو ہر ہفتہ میں ڈیڑھ دو لاکھ روپئے کے قریب بطور رشوت دیتا ہوں، اس کاروبار میں جو نفع کماتا ہوں، اس میں سے غرباء اور ضرورت مندوں کو بھی دیتا ہوں اور اپنے خرچ میں بھی لاتا ہوں، میں یہ کیروسین سرکاری راشن کی دوکانوں سے بلیک (کالا بازاری) میں سے لاتا ہوں، کیا میرے لئے ایسا کاروبار کرنا جو قانوناً گناہ ہے، شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: نثار احمد گودھرا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس کام میں جو بھی منافع ملتا ہے وہ منافع بہر حال حلال ہے؛ لیکن سرکاری قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا جائز نہیں، اسی طرح اس کام کو چالو رکھنے کے لئے رشوت دینے کا سلسلہ جاری کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ١٩٥]

عن أبي هريرة – رضي الله عنه – لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي في الحكم. (ترمذي، باب ماجاء في الراشي والمرتشي في الحكم، النسخة الهندية ١/ ٢٤٨، دارالسلام، رقم: ١٣٣٦، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ١٥/ ٢٣٥، رقم: ٨٦٧٣)

المالک هو المتصرف في ملكه كيف شاء. (بيضاوي، مكتبه رشيد/٧)

كل يتصرف في ملكه ماشاء. (شرح المجلة، رستم مكتبه اتحاد ١/ ٦٥٤، رقم: ١١٩٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍صفر ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۷۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۲/۱۲ھ

راشن دوکان سے غلہ خریدنا

سوال [۸۶۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کنٹرول کی دوکانوں پر غلہ چینی وغیرہ کا جو راشن تقسیم ہوتا ہے، دوکاندار ایسا کرتے ہیں کہ یہ کہہ کر کہ راشن ختم ہوگیا ہے، اس کو علیحدہ فروخت کرتے ہیں، بعض کو کنٹرول ریٹ پر اور بعض کو زائد قیمت پر اس کا خریدنا کیسا ہے؟ اس خرید وفروخت میں مسلم وغیر مسلم دونوں برابر ہیں، یا غیر مسلم سے خرید سکتے ہیں؟ اور مسلمان دوکاندار سے اس راشن کا خریدنا جائز نہیں؟

المستفتی: نور العابدین، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کنٹرول سے کوٹہ لینے والا ڈیلر جب اپنے پیسے دے کر خرید لیتا ہے، تو شرعاً ان اشیاء کا خود مالک ہوجاتا ہے؛ اس لئے عوام کو تقسیم کرنے کے بعد اگر کچھ بچ جاتا ہے یا کسی کے نہ لینے کی وجہ سے رہ جاتا ہے، تو ڈیلر کے لئے اس زائد کو قیمت یا کنٹرول ریٹ میں فروخت کرنا اور دوسروں کے لئے اس کا خریدنا بلا کراہت جائز ہے؛ البتہ قانونی جرم ہو تو احتیاط لازم ہے۔ اور اگر حق دار عوام کو نہ دے کر بلیک میں فروخت کرتا ہے، تو دھوکہ بازی اور خیانت اور قانونی جرم کی وجہ سے ڈیلر گنہگار ہوگا اور خریدنے والا تعاون علی المعصیت کی وجہ سے گنہگار ہوگا؛ البتہ عقد بیع بہر حال منعقد ہوجائے گا۔

قوله تعالى: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ۲]

قال الله تعالىٰ: وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ۱۹۵]

فإن سعّر، فباع الخباز بأكثر مما سعر، جاز بيعه. (هندية، كتاب البيوع، الباب العشرون، فصل في الاحتكار، زكريا قديم ۳/ ۲۱۴، جديد ۳/ ۲۰۰) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۴/ ۶/ ۱۴۱۳ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۳۲۲۶)

دوسروں کے کنکشن سے گیس لے کر زیادہ قیمت میں فروخت کرنا

سوال [۸۶۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید رسوئی گیس کا کاروبار کرتا ہے، کاروبار کی شکل یہ ہے کہ اس کا اپنا ذاتی کنکشن صرف ایک ہے؛ لیکن اس نے اس کے علاوہ کچھ کنکشن ایسے جمع کر رکھے ہیں جن کے ذریعہ گیس ایجنسی سے گیس لاتا ہے اور ذخیرہ جمع کر کے ان سلنڈروں کو ایجنسی کی قیمت سے بہت زیادہ بڑھا کر فروخت کرتا ہے۔ اور جب گیس نہیں ملتا ہے تو ضرورت منداس سے اس کی ہی قیمتوں میں خریدتے ہیں، تو کیا زید کے لئے ایسی خرید وفروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: شمس الحق مدرسہ عربیہ لطیفیہ لالباغ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: زید کے لئے دوسروں کے کنکشن جمع کر کے گیس ایجنسی سے گیس لے کر اس کو مہنگے دام میں فروخت کرنا فی نفسہ جائز ہے اور اس کی کمائی حلال ہے؛ لیکن چونکہ اس طرح فروخت کرنا حکومت کے قانون کے خلاف ہے، اس سے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنا لازم آتا ہے، اور شریعت ایسے کام کی اجازت نہیں دیتی ہے، جس سے عزت وآبرو خطرہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔

قال الله تعالىٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ١٩٥]

عن حذيفة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: لا ينبغي للمؤمن أن يذل نفسه، قالوا: وكيف يذل نفسه؟ قال: يتعرض من البلاء لما لايطيق. (سنن الترمذي، أبواب الفتن، النسخة الهندية ٢/ ٥١، دارالسلام، رقم: ٢٣٥٤)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹؍ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۵۵۱/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۴/۹ھ

گیس کی کالا بازاری کی شرعی حیثیت

سوال [۸۶۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گیس کی کالا بازاری زوروں پر ہے، دو ایڈریس پر گیس باٹلے خریدے جاتے ہیں، جب کہ ضرورت صرف ایک گیس باٹلے کی ہوتی ہے اور دوسرا باٹلہ خریدی کی رقم سے زیادہ قیمت پر فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اور حکومت کے نزدیک یہ بلیک مارکیٹ جرم عظیم ہے، اکثر مسلمانوں کے دیندار گھرانے اس میں ملوث ہیں، کہتے ہیں کہ ہمیں کتنی ضرورت ہے، اس کی فکر مت کرو، ہم نئے اور پرانے ایڈریس پر جتنے بھی باٹلے خرید رہے ہیں وہی فروخت بھی کر رہے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ بغیر روپیوں کے حاصل کرتے ہیں؛ لہٰذا یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ دوکاندار خرید وفروخت کے بعد نفع کماتا ہے، حضرت مفتی صاحب سے پوچھنا ہے کہ زائد از ضرورت گیس کے باٹلے خریدنے میں ملک کے غریب لوگوں کی حق تلفی نہیں ہے؟ کیا ایسا کرنا درست ہے؟

المستفتی: محمد رضوان قاسمی، سورت

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: شخص واحد کا دو ایڈریس پر گیس باٹلہ (سلنڈر) سرکار سے حاصل کرنا جب کہ ضرورت صرف ایک سے پوری ہو جاتی ہے اور دوسرے کو نفع کے ساتھ فروخت کر دینا حکومت کے قانون کی خلاف ورزی ہے، جس سے اجتناب ضروری ہے؛ لیکن اس کی بیع صحیح ہو جاتی ہے۔ اور اس سے حاصل ہونے والا نفع حلال ہے۔

قال الله تعالىٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ١٩٥]

إن المسلم يجب عليه أن يطيع أميره في أمور مباحة. (تكملة فتح الملهم، أشرفيه ٣/ ٣٢٤)

طاعة الإمام فيما ليس بمعصية واجبة. (شامي، الصلاة، باب العيدين،

مطلب تجب طاعة الإمام فيما ليس بمعصية، زكريا ۳/ ۵۳، كراچی ۲/ ۱۷۲)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۹۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲؍ ۴؍ ۱۴۳۵ھ

132 نمبر کا پلاٹ بیچ کر 131 نمبر کا پلاٹ دینا

سوال [۸۶۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک پلاٹ جس کا نمبر 132 ہے، بتدریج (۱) اسحاق (۲) مقصود (۳) سلیمان (۴) عاصم اور (۵) وسیم تک خرید وفروخت ہوتا ہوا پہنچا، وسیم نے یہ پلاٹ عاصم سے -/4,50,000 روپئے میں خریدا، جو دلالوں کے ذریعہ پلاٹ کی جگہ پر خریدا -/2,20,000 روپئے نقد ادا کردئے گئے (یہ پلاٹ 132 تقریبا دو لاکھ سے بڑھتا ہوا اب -/4,50,000 روپئے تک پہنچا، اب ۲،۳،۴؍ پارٹیوں نے یہ پلاٹ 132 نمبر کے نام سے ہی فروخت کیا اور قریب -/2,50,000 روپئے نفع چڑھ گیا۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ وہ پلاٹ 132 جو خرید وفروخت ہو چکا تھا، 131 نمبر کا نکلا، اسحاق کہہ رہا ہے کہ 132 تو میرا پلاٹ ہے، اب مقصود بعد کی پارٹیاں سلیمان، عاصم سے یہ کہہ رہا ہے کہ تم کو 131 پلاٹ لینا ہو تو لو ورنہ آپ پرانے ریٹ کے روپئے واپس لے جاؤ، جس سے اس کو تو اور بھی فائدہ ہو جائے گا، مگر سلیمان اور عاصم یہ پلاٹ 132 نمبر دکھا کر فروخت کر کے منافع اچھا حاصل کر کے وسیم کو بیچ چکے ہیں اور وسیم نے 132 خریدا ہے، پر اس کے گلے میں 131 ڈالا جا رہا ہے، جو کم قیمت کا ہے اور وسیم کو لینا بھی نہیں ہے، حال یہ ہے کہ اسحاق اب وہ پلاٹ 132 فروخت بھی کرنا چاہتا ہے، ان تمام صورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے شریعت میں اس مسئلہ کا کیا حکم ہے؟ ان تمام پارٹیوں کے لئے، ان تمام کے بیچ کی خرید وفروخت کیسی

ہے؟ ان تمام سودوں کا کیا حکم ہے؟ وسیم کے علاوہ سب کے سب 132 کے نام سے فروخت کر کے نفع لے گئے، وہ کیسا ہے؟ ۲،۳،۴/ والی پارٹیاں مل کر 132 خرید کر وسیم کو دلا دیں تو کیسا ہے؟ وسیم اگر دلالوں سے تقاضہ کرتا ہے کہ میں نے 132 خریدا ہے، تو آپ مجھے 132 دو اور دلال وسیم کو کہہ سن کر 132 دلا دیتے ہیں، تو وہ کیسا ہے؟

المستفتی: وقار احمد درگاہی، گودھرا، گجرات

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب پلاٹ ۱۳۲ کے بارے میں معاہدہ طے ہوا ہے، تو بیچنے والے پر پلاٹ نمبر ۱۳۲/ ہی دینا لازم ہے۔ اور پلاٹ نمبر ۱۳۲/ کی جگہ پر پلاٹ نمبر ۱۳۱/ کا پیش کرنا معاہدہ شکنی ہے، جو ناجائز ہے؛ اس لئے کہہ سن کر جس پلاٹ کے بارے میں طے ہوا تھا اور بعد کے خریداروں نے اسی کو بیچا ہے، بائع کے اوپر اس بات پر دباؤ ڈالا جائے کہ اسی کی رجسٹری کرادے۔

وأما شرائط الصحة –إلى قوله– ومنها: أن يكون المبيع معلوما والثمن معلوما علما يمنع من المنازعة –إلى قوله– وأما أحكام، فالأصل له الملک في البدلين لكل منهما في بدل ...... والتابع وجوب تسليم المبيع والثمن. (البحر الرائق، كتاب البيوع، زكريا ٥/ ٤٣٦، كوئٹه ٥/ ٢٦٠-٢٦١، هندية، زكريا قديم ٣/ ٣، جديد ٣/ ٦)

وأما الثالث وهو شرائط الصحة –إلى قوله– ومعلومية المبيع ومعلومية الثمن بما يرفع المنازعة. (شامي، زكريا ٧/ ١٥، كراچی ٤/ ٥٠٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٣/ ٤٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۱/ صفر المظفر ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۹۶۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۱/۲/۱۴۳۴ھ

گلوکوز کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں ایک ''شئ گلوکوز'' نام کی جو کہ سیال بھی ہے اور پاؤڈر ٹائپ میں بھی ہے، کئی دوکانوں میں فروخت ہوتی ہے، جس کا استعمال ہمارے یہاں عموماً نقلی دودھ بنانے میں ہوتا ہے اور بمشکل تمام 20% بچوں کے کھائے جانے والے چاکلیٹ یا دوسری چیزوں میں استعمال ہوتا ہے، دودھ والے حضرات یہ دونوں قسم کی گلوکوز یعنی سیال اور پاؤڈر اور ڈالڈا گھی اور کاسٹک سوڈا ہمارے یہاں سے خرید کر نقلی دودھ بناتے ہیں اور ڈیری والوں کو دھوکہ سے بیچتے ہیں، اس میں دورائے نہیں کہ وہ دودھیا حضرات دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں؛ لیکن ہمارا مذکورہ چیزوں کو بیچنا کوئی دھوکہ نہیں، ڈالڈا گھی تو ہر جگہ ملتا ہے، کاسٹک سوڈا بھی ہر دوکان پر ملتا ہے، اسی طرح گلوکوز بیچنے والے بھی کئی دوکاندار ہوتے ہیں۔ مسئلہ دریافت طلب یہ ہے کہ ہمارے لئے تو اس کا بیچنا کوئی گناہ نہیں، مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے دودھیا حضرات نقلی دودھ بنا کر دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں، کیا ہم بھی اس دھوکہ میں شریک ہیں؟

المستفتی: مولوی ظہیر احمد، مدرسہ انوار العلوم جویا، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے لئے مذکورہ چیزوں کا بیچنا شرعاً جائز ہے اور آپ دھوکہ دینے والوں میں شمار نہیں ہوں گے، جیسا کہ ''درمختار'' کی اس عبارت سے مستفاد ہوتا ہے:

وجاز بيع عصير عنب ممن يعلم أنه يتخذه خمرا؛ لأن المعصية لا تقوم بعينه، بل بعد تغيره. (الدرمع الرد، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ۹/ ٥٦٠-٥٦١، كراچى ٦/ ٣٩١، تبيين الحقائق، زكريا ٧/ ٦٤، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، الأشباه والنظائر، قديم، ص: ٥٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۹۰۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۴۱۷/۶/۱۰ھ

چوری کا اڈا بنانے والے کو زمین فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا ایسے شخص کو اپنی زمین یا پلاٹ فروخت کرنا درست ہے جس سے یہ اندیشہ ہو کہ وہ اس جگہ کو چوری کا اڈا بنا کر استعمال کرے گا؟

المستفتی: جمیل احمد، ایم پی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اپنی زمین یا پلاٹ کسی کے بھی ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے؛ البتہ محلّہ والوں کی خیر خواہی اور تقویٰ کی بات یہ ہے کہ چوروں کے ہاتھ بیچنے کے بجائے اچھے آدمیوں کے ہاتھ فروخت کیا جائے۔

عن تميم الداري –رضي الله عنه– أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: الدين النصحية، قلنا: لمن؟ قال: لله، ولكتابه، ولرسوله، ولأئمة المسلمين، وعامتهم. (مسلم شريف، باب بيان أن الدين النصيحة، النسخة الهندية ١/ ٥٤، بيت الأفكار، رقم: ٥٥)

وكذا إسلام البائع ليس بشرط لانعقاد البيع، ولا لنفاذه، ولا لصحته بالإجماع، فيجوز بيع الكافر وشراءه. (بدائع، البيوع، فصل في شرائط ركن البيع، كراچی ٥/ ١٣٥، زكريا ٤/ ٣٢١) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/۷/۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۸۸۸۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۴/۷/۱۴۲۶ھ

ویزا کی خرید وفروخت

سوال [۸۶۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: کوئی شخص حکومت سے اجازت لے کر دوکان کرتا ہے، جس میں اس شخص کو چار ویزے ملتے ہیں، مذکورہ شخص دو ویزہ مبلغ چھ چھ ہزار درہم میں فروخت کر دیتا ہے، خریدار یہاں آکر اپنا کام یا دوسری جگہ نوکری کرتا ہے، تو کیا یہ پیسہ اس کے لئے جائز ہوگا؟ واضح رہے کہ یہاں اس طرح اکثر لوگ ویزا بیچتے ہیں، اگر ان سے پوچھئے تو کہتے ہیں: دوکان کا خرچ کفیل کا خرچ تو نکالنا پڑتا ہے، یہ ویزا تین سال کا ہوتا ہے، تین سال کے بعد اگر وہ شخص تجدید کرے تو کچھ پیسہ لے کر تجدید کر دیتے ہیں، اس مدت میں اس سے کوئی خرچ نہیں لیا جاتا۔

المستفتی: حبیب اللہ تاج شاہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حکومت کی جانب سے دوکان کرنے والوں کو جو ویزا ملتا ہے، وہ ان کا حق ہے، وہ اس کو چاہیں تو بیچ سکتے ہیں۔ اور اس کی آمدنی کا استعمال کرنا بھی جائز ہوگا، بشرطیکہ اس کام کو کرنے میں عزت پر کوئی آنچ نہ آتی ہو؛ کیوں کہ یہ ایک خلاف قانون کام ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۴۳، امداد الفتاوی ۴/۵۸۰)

فإنهم قالوا: يجوز أخذ العوض على وجه الإسقاط للحق، ولا ريب أن الفارغ يستحق المنزول به استحقاقا خاصا. (شامي، كتاب البيوع، مطلب في العرف الخاص والعام، زكريا ۷/ ۳٦، كراچی ٤/ ٥٢٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ ؍ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۶۹۳)

اخبار کی خریداری کی قیمت کو فیس قرار دینے کا حکم

سوال [۸۶۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں اخباروں، ماہنامہ رسالوں میں کچھ دینی سوالات اور معمہ آتے

ہیں اوران کوبغیرادائیگی فیس صرف صحیح جواب اوردرست کرنے پرادارہ انعام دیتاہے، بندہ نے ان کے متعلق ''فتاویٰ محمودیہ، جواہرالفقہ، امدادالفتاویٰ'' وغیرہ کتب میں دیکھا، جس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ معمہ جات جس میں حل کرنے والےکوفیس اداکرنی پڑے، پھر درست حل پرانعام ملے یہ سود وقمارہے؛ لیکن اگرحل کرنے والےکوکچھ فیس ادانہ کرنی پڑےاورصحیح ودرست پرانعام کامستحق ہوجائےتو یکطرفہ صورت قمارکی نہیں ہے؛ لیکن اگران اخباری اور ماہنامہ کےمعموں کےمتعلق غورکیاجائےتویہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ظاہری طورپران معموں کےحل کرنے کی فیس نہیں لی جاتی؛ لیکن ان اخباراور ماہنامہ رسالوں کوبیچ کرحل کرنے والاان کوخریدکردوسرےطریقہ سےفیس اداکرتاہے؛ اس لئے کہ ان معموں کےحل کےشرائط میں سےایک شرط یہ ہوتی ہے کہ اصل کتاب کی ٹوکن ہی پرجوابات اورخالی جگہ پرکی جائے، اس کی زیروکس کرکےاگرحل بھیجاجائےتووہ قابل اعتناء نہ ہوگا، تواس شرط کی وجہ سے ہرمعمہ بھیجنے والےکووہ رسالہ یااخبارخریدناپڑتاہے، اس طرح ان اخباری اور ماہنامہ رسالوں کےمعموں میں بھی دوسرےطریقہ سےفیس لی یاادا کی جاتی ہے، ناچیزکےاس خلجان کودفع فرمائیں۔

المستفتی: محمدقاسم جھلرہ بجنوریوپی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رسالہ یااخبارخریدنےکی جوقیمت ہےاس کوفیس قراردینا احقرکی سمجھ میں نہیں آتا؛ کیوں کہ رسالہ یااخبارکی جوقیمت دی جاتی ہےوہ توخوداس اخباراور رسالہ کی مناسب قیمت ہے؛ البتہ اگرمناسب قیمت سے زیادتی ہوتی ہےتوفیس شمارہوسکتی ہے؛ اس لئے احقرکی سمجھ سےبالاترہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمدقاسمی عفااللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۳/۱۱/۱۴۱۵ھ	احقرمحمدسلمان منصورپوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۲۱۶)	۲۳/۱۱/۱۴۱۵ھ

ہوٹل والوں کازیادہ قیمت میں کھانافروخت کرنےکاحکم

سوال [۸۶۳۴]: کیافرماتےہیں علمائےدین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: بنگال کے بعض مقامات پر بس والے ہوٹلوں پر بس روکتے ہیں اور مسافران ہوٹلوں پر کھانا کھاتے ہیں، مشروبات پیتے ہیں اور عام ریٹ سے ہوٹل والے زیادہ رقم لیتے ہیں، جب کہ ڈرائیور بس کا عملہ یا ان کا مہمان بھی کھانے میں شریک ہوتا ہے اور ان سے رقم نہیں لی جاتی ،تو اس میں دو باتیں دریافت طلب ہیں: (۱) آیا یہ کھانا ڈرائیور اور دیگر عملہ کے لئے حلال ہے یا حرام؟ (۲) کیا ہوٹل والے کے لئے زیادہ رقم لینا جائز ہے؟

المستفتی: عبدالعزیز قاسمی، تھانہ برہان الدین، ضلع بھول بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں یہ کھانا ڈرائیور اور بس کے دیگر عملہ کے لئے حلال ہے؛ کیوں کہ یہ کھانا احسان کے بدلے میں کھلایا جاتا ہے۔

فإذا أحسن الناس، فأحسن معهم. (صحيح البخاري، الأذان، باب إمامة المفتون والمبتدع تعليقاء النسخة الهندية ١/ ٩٦، مصنف عبدالرزاق، المجلس العلمي ١/ ٥٢٠، رقم: ١٩٩١)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– يخبرهم بذلک عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال: إذا كفى أحدكم خادمه طعامه حره ودخانه، فليأخذ بيده، فليقعده معه، فإن أبى فليأخذ لقمة، فليطعمه إياها. (ترمذي، باب ما جاء في الأكل مع المملوك والعيال، النسخة الهندية ٢/ ٦-٧، رقم: ١٨٥٣، مسند أحمد بن حنبل ٢/ ٢٩٩، رقم: ٧٩٦٨، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ١٥/ ٣٢١، رقم: ٨٦٦٤)

(۲) ہوٹل والے اپنی چیز کے مالک ہیں؛ اس لئے ان کو حق بنتا ہے کہ وہ زیادہ رقم پر اپنی اشیاء کو فروخت کریں اور یہ ان کے لئے جائز ہے۔ (مستفاد: فتاویٰ محمودیہ ۱۳/ ۲۴۹)

والمالک هو المتصرف في الأعيان المملوكة كيف شاء من الملک. (بيضاوي، مكتبه رشيد/ ٧)

كل يتصرف في ملكه ماشاء. (شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ديوبند ١/ ٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۹ھ

قانوناً پابندی شدہ جنگلات سے لکڑیاں کاٹ کرلانا

سوال [۸۶۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے علاقہ میں جنگلات کی دو قسمیں ہیں: ایک تو وہ ہیں جن پر سرکاری آدمی متعین ہیں، دوسرے وہ ہیں جن پر سرکاری آدمی متعین نہیں ہیں، لوگ دونوں جنگلات سے لکڑیاں کاٹ کرلا کر فروخت کرتے ہیں، تو ان دونوں جنگلات سے لکڑیاں کاٹ کر خریدنے اور فروخت کرنے میں کیا حکم ہوگا؟

المستفتی: مفتی عتیق الرحمٰن، مدرسہ اسلامیہ، ناگپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جنگل کی چیزیں ملکیت عامہ مباحہ ہوتی ہیں، ان سے لکڑیاں کاٹ کرفروخت کرنا اور خریدنا سب درست ہے۔

والحطب في ملک رجل ليس لأحد أن يحتطبه بغير إذنه، وإن كان غير ملک فلا بأس به، ولا يضر نسبته إلى قرية أو جماعة ما لم يعلم أن ذلک ملک لهم. (شامي، كتاب إحياء الموات، فصل الشرب، زكريا ۱۰/ ۱٦، كراچی ٦/ ٤٤٠)

البتہ جن جنگلات پر قانوناً پابندی لگی ہوئی ہو اور سرکاری لوگ متعین ہوں، تو چونکہ کسی حکومت کے تحت رہنے میں اس کے قانون کی پابندی بھی لازم ہوتی ہے اور اس کے خلاف کرنے میں قانونی چوری ہوتی ہے، جس سے عزت ومال دونوں کا خطرہ ہوتا ہے؛ اس لئے قانوناً پابندی شدہ جنگلات سے لکڑیاں کاٹ کرلانا کراہت سے خالی نہیں ہوگا۔ (مستفاد: فتاوی احیاء العلوم، ص: ۲۵۰، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۳/ ۳۵۴، جدید ڈابھیل ۱٦/ ۱۴۸)

قال الله تعالىٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ۱۹۵]

عن حذيفة -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله صلى الله عليه

وسلم: لا ينبغي للمومن أن يذل نفسه، قالوا: وكيف يذل نفسه؟ قال: يتعرض من البلاء لما لايطيق. (سنن الترمذي، أبواب الفتن، النسخة الهندية ۲/ ۵۰، ۵۱، دارالسلام، رقم: ۲۲۵۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۰۶۴)

سرکاری جنگلات کی لکڑیوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے اطراف واکناف میں لکڑی ساگون کے جنگلات ہیں اور وہ دو طرح کے ہیں، ایک تو وہ ہیں جن پر سرکاری آدمی متعین ہیں یا سرکار نے تاروں وغیرہ کے ذریعہ احاطہ کر رکھا ہے۔ اور دوسرے وہ ہیں جن پر نہ سرکاری آدمی متعین ہے اور نہ ہی کسی قسم کا احاطہ، تو اگر کوئی آدمی خفیہ طور پر اس کی لکڑیاں کاٹ کر لائے اور فروخت کرے، تو اس کا فروخت کرنا اور لینا شرعاً کیسا ہے؟ یاد رہے کہ دوسری قسم کا جنگل اگرچہ اس کا سرکار نے احاطہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی آدمی متعین ہے؛ لیکن جنگل سے ملحق شہر کی پولیس کو اس کی اطلاع ہو جائے تو پولیس اس پر سرزنش کرتی ہے۔

المستفتی: مفتی عتیق الرحمٰن صاحب

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگرچہ ایسے جنگلات سے لکڑیاں لا کر فروخت کر کے جو پیسہ حاصل ہوگا وہ حلال ہے، مگر اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنا بھی شرعاً ممنوع ہے؛ اس لئے: ﴿وَلَا تُلْقُوا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ [البقرة: ۱۹۵] کے تحت داخل ہو کر ممنوع وناجائز ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ ۱۱/ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۲۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۱۱/ ۱۴۱۵ھ

دریائی جانوروں کی بیع اوران کے کھانے کا حکم

سوال [۸۶۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بعض علاقوں میں گھونگھا، سیپی، کیکڑا، کچھوے اور کچھوا کے انڈے کی تجارت ہوتی ہے، تو ان دریائی جانوروں کی بیع کرنا اور کھانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: مولانا شہیر الدین مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دریائی جانوروں میں سے سوائے مچھلی کے کسی جاندار کا کھانا درست نہیں۔ اور سوال میں ذکر کردہ جانور مچھلی میں داخل نہیں ہیں۔

ولا یوکل من حیوان الماء إلا السمک. الخ (هداية، كتاب الذبائح، فصل فيما يحل أكله وما لا يحل، أشرفى ٤/ ٤٤٢، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١١/ ٢٤٨، مختصر القدوري، ص: ٢٢٦)

البتہ ان جانوروں سے انتفاع کیا جاتا ہے، مثلاً کیکڑے کو جلا کر شہد میں ملا کر پرانی کھانسی کے لئے استعمال کرنا بہت مفید ہے۔ اور سیپی سے چونا بنایا جاتا ہے؛ لہٰذا ان کی بیع درست ہے، اور اس کا پیسہ بھی حلال ہے۔

والصحیح أنه یجوز بیع کل شيء ینتفع به. (هندية، كتاب البيوع، الباب التاسع، الفصل الرابع زكريا قديم ٣/ ١١٤، جديد ٣/ ١١٥)

أن جواز البیع یدور مع حل الانتفاع. (الفتاوى التاتارخانية ٨/ ٣٤٠، رقم: ١٢١٢٥، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٩/ ٣٣٢، رقم: ١١٩٩٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۰۷۵)

مردار کی ہڈی، دانت، سینگ، پٹھے کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ مردار کی ہڈی اور مردار کا بال اور مردا کی سینگ اور پٹھے وغیرہ پاک ہیں یا ناپاک؟ ان اشیاء کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح ان کی تجارت بھی جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: نیاز احمد فاروقی، حلال ٹرسٹ جمعیۃ العمار ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مردار کے وہ تمام اجزاء پاک اور قابل انتفاع ہیں، جن میں خون نہ ہو؛ لہٰذا مردار جانور کی سینگ، ہڈی، دانت، کھر، بال، پٹھے وغیرہ یہ سب کے سب قابل انتفاع ہیں، ان سب چیزوں کی تجارت اور ان کا پیسہ جائز اور حلال ہے۔ اور ان کو جانوروں کے غذا کی شکل دے کر جانوروں کو کھلانا بھی بلاشبہ جائز ہے۔

لا بيع جلود الميتة قبل الدباغ، ويجوز بعده وينتفع به، ويباع عظمها وينتفع به، وكذا عصبها، وقرنها، وصوفها، وشعرها، ووبرها، وكذا عظم الفيل خلافا لمحمد، وتحته في مجمع الأنهر: المختار قولهما. (ملتقی الأبحر مع مجمع الأنهر، کتاب البيوع، باب البيع الفاسد، جديد ۳/ ۸۵)

اور بدائع کی عبارت اور زیادہ واضح ہے، ملاحظہ فرمائیے:

أما الأجزاء التي لا دم فيها، فإن كانت صلبة كالقرن، والعظم، والسن، والحافر، والخف، والظلف، والشعر، والصوف، والعصب، والأنفحة الصلبة، فليست بنجسة عند أصحابنا. (بدائع الصنائع، كتاب الطهارة، فصل في حكم الميتة، زكريا ۱/ ۱۹۹، كراچی ۱/ ۶۳، الموسوعة الفقهية الكويتية ۴۰/ ۷۴)

اور ''تاتارخانیۃ'' کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

أما شعر الميتة، وعظمها، وصوفها، وقرنها فلا بأس بالانتفاع بها،

وبيع ذلك كله جائز، وقوله: أما العصب ففيه روايتان في رواية جاز الانتفاع به وبيعه. (تاتارخانية، كتاب البيوع، الفصل السابع في بيع المحرمات، زكريا ۸/ ۳٤۲، رقم: ۱۲۱۳۳، محيط البرهاني، كتاب البيوع، الفصل السادس في ما يجوز بيعه وما لايجوز، جديد بيروت ۹/ ۳۳٤، رقم: ۱۱۹۹۸، كوئٹه ۷/ ۳۰۷، هندية، كتاب البيوع، الباب التاسع فيما يجوز بيعه وما لايجوز، الفصل الخامس، مطلب في بيع المحرمات، زكريا وكوئٹه ۳/ ۱۱۵، جديد زكريا ۳/ ۱۱٦)

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ: قال: قل لا أجد فيما أوحي إلي محرما على طاعم يطعمه ألا كل شيء من الميتة حلال إلا ما أكل منها، فأما الجلد، والقرن، والشعر، والصوف، والسن، والعظم، فكل هذا حلال؛ لأنه لا يذكي. (سنن داراقطني ۱/ ٤۳، رقم: ۱۱۷)

اورشامی کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

شعر الميتة، وعظمها، وعصبها على المشهور وحافرها، وقرنها الخالية عن الدسومة، وفي الشامية: قيد للجميع كما فى القهستاني. (شامي، كتاب الطهارة، باب المياه، مطلب في أحكام الدباغة، زكريا ۱/ ۳۵۹، كراچی ۱/ ۲۰٦)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/۱۱/۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/۱۱۸۱۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۱۱/۱۴۳۵ھ

مردار جانور کے کچے چمڑے اور ہڈی کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸٦۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مردار جانور کا چمڑا کچا ہو تو اس کی ہڈی کا خریدنا بیچنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: رحمت اللہ قاسمی سنبھل، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مردار کی کھال تازہ اور کچی حالت میں فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ اور سوکھ جانے کے بعد وہ پاک ہو جاتی ہے؛ اس لئے خشک ہونے کے بعد اس کا فروخت کرنا جائز اور درست ہے۔ اور مردار کی ہڈی جس پر چکناہٹ اور تری ہو تو اس کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔ اور اگر ہڈی پر تری اور چکناہٹ نہیں ہے، تو اس کی خرید وفروخت جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی دار العلوم ۱۴/ ۳۷۰)

عن ابن عباس -رضي الله عنه- فی قوله عز وجل: ﴿قُلْ لَا اَجِدُ فِيْ مَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ﴾ قال: الطاعم: الأكل فأما السن، والقرن، والعظم، والصوف، والشعر، والوبر، والعصب، فلا بأس به؛ لأنه يغسل، وقال شبابة إنما حرم من الميتة مايوكل منها، وهو اللحم، فإما الجلد والسن، والعظم، والشعر، والصوف فهو حلال. (سنن داراقطني، دارالكتب العليمة بيروت ۱/ ۴۲، رقم: ۱۱۲)

لا يتنجس من الميتة عشرة أشياء: الشعر، والصوف، والوبر، والريش، والحافر، والقرن، والظفر، والظلف، والعظم، والعصب إذا لم يكن عليه دسومة، ولا لحم ولا دود. وفي الذخيرة: وأما العصب ففيه روايتان: في رواية: جاز الانتفاع به، وبيعه؛ لأنه طاهر. وفي الظهيرية: قال أبوحنيفة رحمه الله: لا بأس بالانتفاع بحافر الميتة، وظلفها، وعظمها. وفي الملتقط: عظام الفيل بعد ما جف طاهرة يجوز بيعها. (تاتارخانية ۱/ ۴۴۶، رقم: ۱۱۵۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍ شعبان ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۹۹۵)

حلال جانوروں کے کون کون سے اعضاء کی تجارت جائز ہے؟

سوال [۸۶۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بھینس، بیل، بکری کے جسم کی کون کون سی چیز کی تجارت کر سکتے ہیں؟ جیسے کہ ان تینوں جانوروں کے پیٹ میں پتا ہوتا ہے،اس کے پانی کی تجارت دیگر ملکوں میں ہوتی ہے، پتے کا پانی اس کو ابال کر خشک کیا جاتا ہے،اس میں کیا گنجائش ہے؟ واضح فرمائیے۔

المستفتی: محمد ظریف قریشی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر حلال جانور کو جائز طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو تو اس کے سارے اعضاء پاک ہیں اور اس کی تجارت جائز ہے؛ البتہ اس کا دم سائل حرام ہے اور اس کی تجارت بھی جائز نہیں ہے۔ اور اس کے پتے، مثانہ، بچہ دانی، ذکر اور غدود اور خصیتین وغیرہ کھانا مکروہ ہے؛ لیکن تجارت ان کی بھی جائز ہے؛ اس لئے کہ ان چیزوں کو بطور دوا اور علاج کے استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔

والحاصل أن جواز البیع یدور مع حل الانتفاع. (شامي، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، مطلب في بیع دودة القرمز، زکریا ۷/ ۲۶۰، کراچی ۵/ ۶۹، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۹/ ۱۵۵، ۱۷/ ۲۸۱، مجمع الأنهر، مصري قدیم ۲/ ۱۰۸، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۱۵۱) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶؍ شعبان ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۷۸۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷؍۸؍۱۴۳۳ھ

مرغ وغیرہ جانوروں کو زندہ فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: آج کل جورواج چل پڑا ہے کہ مرغ کو زندہ ہی حالت میں بیچتے خریدتے ہیں، اس طرح کی خریداری ازروئے شرع مباح ہے یا حرام؟ اگر ناجائز وحرام ہے،تو کیوں؟ کیا اس سلسلے میں قرآن وسنت یا کتب فقہ میں کوئی صراحت موجود ہے؟ کیا اس طرح بیچنا خریدنا اور کھانا سب حرام ہے؟ کیا اس سلسلے میں کوئی واضح شرعی ضابطہ موجود ہے کہ کون سی چیز کس طرح اور کس پیمانے سے بیچی جائے؟ برائے کرم صاف مفصل واضح مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: اظہار الحق،مبارک پور، اعظم گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مرغ کو زندہ حالت میں روپیہ پیسے کے عوض میں فروخت کرنا بلا کراہت جائز اور درست ہے، چاہے گن کر فروخت کیا جائے یا تول کر ہر طرح جائز ہے،اس میں ناجائز ہونے کی کوئی علت نہیں، اسی طرح گائے، بھینس، بکری، مچھلی وغیرہ تمام حلال جانوروں کو زندہ حالت میں پیسوں کے عوض میں تول کر اور شمار کرکے ہر طرح سے فروخت کرنا جائز اور درست ہے۔

وقال محمد: إن كان بغير جنسه كلحم البقر، بالشاة الحية جاز كيفما كان. الخ (شامي، كتاب البيوع، باب الربا، زكريا ٧/ ٤١٥، كراچی ٥/ ١٨٠، حاشية چلپی مكتبه إمداديه ملتان ٤/ ٩١، زكريا ٤/ ٤٦٠)

قال أبو حنيفة وأبو يوسف يجوز بيع اللحم بالحيوان؛ لأن الحيوان وهو بيع موزون بغير موزون. الخ (أوجز المسالك، قديم ٥/ ١٠٥، جديد دارالقلم)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ رصفر ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۶۹۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۲/ ۱۴۱۷ھ

زندہ جانور تول کر بیچنا

سوال [۸۶۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: جانورکوزندہ تول کرخرید سکتے ہیں یانہیں؟

المستفتی: محمد اقبال شمسی طویلہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زندہ جانورکوروپئے پیسے کےعوض تول کر بیچنا جائزاور درست ہے؛ کیوں کہ اس زمانے میں وزن اورتول سے زندہ جانوروں کی خرید فروخت ہونے لگی ہے، اس بنا پر معمولی جہالت نزاع کا سبب نہیں ہوتی؛ لہٰذا بیع درست ہے۔

(مستفاد: احسن الفتاوی دہلی ۶/ ۴۹۷، ایضاح المسائل/ ۱۵۸)

كما استفاد من هذه العبارة، كما لو باعه بالأثمان وإن باعه بحيوان بغير مأكول اللحم جاز في ظاهر قول أصحابنا، وهو قول عامة الفقهاء، وفي المحلى: قال أبوحنيفة وأبويوسف: يجوز بيع اللحم بالحيوان؛ لأن الحيوان ليس من مال الربو، وهو بيع موزون بغير موزون. (أوجز المسالك ٥/ ١٠٥، فتح القدير، دارالفكر، مصرى قديم ٧/ ٢٧، كوئٹه ٦/ ١٦٧، زكريا ٧/ ٢٥، شامي، زكريا ٧/ ٤١٥، كراچى ٥/ ١٨٠، حاشية چلپى، إمداديه ملتان ٤/ ٩١، زكريا ٤/ ٤٦٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱۸۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۰/۶/۵ھ

مذبوحہ جانوروں کے اعضائے تناسل اورخون کی بیع کا حکم

سوال [۸۶۴۳]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مذبوحہ جانوروں کے اعضاء تناسل اوران کےخون کی بیع جائز ہے یانہیں؟ اگر جائز ہے،تب توصحیح، ورنہ بجائے ضائع کرنے کے دینی خدمات یاعوام کے مصارف ضروریہ میں کیاخرچ کرنادرست ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حلال جانوروں کے اجزاء میں سے جن اجزاء کا کھانا ممنوع ہے، وہ دو قسموں پر ہیں: (۱) وہ اجزاء جن کا استعمال حرام ہے، جیسا کہ دم مسفوح اس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، نہ اس کا کھانا جائز ہے اور نہ ہی اس کی خرید وفروخت جائز ہے، اس کو بیچ کر جو پیسہ آتا ہے وہ بھی حرام ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ. [المائدة: ۳]

(۲) دوسری قسم وہ اجزاء جن کے استعمال کی ممانعت دلیل ظنی سے ثابت ہے، یعنی خبر واحد سے جیسے ذکر، خصیتین، قبل، غدود، مثانہ اور پتہ۔

وأما بيان ما يحرم أكله من أجزاء الحيوان المأكول، فالذي يحرم أكله منه سبعة الدم المسفوح، والذكر، والأنثيان، والقبل، والغدة، والمثانة، والمرارة، والمروي عن أبي حنيفة أنه قال: الدم حرام، وأكره الستة أطلق اسم الحرام على الدم المسفوح، وسمى ماسواه مكروها. (بدائع الصنائع، كتاب الذبائح، والصيود ما يستحب في الزكوة، زكريا ٤/ ١٩٠، كراچی ٥/ ٦١)

ان چیزوں کا کھانا تو مکروہ ہے؛ لیکن ان چیزوں کی خرید وفروخت اس لئے جائز ہے کہ یہ چیزیں کھانے کے علاوہ بطور علاج استعمال ہوسکتی ہیں؛ اس لئے ان کی بیع بھی جائز اور پیسہ بھی حلال ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۵۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۷/۵/۱۴۲۱ھ

سمندری کیکڑے کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: حنفیوں کے لئے سمندر کا کیکڑا فروخت کرنا کیسا ہے، جائز ہے یا نہیں؟ جو لوگ اس کو فروخت کرتے ہیں، وہ اس پیسہ کے مالک ہوتے ہیں یا نہیں؟ نیز ان کے گھر کا کھانا کھانا اور ان سے تعلق رکھنا درست ہے یا نہیں؟ مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: رضاء الکریم قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: حنفیہ کے نزدیک کیکڑے کو کھانے کے لئے بیچنا اور خریدنا جائز نہیں ہے؛ لیکن اگر اس کا استعمال دوائیوں میں ہوتا ہے جیسا کہ معتبر اطباء سے معلوم ہوا ہے کہ کیکڑے کی کھال کا استعمال پھیپھڑے کی دوائیوں میں ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں اس کو بیچنا اور خریدنا جائز ہے۔ اور مالک بیچنے کی وجہ سے اس پیسہ کا مالک ہوجائے گا، اور اس کی دعوت وغیرہ قبول کرنا بھی جائز ہے۔

الحاصل أن جواز البيع يدور مع حل الانتفاع. وفي الشامية: يجوز بيع الحيات إذا كان ينتفع بها للأدوية وما جاز الانتفاع بجلده أو عظمه، أي من حيوانات البحر أو غيرها. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في بيع دودة القرمز، زكريا ۷/ ۲٦۰، كراچی ٥/ ٦٩، الموسوعة الفقهية الكويتية ۹/ ۱٥٥، ۱۷/ ۲۸۱، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱٥۱، مصري قديم ۲/ ۱۰۸)

ولو دعي إلى دعوة، فالواجب أن يجيبه إلى ذلك، وإنما يجب عليه أن يجيبه إذا لم يكن هناك معصية ولا بدعة. (عالمگيري، كتاب الكراهية، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات، زكريا قديم ٥/ ۳٤۳، جديد ٥/ ۳۹۷)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۷۰۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/۶/۱۴۲۳ھ

کتے کی بیع کی شرعی حیثیت

سوال [۸۶۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک حنفی عالم جو اپنے آپ کو دارالعلوم دیوبند کی طرف منسوب کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ حنفی مسلک قرآن وحدیث سے بہت دور ہے، یہی وجہ ہے کہ پورے خلیج میں ڈھونڈنے سے ایک حنفی بھی نہیں ملے گا۔ ''ہدایہ'' میں لکھا ہے کہ کتا فروخت کرنا جائز ہے، ایسے بہت سے واقعات ہیں۔

المستفتی: شفیع احمد الاعظمی، بحرین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: جس حنفی عالم کا سوال نامہ میں ذکر کیا گیا ہے اور جو اپنے آپ کو دارالعلوم دیوبند کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اوپر سے اس جہالت کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ حنفی مسلک قرآن وحدیث سے بہت دور ہے، اور اس پر یہ تنزیہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ''ہدایہ'' میں لکھا ہے کہ کتا فروخت کرنا جائز ہے، تو اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ صرف کرتا پائجامہ والے عالم ہیں؛ اس لئے یہ شخص نہ حنفی مسلک سے واقفیت رکھتا ہے اور نہ ہی حدیث رسول سے واسطہ ہے؟ کیا صحیح حدیث شریف میں اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ کلب معلم کو فروخت کرنا جائز اور درست ہے۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمائیں۔

حدثنا أبوبكر النيسابوري، نا إسحاق بن الجراح، نا الهيثم بن جميل، ح وحدثنا عثمان بن أحمد الدقاق، نا محمد بن أحمد بن الوليد بن برد، نا الهيثم بن جميل، نا حماد بن سلمة، عن أبي الزبير، عن جابر قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن ثمن الكلب والسنور، إلا كلب صيد. (سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۶۱، رقم: ۳۰۴۹)

حدثنا محمد بن القاسم بن زكريا، نا أبو كريب، محمد بن العلاء، نا سويد بن عمرو، عن حماد بن سلمة، عن أبي الزبير، عن جابر قال: نهى

رسول الله صلى الله عليه وسلم عن ثمن السنور والكلب، إلا كلب صيد.

(سنن الدارقطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٦١، رقم: ٣٠٥٠)

عن جابر بن عبدالله أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن ثمن الكلب والسنور، إلا كلب صيد. (نسائي شريف، البيوع، باب بيع الكلب، النسخة الهندية ٢/ ٢٣٠، دارالسلام، رقم: ٤٦٦٨)

قال الحافظ في الباري: أخرجه النسائي بإسناد رجاله ثقات. (فتح الباري، البيوع، باب ثمن الكلب، أشرفيه ٤/ ٥٣٦، دارالفكر ٤/ ٤٢٧)

نیز بعض متعدد روایات میں کھیتی کے کتے کی فروختگی کا جواز بھی ثابت ہے؛ لیکن ان روایات کی صحت میں محدثین نے کلام کیا ہے، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے کتے کا پیسہ حلال قرار دیا ہے اور اس پر کسی جاہل کو اشکال ہے تو اس کا اشکال اسی کو مبارک ہو، نیز یاد رکھئے کہ حنفی مسلک کے مسائل کے لئے احادیث شریفہ ڈھونڈی جائیں تو انشاء اللہ ہر ایک مسئلہ کے موافق حدیث رسول مل جائے گی، چاہے دلالۃ ہو یا اشارۃ یا اقتضاء ہو۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍صفر ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۲۰/۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۲/۲۴ھ

انسانی وحیوانی فضلات کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: موجودہ زمانہ میں انسانی اور حیوانی فضلہ کا استعمال بطور کھاد ہوتا ہے۔ اور اس سے گیس بھی پیدا کی جاتی ہے؛ لہٰذا ایسی صورت میں انسانی وحیوانی فضلات کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟ دونوں کا حکم الگ الگ ہے یا ایک ہے؟ جواب تحریر فرمادیں۔

المستفتی: کلیم احمد حسن پور، امروہہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خالص انسانی فضلات کی خرید وفروخت کرنا مکروہ ہے، اوراگروہ راکھ یا مٹی وغیرہ کے ساتھ مخلوط ہو اور وہ غالب ہو تو بلاکراہت جائز ہے۔ اور حیوانی فضلات کی خرید وفروخت بہرحال بلاکراہت جائز ہے۔

كره بيع العذرة رجيع الآدمي خالصة لا يكره بل يصح بيع السرقين، أي الزبل، ثم قال: وصح بيعها مخلوطة بتراب أو رماد غلب عليها في الصحيح. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، فصل في البيع، زكريا ٩/ ٥٥٢، كراچى ٦/ ٣٨٥، البناية، أشرفيه ١٢/ ٢٠١، الموسوعة الفقهية الكويتية ٤٠/ ١٠٢، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٨/ ١٠٢، رقم: ٩٦٨٧، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ١٨/ ٢٣٥، رقم: ٢٨٦١٥، هندية، زكريا قديم ٣/ ١١٦، جديد ٣/ ١١٧، أحسن الفتاوى ٦/ ٣٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۰۴۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/ ۵/ ۱۴۲۴ھ

بریلوی مسلک کے لوگوں کو زمین فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم نے گاؤں میں ایک دو بیگہ آراضی خریدی، اس زمین کو بریلوی مسلک کے لوگ ہم سے خرید کر ایک مدرسہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں، جب کہ اس جگہ کے برابر میں ایک دیوبندی مسلک کا مدرسہ بھی ہے، تو ایسی صورت میں ہم اپنی زمین کو ان حضرات کے ہاتھوں فروخت کرسکتے ہیں؟ جو بھی حکم شرعی ہو واضح فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: فہیم انور قریشی، محلّہ اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خرید وفروخت ایک اختیاری عمل ہے جو چاہے، بیچ سکتا ہے اور جو چاہے خرید سکتا ہے؛ لیکن جب آپ کو پہلے سے یہ بات نظر آرہی ہے کہ بریلوی مسلک کے لوگ یہاں ادارہ قائم کریں گے جس کی وجہ سے خوش عقیدہ دیوبندی مسلک کے ادارہ کے ساتھ ٹکراؤ اور مسلسل فتنہ کا ایک دروازہ کھل جائے گا جو دونوں طرف کے لوگوں کے لئے بے چینی اور بے قراری کا سبب ہوگا؛ اس لئے وہ زمین کسی دیوبندی مسلک کے آدمی کے ہاتھ فروخت کرنا زیادہ بہتر ہے۔

وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ. [البقرة: ۲۱۷]

قال رسول الله ﷺ: إن الشيطان قد أيس أن يعبده المصلون في جزيرة العرب، ولكن في التحريش بينهم. (مسلم، كتاب صفة المنافقين، باب تحريش الشيطان ۲/ ۳۷۶، بيت الأفكار، رقم: ۲۸۱۲)

لكل واحد منهم أن يتصرف في حصته كيف ماشاء. (شرح المجلة رستم باز، اتحاد ديوبند ۱/ ۶۴۳، رقم: ۱۱۶۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۳/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۳۰۰۴)	۱۴۳۶/۶/۲۳ھ

۲ / باب الخیار

بیع کے تام ہونے کے بعد کسی ایک فریق کے بیع کو ختم کرنے کا حکم

سوال [۸۶۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مرحوم عبدالمنان خان کھرگون ایم پی نے اپنی زندگی میں شیخ حمید اسلام پور مہاراشٹر کو اپنی کھیتی کی زمین (قابل زراعت وپیداوار) ۸/ ایکٹر ۴/ ڈسمل جو ۱۹۹۸ء میں مبلغ تین لاکھ ۳۲/ ہزار روپے میں فروخت کی۔ مذکورہ رقم کی ادائے گی کی شکل فریقین میں اتفاق رائے سے اس طرح طے کی گئی پچاس ہزار روپے ۱۵/ جون ۱۹۹۸ء کو، پھر ایک لاکھ روپے یکم اگست ۱۹۹۸ء کو اور ایک لاکھ ۲۵/ ہزار روپے یکم جنوری ۱۹۹۹ء کو یہ کل -/2,75,000 ہوئے باقی بچے -/57,000 روپے، یہ رجسٹری ہوجانے کے بعد ادا کئے جائیں گے۔

غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ -/2,75,000 روپے یکم جنوری ۱۹۹۹ء تک ادا کرنے چاہئے تھے، مگر فروری ۲۰۰۰ء تک شیخ حمید نے صرف -/2,15,000 روپے ہی ادا کئے ہیں اور باقی -/60,000 ساٹھ ہزار ابھی تک ادا نہیں کئے ہیں، تو ایسی صورت میں جب کہ ساٹھ ہزار کو ۱۲/ ۱۳/ سال کا طویل عرصہ گذر گیا ہے، تو کیا عبدالمنان مرحوم کے لڑکے شیخ حمید سے ساٹھ ہزار کا معاوضہ لے سکتے ہیں؛ کیوں کہ شیخ حمید نے وعدے کے مطابق ۱۹۹۹ء تک -/2,75,000 روپے ادا نہیں کئے ہیں، زمین کی پوری قیمت ادا کئے بغیر ۱۲-۱۳/ سال سے اس زمین کی پیداوار حاصل کر رہا ہے؛ لہٰذا عبدالمنان کے لڑکوں کو یا تو اس کا معاوضہ ملنا چاہئے یا پھر سودا کینسل کرنے کا اختیار رہنا چاہئے، شرعاً کیا حکم ہے؟

المستفتی: قیصر محمود خان کھرگون

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عبدالمنان کا شیخ حمید کو اپنی زمین بغیر کسی شرط کے ثمن

مؤجل کے ساتھ بیچ دینا اور شیخ حمید کا بائع کی اجازت سے اس پر قبضہ کر لینے سے وہ زمین اس کی ملکیت میں داخل ہوگئی، اب شیخ عبد المنان کے لڑکوں کو مبیع کے کچھ ثمن کی ادائے گی نہ ہونے پر اس بیع کو تنہا اپنی طرف سے فسخ کرنے کا اختیار نہ ہوگا؛ بلکہ وہ صرف مابقیہ قیمت کے حقدار ہوں گے جس کی ادائے گی کے لئے شیخ حمید پر دباؤ ڈالا جائے گا۔ اور اگر دباؤ کے باوجود ساٹھ ہزار روپئے ادا نہیں کرتا ہے تو پھر عبد المنان کے لڑکوں کو عقد کے فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہوجائے گا۔

إذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع. (تاتارخانية ۸/ ۲۲۲، رقم: ۱۱۷۱٤، هداية، كتاب البيوع، أشرفي ديوبند ۳/ ۲۰، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ۱/ ۲۲٦، دارالكتاب ديوبند ۱/ ۲۲۰، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱۰)

وللبائع حق حبس المبيع لاستيفاء الثمن إن كان الثمن حالا، وإن كان الثمن مؤجلا لم يكن له حق الحبس، وإذا استوفى الثمن وسلم المبيع أو سلم بغير قبض الثمن وبعضه مؤجل، أو قبض المشتري بإجازة البائع لفظا أو قبضه وهو يراه، ولا ينهاه ليس له أن يسترده ليحبسه بالثمن.
(تاتارخانية ۸/ ۲٤۲، رقم: ۱۱۷۷۸، الفقه الإسلامی وأدلته، هدی انٹرنیشنل دیوبند ٤/ ۱۷۸)

لأن أحد المتعاقدين لا ينفرد بالفسخ كمالا ينفرد بالعقد. (هداية، كتاب القضاء، باب التحكيم، مسائل شتى، اشرفيه ديوبند ۳/ ۱٤۷)

لأنه لما تعذر استيفاء الثمن من المشتري، فات رضا البائع، فيستبد بفسخه. الخ (هداية، أشرفی ديوبند ۳/ ۱٤۷، البحرالرائق، كوئٹه ۷/ ۳٦، زكريا ۷/ ٦۱) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ رجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۱۹۸/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/۷/۱۴۳۴ھ

عقد صحیح کے بعد واپسی پر مجبور کرنا

سوال [۸۶۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید اپنی زمین فروخت کررہا تھا، عمرو دو آدمیوں کو لے کر زید کے پاس آیا اور زید سے زمین کا سودا کرنا شروع کیا، زید نے اس کی قیمت پانچ ہزار روپیہ فی بیگہ خام کم از کم بتائی، عمرو کے ساتھ اس کا لڑکا بھی تھا جو عاقل وبالغ ہے، عمرو نے اس کی قیمت ساڑھے تین ہزار روپیہ فی بیگہ خام لگائی، کچھ دن خاموشی رہی، اس کے بعد سے عمرو کے لڑکے نے پونے چار ہزار روپیہ فی بیگہ خام لگائی، اس کے بعد زید نے ہنس کر کہا کہ بیٹا تمہارے بس کی نہیں، پھر تقریباً پندرہ منٹ خاموشی رہی، عمرو کے ساتھ جو دو آدمی آئے تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ دونوں فریق کیوں خاموش ہوگئے؟ اس کے بعد زید نے ان دونوں آدمیوں کو اختیارات دے دئے، جن کو عمرو لے کر آیا تھا کہ تم کو کل اختیار رہے، چاہے جتنے میں طے کردو، پھر خاموشی رہی، کچھ دیر بعد عمرو نے بھی ان دونوں ہی آدمیوں کو اختیار دے دیا، اس کے بعد پیسے کا لین دین شروع ہوگیا اور اگلے ہی روز سے زید نے زمین عمرو کے قبضہ میں دے دی، کچھ دنوں بعد جب عمرو پاکستان جانے لگا تو زید سے یہ کہہ کر گیا کہ میرے لڑکے سے پیسے لینے کی کوشش کرنا، یہ پیسہ دینا نہیں چاہتا ہے، زید نے جب لڑکے سے پیسوں کو کہا تو آج کل کرتا رہا اور اس طرح دو مہینے عمرو کا لڑکا زید کو دھوکہ دیتا رہا، عمرو کے پاکستان سے آنے پر زید نے یہ واقعہ من وعن عمرو سے دوہرایا، جس پر عمرو نے خاموشی اختیار کی اور کوئی جواب نہیں دیا، اس کے بعد عمرو نے لوگوں سے یہ کہنا شروع کیا کہ زید مجھ کو زمین دینا نہیں چاہتا اور اس بات کو خوب شہرت دی، اس کے بعد لوگوں نے زید سے معلوم کیا، زید نے لوگوں سے کہا کہ یہ غلط ہے، جو لوگ ثالث ہیں وہ مجھے جو حکم دیں گے میں اس کا پابند رہوں گا، عمرو نے ان ثالثوں سے ایک مرتبہ بھی یہ نہیں کہا کہ فیصلہ دو اور زمین لکھوا دو، بلکہ زید کی تحقیر وتذلیل میں مستقل لگ گیا، کچھ دنوں کے بعد ان ثالثوں میں سے ایک آدمی کو

لے کرعمروزید کے پاس آیااور کہا کہ مجھے کسی قیمت پرزمین نہیں لینی ہے، میرا جورو پیہ ہے وہ واپس کردو، ان حالات میں اس زمین کی پیداوار عمرو نے کھائی، اس کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ اوراس پیدوار کا شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: عبداللطیف قاسمی، قبصہ اکبرآباد، ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفیق: مذکورہ حالات میں اگرفسادِ عقد کی کوئی علت نہیں ہے اور نہ ہی زمین میں کوئی عیب سابق موجود ہے، عمرو کے لئے زید کو مجبور کر کے زمین واپس کرنا شرعاً جائز نہیں ہے؛ بلکہ عمرو پر واجب ہے کہ وعدہ کے مطابق زمین کی رقم ادا کرے۔

وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع، ولا خيار لواحد منهما إلا من عيب، أو عدم رؤية. الخ (هداية، كتاب البيوع، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٠، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٢٢٦، دارالكتاب ديوبند ١/ ٢٢٠، تاتارخانية، زكريا ٨/ ٢٢٢، رقم: ١١٧١٤، ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١٠-١١)

اورعمرو جب اس زمین کی پیداوار استعمال کر چکا ہے تو اب زمین کا واپس کرنا ہرگز درست نہیں ہے۔

باع كرما وسلمه، فأكل ………… (الدرالمختار، قبيل باب المرابحة والتولية، كراچى ٥/ ١٣٢، زكريا ٧/ ٣٤٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۵۲۲/۲۵)

بیعانہ کی ادائے گی نہ کرنے پر کیا بیع کو ختم کیا جاسکتا ہے؟

سوال [۸٦۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فدوی نے اپنی زمین کا سودہ ایک ہندو سے مبلغ دولاکھ دس ہزار روپئے میں کیا تھا،

مورخہ: ۱/۷/ ۲۰۰۹ءکو اور اس نے فدوی کو ایڈوانس ایک لاکھ سڑسٹھ ہزار پانچ سو روپے دیئے، باقی رقم اس نے بیعانہ پر دینے کو کہا تھا، تاہم اس نے بیعانہ نہیں کروایا، بیع نامہ کی مدت ۶/ماہ رکھی تھی، نہ اس نے رقم ادا کی اور اب اس معاملہ کو تقریباً تین سال تین ماہ گذر چکے ہیں، اب زمین کی قیمت سات لاکھ روپئے ہے، اس نے جو رقم ایڈوانس دی تھی، فدوی نے اس کو زمین جوتنے کی اجازت دے دی تھی، براہ کرم جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: لیاقت حسین اعجاز نگر بریلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب بیع نامہ کی مدت چھ مہینے تھی اور چھ مہینے کی مدت گذر جانے کے بعد بھی اس نے بیع نامہ نہیں کیا ہے اور اسی پر تین سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا ہے، تو ایسی صورت میں آپ کو بیع فسخ کر کے اس کا پیسہ اس کو دے کر اپنی زمین واپس لینے کا حق ہے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۵/۵۰۶)

فإذا عزم البائع على ترک الخصومة، تم الفسخ ...... ولأنه لما تعذر استيفاء الثمن من المشتري، فات رضا البائع، فيستبد بفسخه.
(هداية، كتاب القضاء، باب التحكيم، مسائل شتى، اشرفيه ديوبند ۳/ ۱۴۶، البحر الرائق، زكريا ۷/ ۶۱، كوئٹه ۷/ ۳۶)

فيستبد بفسخه لفوات شرط البيع، وهو التراضي. (فتح القدير، زكريا ۷/ ۳۰۹، كوئٹه ۶/ ۴۱۸) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳/ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۰۸۷۹)

مدت متعینہ پر ثمن کی ادائے گی نہ ہونے پر بائع کو خیار فسخ حاصل ہے

سوال [۸۶۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: زید نے اپنی زمین خالد کو فروخت کی اور زید نے کہا کہ یہ زمین اس لئے فروخت کر رہا ہوں کہ مجھے دوسری جگہ زمین خریدنی ہے، اگر آپ ایک مہینے کے اندر پوری رقم ادا کر سکتے ہیں، تو یہ زمین لیجئے، اگر آپ ایک مہینہ کے اندر رقم ادا نہیں کر سکیں گے تو میں دوسری جگہ زمین نہیں خرید سکوں گا، تو خالد نے کہا کہ میں ایک مہینہ کے اندر پوری رقم ادا کر دوں گا اور آدھی رقم زید کو دی اور وہ پڑھانے کے لئے باہر چلے گئے، بار باران کو اطلاع بھی دی گئی؛ لیکن اس نے رقم ایک مہینہ کے اندر نہیں دی۔ اور زید نے یہ شرط لگادی تھی؛ لیکن اس نے رقم ایک مہینے کے اندر نہیں دی۔ اور زید نے یہ شرط لگادی تھی کہ اگر وہ زمین خرید نہیں سکا تو یہ زمین میں آپ کو نہیں دوں گا؛ اس لئے کہ یہ زمین فروخت کرنے کا مقصد دوسری زمین خریدنی ہے۔ اور خالد نے یہ رقم دس مہینے کے بعد ادا کی اور وہ زمین بھی زید کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ اور خالد نے جو بقیہ رقم ادا کی تھی وہ زید کے بھائی کو دی تھی، زید کو نہیں دی تھی، تو کیا اس صورت میں خالد کو رقم لوٹائی جائے گی یا زمین لکھی جائے گی، جیسا کہ زید نے یہ شرط لگائی تھی کہ ایک مہینہ کے اندر پوری رقم ادا کر سکتے ہیں، تو آپ لیجئے ورنہ آپ کو میں زمین نہیں دوں گا۔

المستفتی: حافظ محمد اشفاق، بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں درج کردہ صورت میں بیع مکمل منعقد نہیں ہوئی۔ اور بیع تام نہ ہونے کی وجہ سے زید کو اختیار رہے کہ رقم واپس کر کے اپنی زمین اپنے پاس رکھ لے۔

عن سليمان بن البرصاء قال: بايعت ابن عمر بيعا، فقال لي: إن جاء تنا نفقتنا إلى ثلاث ليال، فالبيع بيعنا، وإن لم تأتنا نفقتنا إلى ذلك فلا بيع بيننا وبينك، ولك سلعتك. (المحلى بالآثار، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ٧/ ٢٦٥، إعلاء السنن، دارالكتب العلمية بيروت ١٤/ ٥٧، رقم: ٤٦٢١)

فإن اشترى شخص شيئا على أنه أي المشتري إن لم ينقد ثمنه إلى

ثلاثة أيام فلا بيع صح إستحسانا، خلافا لزفر فلو لم ينقد في الثلاث فسد (وفي الشامية) هذا لو بقي المبيع على حاله. (الدر مع الشامي، كتاب البيوع، باب خيار الشرط، مطلب خيار النقد، کراچی ٤/ ٥٧١، زكريا ٧/ ١١٧، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٣٦، هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٣٠، تاتارخانية، زكريا ٩/ ٥٣، رقم: ١٢٦٩١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵؍ شعبان ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۰۹۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷؍ ۸؍ ۱۴۲۷ھ

مال میں نقص نکلنے پر کارخانہ دار پر ہرجانہ عائد کرنا

سوال [۸٦٥۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے یہاں کی ایک ایکسپورٹ کرنے والی فرم کو ایک سیمپل بنا کر دیا، اس کا آرڈر میرے پاس منظور ہوکر آگیا اور میرے اور ایکسپورٹ پارٹی کے درمیان ریٹ طے ہوگئے اور میں نے آرڈر کا نصف حصہ بنا کر دے دیا، میں نے اپنی بقایا رقم مبلغ تین لاکھ ۷۵؍ ہزار روپیہ کا مطالبہ کیا، تو یہاں کی ایکسپورٹ پارٹی یہ کہہ رہی ہے کہ آپ نے مال خراب دیا تھا؛ اس لئے میری غیر ملکی پارٹی بطور ہرجانہ کاٹ رہی ہے جو کہ میں آپ کے روپیہ میں سے مجری کروں گا، کیا یہ اقدام جائز ہے یا ناجائز ہے؟ جب کہ انہوں نے مال لیتے وقت ایک ایک عدد کی چیکنگ کی تھی اور جو مال میں نقص تھا اس کی پھر میں نے مرمت کرا کر مال کو دوبارہ ٹھیک کر کے واپس کیا، اب وہ میرا ایک لاکھ پچھتر ہزار روپیہ بطور ہرجانہ کاٹ رہے ہیں، یہ جائز ہے کہ نہیں؟

المستفتی: محمد عرفان محلّہ طویلہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ نے ایک ایک مال چیک کرا کے دیا ہے اور

ایکسپورٹر نے چیک کرکے لیا ہے اور پورے اطمینان کے بعد مال دوسرے ملک میں امپورٹ کے پاس پہنچنے کے بعد مال میں خرابی نکلی ہے تو اس کے ذمہ دار شرعی طور پر آپ نہیں ہیں؛ بلکہ اس کا ذمہ دار ایکسپورٹر ہی ہوگا؛ لہٰذا ایسی صورت میں ایکسپورٹر آپ سے ہرجانہ (کلیم) لینے کا حقدار نہیں ہے۔

وعلمت أن بيع المشتري للمعيب حبس للمبيع سواء علم بالعيب أو لم يعلم، فلا يمكنه الرد بعد ذلك. الخ (فتح القدير، كتاب البيوع، باب خيار العيب، زكريا ٦/ ٣٦٢، كوئٹه ٦/ ٣٨)

ولا يرجع بائعه على بائعه؛ لأنه صار بالبيع حابسا للمبيع. الخ (كفاية مع الفتح كوئٹه ٦/ ٣٨، زكريا ٦/ ٣٦٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ذیقعدہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/۵۴۹۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۱۱/۱۴۱۸ھ

وقت پر قیمت ادا نہ کرنے کی وجہ سے معاملہ فسخ کرنا

سوال [۸۶۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک صاحب سے میں نے ۸/ لاکھ پچاس ہزار روپئے میں مکان خریدا، جن میں سے ۲/ لاکھ ۱۰/ ہزار روپئے باقی رکھے، جس کی مدت متعین ہوگئی، مجھے ایک تاجر سے ۴۰/ لاکھ روپئے لینے تھے کہ اچانک اس کی بیوی کو کینسر ہوگیا اور وہ روپئے مجھے نہ دے سکا اور میں مالک مکان کو وقت مقررہ پر پیسے نہ دے سکا، جس کی بنا پر مالک مکان بہت ناراض ہوا اور زبردستی مجھ سے ایک عہد نامہ لکھوایا کہ اگر آئندہ چھ مہینے میں مجھے میری باقی رقم ۲/ لاکھ ۱۰/ ہزار لوٹا دی تب تو ٹھیک ہے ورنہ تمہاری دی ہوئی رقم ۶/ لاکھ ۴۰/ ہزار میں سے ایک روپیہ بھی تم کو نہیں دوں گا۔ اور مکان بھی واپس لے لوں گا اور میری اجازت کے بغیر کسی کو مکان بیچ بھی

نہیں سکتے، اب یہ چھ مہینے کی مدت بھی پوری ہونے والی ہے اور میرے پاس انتظام نہیں ہو پایا، میں نے سوچا کہ مکان بیچ دوں اور اس سے پیچھا چھڑالوں، جب مالک مکان کو پتہ چلا تو کہتا ہے کہ منافعہ میں سے آدھا منافع اگر مجھے دوتب بیچ سکتے ہو ورنہ عہد نامہ کے مطابق تجھ پر کیس کردوں گا، تو مالک مکان کی یہ شرطیں کہاں تک درست ہیں، میں اگر مکان بیچوں تو کیا واقعی وہ آدھے منافع کا حق دار ہے؟ فی الحال مکان پر میرا قبضہ ہے، میں مکان میں رہتا ہوں، مکان کاٹیکس میرے نام سے آتا ہے، لائٹ کا بل بھی میرے نام سے آتا ہے۔

المستفتی: محمد سلمان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں جب کہ بیع کا معاملہ مکمل ہو چکا ہے اور مشتری نے مبیع زمین پر قبضہ اور دخل لے لیا ہے، تو اب اگر وقت پر قیمت ادا نہ کرنے کی وجہ سے فریقین کی رضامندی سے اس معاملہ کو فسخ کیا جائے تو حکم یہ ہوگا کہ مشتری خالی مکان بائع کے حوالہ کرے اور بائع وصول کردہ پوری رقم کو مشتری کو واپس کرے، معاملہ فسخ ہونے کی صورت میں اس ادا کردہ رقم کو ضبط کرنے کی شرط قطعاً حرام ہے اور خلاف شریعت جبر یہ معاہدہ کا کوئی اعتبار نہیں، نیز جب تک معاملہ فسخ نہ ہو مشتری اس جگہ کو اپنی مرضی سے کسی بھی شخص کے ہاتھ فروخت کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور اس میں جو بھی منافع ہوں وہ خود ہی اس کا مالک ہوگا، بائع اس منافع میں سے کسی بھی حصہ کا حق دار نہیں۔ الغرض خلاصہ یہ ہے کہ بائع مقررہ قیمت سے ایک روپیہ بھی زائد لینے کا مطالبہ کسی صورت میں نہیں کرسکتا؛ البتہ رقم مقررہ وقت پر ادا نہ ہونے کی شکل میں وہ معاملہ فسخ کرنے کی بات کرسکتا ہے؛ لیکن اس صورت میں بھی اسے آمدہ رقم میں سے کوئی حصہ ضبط کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

الإقالة جائزة في البيع بمثل الثمن الأول، فإن شرط أكثر منه أو أقل، فالشرط باطل ويرد مثل الثمن الأول. (هداية، كتاب البيوع، باب الإقالة، أشرفي ديوبند ۳/ ٦۹)

فلو شرط فيها أي الإقالة أكثر من الثمن الأول، أو خلاف الجنس بطل الشرط، ولزم الثمن الأول عند الإمام؛ لأن الإقالة فسخ وهو لا يكون إلا على الثمن الأول، فيصير ذلک الشرط فاسدا ولغوا دون الإقالة لما مرّ إن الإقالة لا تفسد بالشرط الفاسد. (مجمع الأنهر، دارالکتب العلمية بيروت ۳/ ۱۰۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/۷/۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۱۴/۹۷)

بیع تام اور لازم ہونے کے بعد معاملہ منسوخ کرنے کا حکم

سوال [۸۶۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک جائیداد (نشست گاہ) واقع محلّہ کٹکوئی چاند پور، ضلع بجنور جس کا رقبہ تقریباً تیس گز ہے جو کہ ترکہ پدری جناب حکیم سید ابن حسن صاحب مرحوم سے چاروں بھائیوں کو وراثت میں پہنچی، والدین کے انتقال کے بعد چاروں بھائیوں کی باہمی رضا مندی سے یہ طے پایا کہ جائیداد قلیل ہونے کی وجہ سے اس کو تقسیم کر کے ہر حصہ قابل تعمیر نہ رہے گا؛ لہٰذا اس کی قیمت اسی ہزار روپئے قائم کر کے طے پایا کہ اس کو کسی ایک بھائی کو دے دیا جائے، خرید نے والا بھائی ان تینوں بھائیوں کو ان کے حصہ کی قیمت ادا کر دے اور جائیداد مذکورہ کو اپنے نام کرالے؛ لہٰذا سب سے بڑے بھائی سے چھوٹے احمد اشرف نے اس کو لینا اور تینوں بھائیوں نے اس کو دینا قبول کیا، بڑے بھائی غلام غوث نے احمد اشرف سے دس ہزار نقد لے لیا، دس ہزار باقی رہا، اس کے چار سال بعد بڑے بھائی کا انتقال ہوگیا، باقی چھوٹے دونوں بھائیوں نے بھی اپنے حصہ کی رقم بیس بیس ہزار روپئے اپنے خریدار بھائی سے وصول کرلی؛ البتہ بڑے بھائی مرحوم کے دس ہزار روپئے اب بھی باقی ہیں، کیا بڑے بھائی مرحوم کی اہلیہ یا ان کی کسی اولاد کو اس فیصلہ کے منسوخ کرنے کا شرعاً حق حاصل ہے، جو فیصلہ بڑے بھائی مرحوم کر گئے ہیں، اس تحریر کے مطابق شریعت کا کیا فیصلہ ہے؟

المستفتی: احمد اشرف جیلانی محلّہ کٹکوئی چاند پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب چاروں بھائیوں نے مل کرآپسی رضامندی کے ساتھ مذکورہ معاملہ طے کرلیا تھا، تواب اسی پر قائم رہنالازم ہے، بڑے بھائی کے انتقال کے بعدان کی اہلیہ یا دیگر وارث کو مذکورہ معاملہ منسوخ کرنے کا شرعاً حق نہیں ہے؛ بلکہ یہ معاملہ لازم اورتام ہو چکا ہے؛ اس لئے اسی پر قائم رہنا ضروری ہے، ہاں البتہ جودس ہزارروپیہ باقی ہے وہ بلاتاخیر ادا کردینا چاہئے۔

وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع، ولا خيار لواحد منهما إلا من عيب، أو عدم رؤية. (هداية، كتاب البيوع، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٠، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٢٢٦، دارالكتاب ديو بند ١/ ٢٢٠، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١٠، تاتارخانية، زكريا ٨/ ٢٢٢، رقم: ١١٧١٤)

وإن كان كل واحد منهما يستضر لصغره لم يقسمها إلا بتراضيهما ...... وتجوز بتراضيهما؛ لأن الحق لهما، وهما أعرف بشأنهما. (هداية مع فتح القدير، كتاب القسمة، فصل فيما يقسم وما لايقسم، زكريا ٩/ ٤٤٥، كوئٹه ٨/ ٣٥٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۶ر صفر ۱۴۲۶ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۶۸۹)	۱۴۲۶/۲/۸ھ

وعدہ کی خلاف ورزی پر سابقہ معاملہ ختم کردینے کا حکم

سوال [۸۶۵۵]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم لوگ ایک خاندان کے افراد ہیں، آج سے تقریباً ۱۵ رسال قبل ہمارے درمیان جائیداد کا بٹوارہ ہوا، اس سے پہلے ہم سب لوگ مشترک مکان میں رہتے تھے، کسی کے پاس کم اور کسی کے پاس اس کے حصہ رسد سے زیادہ تھا، ایک قطعہ مکان جوفریق ثانی کے قبضہ میں تھا، جس کی قیمت اس وقت اڑتالیس ہزارروپیہ مانی گئی تھی، اس میں سے -/26,750 روپئے فریق ثانی

کا حصہ تھا اور باقی -/21,250 روپئے کا ہمارا (فریق اول) کا حصہ تھا؛ لہٰذا طے ہوا کہ فریق ثانی دو چار روز میں فریق اول کے حصہ کی قیمت -/21,250 روپئے نقد ادا کردے، تو فریق اول اپنے حق سے دست بردار ہوجائے گا، باہمی طور پر یہ بات طے ہوگئی؛ لیکن فریق ثانی نے مقررہ رقم کی ادائے گی کافی عرصہ تک باوجود تقاضہ کے نہیں کی ۷-۸؍سال بعد فریق ثانی نے صرف دس ہزار -/10,000 روپیہ دینا چاہا جو فریق اول نے لینے سے انکار کردیا اور معاملہ معلق رہا، اب فریق اول کہتا ہے کہ چونکہ فریق ثانی نے طے شدہ معاملہ کے خلاف کیا ہے؛ لہٰذا وہ معاملہ ختم ہوگیا، اب فریق ثانی مکان مذکورہ مشترکہ کے میرے حصہ کی رقم موجودہ بازار بھاؤ سے ادا کرے اور اس عرصہ کے استعمال کا کرایہ ادا کرے، یا پھر اپنے حصہ کی قیمت فریق اول سے لے کر مکان اس کے سپرد کرے، جس کے لئے فریق ثانی تیار نہیں ہے۔

المستفتی: ذکرالرحمٰن، محلّہ گلشہید، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر سائل کا سوال واقع کے مطابق ہے، اور فریق ثانی نے طے شدہ وعدہ کے مطابق فریق اول کا حق ادا نہیں کیا ہے، تو فریق اول کو سابقہ معاملہ شرعاً ختم کردینے کا حق ہے، نیز فریق اول کا یہ مطالبہ بھی صحیح ہے کہ فریق ثانی اپنے حصہ کی قیمت فریق اول سے وصول کر کے اپنے حصہ سے دست بردار ہوجائے۔

عن عمرو بن يحيى المزني، عن أبيه أن رسول الله ﷺ قال: لا ضرر ولا ضرار. (موطا إمام مالك، كتاب القضاء، القضاء في المرفق، أشرفي ديوبند/ ٣١١)

قوله عليه السلام: لا ضرر ولا ضرار. الحديث، لا يضر الرجل أخاه ابتداءًا ولا جزاء. الخ (الأشباه، قديم/ ١٣٩، قواعد الفقه، أشرفي ديو بند/ ١٠٦، شرح المجلة رستم باز اتحاد ديو بند ١/ ٢٩، رقم المادة: ١٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۵۸)

۳/ باب العربون

بیع عربون

سوال [۸۶۵۶]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بیع عربون (بیعانہ) کے جواز کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عمل سے کتب احادیث میں کوئی روایت موجود ہوتو بحوالہ نقل فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیع عربون کے جواز کے متعلق روایات کتب حدیث میں موجود ہیں۔ حضرت نافع بن عبدالحارث اور حضرت عمرؓ کا واقعہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:

حدثنا ابن عيينة عن عمرو عن عبدالرحمن بن فروخ أن نافع بن عبدالحارث اشترى دار السجن من صفوان بن أمية بأربعة آلاف درهم، فإن رضي عمر فالبيع له، وإن عمر لم يرض، فأربع مئة لصفوان. (مصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن بيروت ١١/ ٦٧٢، رقم: ٢٣٦٦٢)

واشترى نافع بن عبدالحارث دارا للسجن بمكة من صفوان بن أمية على أن عمر رضي بالبيع، فالبيع بيعه، وإن لم يرض عمر فلصفوان أربع مائة دينار، وسجن ابن الزبير بمكة. (بخاري شريف، كتاب الخصومات، باب الربط والحبس في الحرم ١/ ٣٢٧، رقم الباب: ٨)

عن زيد بن أسلم أن النبي ﷺ أحل العربان في البيع. (مصنف لابن أبي شيبة، مؤسسة علوم القرآن بيروت ١١/ ٦٧١، رقم: ٢٣٦٥٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶ رذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۱۸)

بیعانہ دے کر خرید وفروخت کرنے کا حکم

سوال [۸٦۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خالد کاروبار اس طرح کرتا ہے کہ مثلاً زمین ایک لاکھ روپئے کی خرید کر بیعانہ دے کر لی اور طے کردیا کہ ایک لاکھ روپئے ایک ماہ یا دو ماہ میں ادا کردوں گا۔ اور پھر اسی زمین کو ۱۵؍ دن میں ڈیڑھ لاکھ کی بیچ کر وہ ایک لاکھ روپئے ادا کردئے، کیا اس طرح کاروبار کرنا صحیح ہے؟ عاقل کا کہنا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ بیع قبل القبض ہے جو صحیح نہیں، صحیح جواب سے نوازیں۔

المستفتی: مجیب الرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حسب تحریر سوال خالد نامی شخص کا بیعانہ دے کر زمین اس شرط کے ساتھ خریدنا کہ میں ایک دو ماہ میں قیمت ادا کردوں گا اور اس کے بعد اس زمین کو کچھ زائد نفع کے ساتھ غیر کو بیچ کر اس روپیہ سے زمین کی قیمت ادا کرنا اور اس طرح کاروبار کرنا شرعاً درست ہے اور عاقل کا اس خرید وفروخت کو بیع قبل القبض قرار دینا صحیح نہیں؛ اس لئے کہ زمین کی خرید وفروخت میں حکماً قبضہ موجود ہے۔

قال أبو حنيفة وأبو يوسف: يمنع بيع قبل القبض في سائر المنقولات، ويجوز في العقار الذي لا يخشى هلاكه. (تکمله فتح الملهم، کتاب البيوع، باب بطلان بيع المبيع قبل القبض، أشرفيه ديوبند ١/ ٣٥١)

للمشتري أن يبيع المبيع من آخر قبل قبضه إن كان عقارا. (شرح المجلة رستم باز ١/ ١٢٨، رقم المادة: ٢٥٣، مكتبه اتحاد ديوبند)

ويجوز بيع العقار قبل القبض عند أبي حنيفة وأبي يوسف. (هداية، باب المرابحة والتولية، أشرفی دیوبند ٣/ ٧٤، تاتارخانية زكريا ٨/ ٢٦٦، رقم: ١١٨٦٢،

الفقه على المذاهب الأربعة، مبحث التصرف في المبيع قبل قبضه، دارالفكر بيروت ۲/ ۲۳٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۱/۲/۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۸۹۳/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۲/۱۴ھ

کیا دھوکہ سے اپنے نام بیع نامہ کرانے سے ملکیت ثابت ہوجائے گی

سوال [۸٦٥٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے شوہر نے ایک پلاٹ ذاتی آمدنی سے خریدا تھا اور پوری قیمت سوسائٹی کو ادا کردی تھی؛ لیکن بیع نامہ نہیں ہوا تھا، میرے شوہر کے شہید ہونے کے بعد خسر نے میرے بڑے لڑکے فہیم الدین سے بہانہ سے اس کی رسید حاصل کر کے بیع نامہ کرالیا، جب کہ وعدہ فہیم کے نام کرانے کا کیا تھا، تو اس پلاٹ کے مالک میرے خسر ہیں یا میں؟ اور میرا شرعاً اس میں کتنا حق ہے؟ جب کہ خسر نے شوہر کے انتقال کے بعد لوگوں کو گواہ بنا کر پلاٹ پر نسیم کی ملک ہونے کا اقرار کیا تھا، جواب سے مطلع فرمائیں۔

المستفتية: نرگس جہاں، ہمشیرہ حاجی محمد انصار، ڈھوتی کھار، آگرہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: جب نسیم مرحوم نے اپنی ذاتی آمدنی سے پلاٹ خریدا ہے تو وہ پلاٹ ان کی ملک ہے، ان کے والد نے دھوکہ دے کر پلاٹ کے کاغذات میں اپنے نام جو بیع نامہ کرالیا ہے، اس سے شرعاً وہ اس پلاٹ کے مالک نہ ہوں گے؛ بلکہ یہ نسیم مرحوم ہی کی ملک ہے؛ لہٰذا ان کے انتقال کے بعد وہ پلاٹ شرعی وارثین میں بطور ترکہ تقسیم ہوگا۔ (مستفاد: امداد المفتیین ۲/ ۸۹۰)

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يأخذن أحدكم متاع أخيه

لاعبا ولا جادا. الحديث (سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب من يأخذ الشيء من مزاح، النسخة الهندية ٢/ ٦٨٣، دارالسلام، رقم: ٥٠٠٣)

عن عبدالله بن السائب بن يزيد عن أبيه عن جده قال: قال رسول الله ﷺ: لا يأخذ أحدكم عصا أخيه لاعبا أو جادا، فمن أخذ عصا أخيه فليردها إليه. (سنن الترمذي، أبواب الفتن، باب ماجاء لا يحل مسلم أن يردع مسلما، النسخة الهندية ٢/ ٣٩، دارالسلام، رقم: ٢١٦٠، شامي، كتاب الغصب، مطلب في رد المغصوب وفيما لو أبى المالك قبوله، كراچی ٦/ ١٨٢، زكريا ٩/ ٣٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ جمادی الاولی ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۵ھ

کیا ''امدادالفتاوی'' میں بیعانہ ضبط کرنے کا مسئلہ ہے؟

سوال [۸۶۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کیا حضرت تھانویؒ نے ''امدادالفتاوی'' میں بیعانہ ضبط کرنے سے متعلق کوئی فتویٰ تحریر کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو اس کو وضاحت سے تحریر فرمائیے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: حضرت تھانویؒ نے ''امدادالفتاوی'' جدید ۳/ ۱۴۲ پر اپنے ایک فتوی میں بیعانہ کی رقم کو ضبط کرنے کی اجازت دی ہے۔ سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے دانت بنانے والے سے دانت بنوائے اور بطور بیعانہ کے اس کو رقم پیشگی دے دی اور وہ شخص دانت بنا چکا؛ البتہ اس میں کچھ نقص رہ گیا، اس دوران اس شخص کا انتقال ہو گیا، تو اب یہ شخص یہ رقم بیعانہ واپس کرے گا یا نہیں؟ چنانچہ اس کے جواب میں حضرت فرماتے ہیں: میرے نزدیک جب وہ بنے ہوئے دانت لے چکا اور وہ موافق فرمائش کے تھے اور ایسی

خفیف کمی جو عرف کے موافق ہو، موافقت فرمائش کے خلاف نہیں ہے، تو وہ بیع کامل ہوگئی اور بنانے والا دانت کا مالک ہوگیا، اس لئے بنانے والا بقیہ دام کا مستحق ہے۔ اور بقیہ کا وہ مطالبہ کرے گا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۱۴۲/۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/۳/۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۴۶۲/۴۰)

زرِ بیعانہ کی واپسی کا حکم

سوال [۸۶۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خرید وفروخت کے وقت جب کہ قیمت متعین ہوجاتی ہے اور خریدار کے پاس فی الحال مکمل قیمت موجود نہیں ہے، تو خریدار اسی مجلس میں آئندہ مکمل قیمت دینے کا وعدہ کرتا ہے اور بات کو معتبر اور پختہ بنانے کے لئے زر بیعانہ کے نام پر کچھ روپے دیتا ہے، اب اگر خود مشتری کی جانب سے یہ معاملہ فسخ کیا گیا تو سامان کا مالک زر بیعانہ والی رقم واپس نہیں کرتا اور اپنے لئے حلال سمجھتا ہے، کیا یہ جائز ہے؟

المستفتی: محمد اشتیاق نواز قاسمی، بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: معاملہ چاہے مشتری کی طرف سے فسخ ہوجائے یا بائع کی طرف سے ہر حال میں بیعانہ کی رقم مشتری کو واپس دے دینا بائع پر لازم ہے۔ اور بائع کے لئے وہ رقم حلال نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۷۷)

عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع العربان، قال أبو عبدالله: العربان: أن يشتري الرجل دابة بمائة دينار، فيعطيه دينارين عربونا، فيقول: إن لم أشتر الدابة فالديناران لك.

الحديث (ابن ماجة شريف، أبواب التجارات، باب بيع العربان، النسخة الهندية ١/ ١٥٨، دارالسلام، رقم: ٢١٩٣، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في العربان، النسخة الهندية ٢/ ٤٩٤، دارالسلام، رقم: ٣٥٠٢)

ويرد العربان إذا ترك العقد على كل حال بالاتفاق. (بذل المجهود يحيى سهارنپور ٤/ ٢٨٧، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ١١/ ٢٢١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ شعبان ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۱۵۲)

بیعانہ کی واپسی لازم ہے

سوال [۸۶۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے ایک مکان خریدنے کے لئے عمر سے سودا کیا اور کچھ رقم بطور بیعانہ دے کر ایک مدت مثلاً تین ماہ یا چھ ماہ رجسٹری کرنے کے لئے طے کرلی، مدت پوری ہونے سے پہلے زید نے عمر سے کہا کہ میں مکان نہیں لے سکوں گا؛ لہٰذا کچھ دن بعد زید نے عمر سے اپنی بیعانہ کی رقم واپس مانگی تو عمر نے کہا کہ وہ رقم مسجد کو دے دی۔

(الف) کیا عمر کو زید کی رقم مسجد کو دینا درست ہے یا نہیں؟

(ب) کیا رقم زید کو واپس ملنی چاہئے یا نہیں؟

(ج) بیعانہ کی رقم واپس نہ کرنے پر عمر معاوضہ دار رہے گا یا نہیں؟

المستفتی: محمد شفیق جگر کالونی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب زید نے مکان لینے سے انکار کردیا ہے، تو عمر پر لازم ہے کہ بیعانہ کی رقم زید کو واپس کردے اور مسجد کو جو رقم عمر نے دی ہے اس کا ذمہ دار عمر خود ہے، اور وہ پیسہ عمر کا اپنی جیب سے دینا شمار ہوگا۔ اور زید سے لی ہوئی رقم واپس کرنا لازم ہے۔

عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع العربان، قال أبو عبدالله: العربان: أن يشتري الرجل دابة بمائة دينار، فيعطيه دينارين عربونا، فيقول: إن لم أشتر الدابة فالديناران لك. **الحديث** (ابن ماجة شريف، أبواب التجارات، باب بيع العربان، النسخة الهندية ۱/ ۱۵۸، دارالسلام، رقم: ۲۱۹۳، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في العربان، النسخة الهندية ۲/ ۴۹۴، دارالسلام، رقم: ۳۵۰۲)

ويرد العربان إذا ترك العقد على كل حال بالاتفاق. (بذل المجهود يحيى سهارنپور ۴/ ۲۸۷، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ۱۱/ ۲۲۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۴۳)

بیعانہ کی رقم ضبط کرنے کا حکم

سوال [۸۶۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اپنی ایک چیز مثلاً زمین فروخت کی اس رقم سے کوئی دوسرا کام کرنا تھا، عمرو نے وہ زمین خریدنے کی بات کی، قیمت طے ہوگئی اور یہ وعدہ ہوگیا کہ دس دن بعد ۱/۴ قیمت ادا کروں گا اور ایک ماہ بعد کل قیمت ادا کر کے بیعانہ لکھا لے گا، یہ بات طے ہونے کے بعد عمرو نے مبلغ دو ہزار روپئے زید کو بیعانہ کے طور پر دے دیئے جو کہ ایک طرح کی ضمانت ہوتی ہے بات کی پختگی کے لئے، بات طے ہونے کے بعد زید نے دوسرے خریداروں کو منع کر دیا کہ ہماری زمین فروخت ہوگئی؛ لیکن عمرو نے وعدہ خلافی کی اور حسب وعدہ نہ تو دس دن میں ۱/۴ قیمت ادا کی نہ ایک ماہ بعد کل قیمت ادا کی، نہ بیعانہ کرایا، عمرو کے اس عمل سے زید کا نقصان یہ ہوا کہ وہ جو کام اس رقم سے کرنا چاہتا تھا وہ نہیں کرسکا اور اشیاء کی قیمت بڑھنے اور گرانی ہو جانے کی وجہ سے زید کو ہی وہ کام زیادہ مہنگا اور زیادہ قیمت میں ملا، وعدہ کی مدت نکلنے کے بعد اور مزید انتظار کے بعد زید

نے اپنی وہ زمین دوسرے شخص کوفروخت کردی، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اپنے نقصان کے بدلے میں زید عمرو کے دو ہزار روپئے جوبطور بیعانہ آئے تھے ضبط کرسکتا ہے یانہیں؟ یا اس بیعانہ کی رقم کوواپس کرنا ضروری ہے؟ جواب عالی سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: محمد عمیر کاس گنج

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وقت معینہ پر رقم ادا نہ کرنے کی بناء پرفروخت کرنے والے کے لئے عقد ختم کرنے کا حق ہے، مگر عقد ختم کرنے کے بعد دئے ہوئے بیعانہ کوضبط کر لینا جائز نہیں ہے، اس کوواپس کردینا لازم ہے۔

أن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم نهی عن بیع العربان، قال أبو عبداللّٰہ: العربان: أن یشتري الرجل دابة بمائة دینار، فیعطیه دینارین عربونا، فیقول: إن لم أشتر الدابة فالدیناران لک. الحدیث (ابن ماجة شریف، أبواب التجارات، باب بیع العربان، النسخة الهندیة ۱/ ۱۵۸، دارالسلام، رقم: ۲۱۹۳، سنن أبي داؤد، کتاب البیوع، باب في العربان، النسخة الهندیة ۲/ ۴۹۴، دارالسلام، رقم: ۳۵۰۲)

ویرد العربان إذا ترک العقد علی کل حال بالاتفاق. (بذل المجهود مکتبه یحیی سهارنپور ۴/ ۲۸۷، دارالبشائر الإسلامیه بیروت ۱۱/ ۲۲۱) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ر محرم ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۶۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۱/ ۱۴۱۹ھ

بیعانہ کی واپسی پر زائد رقم لینا

سوال [۸۶۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے بکر سے ایک آراضی بذریعہ عمر مبلغ ایک لاکھ دس ہزار روپیہ میں خرید لی اور مبلغ پانچ ہزار روپیہ کا بیعانہ بذریعہ عمر دلاکر آراضی کا سودا بالکل پکا طے پا گیا، نیز جس دن

بیعانہ دیا گیا اسی دن کے لئے بیعانہ ہونا بھی طے پا گیا، رجسٹری شدہ مگر کچھ دیر کے بعد بکر عمر کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ مذکورہ آراضی میں نے کسی دوسرے شخص کو مبلغ ایک لاکھ بیس ہزار روپئے میں فروخت کردی ہے، تم اپنا بیعانہ واپس لے لو، عمر نے منع کیا، بات بڑھتی دیکھ کر کچھ لوگ اکٹھا ہو گئے اور صورت حال معلوم کرنے کے بعد لوگوں نے کہا کہ اس طرح سودا ختم کئے جانے پر بیعانہ کا دوگنا روپئے واپس کیا جاتا ہے، اس پر بکر نے عمر کو مبلغ دس ہزار روپئے واپس کردئے، یعنی پانچ ہزار روپئے زائد واپس کئے اور یہ زائد روپئے اس وقت عمر کے پاس ہی بطور امانت کے ہیں، عمر یہ چاہتا ہے کہ یہ روپئے بکر کو ہی دئے جائیں، جب کہ زید کا کہنا ہے کہ یہ روپئے مجھے ملنے چاہئیں، تو ایسی صورت میں عمر کو یہ روپئے کس کو دینے چاہئیں؟ کیوں کہ علماء حضرات سے سنا ہے کہ اس طرح کا لین دین سود کہلاتا ہے، جو کہ ناجائز ہے، اگر عمر یہ روپئے زید کو دیتا ہے، تو کیا عمر بھی گنہگار ہوگا؟ اور آخرت میں ایسے شخص کے بارے میں کیا وعید آئی ہے؟ برائے کرم تفصیل سے روشنی ڈال کر جواب مرحمت فرمائیں، تاکہ حق والے کو حق مل جائے۔

المستفتی: عبدالحمید راعینی، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بیعانہ کی واپسی پر جو زائد رقم بائع بکر سے وصول کی گئی ہے، وہ بکر کو واپس کردی جائے، اس کا لینا جائز نہیں۔

لا یجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعي.

(شامي، کتاب الحدود، مطلب في التعزیر بأخذ المال، کراچی ۴/ ۶۱، زکریا ۶/ ۱۰۶، هندیة زکریا قدیم ۲/ ۱۶۷، جدید ۲/ ۱۸۱، البحرالرائق، کوئٹه ۵/ ۴۱، زکریا ۵/ ۶۸، قواعد الفقه، أشرفی دیوبند / ۱۱۰، رقم: ۲۶۹، الموسوعة الفقهية ۲۱/ ۱۱۲)

البتہ بکر نے معاملہ طے ہو جانے کے بعد جو دھوکہ دیا ایسا کرنا جائز نہیں، بکر اس سے گنہگار ہوا؛ لہٰذا بکر پر توبہ واستغفار ضروری ہے۔

اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ فَاُولٰٓئِکَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ. الآية [النساء: ۱۷] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/۷/۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۲۴۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۷/۱۴۲۰ھ

بیعانہ کے بعد معاملہ ختم کرنے کا حکم

سوال [۸۶۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اپنے مکان کا ایک آدمی سے سودا کیا تھا، میں نے چھ ماہ کا ٹائم دیا تھا، اس چھ ماہ میں تقاضہ کرنے پر میری بقایا رقم اس نے نہیں دی، جس کو تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو گیا، ڈیڑھ سال کے عرصہ سے برابر تقاضہ کر رہا ہوں، میں اب اپنا معاملہ بقایا رقم نہ دینے کی صورت میں ختم کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے دئے ہیں وہ رقم واپس کر کے اپنی جائیداد واپس لینا چاہتا ہوں، کیا یہ میرے لئے جائز ہے؟

المستفتی: صباحت علی ولد صفایت علی، محلّہ تمبا کو والان، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر خریدار وقت مقررہ پر بقیہ رقم ادا کرے تو فروخت کرنے والے کو مطالبہ کے باوجود رقم ادا کرنے پر عقد فسخ کرنے کا حق ہوگا۔ اور سوال نامہ سے واضح ہوتا ہے کہ بجائے چھ ماہ کے ڈیڑھ سال مہلت دی گئی ہے؛ اس لئے آپ کو معاملہ فسخ کر کے حاصل شدہ رقم واپس کر کے اپنی جائیداد واپس لینے کا حق ہے۔

إذ الحاجة مست إلى الانفساخ عند عدم النقد تحرزا عن المماطلة في الفسخ. الخ (هداية، كتاب البيوع، باب خيار الشرط، أشرفی ديوبند ۳/ ۳۰)

فإذا عزم البائع على ترک الخصومة، تم الفسخ ...... ولأنه لما تعذر

استيفاء الثمن من المشتري فات رضا البائع، فيستبد بفسخه. (هداية، القضاء، باب التحكيم، مسائل شتى، أشرفي ديوبند ٣/ ١٤٦-١٤٧، البحرالرائق، كوئٹه ٧/ ٣٦، زكريا ٧/ ٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍شعبان ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۱۹۲۹)

جائیداد کا بیعانہ دوسرے کو دے کر سوتیلے بیٹے کو فروخت کرنا

سوال [۸۶۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: روشن اختر نے اپنی دولڑکیوں کے جائیداد کے حصہ کا معاہدۂ بیع کچھ رقم پیشگی لے کر بیعانہ کے طور پر میرے نام کر دیا تھا، معاہدۂ بیع کے وقت لڑکیوں کی عمر ۱۲؍سال اور ۱۴؍سال کی تھی، آٹھ سال بعد لگ بھگ روشن اختر نے اسی حصہ کا بیعانہ اپنے سوتیلے بیٹے انتخاب کے نام کرادیا، معاہدۂ بیع کے وقت روشن اختر کے پاس اپنی لڑکیوں کے پالن پوسن تعلیم وغیرہ کے لئے کوئی اثاثہ نہیں تھا، تو میرے نام معاہدۂ بیع کرنے کے بعد سوتیلے بیٹے کو بیعانہ کر دینا کیسا ہے؟ کیا اس پر لازم ہے کہ بعد والے بیعانہ کو ختم کر کے پہلے والے خریدار کے نام بیعانہ کرائے، شرعی حکم کیا ہے؟

المستفتی: اقبال انور تمبا کو والان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: روشن اختر نے اپنی لڑکیوں کی جائیداد کا آپ کے نام جو بیعانہ کیا ہے، یہ ایک طرح کا وعدۂ بیع ہے، نہ کہ بیع، روشن اختر کو وعدۂ بیع پورا کرنا چاہئے تھا، وعدہ پورا نہ کرنے کی وجہ سے وہ گنہگار ہوگی اور روشن اختر کا اپنے سوتیلے بیٹے انتخاب عالم کے نام بیعانہ کر کے فروخت کرنا درست ہوگا۔ اور روشن اختر پر اس بیع کو ختم کرنا لازم اور ضروری

نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ بیع مکمل ہوگئی ہے، جوفریقین کی رضامندی کے بغیر ختم نہیں کی جاسکتی، اور پہلے معاہدہ کی وجہ سے وہ صرف گنہگار ہوگی۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: آية المنافق ثلاث: إذا حدث كذب، وإذا وعد أخلف، وإذا اؤتمن خان. (ترمذي شريف، أبواب الإيمان، باب ماجاء في علامة المنافق، النسخة الهندية ٢/ ٩١، دارالسلام، رقم: ٢٦٣١، صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب علامة المنافق ١/ ١٠، رقم: ٣٣)

وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع، ولا خيار لواحد منهما. (هداية، كتاب البيوع، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٠، تاتارخانية، زكريا ٨/ ٢٢٢، رقم: ١١٧١٤، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٢٢٦، دارالكتاب ديوبند ١/ ٢٢٠، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍رجب ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۱۲۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸؍۷؍۱۴۲۴ھ

بائع کا بیعانہ کی رقم جمع کرنا اور مشتری کا ڈبل رقم لینا

سوال [۸۶۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کو کسی آدمی نے زمین خریدنے کی غرض سے دو لاکھ روپئے ایڈوانس بیعانہ کے طور پر دیا۔ اور روپئے دیتے وقت یہ عہد ہوا جو کاغذ پر لکھا گیا کہ اگر میں فلاں تاریخ تک آپ سے زمین نہیں لیتا ہوں، تو میرے یہ دو لاکھ روپئے آپ نہیں دیں گے، اور نہ ہی میں اس کا حق دار ہوں گا، اور اگر آپ مجھے فلاں تاریخ تک زمین نہیں لکھتے ہیں تو میں آپ سے دو لاکھ روپئے کا چار لاکھ روپئے لوں گا۔ اور وہ تاریخ نکل گئی جس تاریخ کا معاہدہ ہوا تھا، دوسری بات یہ ہے کہ مشتری نے بائع کو کورٹ تک دوڑایا، کورٹ سے اس کے پاس نوٹس آیا تو وہ کورٹ میں حاضر ہوا؛ لیکن جب بات چلی تو وکیل نے بھی کہا کہ جب کاغذ بن گیا ہے، تو اس کا مشتری

حقدار نہیں ہے، اس کے بعد پھر بھی وہ زمین لینے کے لئے پہلی والی رقم دو لاکھ کے ساتھ تیار ہے اس صورت میں بائع کیا کرے؟ اب اس زمین کو دوسرا بھی لینے کے لئے تیار ہے جو کہ اس سے زیادہ رقم دے رہا ہے، اب بائع اس صورت میں کیا کرے کہ پہلے مشتری کو جو دو لاکھ ایڈوانس دیا تھا اس کو دے یہ دو لاکھ روپئے کو جوڑ کر یا اس کے علاوہ پھر دوبارہ اس سے پوری رقم لی جاوے، یا زمین کسی اور کے معرفت بیچ دے؟

المستفتی: محمد سعود شہزادہ باغ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جائیداد کی خریداری کے لئے معاہدہ نامہ اور اقرار نامہ لکھتے وقت مشتری کی جانب سے جو پیشگی روپئے دئے جاتے ہیں اس کا دینا جائز ہے، کیونکہ یہ رجسٹری کے وقت محسوب ہو جاتا ہے؛ لیکن اگر کسی وجہ سے مشتری وقت مقررہ پر خرید نہ سکے، تو بیعانہ کی رقم بائع ضبط کر لے اور بائع اس کو حلال سمجھ کر استعمال کرنے لگے، اسی طرح وقت مقررہ پر رجسٹری کرانے سے بائع گریز کرنے لگے یا بیچنے سے انکار کر دے تو جتنی رقم بائع کے یہاں جمع ہوئی ہے اس کی دوگنی رقم مشتری کو دینی پڑ جائے تو جانبین کی یہ دونوں شرطیں شرعی طور پر ناجائز ہیں؛ بلکہ مشتری نے جتنی رقم جمع کی ہے ہر حال میں خریداری نہ ہونے یا بائع کے نہ بیچنے کی صورت میں اتنی ہی رقم مشتری کو واپس کر دینا واجب ہوتا ہے، نہ فروخت کرنے والے کے لئے اس رقم کا ضبط کرنا جائز ہے اور نہ ہی مشتری کے لئے اور نہ بیچنے کی صورت میں ڈبل رقم وصول کرنا جائز ہوگا۔ (مستفاد: ایضاح النوادر/ ۷۷)

أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع العربان، قال أبو عبدالله: العربان: أن يشتري الرجل دابة بمائة دينار، فيعطيه دينارين عربونا، فيقول: إن لم أشتر الدابة فالديناران لك. الحديث (ابن ماجة شريف، أبواب التجارات، باب بيع العربان، النسخة الهندية ١/ ١٥٨، دارالسلام، رقم: ٢١٩٣، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في العربان، النسخة الهندية ٢/ ٤٩٤، دارالسلام، رقم: ٣٥٠٢)

ویرد العربان إذا ترک العقد علی کل حال بالاتفاق. (بذل المجهود یحیی سهارنپور ٤ / ۲۸۷، دارالبشائر الإسلامیه بیروت ۱۱ / ۲۲۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۶۴۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۶/۲۴ھ

معاملہ ختم ہونے کی صورت میں بیعانہ کی رقم کا حکم

سوال [۸٦٦٧]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زاہد نے ایک زمین فروخت کی، مثلاً پچاس ہزار روپئے میں معاملہ کرتے وقت مشتری نے دس ہزار روپئے دئے اور کہا کہ مابقیہ رقم رجسٹری کے وقت ادا کردوں گا یا بعد میں، جب آپ کہیں، مگر چندہ ماہ بعد مشتری نے زمین خریدنے سے انکار کردیا کہ زمین نہیں لوں گا، دس ہزار روپئے جو معاملہ کرتے وقت دئے تھے، وہ واپس کردو، زاہد نے کہا زمین نہیں لوگے تو روپئے واپس نہیں ہوں گے؛ اس لئے کہ ہم دونوں کے عرف میں معاملہ کے وقت کی ادا شدہ رقم معاملہ کے فسخ کی صورت میں واپس نہیں ہوتی؛ اس لئے اب روپئے نہیں ملیں گے، صورت مذکورہ کا شرعاً کیا حکم ہے؟ عرف عام کا رواج جو مشتری اور بائع کے علاقہ میں ہے، جس کا اوپر بھی تذکرہ کردیا ہے، اس کی شرع میں کچھ حیثیت ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عرف عام کی وجہ سے تخصیص نص تو جائز ہے، مگر ترک نص جائز نہیں ہے۔ اور بیعانہ واپس نہ کرنے کی صورت میں ترک نص لازم آرہا ہے؛ اس لئے ایسا عرف جائز نہیں ہے۔ اور بیعانہ دس ہزار روپئے واپس کرنا لازم ہوگا۔ نص حدیث میں واپسی کی صراحت ہے:

أن النبي ﷺ نهی عن بیع العربان، قال أبو عبدالله: العربان: أن

يشتري الرجل دابة بمائة دينار، فيعطيه دينارين عربونا، فيقول: إن لم أشتر الدابة فالدينار ان لک. الحديث (ابن ماجة شريف، أبواب التجارات، باب بيع العربان، النسخة الهندية ۱/ ۱۵۸، دارالسلام، رقم: ۲۱۹۳، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في العربان، النسخة الهندية ۲/ ۴۹۴، دارالسلام، رقم: ۳۵۰۲، حجة الله البالغة ۲/ ۱۰۸)

ويرد العربان إذا ترک العقد على كل حال بالاتفاق. (بذل المجهود يحيى سهارنپور ۴/ ۲۸۷، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ۱۱/ ۲۲۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ ربیع الاول ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۶۵۸)

بیعانہ کی ڈبل رقم واپس کرنا

سوال [۸۶۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص اپنا مکان یا زمین فروخت کرنا چاہتا ہے، اور اس نے اس کے متعلق دوسرے شخص سے بات چیت کی اور بیعانہ بھی لے لیا، پھر اس کے بعد اس کو بیچنے کا ارادہ ترک کردیا، تو کیا وہ شخص بیعانہ ڈبل واپس کرسکتا ہے، جب کہ اس میں ربو کی بو محسوس ہوتی ہے؟

المستفتی: محمد فاروق، راجونگر، منڈولی، دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب ایجاب وقبول ہوگیا اور ساتھ میں بیعانہ کے طور پر پیشگی کچھ رقم بھی دے دی گئی ہے، تو بیچنے والے کے لئے بعد میں سابقہ معاہدہ کے مطابق زمین مشتری کے حوالے کرنے سے مکر جانا ناجائز اور سخت وعدہ خلافی ہے، حدیث میں ایسی وعدہ خلافی اور دھوکہ دھڑی کی سخت وعید آئی ہے، تاہم اگر معاملہ فسخ کرے، تو بیعانہ جتنا دیا گیا ہے، اتنا ہی واپس ہوگا اس کا دوگنا دینا اور لینا سودا ورنا جائز ہے۔

آية المنافق ثلاث: إذا حدث كذب، وإذا وعد أخلف، وإذا أؤتمن

خان. (ترمذي شريف، أبواب الإيمان، باب ماجاء في علامة المنافق، النسخة الهندية ۲/ ۹۱، دارالسلام، رقم: ۲٦۳۱)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: –إلى قوله– من غشنا فليس منا. (مسلم شريف، كتاب الإيمان، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: من غشنا فليس منا، النسخة الهندية ۱/ ۷۰، بيت الأفكار، رقم: ۱۰۱)

عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده أنه قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع العربان، قال مالک: وذلک فيما نرى –والله أعلم– أن يشتري الرجل العبد، أو يتکارى الدابة، ثم يقول: أعطيک دينارا على أني إن ترکت السلعة، أو الکراء فما أعطيتک لک.(سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في العربان، النسخة الهندية ۲/ ٤۹٤، دارالسلام، رقم: ۳۵۰۲)

قلت: ويرد العربان إذا ترک العقد على کل حال بالإتفاق. (بذل المجهود، قديم دارالبشائر الإسلاميه ۱۱/ ۲۲۱)

لأن الربوا عرفه الحنفية بأنه فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين فی المعاوضة. (الموسوعة الفقهية ۲۲/ ۵۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲/ ۲۹۵۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۶/ ۴/ ۱۴۳۲ھ

خریداری میں دی گئی رقم کی واپسی میں دوگنی رقم لینا

سوال [۸٦٦۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خالد نے حامد سے ایک زمین خریدی، جس کی دو تہائی رقم ادا کردی گئی، جب کہ ایک تہائی

رقم کا زمین کی رجسٹری کے موقع پر ادا کرنا طے ہوا؛ لیکن حامد نے دھوکہ سے ایسی زمین فروخت کی جس کے وہ خود مالک نہ تھے، دس ماہ تک رجسٹریشن کے لئے ٹال مٹول کرتے رہے، تحقیق پر پتہ چلا کہ وہ خود اس زمین کے مالک نہیں ہیں؛ لہٰذا حامد سے ہر روز مطالبہ کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں دوسری زمین دیتا ہوں، دو چار زمینیں اور دکھلائیں؛ لیکن وہ بھی متنازع فیہ تھیں، خالد نے لینے سے انکار کیا، اس طرح دو تین ماہ اور گذر گئے، اس وقت تک اس زمین کی قیمت جس کو خالد نے خریدا تھا، کئی گنا بڑھ چکی تھی، اب خالد نے حامد سے کہا کہ جو زمین آپ نے ہمیں بیچی ہے وہ خود آپ خرید لیں اور آج کی بازار کی قیمت سے کچھ کم ادا کردیں، مختلف مجالس میں طویل بحث کے بعد یہ طے پایا کہ خالد اصل رقم بیس لاکھ روپئے جو ادا کر چکا تھا پر مزید بیس لاکھ روپئے ملا کر دے دیں گے۔ (یعنی جملہ چالیس لاکھ روپئے) یہ فیصلہ ہو گیا، اس فیصلے کے بعد رقم وصول کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی، بہر حال تین سال کے عرصہ میں مختلف قسطوں میں انیس لاکھ پچاس ہزار روپئے خالد نے وصول کئے، اصل رقم میں ابھی پچاس ہزار روپے وصول ہونا باقی ہے؛ لیکن حامد نے اپنی زمین خالد سے چالیس لاکھ روپے میں خریداری کی (یعنی بیس لاکھ زائد رقم اصل بیس لاکھ پر دینے کا وعدہ کیا) وہ رقم اب دینے سے یہ کہہ کر انکار کر رہے ہیں کہ یہ رقم تمہارے لئے جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ تمہاری رقم صرف بیس لاکھ روپے ہے، اس پر جو بھی رقم زائد خالد لے گا وہ سود ہوگا، اس لئے میں خالد ان مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ از روئے شرع یہ زائد رقم میرے لئے جائز ہے یا ناجائز ہے؟

المستفتی: امداد اللہ راجہ پوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: زمین کی خریداری میں دی گئی رقم کے ساتھ جو شرط لگائی گئی کہ رقم کی واپسی کے ساتھ دو گنے واپس ہوں گے، یہ ناجائز شرط ہے؛ لہٰذا اصل رقم جو بیس لاکھ ہے، اس کے اوپر جو کچھ بھی زائد واپس ہوگا وہ سود ہے، لینے والے کے حق میں وہ پیسہ

حرام ہے؛ لہٰذا خالد کو صرف بیس لاکھ واپس ملے گا اور بیس لاکھ پر زائد حاصل کرنا سود اور حرام ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ا/ ۷۸)

أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع العربان، قال أبو عبدالله: العربان: أن يشتري الرجل دابة بمائة دينار، فيعطيه دينارين عربونا، فيقول: إن لم أشتر الدابة فالديناران لك. الحديث (ابن ماجة شريف، أبواب التجارات، باب بيع العربان، النسخة الهندية ١/ ١٥٨، دارالسلام، رقم: ٢١٩٣، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في العربان، النسخة الهندية ٢/ ٤٩٤، دارالسلام، رقم: ٣٥٠٢)

قلت: ويرد العربان على كل حال بالإتفاق. (بذل المجهود، قديم دارالبشائر الإسلاميه ١١/ ٢٢١)

لأن الربوا عرفه الحنفية بأنه فضل خال عن عوض بمعيار شرعي مشروط لأحد المتعاقدين فى المعاوضة. (الموسوعة الفقهية ٢٢/ ٥٠) **فقط** واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ رشعبان ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۶۹۰/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۸/۲ھ

۴/ باب البیع الفاسد، والباطل، والمکروہ

شرطِ فاسد کے ساتھ خرید وفروخت کی شرعی حیثیت

سوال [۸۶۷۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک چیز کی قیمت بازاری بھاؤ کے اعتبار سے ۲۹۰/ روپئے ہے، اس وقت زید نے وہ چیز ۳۰۰/ روپیہ کے اعتبار سے خریدی اس شرط پر کہ آئندہ فروخت کرنے پر اس میں جو نفع ہوگا وہ میرا اور جو نقصان ہوگا وہ بائع کا۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ اس طرح کی بیع وشراء جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: ذبیح الرحمٰن چاندپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں ذکر کردہ شرط شرعاً شرطِ فاسد ہے؛ اس لئے ایسا معاملہ شرعاً جواز کے دائرہ میں داخل نہیں ہوتا؛ لہٰذا مسلمانوں کا اس طرح معاملہ کرنا جائز نہیں ہے۔

کل شرط لا یقتضیہ العقد، وفیہ منفعة لأحد العاقدین أو للمعقود علیہ وهو من أهل الاستحقاق یفسدہ. الخ (هدایة، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، أشرفي ۳/ ۵۹) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴/ رمضان ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۴۳۶)

شروط فاسدہ کے ساتھ بیع کا معاملہ

سوال [۸۶۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے بکر سے ایک قطعہ زمین اس شرط ووعدہ کر کے خریدی کہ میں اس زمین میں اینٹ

کا بھٹہ لگاؤں گا، اس میں تمہاری آدھی شرکت رہے گی۔ اور اس زمین میں دیگر ترقیاتی کام کروں گا جس سے تمہاری بھی ترقی وفائدہ ہوگا، نیز اگر اس زمین کو نفع سے بیچوں گا تو اصل قیمت خرید سے جتنی زیادہ کی بکے گی اس اضافہ اور نفع میں ہماری تمہاری نصف نصف شرکت رہے گی، ان شرائط اور وعدے اور امیدیں دلا کر زید نے بکر سے زمین نصف قیمت میں طے کرلی، یعنی اس وقت مثلاً چار ہزار روپیہ فی کس قیمت کی زمین دو ہزار روپیہ فی کس میں خرید لی، بکر نے اس امید وشرط پر کہ اگر میری زمین کچھ عرصہ بعد زیادہ قیمت میں بکے گی تو آدھا نفع ملے گا، یا تجارت وکاروبار ہوگا، تو اس نفع میں شرکت رہے گی، اس وقت آدھی قیمت میں اس زمین کا زید کے نام بیع نامہ کردیا؛ لیکن زید نے وعدوں کے مطابق اس زمین میں نہ بھٹہ لگایا اور نہ ہی کوئی ترقیاتی کام حسب وعدہ کیا اور نہ اس زمین کو بیچ کر نفع کی نصف رقم دینے کو تیار ہے؛ بلکہ قانونی پختگی وبیع نامہ کرانے کے بعد خود کو مستقل مالک کہتا ہے، نہ تجارت میں بکر کو شریک کرنا چاہتا ہے اور نہ قیمت کے اضافہ ونفع میں حسب وعدہ نصف منافع دینے کو تیار ہے۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ جس شرط کے ساتھ بکر نے زید کو نصف قیمت پر زمین دی تھی، اس شرط ووعدہ کو پورا نہ کرنے کی شکل میں بکر اس زمین کی پوری قیمت زید سے وصول کرنے کا شرعاً حق دار ہے یا نہیں؟ اور کیا کسی طرح آدھی رقم وصول کرسکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالرحمٰن خان قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں زید کا بکر سے شرط کے ساتھ زمین کی بیع کا جو معاملہ ہوا وہ تمام شرائط باطل ہیں اور وہ شروط فاسدہ میں سے ہیں، ایسی شرائط کے ساتھ بیع جائز نہیں ہوتی؛ کیوں کہ خرید وفروخت میں ایسی شرط لگانا جو متعاقدین میں سے کسی ایک کے لئے نفع مند ہو شرط فاسد کہلاتی ہے؛ لہٰذا اس میں بائع کو یہ حق ہے کہ وہ بیع کو فسخ کرکے مذکورہ زمین کو مشتری سے واپس لے لے اور مشتری کے لئے بھی لازم ہے کہ بلا کسی چوں چرا کے اس زمین کو واپس کردے۔

عن سعید بن زید -رضي اللّٰه عنه- أن رسول اللّٰه ﷺ قال: من اقتطع

شبرا من الأرض ظلما طوقه الله إياه يوم القيامة من سبع أرضين. (مسلم شريف، باب تحريم الظلم وغصب الأرض وغيرها، النسخة الهندية ۲/ ۳۲، بيت الأفكار، رقم: ۱۶۱۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ رجب ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۸۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳؍ ۷؍ ۱۴۲۱ھ

بیع میں شرطِ فاسد لگانے کا حکم

سوال [۸۶۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے خالد سے ایک زمین دس لاکھ روپئے میں خریدی، دو لاکھ روپئے زید نے خالد کو دے دیئے، باقی آٹھ لاکھ روپئے کے بارے میں خالد نے زید کو یہ سہولت دی کہ آپ یہ آٹھ لاکھ روپئے ۲۰۱۵ء تک یعنی پانچ سال کے اندر اندر ادا کر دینا، چاہے تھوڑا تھورا کر کے چاہے یکبارگی دونوں بخوشی اس بیع اور معاملہ پر رضامند ہو گئے، پھر خالد جو بائع ہے، یوں کہتا ہے کہ اگر آپ نے یعنی زید نے اگر پانچ سال کے اندر اندر یہ آٹھ لاکھ کی رقم ادا نہیں کی اور زید پھر منع کرنے لگے کہ میں زمین نہیں لیتا مجھ سے آٹھ لاکھ کی رقم ادا نہیں ہو پا رہی ہے، تو خالد کہتا ہے کہ میں پانچ سال کے بعد زمین کی جو قیمت ہوگی وہ قیمت لگاؤں گا؛ کیوں کہ پانچ سال تک میری زمین آپ کو بیچنے کی وجہ سے بیکار پڑی رہی اور اس قیمت کو میں آپ کی دی ہوئی دو لاکھ کی رقم سے وضع کرلوں گا، خالد کی اس بات پر زید رضامند ہو گیا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا خرید وفروخت کی یہ شکل درست ہے، خالد کا یہ شرط لگانا اور زید کا اس پر رضامند ہو جانا درست ہے؟ شرعاً جو فیصلہ ہو تحریر فرمائیں۔

المستفتی: جلال الدین کملائی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: سوال میں خرید وفروخت سے متعلق جو معاملہ لکھا گیا ہے وہ جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ اس معاملہ کو اس بات پر معلق کیا گیا ہے کہ پانچ سال میں اگر

زید بقیہ آٹھ لاکھ روپیہ ادا نہ کر سکے تو زمین کی طے شدہ قیمت (دس لاکھ روپیہ) باقی نہیں رہے گی؛ بلکہ پانچ سال کے بعد مذکورہ زمین کی جو قیمت ہوگی وہی قیمت ادا کرنی ہوگی اور وہ قیمت مجہول ہے؛ لہٰذا یہ معاملہ بیع فاسد اور واجب الاسترداد ہے اور جو دو لاکھ روپیہ ادا کیا گیا ہے اس کو پورا کا پورا واپس کرنا لازم ہوگا۔ اور پانچ سال کے بعد اگر طرفین آپسی رضامندی سے نئے سرے سے دوسرا معاملہ کرتے ہیں، تو اس کی اجازت ہے۔

عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده أن النبي ﷺ نهى عن بيع وشرط. الخ (مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٨٥، نصب الرأية ٤/ ٤٣، المعجم الأوسط، دارالفكر ٣/ ٢١١، رقم: ٤٣٦١)

والأثمان المطلقة لا تصح إلا أن تكون معروفة القدر والصفة ...... هذه الجهالة تفضي إلى المنازعة، وكل جهالة هذه صفتها تمنع الجواز هذا هو الأصل. (هداية، كتاب البيوع، اشرفي ٣/ ٢٠-٢١)

عن عمرو بن عوف المزني، عن أبيه، عن جده، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: -إلى- والمسلمون على شروطهم، إلا شرطا حرم حلالا، أو أحل حراما. (سنن الترمذي، أبواب الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله ﷺ في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ١/ ٢٥١، دارالسلام، رقم: ١٣٥٢، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١٧/ ٢٢، رقم: ٣٠)

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلك لما حرم الله مال المسلم على المسلم. (مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣، مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ ذی قعدہ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۲۲۰)

بیع واجارہ بیک وقت شئ واحد میں کرنے کا حکم

سوال [۸۶۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سمرن نامی ایک کمپنی ہے جو فارم والے کو مرغی کا بچہ دیتی ہے، بچہ کا بھاؤ بیس روپیہ پچاس پیسہ طے کرتی ہے، چاہے بازار میں اس سے کم بھاؤ ہو یا زیادہ ہو اور ساتھ میں اس بچہ کے متعلق دوائی کا خرچ اور دانہ وغیرہ تمام خرچ کمپنی کے ذمہ ہوتا ہے۔ اور فارم والے کا فارم پانی لائٹ اور محنت ہوتی ہے، کمپنی کی طرف سے فارم والے کو اس کی محنت کی اجرت دے دی جاتی ہے، مگر اس کے لئے چند شرائط ہوتی ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) مرغی کے ایک کلو وزن کے ساتھ دانہ ایک کیلو ۸۵/گرام استعمال ہونا چاہئے اور لوگوں کا تجربہ یہ ہے کہ اتنی مقدار دانے میں مرغی کا وزن ایک کیلو ہو جاتا ہے، دانہ کی مقدار طے کر دینے کی وجہ یہ ہے کہ اگر چھوٹ دے دی جائے تو بعض فارم والے دانہ کی چوری کر کے بازار میں بیچ دیتے ہیں۔

(۲) اگر مرغی کا ایک کلو وزن ۴۸/روپیہ ۲۵/ پیسے تک ہوا تو فارم والے کو ہر کیلو پر ۳/روپیہ ۸۰/ پیسہ اجرت ملے گی۔ اور اگر اس سے کم خرچ میں تیار ہوا تو ہر ایک روپیہ کم خرچ ہونے پر مزید ۳۰/ پیسہ اجرت ملے گی۔ اور اگر ۴۸/روپیہ ۲۵/ پیسہ سے زیادہ خرچ لگ گیا تو ہر ایک روپیہ زائد ہونے پر ۳۰/پیسہ کم ہو جائے گا۔

(۳) پھر اگر کمپنی کو مارکیٹ میں ایک کیلو کا بھاؤ ۵۵/روپیہ سے زائد ملا تو ہر ایک کلو پر کمپنی مزید ۱۰/ پیسہ انعام دے گی۔

(۴) مال اٹھاتے وقت جس قدر مرغیاں ہوں گی، فقط ان ہی کی اجرت ملے گی، اگر کسی وجہ سے کچھ مرغیاں مرگئی تو مری ہوئی مرغیوں کی اجرت نہیں ملے گی، چاہے مال اٹھانے کے ایک گھنٹہ قبل ہی مری ہوں۔

سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا طریقہ پر کمپنی کے ساتھ معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز نہیں ہے تو جواز کی کیا شکل ہے؟

المستفتی: مولانا مجاہد ڈینڈ رولوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ پر بار بار غور کیا گیا اور بعض مرغی فارم چلانے والوں سے براہ راست تبادلہ خیال کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ اس طرح کا معاملہ مرغی فارم چلانے والے کو بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ اور بیس روپیہ پچاس پیسے ہر بچہ کی قیمت شمار کی گئی اور ایک مہینہ یا پینتیس دن تک ان کی دیکھ ریکھ پرورش کرنے کے لئے تین روپیہ تیس پیسہ فی بچہ اجرت طے کی گئی، تو سب سے تضادیوں پیش آیا کہ شروع میں بیع کی بات سمجھ میں آرہی ہے اور آخر میں اجارہ کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ اور بیع واجارہ بیک وقت شئ واحد میں جائز نہیں ہے۔ اور اس میں کچھ شرائط مجہول اور متردد فیہ لگائی گئی ہیں:

(۱) اگر مرغی کا ایک کیلو وزن ۴۸/روپیہ ۲۰/ پیسہ تک ہوا تو فارم والے کو ہر کیلو پر ۳/روپیہ ۸۰/ پیسے اجرت ملے گی۔ اور اگر اس سے کم خرچ میں تیار ہوا تو کم خرچ ہونے پر ۳۰/ پیسہ مزید اجرت ملے گی۔ اور اگر ۴۸/روپیہ ۲۵/ پیسہ سے زائد خرچ لگ گیا تو ہر روپیہ زائد ہونے پر ۳۰/ پیسہ کم ہو جائیں گے۔ اور پھر کمپنی کو مارکیٹ میں ایک کیلو کا بھاؤ ۵۵/روپیہ سے زائد ملا تو کمپنی فی کیلو پر دس پیسہ انعام دے گی، یہ سب امر متردد فیہ ہیں، جن کی وجہ سے یہ معاملہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

عن عبداللّٰہ بن مسعود –رضی اللّٰہ عنہ– قال: نہی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن صفقتین في صفقۃ. (مسند أحمد بن حنبل ۱/ ۳۹۸، رقم: ۳۷۸۲، مسند البزار، مکتبۃ العلوم والحکم ۵/ ۳۸٤، رقم: ۲۰۱۷)

ومنہا: أن یکون المبیع معلوما، والثمن معلوما علما یمنع من المنازعۃ، فالمجہول جہالۃ مفضیۃ إلیہا غیر صحیح. (البحرالرائق،

كتاب البيوع، كوئٹه ٥/ ٢٦٠، زكريا ٥/ ٤٣٦، هندية، زكريا قديم ٣/ ٣، جديد ٣/ ٦، شامي، زكريا ٧/ ١٥، كراچی ٤/ ٥٠٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٣/ ٤٣)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح:	کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ	۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ
۱۴۳۳/۵/۷ھ	(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۶۸۲/۳۹)

معدوم کی بیع کا حکم

سوال [۸۶۷۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل ایک کمپنی ایم سی ایکس کے نام سے زور شور سے چل رہی ہے، اس کا پورا نام ''میلٹی کموڈیٹی ایکسچینج'' ہے اس کا ہیڈ کواٹر بمبئی میں ہے اور اس کی آفسیں پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور ان تمام برانچ آفسوں میں کمپنی کے افراد متعین ہیں اور ہر آفس میں کمپیوٹر بھی لگا ہوا ہے، اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ ملکی اور بین الاقوامی مارکیٹوں میں اشیاء کا بھاؤ کیا ہے وہ اپنے کمپیوٹر میں انٹرنیٹ کے ذریعہ سے درج کروالیتا ہے، مثلاً سونا، چاندی، تابنا، پیتل، گیہوں، چاول، پیپل منٹ کا تیل وغیرہ مختلف اشیاء کا ملکی اور بین الاقوامی بھاؤ معلوم کر کے کمپیوٹر اسکرین پر درج کردیا جاتا ہے۔ اور کمپنی کے پاس ان اشیاء میں سے کوئی چیز نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی یہ کمپنی کسی چیز کی مالک ہوتی ہے، بس اس کا کام صرف اتنا ہے کہ دنیا بھر کی چیزوں کا بھاؤ اپنی اسکرین پر درج کردے۔ اور دوسرا کام یہ ہوتا ہے کہ اپنے ورکروں کے ذریعہ سے اور اپنی برانچ آفسوں کے ذریعہ سے عام لوگوں کو اس کمپنی میں شرکت کی دعوت دیتی ہے۔ اور اس کی شرکت کی شکل یہ ہے کہ کم سے کم پندرہ ہزار روپئے پہلی بار آفس میں جمع کریں اور یہ طے کر کے جمع کریں کہ کمپیوٹر اسکرین میں مختلف اشیاء کا جو بھاؤ آرہا ہے پندرہ ہزار روپئے میں ان میں سے کوئی چیز زبانی خریدلیں کہ جو پندرہ ہزار روپئے ہم نے

آپ کو دیا ہے، اس کی ہم مثلاً چاندی خرید لیتے ہیں، مثلاً اس وقت ڈیڑھ کلو چاندی پندرہ ہزار روپئے میں مل سکتی ہے اور اسکرین میں چاندی کا بھاؤ آیا ہے کہ دس ہزار روپئے کلو ہے، تو ہم وہیں بیٹھے بیٹھے آفس میں جس آدمی کو پندرہ ہزار روپے دیتے ہیں اس سے ہم یہ کہہ دیں کہ ہم نے آپ سے ڈیڑھ کلو چاندی خرید لی اور وہ اسکرین اسی طرح گھومتی رہے گی، حالاں کہ اس کے پاس چاندی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ملکیت میں ہے، اور مثلاً شام کو چاندی گیارہ ہزار روپئے بن گئی ہے تو ہمارے ڈیڑھ کلو کی قیمت ساڑھے سولہ ہزار بن گئی ہے، ہم اسی وقت آفس کے ذمہ دار سے یہ کہہ کر کے ساڑھے سولہ ہزار روپئے لے سکتے ہیں کہ ہم نے آپ کے ہاتھ چاندی بیچ دی ہے، ہمیں ساڑھے سولہ ہزار روپئے دے دو، اسی طرح اگر چاندی کا بھاؤ گھٹ گیا ہے، تو وہ ہمیں اتنا گھٹا کر دے گا جتنا بھاؤ گھٹ گیا ہے، یہی اس اسکیم اور کمپنی کا خلاصہ ہے، حالاں کہ کمپنی کے پاس نہ تو چاندی موجود ہے اور نہ ہی کمپنی اس کی مالک ہے، بس صرف بین الاقوامی یا ملکی قیمت اس کی اسکرین پر آتی رہتی ہے، تو کیا شریعت میں اس طرح کی تجارت اور لین دین جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد قربان، خادم مدرسہ فیض العلوم، تھانہ بٹن رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب یہ کمپنی کسی چیز کی مالک نہیں ہے اور نہ ہی کوئی چیز اس کے پاس موجود ہے اور نہ کمپنی کا ارادہ خریدکران اشیاء کو اپنی ملکیت میں لانے کا ہے اور نہ ہی کمپنی حقیقی مالک اور خریدار کے درمیان مذکورہ اشیاء کے فروخت کروانے اور خریدوانے کا حقیقی معنی میں واسطہ ہے؛ بلکہ یہ ایسا ہے جیسے ہاتھی کے دانت ہیں دکھانے کے اور ہیں کھانے کے لئے دوسرے ہیں، اس لئے ایسا معاملہ شریعت میں شروع سے آخر تک جائز نہیں ہے۔

عن حكيم بن حزام –رضي الله عنه– قال: نهاني رسول الله ﷺ أن أبيع ماليس عندي. (سنن الترمذي، البيوع، باب ماجاء في كراهية بيع ما ليس عندك، النسخة الهندية ١/ ٢٣٣، دارالسلام، رقم: ١٢٣٣)

وبيع ما ليس في ملكه لبطلان بيع المعدوم وماله خطر العدم (درمختار) وفي الشامية: قوله: لبطلان بيع المعدوم: إذ من شرط المعقود عليه أن يكون موجودا مالا متقوما مملوكا في نفسه، وأن يكون ملك البائع فيما يبيعه لنفسه، وأن يكون مقدور التسليم. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب الآدمي مكرم شرعا ولو كافرا، زكريا ۷/ ۲٤٦، كراچی ٥/ ٥٨-٥٩، البحرالرائق، زكريا ٥/ ٤٣٥، كوئٹه ٥/ ٢٦٠، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣٣٩، كراچی ٥/ ٤٦، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ١٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍محرم الحرام ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۲ ۹۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۱/۱۹ھ

''بیع منابذہ''

سوال [۸۶۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک کام یہاں ہوتا ہے کہ کئی آدمی مل کر ایک جگہ روپیہ جمع کراتے ہیں، پھر وہ انعام کے طور پر قرعہ اندازی کرتے ہیں اور اس میں کسی کے نام کولر، کسی کے نام ریڈیو، کسی کے ٹیلی ویژن، کسی کے اسکوٹر، کسی کے کپڑا دھونے کی مشین نکلتی ہے، کئی چھوٹے بڑے انعام اوروں کے بھی نکلتے ہیں، ایسی صورت میں یہ سب کام جائز ہے یا ناجائز؟

المستفتی: حاجی ماسٹر علی محمد جھن جھنوں، راجستھان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مذکورہ معاملہ اور اسکیم بیع منابذہ اور بیع القاء الحجر ہونے کی وجہ سے ناجائز اور باطل ہے، جس کو شریعت نے قطعی طور پر حرام قرار دیا ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله صلى الله عليه وسلم

نهى عن الملامسة والمنابذة. (صحيح مسلم، البيوع، باب إبطال بيع الملامسة والمنابذة، النسخة الهندية ٢/ ١، بيت الأفكار، رقم: ١٥١١)

ولا يجوز البيع بإلقاء الحجر، والملامسة، والمنابذة. (هداية، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، أشرفي ٣/ ٣٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ ر رجب المرجب ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۳۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/ ۷/ ۱۴۲۲ھ

کمیٹی کا خریدار سے متعینہ رقم سے زیادہ کا مطالبہ کرنا

سوال [۸۶۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے شہر کھر گون میں عامة المسلمین کی ایک منتخب کمیٹی (جماعت اصلاح المسلمین) ہے، جو قومی وملی خدمات انجام دیتی ہے، مذکورہ جماعت شہر میں مکاتب بھی چلاتی ہے، قوم وملت کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اصلاحات کرنا اور وقت اور موقع کی نزاکت کے اعتبار سے قوم وملت کی صحیح رہنمائی کرنا وغیرہ اس جماعت کے اہم مقاصد ہیں۔

جماعت کو اپنے دینی، قومی وملی پروگرام منعقد کرنے کے لئے ایک جماعت خانہ (بڑے ہال) کی اشد ضرورت تھی، اس اہم ضرورت کی تکمیل کے لئے جماعت نے باتفاق رائے یہ طے کیا کہ جماعت کے پاس جو کھیت ہے اس میں پلاٹ کاٹ دئے جائیں اور آسان قسطوں پر عام غریب مسلمانوں کو فروخت کر دیئے جائیں اور اس سے حاصل ہونے والی رقم سے جماعت خانہ تعمیر کیا جائے، تاکہ بے گھر غریب مسلمانوں کو گھر مل جائیں اور جماعت خانہ کی تعمیر بھی انجام پذیر ہو سکے گی۔

آج سے تقریباً ۱۸ ر سال قبل جماعت نے اپنے کھیت میں ۲۳۷ ر پلاٹ کاٹے تھے مختلف قسم کے مختلف سائز کے پلاٹ کاٹے اور مسلمانوں کو فروخت کر دئے، مثلاً -/18,000

-/6,000 -/8,000 -/10,000 آسان قسطوں پر فروخت کئے شروع میں قسطیں جمع کرواتے رہیں، مگر جماعت کی باڈی ہر تین سال میں بدلنے چینج ہونے کی وجہ سے قسطوں کا جمع کرنے اور کروانے کا سلسلہ ختم ہوگیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ہی لوگوں کی قسطیں پوری جمع ہوسکیں اور اکثر قسطیں باقی رہ گئیں، کسی کی کم تو کسی کی زیادہ۔

پلاٹ کے خریداروں نے کئی مرتبہ جماعت کے صدر، سکریٹری سے درخواست کی کہ ہماری قسطیں جمع کرلی جائیں اور پلاٹ کی رجسٹری کروادی جائے؛ لیکن کسی بھی صدر نے اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا، تادم تحریر صرف ۱۴-۱۵/ پلاٹوں کی رجسٹری ہی ہوسکی ہے۔

ماضی کی طرح موجودہ باڈی سے بھی پلاٹ کے خریداروں نے درخواست کی کہ قسطیں جمع کرکے رجسٹری کروادی جائے اور ہمارے پلاٹوں پر ہمیں قبضہ دیا جائے، الحمدللہ موجودہ باڈی نے ہماری درخواست کو قبول کرتے ہوئے ایک میٹنگ بلائی، مگر استغفر اللہ جماعت نے ایک بے جا اور بے تکا فیصلہ لے کر پلاٹ کے خریداروں کو بہت ہی مایوس کیا ہے۔

زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے عرض ہے کہ جماعت نے یہ فیصلہ لیا ہے کہ چونکہ پلاٹوں اور زمین کی قیمت آسمان چھو رہی ہے؛ اس لئے فی الحال زمین کے جو بھاؤ اور ریٹ چل رہے ہیں اس اعتبار سے پلاٹ کی قیمت ادا کی جائے، جماعت کے اس فیصلہ کے مطابق مثلاً -/6,000 کے پلاٹ کی قیمت ایک لاکھ روپے -/8,000 والے کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپے -/10,000 اور -/18,000 والے کی ۲/ڈھائی تین لاکھ روپے اب ادا کرنی ہوگی۔ عرض یہ ہے کہ پلاٹ کی قیمت کئی گنا اضافے کے ساتھ ادا کرنی ہوگی، جب ہی پلاٹ پر قبضہ ہوسکے گا، اور تعجب تو یہ ہے کہ جماعت اس اضافی رقم کو امداد اور تعاون کا لبادہ پہنا کر قوم کو لبھا رہی ہے اور قوم کو اپنی بات منوا کر اپنے فیصلہ کو برقرار رکھنے میں مصروف ہے۔ اور کہتی ہے کہ یہ اضافی رقم امداد ہے، جس سے قوم کے کام انجام دئے جائیں گے۔

جماعت کے اس فیصلے سے عوام میں کافی بے چینی اور انتشار کی صورت حال پیدا ہوگئی ہے، دن بدن ٹکراؤ کے حالات بن رہے ہیں۔ غور طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) ۱۸؍سال قبل جماعت نے جو پلاٹ فروخت کئے تھے، اس کی قیمت آج کئی گنا ہوگئی ہے، تو کیا جماعت کو شرعاً حق ہے کہ وہ موجودہ قیمت پر خریداروں سے رقم وصول کریں؟

(۲) جماعت اس اضافی رقم کو امداد کا نام دے رہی ہے، تو شرعی نقطہ نظر سے یہ امداد ہوگی اور امداد لینے کا یہ طریقہ کس زاویے سے درست ہے؟ جتنی جلدی ممکن ہو تسلی و تشفی بخش جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں عنایت فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں، نوازش ہوگی۔

المستفتی: عبدالرشید انصاری کھرگون

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں اٹھارہ سال پہلے جو پلاٹ جس قیمت پر فروخت ہوئے تھے، کمیٹی کے لئے اس متعینہ رقم سے زیادہ وصول کرنا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر پوری رقم ادا کرنے کے لئے ایک مدت متعین ہوچکی تھی اور اس وقت پر ادائیگی نہیں کی گئی تو ایسی صورت میں کمیٹی کے لئے گذشتہ عقد کو ختم کرکے از سر نو کسی بھی رقم پر فروخت کرنا درست ہوگا۔ (مستفاد: احسن الفتاوی ۶/ ۵۰۶)

ولأنه لما تعذر استيفاء الثمن من المشتري فات رضا البائع، فيستبد بفسخه. (هداية آخرين، كتاب القضاء، باب التحكيم، أشرفي ۳/ ۱۴۷، البحرالرائق، كوئٹه ۷/ ۳۶، زكريا ۷/ ۶۱)

إذا تبايعا على أن يؤدى المشتري الثمن في وقت كذا وإن لم يؤده فلا بيع بينهما صح البيع –إلى قوله– إذا لم يؤد المشتري الثمن في المدة المتعينة كان البيع الذي فيه خيار النقد فاسدا، ولكل من العاقدين فسخه، إذا بقي المبيع على حاله. (شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ۱/ ۱۶۶، رقم المادة: ۳۱۳-۳۱۴) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۰۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۱۳/۵/۱۴۳۴ھ

دوسرے کی زمین فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے ایک مکان تقریباً پندرہ وبیس سال پہلے اپنے ماموں سے خریدا تھا، جس میں ایک زینہ آمد ورفت کا ہے جو کہ میرے استعمال میں ہے، مگر اب آ کر مجھ پر واضح ہوا ہے کہ وہ زینہ پڑوسی کے آنچک میں بنا ہوا ہے، ان کے اور پڑوسی کے بیچ میں مقدمہ بازی بھی ہوئی تھی، جس کے تصفیہ میں یہ لکھا ہے کہ ان کو زینہ کا حق تصرف حاصل تھا، نہ کہ ملکیت آج وہ وہ جگہ میرے استعمال میں ہے، کیا ان کو وہ جگہ بیچنے کا حق تھا؟

(۲) اب جب کہ وہ مکان میری ملکیت ہے اور مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس جگہ کا صرف حق تصرف تھا، حق ملکیت نہیں تو وہ جگہ میرے لئے جائز ہے اگر نہیں تو کیا کرنا چاہئے؟

المستفتی: کرامت علی ۲۴ / پرگنہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب وہ زمین پڑوسی کی ہے اور اس کا آپ کے ماموں کو استعمال کے لئے دینا آپ پر ایک احسان ہے، آپ کے ماموں کو فروخت کرنے کا حق نہیں ہے؛ اگر فروخت کر دیا ہے تو پڑوسی کو اپنا حق واپس لے لینے کا حق ہے۔

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلك لما حرم الله مال المسلم على المسلم.

(مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

عن أبي حرة الرقاشي، عن عمه، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل مال رجل مسلم لأخيه، إلا ما أعطاه بطيب نفسه. (السنن الكبرى للبيهقي، باب أهل البغي إذا فاؤا، دارالفكر ١٢/ ٣٥٢، رقم: ١٧٢٢٤)

لا يجوز لأحد أن يتصرف في ملك الغير بغير إذنه. الخ. لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. الخ (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ١١٠،

رقم: ۲٦۹- ۲۷۰، شرح المجلة رستم، مکتبه اتحاد ۱/ ٦۱-٦۲، رقم المادة: ۹٦-۹۷)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍رجب ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۱۳/۳۵۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۳؍۷؍۱۴۱۴ھ

دوسرے کی دوکان اپنی بنا کر فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸٦۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے والد احمد نبی خان ولد عبد الغنی خان نے ایک قطعہ دوکان اپنے انتقال کے بعد چھوڑی۔ اور زید کے والد مرحوم کے زید سمیت دولڑکے، دولڑکیاں، چار بچے تھے، جواس دوکان کے شرعاً مالک ہوگئے تھے، اس کے بعد زید کے چچا نیاز احمد خان ولد عبد الغنی خاں نے زید سمیت چاروں بہن بھائی سے یہ کہہ کر کہ تم کو دوکان سے زیادہ آمدنی ہوجاوے گی، میں دوکان کو دوبارہ تعمیر کرا کر دے دوں اور جب تک میرا لگا ہوا تعمیر میں روپیہ وصول ہوگا دوکانوں کا کرایہ اس وقت تک میں وصول کرتا رہوں گا، جب تک میرا لگا ہوا پیسہ کل وصول ہوگا اس کے بعد کرایہ داروں سے کرایہ آپ لوگوں کو دلوا دوں گا، ہم چاروں نے ان کو اپنا چچا سمجھتے ہوئے اجازت دے دی، تعمیری کام شروع ہوگیا، اسی دوران ہم کو معلوم ہوا کہ چچا نے خود کو مالک بتا کر نقشہ بنوایا ہے، تب ہم نے ان سے معلوم کیا تب انہوں نے یہ کہا کہ میں تمہارا چچا ہوں، تم اگر چاہو تو میں تم کو اقرار نامہ کرا دوں؛ لہٰذا انہوں نے چاروں کے مالک رہنے کا اقرار نامہ لکھا دیا جو کہ زید کے پاس موجود ہے؛ لیکن چچا نے ان دوکانوں کو اپنی بیٹی رخسانہ کو بیچ دیا، جب کہ وہ مالک ہی نہیں تھے، اب چچا کا انتقال ہوگیا ہے، ایسی صورت میں کون مالک ہوا؟

المستفتی: راحت جان جامع مسجد روڈ مغل پورہ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر ایسا واقعہ ہے جیسا کہ سوال نامہ میں درج ہے، تو اس دوکان کا مالک نیاز احمد نہیں ہے اور نہ ہی اس کو فروخت کرنے کا حق ہے؛ بلکہ احمد نبی خان کی مذکورہ اولاد ہی مالک ہوں گی اور انہیں کو قبضہ دے دینا لازم ہوگا۔ اور ان کے چچا نیاز احمد خان کا فروخت کرنا صحیح نہیں ہے؛ البتہ چچا نے جتنا خرچ کیا وہ لے سکتا ہے۔

عن أبي حرة الرقاشي، عن عمه، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (شعب الإيمان للبيهقي، باب في قبض اليد عن الأموال المحرمة، دارالكتب العلمية بيروت ٤ / ٣٨٧، رقم: ٥٤٩٢)

لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. الخ (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ١١٠، رقم: ٢٦٩، شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ١ / ٦٢، رقم المادة: ٩٧، هندية، زكريا قديم ٢ / ١٦٧، جديد ٢ / ١٨١، مجلة الأحكام العدلية ١ / ٢٧، رقم: ٩٧)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸؍شوال ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۴۷۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۱۰/۲۸ھ

دوسرے کی چیز بلا اجازت فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۷۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک پتھر کی کان کا مالک ہے، عمرو خریدار نے ۲۰؍روپیہ کے حساب سے کٹ سائز کے پیسے ادا کردئے اور زید نے قبول کرتے ہوئے کہا کہ کان سے پتھر نکلتے ہی اس کو کٹ سائز کے اعتبار سے کٹوا کر اور اس کی ٹائلیں بنا کر آپ کے حوالہ کردوں گا، اب جب پتھر کان سے باہر آتا ہے، تو زید بجائے اس کی ٹائلیں بنانے کے دوسرے شخص بکر کے ہاتھوں دوگنی

قیمت میں بیچتا ہے (قطع نظر اس سے کہ بکر کو اس پتھر کے بکے ہوئے ہونے کا علم تھا یا نہیں) اور زید عمرو مشتری اول کو کہتا ہے کہ ۲۵/روپیہ کے اعتبار سے تمہارا حصہ رکھ کر پر وفٹ سمیت تمہیں دے دوں گا اور باقی منافع میں رکھوں گا، تو کیا زید کا مشتری اول عمرو کی اجازت سے پتھر کو بیچنا اور اسکوائر فٹ ۵/روپیہ کا منافع عمرو کو دے کر باقی خود رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر بحکم شرع زید کے لئے منافع رکھنا جائز نہیں ہو تو عمرو نے جو پر وفٹ ۵/روپیہ کا منافع لیا ہے وہ اس کے لئے حلال رہے گا یا نہیں؟

المستفتی: محمد رمضان، مکرانوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: طے شدہ عقد کے مطابق وہ پتھر عمرو ہی کی ملکیت ہے؛ لہٰذا عمرو کی ملکیت کی چیزوں کو زید نے اس کی اجازت کے بغیر جو فروخت کیا ہے، اس کی تلافی کی دو شکلیں ہیں: پہلی شکل یہی ہے کہ جتنے میں فروخت کیا ہے وہ سارا پیسہ عمرو کے حوالہ کردے، ہاں البتہ اس میں زید عمرو سے اتنا مطالبہ کرسکتا ہے کہ فروخت کرنے کے محنتانہ کے طور پر کچھ اجرت زید کو مل جائے یہ بھی عمرو کی طرف سے تبرع ہوگی، لازم نہیں ہوگی۔ دوسری شکل یہ ہے کہ عمرو کے جو پتھر زید نے فروخت کردیئے ہیں بعینہٖ اسی صفت اور اسی معیار کے اتنے پتھر زید عمرو کے حوالہ کردے، چاہے اسی کان میں سے یا دوسری جگہ سے خرید کر۔

عن أبي حرة الرقاشي، عن عمه، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (مسند أبي يعلى الموصلي، دارالكتب العلمية بيروت ۲/ ۹۱، رقم: ۱۵۶۷، مسند أحمد بن حنبل ۵/ ۷۲، رقم: ۲۰۹۷۱، سنن الدار قطني، كتاب البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۲۲، ۲۸۶۲-۲۸۶۳)

ليس لأحد أن يأخذ مال غيره بلا سبب شرعي. (شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ديوبند ۱/ ۶۲، رقم المادة: ۹۷)

وإن أخذه ولو على ظن أنه ملكه وجب عليه رده علينا، إن كان قائما

وإلا فيضمن قيمته إن كان قيما، ومثله إن كان مثليا . (شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ديوبند ١/ ٦٢، رقم المادة: ٩٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۵؍ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر:۳۹/ ۱۰۶۶۹)	۱۴۳۳/۴/۲۵ھ

لون کے رکشہ فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) میں ایک رکشہ ایجنٹ ہوں، نیا رکشہ لون کروا کر بیچ سکتا ہوں یا نہیں؟ خریدنے والا ایمان والا ہو یا غیر ایمان والا؟

(۲) اگر خریدنے والا غیر ایمان والا ہے اور جس کے نام پر لون کر رہے ہیں وہ بھی غیر ایمان والا ہو تو اس کو لون کروا کر دینا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) نیا رکشہ اگر کیش میں ایک لاکھ دس ہزار میں پڑتا ہے، اس میں انکم ٹیکس کی پروبلم ہونے کی وجہ سے لوگ لون کی ہی مانگ کرتے ہیں، تو ایسی صورت میں لون کروا سکتے ہیں یا نہیں؟ (۴) جس رکشہ پر لون پہلے سے موجود ہو تو وہ رکشہ خرید کر بیچ سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: محمد عمران یونس پٹھان نمبر ۱۰۱ ر بھوانی پیٹھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) لون پر رکشہ لینے میں تین شکلیں نکلتی ہیں: ایک شکل تو ناجائز اور دو شکلیں جائز ہیں:

(۱) ناجائز شکل: خریدنے والا اگر کمپنی سے از خود ایک لاکھ روپیہ میں رکشہ خریدے اور اس کی قیمت بینک ادا کرے؛ لیکن بینک خریدار سے ایک لاکھ پانچ ہزار روپیہ وصول کرے، تو یہ خریدار کا بینک کو پانچ ہزار روپیہ مزید دینا ناجائز اور حرام ہے۔ اور یہ سود میں داخل ہے۔

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي ﷺ أنه قال: كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربا. (السنن الكبرى للبيهقي، البيوع، باب كل قرض جر منعفة فهو ربا، دارالفكر ٨/ ٢٧٦، رقم: ١١٠٩٢)

عن إبراهيم قال: كل قرض جر منفعة فهو ربا. (المصنف لابن أبي شيبة، البيوع، من كره كل قرض جر منفعة، موسسة علوم القرآن جديد ١٠/ ٦٤٨، رقم: ٢١٠٧٨)

كل قرض جر نفعا فهو حرام. (شامي، البيوع، باب المرابحة والتولية، مطلب كل قرض جر نفعا حرام، زكريا ٧/ ٣٩٥، كراچی ٥/ ١٦٦)

(۲) بیع مرابحہ کی شکل: جو جواز کے دائرہ میں آتی ہے، یہ ہے کہ بینک خریدار کے ساتھ اپنے کسی آدمی کو بھیج دے اور بینک کا آدمی بینک کے لئے ہی ایک لاکھ روپیہ میں کمپنی سے سودا کرے، تو وہ گاڑی بینک کی ہو جائے گی، پھر بینک خریدار کو ایک لاکھ پانچ ہزار روپے میں فروخت کردے، تو یہ شکل شرعاً جائز ہے۔

عن أبي بحر عن شيخ لهم، قال: رأيت على علي رضى الله عنه إزارا غليظا، قال: اشتريت بخمسة دراهم، فمن أربحني فيه درهما بعته إياه.

(السنن الكبرى للبيهقي، البيوع، باب المرابحة، دارالفكر ٨/ ٢٢٩، رقم: ١٠٩٤٤)

المرابحة بيع بمثل الثمن الأول، وزيادة ربح (إلى قوله) جائز.

(عالمگيري، زكريا قديم ٣/ ١٦٠، جديد ٣/ ١٥٦، معجم لغة الفقهاء، كراچی، ص: ٤٢٠، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٥/ ١٨٣، رقم: ١٢٧٢٩)

(۳) وکالت کی شکل: یہ بھی جواز کے دائرہ میں آتی ہے کہ بینک خریدار کو اپنا وکیل بنا دے، پھر وہی شخص رکشہ کو کمپنی سے خرید کر بینک کے حوالہ کردے، پھر بینک اس رکشہ کو ایک لاکھ پانچ ہزار روپیہ میں فروخت کردے، تو یہ صورت بھی شرعاً جائز ہے۔ اور اخیر کی ان دو صورتوں کے مطابق اگر بینک سے رکشہ کا لون کرایا جائے تو درست ہے، ورنہ نہیں۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۱۳۵، انوار رحمت، ص: ۲۱۲، ایضاح النوادر ۱/ ۱۰۷)

(۲) اگرخریدنے والا غیر مسلم ہواور جس کے نام لون کرایا جائے وہ بھی غیر مسلم ہو، تو ایسی صورت میں ان کے حق میں یہ معاملہ درست ہے۔اور آپ کے لئے لون کرانا جب کہ خرید نے والا اور بینک کے تمام ذمہ دار غیر مسلم ہیں،تو جائز اور درست ہے۔

فهذا عمر قد أجاز لأهل الذمة ببيع الخمر والخنازير، وأجاز للمسلمين أخذ أثمانها. (إعلاء السنن، البيوع، باب حرمة بيع الخمر والخنزير والأصنام، دارالكتب العلمية بيروت ١٤/ ١٣٥، كراچی ١٤/ ١١٢، أنوار رحمت/ ١٩٤)

(۳) انکم ٹیکس کی مجبوری ہے،تو ایسی صورت میں مرابحہ اور وکالت کی شکلیں اختیار کریں جو جواب نمبر ا ر کی شکل نمبر ۲ ر اور نمبر ۳ ر میں موجود ہے۔

(۴) اگرلون کرتے وقت لون کی صراحت کردی گئی ہوتو کوئی دھوکہ دہی نہیں ہے، مگر ایک سودی معاملہ میں شامل ہونے کی بناپر گنہگار ہوگا۔

عن جابر –رضي الله عنه– قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربو ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، باب لعن أكل الربا وموكله، النسخة الهندية ٢/ ٢٧، بيت الأفكار، رقم: ١٥٩٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ر رجب ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۰۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۶/ ۷/ ۱۴۲۷ھ

سامان نہ ملنے پر ۴۵ ر سو کی جگہ چھ ہزار لینے کا حکم

سوال [۸۶۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید پتھر کی کان کا مالک ہے،عمرو نے زید کی کان میں جمے ہوئے پتھر کا ناپ چوک کرتے ہوئے کہا کہ میں یہ پتھر -/4,500 میں خریدتا ہوں اور پیسے دے دئے، زید نے قبول کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں نے یہ پتھر وقت مقررہ پر آپ کے حوالہ نہ کیا تو آپ کو

6,000/- روپیہ دے دوں گا، دھیان رہے کہ ایک پتھر جو کان میں جما ہوا ہوتا ہے، اس کو باہر آنے میں تقریباً دو تین مہینہ لگ ہی جاتے ہیں اور باہر آنے کے بعد وہی پتھر جو جمے ہوئے ہونے کی حالت میں 4,500/- کا تھا، چھ ہزار یا سات ہزار میں بکتا ہے، ان ہی باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے، زید نے خود ہی کہا تھا کہ اگر میں نے وقت مقررہ پر آپ کے حوالہ نہ کیا تو میں آپ کو ۶۰۰۰ ر ہزار روپئے دے دوں گا، تو کیا عمرو کا ۴۵۰۰ ر روپئے دے کر ۶۰۰۰ ر روپئے لینا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ جب کہ عمر نے ۴۵۰۰ ر روپئے کے اوپر کا جو منافع ہے، ڈیڑھ یا دو ہزار اس کو حاصل کرنے کے لئے ہی زید کو تین مہینہ پہلے ۴۵۰۰ ر روپئے دیئے تھے۔

المستفتی: محمد رمضان مکرانوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سوال میں ذکر کردہ صورت میں عمرو کے دیئے ہوئے ۴۵۰۰ ر روپئے کے بدلے ۶۰۰۰ ر روپئے لینے میں ۱۵۰۰ ر روپئے سود ہو جائیں گے، اور نقصان سے بچنے کی شکل یہ ہے کہ طے شدہ پتھر ہی وصول کرلیں۔ (احسن الفتاوی ۶/ ۴۸۱، آپ کے مسائل اوران کا حل ۶/۱۶۴)

فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربى الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به. (تفسير كبير ۷/ ۹۱)

كان الرجل إذا حل ماله على صاحبه يقول المطلوب للطالب: زدني في الأجل، وأزيدك على مالك، فإذا فعل ذلك قيل لهم هذا ربا، قالوا: سواء علينا إن زدنا في أول البيع أو عند محل المال فهما، سواء فأكذ بهم الله تعالىٰ، فقال: ﴿واحل الله البيع وحرم الربوا﴾ (الدرالمنثور، تحت رقم الآية: ۲۷۵ من سورة البقرة، دارالكتب العلمية بيروت ۱/ ۶۴۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ ر ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۶۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/۴/۱۴۳۳ھ

۵۰۰/روپئے کا بل ۴۰۰/روپئے میں فروخت کرنا

سوال [۸۶۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنا غلہ ان شرطوں پر فروخت کیا فی کوئنٹل -/2,200 روپئے نقد -/1,700 روپئے -/500 روپئے دوقسطوں میں ملیں گے۔ -/500 روپئے ملنے میں دیر ہوگئی، زید کو ضرورت پڑی پیسوں کی تو زید نے -/500 روپئے کا بل بیچ دیا، حارث نے زید کے غلہ کا بل -/400 روپئے میں خریدا، حارث کا کم قیمت میں بل خریدنا یعنی -/500 روپئے کا بل -/400 روپئے میں خریدنا شریعت کی نظر میں کیسا ہے؟

المستفتی: سیداشرف علی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفیق: زید کا غلہ فروخت کرنے کے بعد پانچ سو روپئے ملنے میں تاخیر ہونے کی بنا پر پانچ سو روپئے کا بل چار سو روپئے میں فروخت کرنا، میعادی چیک کی بیع اور بیع الجامکیہ کے مرادف ہو کرنا جائز وحرام ہوگا۔ اور بیع الجامکیہ کی صورت یہ ہے کہ حکومت کا ملازم یا صاحب وظیفہ جس کو منجانب حکومت مقررہ میعاد پر تنخواہ یا وظیفہ ملتا ہے، وہ کبھی وقت مقررہ سے پہلے ضرورت کی وجہ سے کم پیسے میں اپنی تنخواہ یا وظیفہ فروخت کر دیتا ہے اور خریدار وقت مقررہ پر صاحب وظیفہ کے نام سے پورا وظیفہ وصول کر لیتا ہے، تو حضرات فقہاء نے اس طرح کی خرید وفروخت کو ناجائز اور حرام کہا ہے؛ اس لئے زید کے لئے قبل از وقت کم قیمت میں اپنا بل فروخت کرنا ربا اور سود کی وجہ سے جائز نہ ہوگا۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۳۶)

إن بيع الصک و البراء ة و الجامكية إنما لا يجوز. (إعلاء السنن، کراچی ۱۴/ ۲۴۴، کتاب البیوع، بيع الصك والبراءة والجامكية والنوط، دارالكتب العلمية بيروت ۱۴/ ۲۸۷)

وأفتى المصنف ببطلان بيع الجامكية. (درمختار مع الشامي، البيوع، مطلب في بيع الجامكية، زكريا ۷/ ۳۳، كراچی ٤/ ٥١٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ ر رجب ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۸۸۸۳)

پیمنٹ کی دوسونوے کی پرچی ۲۸۰ رمیں فروخت کرنا

سوال [۸۶۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سرکار نے بینکوں کے لئے ایک کپڑا تیار کرنے کے لئے دیا ہے، جس کو جنتا جوڑا کہتے ہیں، اس کو سرکار اپنے طور پر سینٹر قائم کر کے خریدتی ہے، اس کا سرکاری بھاؤ -/34/5 روپے ہے؛ لیکن اس کا پیمنٹ ۲۲-۳۰ ر دن یا اس سے کم وزیادہ وقت میں آتا ہے۔ زید نے ۲۰ ر جوڑے میٹر پر جمع کئے، جس کی قیمت ۵۹۵ ر روپئے ہیں، سینٹر کے سوت کے چار میٹر ملے، جس کی قیمت ۴۰۰ ر روپئے ہوئی، زید کو وہاں سے پرچی ملی، جس میں ۲۹۵ ر روپئے ملنے باقی ہیں، زید اپنی اس پرچی کو خالد کو ۲۸۰ ر میں اس لئے فروخت کر دیتا ہے کہ پیمنٹ کئی ہفتہ بعد آئے گا، خالد اس لئے خرید لیتا ہے کہ اس کو دس روپئے کا نفع ہو جائے گا، کیا اس طرح کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عثمان غنی داؤد کاندی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح معاملہ شرعاً جائز نہیں ہے، ہاں البتہ گناہ سے بچنے کے لئے حیلہ کیا جاسکتا ہے کہ زید خالد سے ۲۸۰ ر روپئے بنام قرض لے لے اور خالد سے کہہ دے کہ فلاں تاریخ کو اس پرچی کے ذریعہ فلاں سینٹر سے ۲۹۰ ر روپئے وصول کر کے لے آنا، تو اس میں سے ۲۸۰ ر روپئے قرض کا ہوگا اور دس روپئے اس کام کی مزدوری میں تم کو ملے گا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۱۶۹)

ڈیڑھ روپئے فی اشتہار معاملہ طے کرنے کے بعد ایک روپئے میں چھپوانا

سوال [۸۶۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے بکر سے یہ کہا کہ تم جلسہ کے اشتہار چھپوا دوتو بکر بولا کہ ایک اشتہار ڈیڑھ روپئے کا پڑے گا، اس نے کہا ٹھیک ہے چھپوادو، بکر نے چھپوادئے، اشتہار ایک روپئے کا پڑا، تو بکر کا اب اس سے ایک اشتہار کا ڈیڑھ روپئے وصول کرنا کیسا ہے؟ نیز اگر بکر کچھ روپئے بطور بیعانہ کے جمع کروالے تو یہ نفع جائز رہے گا یا نہیں؟ جب کہ بکر ان روپیوں کو بطور امانت الگ رکھ لے اور اپنی رقم صرف کرے، یا اگر اس کی بھی رقم ملا دے تو یہ معاملہ ونفع جائز رہے گا یا نہیں؟

المستفتی: محمد اویس کاسگنج، ایٹہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کے بکر سے کہنے پر کہ تم جلسے کا اشتہار چھپوادو بکر نے کہا کہ ڈیڑھ روپئے میں ایک اشتہار پڑے گا، گویا کہ زید اور بکر کے درمیان یہ معاملہ طے ہوگیا کہ فی اشتہار ڈیڑھ روپئے کے اعتبار سے زید بکر کو دے گا، چاہے زید نے فی اشتہار کچھ بھی خرچ کیا ہو نفع ونقصان کا ذمہ دار زید ہے۔ اور ڈیڑھ روپئے میں دینے کا ذمہ دار بکر ہے؛ لہٰذا اشتہار تیار کرکے زید کو حوالہ کرنے سے پہلے وہ سب اشتہار ضائع ہوجائے یا چوری ہوجائے تو سارا بھگتان بکر کے ذمہ لازم ہے؛ اس لئے اس درمیان میں جو کچھ بھی نفع ہوگا وہ سب بکر کا حق ہے، اور پھر زید کے حوالے کردینے کے بعد پوری ذمہ داری زید کے اوپر آئے گی، نیز بیع نامہ کے طور پر جمع شدہ رقم خواہ الگ رکھے یا اس رقم کو اشتہار کی چھپائی میں صرف کرے، بہرصورت منافع یعنی فی اشتہار ڈیڑھ روپئے لینا درست ہے۔ (ایضاح النوادر ۲۳/۱)

وبدونه فيما فيه تعامل كخف وقمقمة، وطست صح بيعا لا عدة. (تنوير الأبصار، وتحته في الشامية) ثم ينعقد عند الفراغ بيعا بالتعاطي.

(شامي، كتاب البيوع، باب السلم، مطلب في الاستصناع، زكريا ٧/ ٤٧٥، كراچی

٥/ ٤ ٢٢، الفقه الإسلامي وأدلته، دارالفكر ٥/ ٣٦٤٣، هدى انٹر نیشنل دیوبند ٤/ ٢ ٣٩)
فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ صفر ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۷۲۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۶/۲/۲۹ھ

دیوالی پر مسلمان کا آتش بازی کی اشیاء فروخت کرنا

سوال [۸۶۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دیوالی کے موقع پر کیا ایک مسلمان آتش بازی کے سامان کو بطور تجارت فروخت کرسکتا ہے؟

المستفتی: فردوس برگونہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: دیوالی کے موقع پر جو آتش بازی وغیرہ کا سامان فروخت کیا جاتا ہے، اس کی تجارت کو فقہاء کرام نے مکروہ ممنوع لکھا ہے، اس سے بچنا ضروری ہے۔
(مستفاد: فتاویٰ محمودیہ میرٹھ ۲۴/ ۱۶۶)

عن أبي أمامة قال: قال النبي صلى الله عليه وسلم إن الله عز وجل بعثني هدى ورحمة للعالمين، وأمرني بمحق المعازف، والمزامير، والأوثان، والصلب، وأمر الجاهلية –إلى– لا يحل بيعهن ولا شراؤهن، ولا التجارة فيهن، وثمنهن حرام. (مسند أبي داؤد الطيالسي، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٦٣٥-٦٣٦، رقم: ١٢٣٠، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ٨/ ١٩٦، رقم: ٧٨٠٣، مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٢٥٧، ٢٦٨، رقم: ٢٢٥٧١-٢٢٦٦٣)

ونظيره كراهة بيع المعازف؛ لأن المعصية تقام بها عينها. (شامي، كتاب الجهاد، باب البغاة، مطلب في كراهة بيع ما تقوم المعصية بعينه، زكريا ٦/ ٤٢٠، كراچی ٤/ ٢٦٨)

بيع المزامير يكره. (البحرالرائق، كوئٹه ٥/ ١٤٣، زكريا ٥/ ٢٤٠)

ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريما وإلا فتنزيها. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ٩/ ٥٦١، كراچی ٦/ ٣٩١، مطلب في كراهية بيع ما تقوم المعصية بعينه، زكريا ٦/ ٤٢٠، كراچی ٤/ ٢٦٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٢١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍محرم الحرام ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۵۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲؍۱؍۱۴۳۳ھ

گرین وے پشو پالن میں حصہ لینا

سوال [۸٦٨٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ہماری ایک کمپنی (گرین وے پشو پالن) ہے، اس میں اگر کوئی شخص مثلاً ۴۶۰۰؍ روپئے دیتا ہے، تو اس کو دو طرح سے نفع ملتا ہے، فارم ہاؤس سے اور دوسرے اپنے منافع سے، وہ اس طرح کہ ہم جانتے ہیں کہ بکری ہر چھ ماہ میں بیاہتی ہے، سال میں چار بچے دیتی ہے، ہم اس میں سے پچھتر فیصد رکھ لیتے ہیں اور ۲۵؍ فیصد دیتے ہیں، اس طرح تین بکرے ہم رکھ لیتے ہیں اور ایک بکرا یا چھیالیس سو روپئے اس شخص کو دیتے ہیں، جب تک اس کی بکری یا بکری کے بچوں میں سے کوئی بکری رہے گی اس کو ہر سال ایک بکرا ملتا رہے گا۔

(۲) کمپنی دوسرا نفع اپنی آمدنی سے دیتی ہے، جب کمپنی کی آمدنی دوگنی ہوتی ہے، تو وہ آپ کے مقرر حصہ کو دوگنا کر دیتی ہے، مثلاً کمپنی کے پاس سو لوگ ہوں گے، یعنی سو بکریاں فارم ہاؤس چلی جائیں گی تو وہ حساب کرے گی، تو وہ سو لوگوں کو کچھ نہیں دے گی، جب کمپنی دوسری بار دو سو لوگوں پر حساب کرے گی، تو پہلے والے سو لوگوں کو چالیس چالیس روپئے فی آدمی دے گی، اسی طرح ہر دفعہ دوگنی تعداد ہونے پر نفع دوگنا کرتی رہے گی۔

المستفتی: سید یاور علی نگینہ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال میں کمپنی کے کاروبار کی جوصورت بیان کی گئی ہے کہ آدمی ۴۶۰۰/روپئے جمع کرے اوراس قیمت کی بکری لے کر کمپنی پالتی ہے، جب وہ سال میں بچہ دے تو اس میں کا ایک چوتھائی پیسہ دینے والے کا اور بقیہ تین چوتھائی کمپنی لیتی ہے، یہ شرکت ناجائز ہے؛ بلکہ اس صورت میں کمپنی کو صرف اجرت ملے گی اور روپئے دینے والے کو بکری اوراس کے بچے ملیں گے؛ اس لئے کہ اس میں تردد کی وجہ سے قمار کا شبہ ہے، اسی طرح دوسری صورت جس میں کمپنی اپنے متعین ممبروں کے دوگنے ہونے پر منافع دیتی ہے، اس میں بھی قمار کا شبہ ہے؛ کیوں کہ جتنے ممبر ایک سال میں بنے اتنے دوبارہ بننا ضروری نہیں ہے؛ اس لئے کمپنی کا یہ نفع بھی جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۶۰۳/۱۶)

والربح في الشركة الفاسدة بقدر المال ولا عبرة بشرط الفضل، فلو كل المال لأحدهما، فللآخر أجر مثله كما لو دفع دابّته لرجل ليؤجرها، والآجر بينهما، فالشركة فاسدة، والربح للمالك وللآخر أجر مثله.

(درمختار مع الشامي، كتاب الشركة، مطلب يرجح القياس، زكريا ٦/ ٥٠٣، كراچی ٤/ ٣٢٦)

وعلى هذا إذا دفع البقرة إلى إنسان بالعلف ليكون الحادث بينهما نصفين فما حدث، فهو لصاحب البقرة، ولذلك الرجل مثل العلف الذي علفها وأجر مثله فيما قام عليها. الخ (عالمگيري، الباب الخامس في الشركة الفاسدة، زكريا قديم ٢/ ٣٣٥، جديد ٢/ ٣٣٦، حاشية چلپى مكتبه إمداديه ملتان ٤/ ٤٩، زكريا ٤/ ٣٧٣، الدر مع الرد، زكريا ٦/ ٥٠٤، كراچی ٤/ ٣٢٧)

وحقيقة القمار تمليك المال على المخاطرة، وهو أصل فى بطلان عقود التمليكات الواقعة على الأخطار. (أحكام القرآن للجصاص، سهيل اكيڈمي لاهور ٢/ ٤٦٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲؍رجب المرجب ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۶۷۴/۳۸)

سودی رقم سے، جھوٹ بول کر یا کم تول کر تجارت کرنا

سوال [۸۶۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بینکوں سے سود پر روپئے لے کر کاروبار کرنا، ملاوٹ کر کے، جھوٹ بول کر، کم تول کر، ٹیکس چوری کر کے کاروبار کرنے والوں کی بھی روزی حرام ہے، پھر خنزیر کے بال کے برش بنانے والوں کی روزی کیوں حرام ہے؟ کیا دونوں ایک زمرے میں آتے ہیں؟ یعنی دونوں کی روزی ایک ہی جنس کی ہوگی یا نہیں؟

المستفتی: احسان علی صدیقی، اصغر منزل شیر کوٹ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سود کی رقم جھوٹ بول کر غیر سے حاصل کردہ مال حرام ہے۔

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد، كالبيوع الفاسدة، والاستئجار على المعاصي والطاعات، أو بغير عقد، كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور قديم ١/ ٣٧، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ١/ ٣٥٩، رقم: ٥٩، الدر مع الرد، زكريا ٩/ ٥٥٣، كراچى ٦/ ٣٨٥، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٧، زكريا ٧/ ٦٠، البحرالرائق، زكريا ٩/ ٣٦٩، كوئٹه ٨/ ٢٠١، هندية، زكريا قديم ٥/ ٤٩، جديد ٥/ ٤٠٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٣٤/ ٢٤٦)

انکم ٹیکس اور مکان ٹیکس وغیرہ شرعاً جبری ٹیکس ہیں، اگر جھوٹ بول کر یا کسی اور ترکیب سے ٹیکس کی چوری سے جو رقم محفوظ ہو جائے وہ حلال ہوگی۔

الكذب مباح لإحياء حقه، ودفع الظلم عن نفسه. (الدرالمختار، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ٩/ ٦١٢، كراچى ٦/ ٤٢٧)

اور خنزیر کے بالوں کا پیسہ حرام ہے۔

كالبيوع الفاسدة، والاستئجار على المعاصي والطاعات، أو بغير عقد، كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور قديم ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ۱/ ۳٦۹، رقم: ٥۹)

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵ر ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۲۹)

لاٹری کے پتے، تاش، لوڈو، کنچے، آتش بازی بیچنے کا حکم

سوال [۸٦۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ آیا لاٹری کے پتے بیچنا، کنچے گولی بیچنا، تاش، لوڈو، آتش بازی بیچنا، ان چیزوں کو بیچنا یا استعمال کرنا قرآن وحدیث کی روشنی میں جائز ہے یا ناجائز؟

المستفتی: محمد منظور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ چیزوں کی فروختگی ناجائز ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِيْنٌ. [لقمان: ٦]

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ۲]

البتہ پیسہ حلال رہے گا، نیز اس کا استعمال کرنا اوران سے کھیل بھی ناجائز اور حرام ہے۔

أن الملاهي كلها حرام. (درمختار، كتاب الحظر والإباحة، كوئٹه ٥/ ۲٤٥، كراچى ٦/ ۳٤۸، زكريا ۹/ ٥٠۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴ر صفر ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۱۳)

غیر شرعی لباس کوسلنا اور فروخت کرنا کیسا ہے؟

سوال [۸۶۸۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مومن کے لئے غیر ملکی یا مغربی لباس جیسے کوٹ، پتلون، جیکٹ، جنس کولہوں سے اونچی اور آدھی آستین والی مردانی شرٹ عورتوں کے لئے بلاوز، چولی، میکسی، فراک، غرارے، شرارے، آدھی آستین کے یا مونڈھے اور بغل صاف طور پر محسوس ہوتے ہوں اور گلے کھلے ہوئے ہونے کے باعث پستان بھی نظر آتے ہوں، ان کی کاٹ چھانٹ، سلائی، خرید وفروخت کیسی ہے؟ اور پہننا کیسا ہے؟

مندرجہ بالا قراش تراش کے نابالغ بچوں کے لباسوں کی کٹائی، سلائی، یا سلے ہوئے لاکر ریڈی میڈ ملبوسات کی خرید وفروخت شرعاً کیا حکم رکھتی ہے؟

المستفتی: حبیب الرحمٰن انصاری متصل علی مسجد، شیرکوٹ، ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: وہ لباس جو اغیار کا شعار ہے، اس کا استعمال مسلمانوں کے لئے تشبہ کی وجہ سے ناجائز اور ممنوع ہے۔

عن ابن عمر –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من تشبه بقوم فهو منهم. (سنن أبي داؤد، اللباس، باب في لبس الشهرة، النسخة الهندية ۲/ ۵۶۹، دارالسلام، رقم: ۴۰۳۱)

اگر مذکورہ لباس مغربی یہود ونصاریٰ کا شعار ہے تو اس کا استعمال ناجائز ہے، اسی طرح جو لباس بدن اور ستر کی حفاظت نہ کر سکے اس کا استعمال بھی ناجائز ہے، نیز عورتوں کے لباس میں غرارہ، شرارہ وغیرہ جہاں تک احقر کے علم میں ہے یہود ونصاریٰ کا لباس نہیں ہے؛ بلکہ ہندوستان میں غیر مسلم ومسلم عورتیں سب استعمال کرتی ہیں، ہاں البتہ شرفاء کا لباس نہیں سمجھا جاتا ہے؛ اس لئے اس میں بظاہر کوئی قباحت نہیں ہے؛ البتہ بلاوز عام طور پر ساڑی کے ساتھ

ہی استعمال ہوتا ہے وہ ستر کی حفاظت نہیں کرتا ہے؛ اس لئے اس کا استعمال ناجائز ہے۔ اور اگر چولی کے اوپر باقاعدہ قمیص پہنی ہے تو جائز ہے۔ اور اگر فراک مغربی لباس ہے بالغ لڑکیوں کے لئے استعمال جائز نہیں ہے، اسی طرح آدھی آستین کا لباس اور ایسا لباس کہ جس سے پستان وغیرہ نمایاں نظر آ جائے ناجائز ہے۔ وہ ''**نساء كاسيات عاريات**'' کی وعید کے اندر داخل ہوں گے۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: صنفان من أهل النار ...... ونساء كاسيات عاريات، مميلات مائلات رؤوسهن كأسنمة البخت المائلة، لايدخلن الجنة، ولا يجدن ريحها، وإن ريحها ليوجد من مسيرة كذا وكذا. (صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب النساء الكاسيات، النسخة الهندية ۲/ ۲۰۵، بيت الأفكار، رقم: ۲۱۲۸)

اور ایسے فساق کا لباس بنانے والا درزی فعل مکروہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

أو خياطا أمره أن يتخذ له ثوبا على زي الفساق يكره له أن يفعل؛ لأنه سبب التشبه بالمجوس والفسقة. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، زكريا ۹/ ۵۶۲، كراچی ۶/ ۳۹۲، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۴/ ۱۸۸، مصري قديم ۲/ ۵۳۰، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ۶/ ۲۹، زكريا ۷/ ۶۵) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ محرم ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۲۹۸۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/۱/۱۴۱۳ھ

ہیروئن کی بیع وشراء

سوال [۸۶۹۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ہیروئن (HEROIN) کی بیع وشراء، اس کا استعمال اوراس کی آمدنی کے شرعی احکام کیا ہے؟ ہیروئن کے باقی تمام احکام بالتفصیل مدلل ارشادفرمائیں۔

المستفتی: جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، بردوان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: ہیروئن کی بیع وشراء ناجائز اورحرام ہے اوراسے حرام قرار دینے ہی میں احتیاط ہے؛ چونکہ اس کی تھوڑی سی مقدار بھی نشہ آور ہوتی ہے؛ اس لئے اس کا استعمال بھی حرام ہوگا، اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی ناجائز اورحرام ہوگی۔

عن جابر بن عبدالله -رضي الله عنه- أن رسول الله ﷺ قال: ما أسكر كثيره فقليله حرام. (سنن الترمذي، باب ماجاء أسكر كثيره فقليله حرام، النسخة الهندية ۲/ ۸، دارالسلام، رقم: ۱۸٦۵، سنن النسائي، تحريم كل شراب أسكر كثيره، النسخة الهندية ۲/ ۲۷۷، دارالسلام، رقم: ۵٦۰۷، سنن أبي داؤد، باب ماجاء في السكر، النسخة الهندية ۲/ ۵۱۸، دارالسلام، رقم: ۳٦۸۱، مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۹۱، رقم: ۵٦٤۸)

قلت القليل المسكر والقليل الغير المسكر بينهما فرق، كما قال الشيخ المحدث الفقيه رشيد أحمد الكنكوهي في تقريره الكوكب الدري تحت حديث ما أسكر كثيره فقليله حرام: وإنما يحتاج إلى أمثال هذه التاويلات لما ثبت من بعض الصحابة شرب أمثالها، فعلم بفعلهم أن النهي ليس مطلقا، ويمكن أن يقال في الرواية وهو ما أسكر كثيره: أن الكثير والقليل كلاهما مسكران، إلا أن الكثير أكثر إسكارا من القليل، فالقليل حينئذ قسمان: قليل مسكر، وقليل غير مسكر، والموضوع في الحديث هو القليل الأول دون الثاني، فكان المعنى أن القليل المسكر حرام، وإن قل إسكاره فبقي القليل الغير المسكر غير حله، وهذا التاويل جاز في قوله عليه الصلاة والسلام: كل مسكر حرام. (الكوكب الدري ۲/ ۱۲)

أن محل البيع هو المال، وإنه اسم لما يباح الانتفاع به حقيقة وشرعا، ولم يوجد فلا يكون مالا، فلا يجوز بيعها كبيع الخمر. (بدائع الصنائع، كتاب الأشربة، أحكام الخمر، زكريا ٤/ ٢٨٢، كراچی ٥/ ١١٥)

عن يحيى النخعي قال: سأل قوم ابن عباس عن بيع الخمر وشرائها والتجارة فيها، فقال: أمسلمون أنتم؟ قالوا: نعم، قال: فإنه لا يصلح بيعها ولا شرائها، ولا التجارة فيها. (صحيح مسلم، باب إباحة النبيذ الذي لم يشتد ولم يصر مسكرا، النسخة الهندية ٢/ ١٦٨، بيت الأفكار، رقم: ٢٠٠٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۰۳۲/۴۰)

نشہ آور چیزوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بھانگ، افیم اور ہیروئین وغیرہ نیز نشہ آور اشیاء کی تجارت اور خرید وفروخت اور کاروبار وغیرہ پر حکومتیں سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے دو سال کی سزا دیتی ہیں، شریعت وسنت ہماری اس بارے میں کیا رہنمائی کرتی ہے؟ شرعاً یہ سزا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: سید معین نواز، رانچی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: شراب کی تجارت حرام ہے، اس کے علاوہ دیگر نشہ آور چیزوں کی تجارت مکروہ ہے۔ اور حکومتی قانون کی خلاف ورزی کرکے اپنی جان خطرے میں ڈالنا قطعاً جائز نہیں ہے۔

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ١٩٥]

عن يحيى النخعي قال: سأل قوم ابن عباس عن بيع الخمر وشرائها

والتجارة فيها، فقال: أمسلمون أنتم؟ قالوا: نعم، قال: فإنه لا يصلح بيعها ولا شرائها، ولا التجارة فيها. (صحيح مسلم، باب إباحة النبيذ الذي لم يشتد ولم يصر مسكرا، النسخة الهندية ٢/ ١٦٨، بيت الأفكار، رقم: ٢٠٠٤)

عن زيد بن أسلم، عن عبدالرحمن بن وعلة السبئيّ، من أهل مصر، أنه سأل عبدالله بن عباس عما يعصر من العنب، فقال ابن عباس: إن رجلا أهدى لرسول الله صلى الله عليه وسلم راوية خمر، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: هل علمت أن الله قد حرمها؟ قال: لا فسار إنسانا، فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: بم ساررته؟ فقال: أمرته ببيعها، فقال: إن الذي حرم شربها حرم بيعها. (صحيح مسلم، باب تحريم بيع الخمر، النسخة الهندية ٢/ ٢٢، بيت الأفكار، رقم: ١٥٧٩)

وصح بيع غير الخمر ...... ثم إن البيع، وإن صح لكنه يكره. (شامي، كتاب الأشربة، زكريا ١٠/ ٣٥، كراچی ٦/ ٤٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۲/۸/۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۷۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۸/۱۴ھ

شراب سے بنے ہوئے سرکہ کا استعمال وتجارت

سوال [۸۶۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ گیہوں اور پھلوں سے اخذ کر کے جو سرکہ تیار کیا جاتا ہے، اسے مارکیٹ میں ''وائن ویلیگر'' یا شراب کے سرکہ کے نام سے فروخت کیا جاتا ہے، اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: نیاز احمد فاروقی، حلال ٹرسٹ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گیہوں، دھان، پھل اور سبزی وغیرہ سے اخذ کرنے

سے جو سرکہ تیار کیا جاتا ہے، چاہے اس کو شراب کے سرکہ کے نام سے فروخت کیا جاتا ہو بلا شبہ جائز اور حلال ہے؛ اس لئے کہ کوئی بھی سرکہ ایسا نہیں ہے کہ اس کی اصل ماہیت پر شراب کا مرحلہ نہ گزرا ہو، یعنی پہلے شراب بنتی ہے، پھر اس شراب سے سرکہ بنتا ہے۔ حدیث وفقہ سے اس کا حلال ہونا ثابت ہے۔

عن عائشة –رضي الله عنها– أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: نعم الإدام الخل. (مسلم شريف، باب فضيلة الخل والتأدم به، النسخة الهندية ٢/ ١٨٢، بيت الأفكار، رقم: ٢٠٥١، مسند الدارمي، دارالمغني ٢/ ١٣٠٢، رقم: ٢٠٩٣)

إن النجاسة لما استحالت وتبدلت أوصافها ومعانيها خرجت عن كونها نجاسة؛ لأنها اسم لذات موصوفة، فتنعدم بانعدام الوصف، وصارت كالخمر إذا تخللت. (بدائع، كتاب الطهارة، الدباغة، زكريا ١/ ٢٤٣، كراچی ١/ ٨٥)

وكذا الخمر تصير خلا، فعلم أن استحالة العين تستتبع زوال الوصف. (غنية المستملي شرح منية المصلي، أشرفيه ١٨٩)

ولا يرد طهارة الخمر بانقلابها خلا ...... لأن عين الشيء حقيقته، وحقيقة الخمر ...... ذهبت وخلفتها أخرى، وإنما يرد ذلک لو قلنا ببقاء حقيقة الخمر ...... مع الحكم بطهارتها. (شامي، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، مطلب في العفو عن طين الشارع، زكريا ١/ ٥٣٦، كراچی ١/ ٣٢٨)

لأن العصير لا يتخلل إلا بعد التخمر غالبا، فلو لم نقل بالطهارة لربما تعذر الخمر وهو حلال إجماعا. (نهاية المحتاج ٢/ ٢٣٠، بحواله جديد فقهي تحقيقات ١٠/ ١٣٩)

إذا تخللت الخمر بنفسها بغير قصد التخليل يحل ذلک الخل بلا خلاف بين الفقهاء؛ لقوله عليه الصلاة والسلام: نعم الإدام الخل. (الموسوعة الفقهية الكويتية ٥/ ٢٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۶۹۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/ ۱۱/ ۱۴۳۵ھ

اعضائے انسانی کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۶۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ہر انسان کے سینہ کے اندر دو کیڈنی رہتی ہے (گوشت کے دو ٹکڑے) ان دونوں کا فانکشن ایسا ہے کہ کسی وجہ سے اگر ایک بیکار ہو جاتی ہے تو ایک کیڈنی سے انسان زندہ رہ سکتا ہے؛ البتہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی انسان کی اگر دونوں کیڈنی بیکار ہو جائے تو اس آدمی کو بچانے کے لئے میں اپنی ایک کیڈنی اس کو ہدیہ کرسکتی ہوں؟

(۲) ایسی حالت میں اگر اس آدمی کو روپئے کے بدلے کیڈنی فروخت کردوں تو اس کا کیا حکم ہے؟ میں نے ان سے روپئے کی بات نہیں کی؛ بلکہ شکریہ کے طور پر اس نے روپئے مجھے دے دیا ہے، تو کیا میں اس روپئے کو استعمال کرسکتی ہوں؟

المستفتیة: آمنہ خاتون، ساکن سونا گاچھی، بردوان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: انسان کا کوئی عضو انسان کی ملک نہیں ہے؛ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امانت وودیعت ہے؛ لہٰذا مالکانہ طور پر نہ کسی کو ہدیہ میں دے سکتے ہیں اور نہ بالقیمت بیچ سکتے ہیں اور نہ ہی وہ قیمت اس کے لئے حلال ہے، خواہ شکریہ کے طور پر وہ رقم ملی ہو؛ بلکہ اس رقم کا واپس کرنا ضروری ہے۔ (مستفاد: جواہر الفقہ ۲/ ۴۹، جدید زکریا ۷/ ۱۷۰، فتاوی رحیمیہ قدیم ۶/ ۲۸۶، جدید زکریا ۱۰/ ۱۷۰)

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ. [سورة الإسراء، آيت: ۷۰]

الانتفاع بأجزاء الآدمي لم يجز، قيل: للنجاسة، وقيل: للكرامة هو الصحيح. (هندية، الباب الثامن عشر في التداوي والمعالجات، زكريا قديم ٥/ ٣٥٤، جديد ٥/ ٤٠٩، هداية أشرفی ١/ ٤١، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢٨/ ٣٤٥)

فكما لا يجوز التداوي بشيء من الآدمي الحي إكراما له. (شرح السير الكبير بحواله جواهر الفقه ٢/ ٥١، جديد زكريا ٧/ ٦٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷/ رجب ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۱۲۳)

گوبر اور اس سے نکلے ہوئے دانے کی تجارت

سوال [۸۶۹۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جانوروں کے بڑے بڑے مذبح ہیں، وہاں بڑی مقدار میں گوبر ہوتا ہے، آج کل گوبر بھی فروخت ہوتا ہے، نیز گوبر کو مشینوں کے ذریعہ چھان کر اس میں سے دانہ وغیرہ نکالا جاتا ہے، جسے جانور کے لئے بنائی جانے والی اغذیہ میں استعمال کیا جاتا ہے، کیا گوبر کی تجارت کرنا خواہ وہ کھاد کے لئے ہو یا جانور کی غذا کے لئے، یا کسی اور مصرف کے لئے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: نیاز احمد فاروقی، حلال ٹرسٹ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: گوبر کی خرید وفروخت راجح اور مفتی بہ قول کے مطابق جائز اور درست ہے۔ اور اس کا پیسہ بھی بلا شبہ جائز اور حلال ہے، جیسا کہ ذیل کے جزئیہ سے واضح ہوتا ہے:

قال الإتقاني: ولنا أن السرقين مال فجاز بيعه كسائر الأموال، وإنما قلنا: أنه مال؛ لأن المال ما ينتفع به، ويتمول، أي يدخر لوقت الحاجة، وقد تمول المسلمون السرقين وانتفعوا به من غير نكير من أحد من السلف. (حاشية چلپي على التبيين، كتاب الكراهية، فصل في البيع، زكريا ٧/ ٥٧، إمداديه ملتان ٦/ ٢٦)

''البحر الرائق'' کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

کره بيع العذرة لا السرقين؛ لأن المسلمين يتمولون السرقين، وانتفعوا به في سائر البلاد والأمصار من غير نكير، فإنهم يلقونه في الأراضي لاستكثار الربيع. (البحر الرائق، كتاب الكراهية، فصل في البيع، زكريا ٨/ ٣٦٥، كوئٹه ٨/ ١٩٩، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٦، زكريا ٧/ ٥٧، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٨/ ١٠٢، رقم: ٩٦٨٦)

''مجمع الانہر'' کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

جاز بيع السرقين مطلقا في الصحيح عندنا لكونه مالا منتفعا به لتقوية الأرض في الإنبات. (مجمع الأنهر، كتاب الكراهية، فصل في البيع، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٢١١، مصري ٢/ ٥٤٦)

''شامی'' کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

أجازوا بيع السرقين للانتفاع به –إلى– لأنه مال يضمن به، وهو المفتى به. (شامي، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، مطلب في حكم الصيغ والاستخضاب بالصبغ والحناء النجسين، زكريا ١/ ٥٣٨، كراچی ١/ ٣٣٠)

''ہندیہ'' کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

يجوز بيع السرقين والبعر والانتفاع به، كما في الزاهدي. (هندية، الباب التاسع، الفصل الخامس، زكريا قديم ٣/ ١١٦، جديد ٣/ ١١٧)

(۲) نیز گوبر کو مشینوں سے صاف کر کے دانہ وغیرہ نکال کر جانوروں کی غذا کے طور پر استعمال کرنا بھی بلا شبہ جائز ہے، جب کہ اس میں کسی قسم کی بدبو وغیرہ باقی نہ رہے، یہ ایسا ہے جیسا کہ گیہوں وغیرہ نجاست میں گر جائیں تو انہیں دھوکر صاف کر کے استعمال کرنے کی گنجائش ہوتی ہے، اس کو ''بنایہ شرح ہدایہ'' میں ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

الحنطة المتنجسة قبل أن تنتفخ تغسل ثلاثا وتوكل إذا لم يبق لها رائحة ولا طعم. (بناية شرح هداية، أشرفيه ١/ ٧٤١)

(۲) اور ''فتاوی تاتارخانیہ'' اور ''المحیط البرہانی'' میں مزید وضاحت کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

إذا أصابت الحنطة الخمر إلا أنها لم تنتفخ من الخمر فغسلت ثلاثا ولا يوجد لها طعم ولا رائحة ذكر في بعض المواضع عن أبي يوسف أنه لابأس بأكلها. (فتاوى تاتارخانية ١/ ٤٥٦، رقم المسألة: ١١٩٩، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١/ ٣٨٣، رقم: ٧٨٩)

الحنطة تغير بالماء النجس ...... على قياس أبي يوسف فيطهر بالغسل ثلاثا، والتجفيف في كل مرة. (خلاصة الفتاوى أشرفيه ديوبند ١/ ٤١)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۶۹۶)

مردار جانور کی ہڈی، کھال اور چربی فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۶۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مردار جانوروں کی ہڈی اور کھال وچربی کی خرید وفروخت کیسی ہے؟

المستفتی: عبدالمعید قاسمی، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مردہ جانور کی کھال کو دباغت سے پہلے بیچنا جائز نہیں ہے، دباغت کے بعد بیچنا جائز ہے اور ہڈی میں چونکہ دباغت نہیں دی جاتی؛ اس لئے مردہ جانوروں کی ہڈی کو بغیر دباغت کے بیچنا جائز ہے۔

وإن لم يكن مدبوغا ولا مذبوحا لا ينعقد بيعه؛ لأنه إذا لم يدبغ ولم

يذبح بقيت رطوبات الميتة فيه، فكان حكمه حكم الميتة -إلى- ولهذا يطهر الجلد بالدباغ حتى يجوز بيعه لزوال الرطوبة عنه، ولا رطوبة في هذه الأشياء فلا تكون حراما. (بدائع الصنائع، كتاب البيوع، حكم عظم الخنزير والآدمي، زكريا ٤/ ٣٣٣، كراچی ٥/ ١٤٢)

وأما عظم الميتة فيجوز بيعها. (بدائع زكريا ٤/ ٣٣٣، كراچی ٥/ ١٤٢)

لیکن مردہ جانوروں کی چربی کا استعمال اوراس سے بنے ہوئے گھی کا استعمال اور خرید وفروخت جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اس کی ماہیت تبدیل کرکے صابون وغیرہ بنالیا جائے تو اس کا استعمال درست ہے۔ (مستفاد: ایضاح المسالک/ ۱۴۲، ایضاح المسائل/ ۱۴۷، کفایت المفتی ۹/ ۲۷۹، جدید مطول ۳/ ۴۴۰)

عن ابن عباس -رضي الله عنه- قال: رأيت رسول الله ﷺ جالسا عند الركن، قال: فرفع بصره إلى السماء فضحك، فقال: لعن الله اليهود ثلاثا، إن الله حرم عليهم الشحوم فباعوها وأكلوا أثمانها، وإن الله إذا حرم على قوم أكل شيء حرم عليهم ثمنه. (سنن أبي داؤد، البيوع، باب في ثمن الخمر والميتة، النسخة الهندية ٢/ ٤٩٣، دارالسلام، رقم: ٣٤٨٨)

وعبارة المجتبى جعل الدهن النجس في صابون يفتى بطهارته؛ لأنه تغير والتغير يطهر عند محمد، ويفتي به للبلوى. (شامي، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، زكريا ١/ ٥١٩، كراچی ١/ ٣١٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۵۵۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۸/ ۳/ ۱۴۲۱ھ

میتہ بکریوں کی بیع اوراس کی آمدنی کا حکم

سوال [۸۶۹۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ہماری چالیس بکریاں گاڑی میں آرہی تھیں، ۳۵/بکریاں گاڑی میں دب کر مر گئیں، ان ۳۵/بکریوں کو ہم نے غیر قوم میں فروخت کر دیا، اس سے ۴۵۰۰/سو روپئے بنے، بیوپاری کا سارا روپیہ ادا کر دیا، یہ رقم ہمارے پاس الگ رکھی ہوئی ہے، ہماری مسجد کے برابر میں دو کمریں ہیں جو ٹوٹی پھوٹی حالت میں ہیں، جن میں بچے وغیرہ پڑھتے ہیں، یہ پیسہ ان کمروں کی تعمیر میں کام آسکتا ہے یا نہیں؟ مسجد کے چاروں طرف دیوار میں کام آسکتا ہے کہ نہیں، یہ پیسہ ہمارے کس مد میں کام آسکتا ہے؟ آپ سے گزارش ہے کہ آپ ہمیں اس بات کا خلاصہ بتادیں، تاکہ ہم اپنے پاس سے یہ رقم جلد سے جلد ادا کردیں، جس کام میں بھی ہو جیسے کام آسکتی ہے آپ ہمیں فوراً جواب لکھ کر بھیج دیں، ہم اپنا پتہ لفافہ اس خط کے ساتھ بھیج رہے ہیں، امید کہ آپ جلد سے جلد ہمیں اس بات کا جواب دیں گے۔

المستفتی: رحمت اللہ خان نصیب اللہ خان مرچنٹ گراؤنڈ مقام و پوسٹ گڑور، ضلع الموڑ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مسجد ومدرسہ میں پاک وحلال مال لگانا لازم ہے، مذکورہ بکریوں کی رقم حرام ہے، ان کا پیسہ مسجد ومدرسہ میں اور اس کی ضروریات میں لگانا جائز نہیں ہوگا۔

جابر بن عبدالله –رضي الله عنه– يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم عام الفتح وهو بمكة: إن الله ورسوله حرم بيع الخمر والميتة، والخنزير، والأصنام، فقيل له عند ذلك: أرأيت شحوم الميتة، فإنه يدهن بها السفن، ويدهن بها الجلود، ويستصبح بها الناس؟ قال: لا، هن حرام، ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: قاتل الله اليهود، إن الله حرم عليهم الشحوم، فأجملوه، ثم باعوه، فأكلوا ثمنه. (سنن ابن ماجة، البيوع، باب ما لا يحل بيعه، النسخة الهندية، ص: ۱۵۷، دارالسلام، رقم: ۲۱٦۷)

البيع بالميتة والدم باطل. (هداية ۳/ ۲۳)

أما لو أنفق في ذلك مالا خبيثا ومالا سببه الخبيث والطيب فيكره؛

لأن الله تعالیٰ لا یقبل إلا الطیب. (شامي، کراچی ۱/ ٦٥٨، مطلب کلمة لا بأس دلیل علی أن المستحب غیره؛ لأن البأس الشدة، شامي زکریا ۲/ ٤٣١)

مذکورہ رقم کو بلانیت ثواب فقراء کو دینا لازم ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹ رشعبان ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۱۹۲۰)

مردار جانوروں کے گوشت کی خرید وفروخت

سوال [۸۶۹۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مردہ حلال وحرام جانوروں کا گوشت پہلے گدھ کھا جایا کرتے تھے، اب ادھر گدھ ناپید ہے، گوشت سڑ گل کر فضا کو مسموم کر دیتا ہے؛ اس لئے زید اس گوشت کو فروخت کر دیتا ہے، غیر مسلم خریدار بذریعہ مشین پیس کر اس گوشت کو مچھلیوں کی خوراک بنا دیتا ہے، جس سے مچھلیوں کی نشو ونما غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے، ایسا کاروبار زید کے لئے درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبد الحمید قاسمی، ناظم مدرسہ اسلامیہ کانکی نارہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید کے لئے مردار جانوروں کے گوشت کی فروختگی کا کاروبار ناجائز اور حرام ہے اور اس کا پیسہ بھی حرام ہے، خواہ غیر مسلم ہی سے فروخت کرے، اگر فضا مسموم ہونے کی وجہ سے غیر مسلم کو گوشت دینے کی ضرورت ہے، تو مفت میں دے دیا جائے، اس کی قیمت نہ لی جائے؛ لہٰذا مردار کے گوشت کا کاروبار کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ اور اس کا پیسہ بھی حلال نہیں ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةُ وَالدَّمُ. [المائدة: ۳]

عن ابن عباس – رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لعن الله الیهود، حرمت علیهم الشحوم، فباعوها وأکلوها أثمانها،

وإن الله عز وجل إذا حرم على قوم أكل شيء حرم عليهم ثمنه. (مسند أحمد بن حنبل ۱/ ۲۹٤، رقم: ۲۶۷۸، ۱/ ۲٤۷، رقم: ۲۲۲۱)

وبطل بيع ما ليس بمال، كالدم والميتة. (شرح تنوير مع الشامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في تعريف المال، زكريا ۷/ ۲۳۵، كراچی ۵/ ۵۰)

وكذا بيع الميتة والدم، والحر باطل؛ لأنها ليست أموالا، فلا تكون محلا للبيع. (هداية، أشرفي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، اشرفي ۳/ ٤۹) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۳۸۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۱/۵/۱۴۲۵ھ

جھٹکے کے بکرے کی آنت کی تجارت کا حکم

سوال [۸۶۹۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جھٹکے سے ذبح کئے ہوئے جانور کی آنت کی تجارت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ جیسے: جھٹکے کے بکرے کی کھال پر نمک لگا کر تجارت کرتے ہیں، اسی طرح سے بکری کی آنت پر نمک لگا کر رکھ دیں، اس کا پانی خشک ہونے پر اس کو دھو کر اس کی صفائی کر کے تجارت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ کبھی کسی زمانہ میں شاہی مسجد میں ہم نے پوچھا تھا تو گنجائش بتلائی تھی، قریب ۳۵؍ یا ۴۰؍ سال کا عرصہ گذر گیا؛ لہٰذا کوئی گنجائش ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد ظریف قریشی، اصالت پورہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جھٹکے کے جانور مردار کے حکم میں ہیں اور مردار کے سارے اعضاء ناپاک ہوتے ہیں۔ اور ان کی تجارت جائز نہیں ہوتی ہے؛ البتہ جو اعضاء دباغت کے ذریعہ سے پاک کر کے خارجی استعمال کے لائق ہوتے ہیں، ان کی دباغت کے

بعد خارجی استعمال کے لئے تجارت جائز ہے، مثلاً کھال دباغت کے بعد پاک تو ہوجاتی ہے؛ لیکن کھانے کے لائق نہیں ہوتی؛ بلکہ خارجی استعمال کے لائق ہوتی ہے، اس کی تجارت جائز ہے، اسی طرح اوجھڑی دباغت کے بعد برتن اور مشکیزہ کے طور پر استعمال کے لائق ہوسکتی ہے، اس کو بھی اگر دباغت کے ذریعہ بالکل سکھا کر برتن یا مشکیزہ بنالیا جائے اور مشکیزہ کے طور پر استعمال کے لائق ہو تو اس کی بھی تجارت جائز ہے؛ لیکن سوال نامہ میں مردار کی آنتوں کی دباغت کی بات نہیں ہے؛ بلکہ آنتوں کو دوسری جگہ کھانے کے استعمال میں لانے کے لئے سپلائی کیا جاتا ہے اور سڑنے سے حفاظت کے لئے نمک وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے، اور یہ دباغت کے دائرہ میں داخل نہیں ہے؛ اس لئے یہ ناپاک ہی رہیں گی؛ لہٰذا اس طرح مردار کی آنتوں کی تجارت جائز نہیں ہے۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: رأيت رسول الله ﷺ جالسا عند الركن، قال: فرفع بصره إلى السماء فضحك، فقال: لعن الله اليهود ثلاثا، إن الله حرم عليهم الشحوم فباعوها وأكلوا أثمانها، وإن الله إذا حرم على قوم أكل شيء حرم عليهم ثمنه. (سنن أبي داؤد، البيوع، باب في ثمن الخمر والميتة، النسخة الهندية ۲/ ۴۹۳، دارالسلام، رقم: ۳۴۸۸)

وكذا لو أصلح المثانة ودبغها وجعل فيها اللبن أو السمن جاز، وكذا الكرش، وكل ما يمنع عن الفساد، ويخرج عن حد الأكل، فهو دباغ كان ذلك بالتراب أو الشمس ونحوهم. (قاضيخان، كتاب الطهارة، فصل في النجاسة التي نصيب الثوب، زكريا جديد ۱/ ۱۸، وعلى هامش الهندية ۱/ ۲۵)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵؍ شعبان ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۷۷۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۸/۶ھ

خون کی مصنوعات کی تجارت

سوال [۸۶۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جانوروں کے خون کی مصنوعات اوران کی تجارت جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: نیاز احمد فاروقی حلال ٹرسٹ جمعیۃ علماء ہند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جانوروں کے خون کی تجارت جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ نص قطعی سے دمِ مسفوح کی حرمت ثابت ہے۔ آیت کریمہ ملاحظہ فرمایئے:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ. [المائدۃ: ۳]

قُلْ لَا اَجِدُ فِيْ مَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَسْفُوْحًا. [سورة الأنعام، آيت: ١٤٥]

البتہ خون کی مصنوعات جن میں تبدیل ماہیت ہوکر دم سائل کا رنگ وبومزہ اورسیلانیت ختم ہوکراس کی شکل بدل کرشئ جامد اورشئ آخر بن جائے، تو انقلابِ ماہیت کی وجہ سے پاک ہوجاتی ہیں، پھراس کی تجارت وغیرہ بھی جائز ہوجاتی ہے، اس کے لئے بدائع کی عبارت ملاحظہ فرمایئے:

إن النجاسة لما استحالت وتبدلت أوصافها ومعانيها خرجت عن كونها نجاسة؛ لأنها اسم لذات موصوفة، فتنعدم بانعدام الوصف.

(بدائع، كتاب الطهارة، الدباغة، كراچی ١/٨٥، زكريا ١/ ٢٤٣، الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹر نيشنل ديوبند ١/ ١٠٠)

''فتح القدیر'' اور ''غنیۃ المستملی'' میں اس طرح کی عبارت ہے، ملاحظہ فرمایئے:

إن استحالة العين تستتبع زوال الوصف المرتب عليها. (فتح القدير

زکریا ۱/ ۲۰۲، دارالفکر ۱/ ۲۰۱، الموسوعة الفقهية ۳/ ۲۱۳، ۲۹/ ۱۰۸، غنية المستملي أشرفيه، ص: ۱۸۹)

اس سلسلے میں شامی کی عبارت اس طرح ہے:

لا يرد طهارة ...... الدم بصيرورته مسكا؛ لأن عين الشيء حقيقته، وحقيقة الخمر والدم ذهبت وخلفتها أخرى، وإنما يرد ذلك لو قلنا ببقاء حقيقة الخمر والدم مع الحكم بطهارتها. (شامي، كتاب الطهارة، باب الأنجاس، مطلب في العفو عن طين الشارع، زكريا ۱/ ۵۳۶، كراچی ۱/ ۳۲۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۶۹۵)

خون کی بیع کا حکم

سوال [۸۷۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شہر بمبئی میں ہم قریش برادری کے درمیان ایک مسئلہ درپیش ہے، ہم لوگ آپ سے اس کی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس سے پہلے کہ ہم لوگ اپنا مسئلہ رکھیں پہلے آپ اطمینان سے ہماری مشکلات کو ایک نظر دیکھ لیجئے جو مندرجہ ذیل ہیں: ہم لوگ بمبئی کارپوریشن کے ماتحت کام کرتے ہیں، گونڈی دیونار میں ایک مذبح کارپوریشن نے بنوایا ہے، ہماری برادری کے لوگ ہندوستان کے کونے کونے سے جانور لاتے ہیں، ان کو لانے کے لئے ہم لوگوں کو جو دقتیں ہوتی ہیں وہ ہم ہی لوگ جانتے ہیں، اسٹیٹ اسٹیٹ میں لاری کے کرایہ کے علاوہ چنگی جو حکومت کا حق ہے، وہ دیتے ہیں، ہمارے پاس لائسنس ہے، اس کے لئے رشوت دینی پڑتی ہے، اگر نہ دیں تو پریشانی ہوتی ہے، جانور مرجانے کا ڈر لگتا رہتا ہے؛ اس لئے رشوت دینی پڑتی ہے، وہاں سے نکلے تو راستہ میں آرٹی او پکڑتے ہیں، ان کو بھی رشوت

دینی پڑتی ہے۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ کے پاس لاری پرمٹ ہے، تو آپ کیوں دیتے ہیں؛ اس لئے دینا پڑتا ہے کہ گاڑی پرمٹ صرف نو جانوروں کا ہوتا ہے، اگر نو جانور لائیں گے تو لاری کا کرایہ ان جانوروں پر زیادہ ہو جاتا ہے؛ اس لئے اس میں جانور زیادہ لاتے ہیں، اگر جانور زیادہ نہ لائیں تو جانور کی قیمت بڑھ جائے گی، تو جانور نہیں بکے گا، جتنے وہاں بچتے بچاتے نکلے تو گارے ہتھیار مل جاتے ہیں، وہ تو لاری ہی روک لیتے ہیں، جانور پکڑ لیتے ہیں، لاری کھالی کروا کر جانور نکال دیتے ہیں، ہم لوگ پولیس کی مدد مانگتے ہیں، پولیس آتی ہے مدد کرتی ہے، مگر ان لوگوں کا کچھ نہیں کرتی ہے، کہتی ہے کہ وہ بھی ٹھیک کرتے ہیں جیسے جیسے کر کے جانور پکڑتے ہیں اس میں بھی کبھی جانور گم ہو جاتے ہیں، وہ ہمارا نقصان ہو جاتا ہے، پولیس آتی ضرور ہے، مگر رشوت لے کر آتی ہے نہ دیں تو وہ کیوں آتی، اگر نہ دیں تو معلوم پڑا کہ جانور سب غائب ہو گئے، تو وہ دینا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ (مرتا کیا نہ کرتا) چلئے وہاں سے نکلے تو بمبئی کے چنگی خانہ پر آئے وہاں پر بھی یہی ہوتا ہے، چنگی بھریئے، کاغذ لیجئے، پھر سب سے پہلے کاغذ والا چپراسی رشوت لیتا ہے، وہاں سے نکلے تو خاکی ڈریس بلو ڈریس پٹری والے میونسپلٹی والے اسٹاف آر ٹی او والے واٹریس والے سب چنگی خانہ کے ناکہ ہی پر ملتے ہیں، اس لئے ان لوگوں کو بھی دینا ہی پڑتا ہے، کیوں کہ جانور کئی گھنٹوں سے لاری میں بند رہتے ہیں، وہ لوگ جب حیران کرتے ہیں تو ہم لوگوں کو ڈر لگتا ہے کہیں اندر ہی اندر ایک دو جانور مر نہ جائیں؛ اس لئے ہم پر ضروری ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کو کچھ کھلائیں، کہنے کو تو لائسنس ہے، دیونار میں جانور کاٹتے ہیں، مگر حکومت ہم لوگوں کی کوئی سپورٹ بھی نہیں کرتی ہے، پھر ہم لوگ گورنمنٹ سے پرمیشن یافتہ آدمی ہوتے ہیں۔ خیر جیسے تیسے کر کے ہماری گاڑی دیونار کے گیٹ پر آتی ہے، معلوم پڑتا ہے کہ ستیہ گرہ والے مورچہ لگا کر بیٹھے ہیں، گاڑی اندر ہونے نہیں دیتے ہیں، پھر یہاں پر بمبئی پولیس کی ضرورت ہوتی ہے، ان لوگوں کو بلوایا جاتا ہے، وہ آتے ہیں، ان کو پکڑتے ہیں، پولیس چوکی لے جاتے ہیں، جب ہماری گاڑی اندر ہوتی ہے، یہاں پر بھی وہی بات پولیس والوں کو ہم قریش برادری کی طرف

سے ہفتہ بندھا ہوا ہے، وہ ہر ہفتہ ہم لوگ جمع کر کے چوکی میں بھجوا دیتے ہیں، اگر نہ دیں تو مصیبت ہوتی ہے۔ جیسے وہاں سے نکلے دیونار کے اندر داخل ہو گئے، یہاں بھی مصیبت ہے، سب سے پہلے گیٹ پر جانوروں کی پاوتی بنوائی جاتی ہے، ان کا ٹیکس ادا کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ رشوت بھی دی جاتی ہے، جانور اگر تندرست وخوبصورت ہوا تو وہ لوگ پاس ہی نہیں کرتے؛ اس لئے ان کو بھی دینا ضروری ہے اور دیا جاتا ہے۔ خیر وہ اندر آ گیا، بازار لگا ہوا ہوتا ہے، اب آپ اندازہ لگائیے کہ جانور پر کتنا وزن ہو جاتا ہے، جانور کی خرید وفروخت چالو ہو جاتی ہے، اگر جانور کم آئیں تو جانور مہنگے بکتے ہیں، زیادہ آ گئے تو سستے بکتے ہیں، اس میں بیوپاریوں کا نفع نقصان ہوتا ہے، اسی طرح کاٹنے والوں کو بھی ہوتا ہے، یہ سب رہی ہماری مصیبت جس کا ہم نے مختصر حال بیان کر دیا ہے، آپ آگے سمجھ سکتے ہیں، اب ہم آتے ہیں اپنے اصل مقصد کی طرف:

ہم قریش برادری بہت دنوں سے کارپوریشن لڑ رہے تھے، خون کے بارے میں جس میں ہم لوگ جیت گئے ہیں، دیونار میں جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں، ان کا خون کارپوریشن لیتی ہے اور اس کو فروخت کر دیتی ہے، جس کی سالانہ انکم ۱۵۰۰۰۰۰/ لاکھ کے قریب ہے، ہم سب سمجھتے ہیں کہ یہ خون ہمارے لئے حرام ہے، اس کا پیسہ بھی حرام ہے، مگر اتنی بڑی رقم ہم حکومت کو چھوڑنا نہیں چاہتے ہیں، جب کہ حکومت ہم لوگوں کو اتنا پریشان کرتی ہے اور مصیبت میں اتنا روپئے اس کو دے دیا جائے، جب کہ ہم لوگ یہ کیس جیت گئے ہیں، اب ان روپیوں کو کس کام میں لایا جائے، یہی آپ سے معلوم کرنا چاہتے ہیں، برائے کرم تشفی بخش جواب سے نواز کر عنداللہ ماجور ہوں۔ والسلام

المستفتی: حاجی محمد میاں قدرت اللہ قریشی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: خون کا فروخت کرنا مسلمانوں کے لئے حرام اور بیع شرعاً باطل ہے۔ **حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ.** [المائدۃ: ۳]

بطل بيع ما ليس بمال، كالدم المسفوح، والميتة. (تنوير مع الدر، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب في تعريف المال، زكريا ۷/ ۲۳۵، كراچی ۵/ ۵۰)

اورفروخت کر کے جورقم ہاتھ میں آتی ہے اس کا استعمال حرام ہے، اس کو بلانیت ثواب صدقہ کردیناواجب ہے۔اورجبری رشوت میں دیناہےتوحیلہ تملیک کےبعددی جاسکتی ہے۔

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد، كالبيوع الفاسدة، والاستئجار على المعاصي والطاعات، أو بغير عقد، كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه، ولكن إن أخذه من غير عقد –إلى قوله– يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء. (وقوله) وأما إذا كان عند رجل مال خبيث، فإما إن ملكه بعقد فاسد، أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، وليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور قديم ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ۱/ ۳۶۹، رقم: ۵۹، وهكذا في الهندية، زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، شامي، زكريا ۹/ ۵۵۳، كراچی ۶/ ۳۸۵، البحر الرائق، زكريا ۹/ ۳۶۹، كوئٹه ۸/ ۲۰۱، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ر شوال ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۰۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۲۳ر شوال ۱۴۱۰ھ

خون سے بنے مچھلیوں کے دانہ کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۷۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: دور حاضر میں خون سے گولی بنائی جاتی ہیں، چاہے وہ خون بیل کا ہو یا بھینس کا یا بکری کا اور وہ خون سے بنی ہوئی گولی مچھلیوں کو کھلائی جاتی ہیں، تو اس خون سے بنی گولی کی تجارت جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو کیوں؟

المستفتی: محمد عزیز الرحمٰن مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: گائے، بیل، بھینس اور بکری کے خون سے بنی ہوئی گولیاں جن مچھلیوں کو کھلائی جاتی ہیں وہ مچھلیاں بلا کراہت جائز اور حلال ہیں۔ دمِ مسفوح کی تجارت ناجائز اور حرام ہے؛ لیکن اگر بطور کھاد اس کو استعمال کرنے کے لئے تجارت کی جائے تو اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ سرقین اور انسان کے براز کی تجارت کھاد کے طور پر جائز ہے۔

سئل علي بن أحمد ويوسف بن محمد عن السمكة إذا أخذت وأرسلت في الماء النجس، فكبرت فيه؟ فقال: لا بأس بأكلها للحال.

(التاتارخانية ۱۸/ ۴۹۲، رقم: ۲۹۷۱۰)

ولا يحل حيوان مائي إلا السمک الذي مات بآفة ولو متولدا في ماء نجس. (وتحته في الشامية) فلا بأس بأكلها للحال لحله بالنص وكونه يتغذى بالنجاسة لا يمنع حله. (الدرالمختار مع الشامي، كتاب الذبائح، زكريا ۹/ ۴۴۴، كراچی ۶/ ۳۰۶)

كره بيع العذرة لا السرقين، وقال الشافعي رحمه الله: لا يجوز بيع السرقين أيضا؛ لأنه نجس العين، فلا يكون مالا فلا يجوز بيعه كالعذرة وجلدالميتة قبل الدبغ، ولنا أن المسلمين تمولوا السرقين، وانتفعوا به في سائر البلدان والأعصار من غير نكير، فإنهم يلقونه في الأراضى لاستكثار الريع، بخلاف العذرة؛ لأن العادة لم تجر بالانتفاع بها، وإنما ينتفع بها

مخلوطة برماد وتراب غالب عليها بالإلقاء في الأرض، فحينئذ يجوز بيعها، والصحيح عن أبي حنيفة أن الانتفاع بالعذرة الخالصة جائز. (تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٦، زكريا ٧/ ٥٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ ربیع الاول ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۹۸۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۶/۴/۴ھ

بیع سرطان کا حکم

سوال [۸۷۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بیع سرطان از روئے شرع متین جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: خدا بخش گوبند پور، ۲۴ر پرگنہ مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر چہ فقہ کی بعض جزئیات سے بیع سرطان کا عدم جواز معلوم ہوتا ہے؛ لیکن وہاں پر کلیہ بھی موجود ہے کہ جو چیز دوا کے لئے منتفع ہو اس کی خرید وفروخت جائز ہے۔ اور کیکڑے کی پشت دواؤں میں استعمال ہوتی ہے؛ لہٰذا اس کی بیع جائز ہوگی؛ البتہ کھانا جائز نہیں ہے۔

ويجوز بيع جميع الحيوانات سوى الخنزير، وهو المختار. (هندية، البيوع، الباب التاسع، الفصل الرابع في بيع الحيوانات، زكريا قديم ٣/ ١١٤، جديد ٣/ ١١٥)

يجوز بيع الحيات إذا كان ينتفع بها للأدوية، وما جاز الانتفاع بجلده أو عظمه، أي من حيوانات البحر أو غيرها. (شامي، مطلب في بيع دودة القرمز، زكريا ٧/ ٢٦٠، كراچی ٥/ ٦٨)

فالحاصل أن جواز البيع يدور مع حل الانتفاع. (شامي، زكريا ٧/ ٢٦٠،

کراچی ٥/ ٦٨، الفتاوى التاتارخانية، زكريا ٨/ ٣٤٠، رقم: ١٢١٢٥، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ٩/ ٣٣٢، رقم: ١١٩٩٣، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١٥١، مصري قديم ٢/ ١٠٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ١٥٥، ١٧/ ٢٨١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/۲/۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۰۱۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/۲/۱۴۲۰ھ

خنزیر کے بالوں کے ساتھ دوسرے جانور کے بالوں سے برش بنانا

سوال [۸۷۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ خنزیر (سور) کے بالوں کا برش بنانا اس صورت میں کہ اس میں گائے، بھینس، گھوڑا وغیرہ کے بالوں کی آمیزش بھی ہو یا کثیر مقدار خنزیر کے بال کے علاوہ دوسرے بالوں کی ہو، تو ازروئے شرع حرام ہے یا حلال؟

المستفتی: احسان علی صدیقی، اصغر منزل، شیرکوٹ بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: خنزیر کے بال نجس العین ہیں، شدت ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے جانوروں کے بالوں کی آمیزش کے ساتھ بھی خنزیر کے بالوں سے برش وغیرہ بنانا حرام ہے۔ اور تیار کردہ برش وغیرہ شرعاً ناپاک ہوگا۔

وأما الخنزير فشعره، وعظمه، وجميع أجزائه نجسة. (البحرالرائق، كتاب الطهارة، زكريا ١/ ١٩١، كوئٹه ١/ ١٠٧، هداية، أشرفي ٣/ ٣٩، مجمع الأنهر مصري قديم ١/ ٣٢، دارالكتب العلمية بيروت ١/ ٥١)

وشعر الميتة غير الخنزير على المذهب (تحته في الشامية) أي على قول أبي يوسف الذي هو ظاهر الرواية أن شعره نجس، وصححه في

البدائع، ورجحه في الاختيار. (الدر مع الرد، كتاب الطهارة، باب المياه، مطلب في أحكام الدباغة، زكريا ١/ ٣٥٩، ٣٦٠، كراچی ١/ ٢٠٦، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣٣٣، كراچی ٥/ ١٤٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۲۹)

فحش کتابیں اور خنزیر کی چربی سے بنے چپس فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۷۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کچھ لوگ اپنی دوکانوں میں برہنہ تصویروں والی کتابیں، خنزیر کے خوشبو والے آلو کے چپس اور دوسری چیزیں جو مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے فروخت کرتے ہیں۔

المستفتی: محمد ساجد قاسمی، بجنوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: برہنہ تصویروں کو رکھنا اور فروخت کرنا سخت معصیت ہے، اس کا ترک کرنا لازم ہے، خنزیر کا کوئی بھی جز وفروخت کرنا جائز نہیں، اس کا پیسہ بھی حلال نہیں ہے، مسلمانوں کو اس قسم کی حرکات سے باز رہنا لازم ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ قال: إن الله حرم الخمر وثمنها، وحرم الميتة وثمنها، وحرم الخنزير وثمنه. (سنن أبي داؤد، باب في ثمن الخمر والميتة، النسخة الهندية ٢/ ٤٩٣، دارالسلام، رقم: ٣٤٨٥، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي ١١/ ١٥٢، رقم: ١١٣٣٥، سنن الدار قطني، كتاب البيوع، دارالكتب العليمة بيروت ٣/ ٧، رقم: ٢٧٩٢، المعجم الأوسط، دارالفكر ١/ ٤٦، رقم: ١١٦)

وأما بيع الخمر والخنزير ان قوبل بالدين كالدراهم والدنانير، فالبيع باطل.
(هداية، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، أشرفي ديوبند ٣/ ٤٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷رمحرم ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۱۰۶)

ادھیا پر بکری دینا

سوال [۸۷۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے بکر کو ایک بکری خرید کر دی، تاکہ بڑھے (یعنی زیادہ ہو) اور اگر بچہ دے گی تو اس میں دونوں کا آدھا حصہ ہوگا، زید کے لئے ایسا کرنا شریعت کے اعتبار سے کیسا ہے؟ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: علی مرتضی قاسمی، دارالشفاء اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں جو شکل بتائی گئی ہے، اس کو عوام میں ادھیا پر دینے کا معاملہ کہا جاتا ہے۔ زید کا اس طرح معاملہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ اجارۂ فاسدہ ہے۔ اور اگر زید نے اس طرح کا معاملہ کرلیا ہے اور بچہ بھی پیدا ہوگیا ہے، تو وہ جانور اور بچہ بھی زید کی ملکیت میں شمار ہوں گے۔ اور زید پر بکر کو چارہ کی قیمت اور جو بکری پالنے کی عام طور پر اجرت ہوتی ہے اس کا دینا واجب ہوگا؛ البتہ حضرات فقہاء نے جواز کی ایک شکل بتلائی ہے کہ مالک جانور کی مناسب قیمت لگا کر نصف حصہ پرورش کرنے والے کے ہاتھ فروخت کردے، پھر اس کی قیمت معاف کردے، تو ایسی صورت میں جانور دونوں کے درمیان مشترک ہوجائے گا؛ اس لئے اس کی نسل وآمدنی بھی دونوں کے درمیان نصف نصف ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر/ ۱۱۵)

وعلى هذا إذا دفع البقرة إلى إنسان بالعلف ليكون الحادث بينهما نصفين، فما حدث فهو لصاحب البقرة، ولذلك الرجل مثل العلف الذي علفها وأجر مثله فيما قام عليها، والحيلة في ذلك أن يبيع نصف البقرة من ذلك الرجل بثمن معلوم حتى تصير البقرة وأجناسها مشتركة بينهما فيكون الحادث منها على الشركة. (هندية، كتاب الشركة، الباب الخامس في الشركة الفاسدة، زكريا قديم ۲/ ۳۳۵، جديد ۲/ ۳۳٦، حاشية چلپی، مكتبه إمداديه ملتان ٤/ ٤٩، زكريا ٤/ ۳۷۳)

وعلى هذا دفع البقرة بالعلف ليكون الحادث بينهما نصفين، فما حدث فهو لصاحب البقرة وللآخر مثل علفه وأجر مثله. (شامي، كتاب الشركة، مطلب يرجح القياس، زكريا ٦/ ٥٠٤، كراچی ٤/ ۳۲۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم صفر ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۶۱۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۲/۱ھ

چار من غلہ پر زمین کاشتکاری کے لئے دینا

سوال [۸۷۰٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص اپنی زمین اس شرط پر دیتا ہے کہ مثلاً چار من غلہ دے دو اور یہ زمین میں کاشتکاری فلاں مہینے تک کرتا ہے، اس میں جتنا بھی غلہ پیدا ہوجائے وہ تمہارا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد شمیم اختر ارریاوی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال میں جو شکل مذکور ہے وہ قطعاً ناجائز ہے۔ اور جواز کی شکل یہ ہے کہ پیداوار کی تقسیم حصہ کے اعتبار سے طے کریں، اس طرح کہ دونوں کو نصف

نصف ملے گا، ایک کوایک تہائی اوردوسرے کودوتہائی ملے گا۔(مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۹/۳۱۲، جدیدزکریا۹/۳۱۰)

وأن يكون الخارج شائعا بينهما تحقيقا لمعنى الشركة، فإن شرطا لأحدهما قفزانا مسماة فهي باطلة؛ لأن به تنقطع الشركة؛ لأن الأرض عساها لا تخرج إلا هذه القدر، وصار كاشتراط دراهم معدودة لأحدهما في المضاربة. (هداية، كتاب المزارعة، أشرفي ديوبند ٤/ ٤٢٦)

ہاں ایک شکل یہ ہے کہ غلہ کے بجائے روپئے کے عوض معاملہ کیا جائے تو اس کی گنجائش ہے۔

قال: سألت رافع بن خديج عن كراء الأرض بالذهب والورق، فقال: لابأس به. (مسلم شريف، كتاب البيوع، باب كراء الأرض، النسخة الهندية ٢/ ١٣، بيت الأفكار، رقم: ١٥٤٧، صحيح البخاري، كتاب الحرث والمزارعة، باب كراء الأرض بالذهب والفضة، رقم: ٢٢٨٨، ف: ٢٣٤٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیراحمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍رجب ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۳۴ ۶۲۷۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصورپوری غفرلہ
۲۴؍۷؍۱۴۲۰ھ

زمین کی فروختگی کی ایک شکل

سوال [۸۷۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اپنی زمین حامد کے ہاتھ فروخت کردی، خرید نے والے حامد کے دریافت کرنے پر کہ زمین جو میں نے آپ سے خریدی ہے، وہ کس طرف ہے، آپ اس کی تعیین کردیں، میں نے حامد کو نقشہ دے کر کہا کہ کہیں ہوگی، تم پٹواری کے ذریعہ اسے تلاش کرلو، چنانچہ حامد نے پٹواری کے ذریعہ زمین تلاش کی، مگر اس کی تعیین نہیں ہوسکی، گو مجھے

یقین تھا کہ زمین اسی موضع میں ہے، ابھی زمین کی تعیین نہیں ہوسکی تھی کہ اسی درمیان میں میرے ہی مشورہ سے حامد نے مذکورہ زمین خالد کے ہاتھ فروخت کردی، واضح رہے کہ حامد نے مذکورہ زمین اپنی ایک متعین زمین کے ساتھ فروخت کی ہے، جب خالد نے زمین کی تعیین چاہی تو حامد نے اپنی متعین زمین کی تو تعیین کردی، مگر مذکورہ زمین کے بارے میں وہی جواب دیا جو میں نے حامد کو دیا تھا، یعنی یہیں کہیں ہوگی، تم نقشہ لو اور پٹواری کے ذریعہ اس کی تعیین کرالو۔ عرض یہ ہے کہ حامد نے جو مجھول زمین مجھ سے خریدی وہ بیع تام ہوئی کہ نہیں اور جو بیع حامد نے خالد کو کی اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد زبیر عباسی جنرل اسٹور، چوک گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں عقد اول اور عقد ثانی دونوں ناتمام ہیں؛ اس لئے کہ دونوں میں مشتری کے حق میں مبیع مجہول ہے اور اس طرح جہالت کہ جس کی وجہ سے مبیع کو مشتری کے ضمان میں منتقل کرنا اور مشتری کے لئے اس میں تصرف کرنا ممکن نہ ہو جائز نہیں ہے، اس سے بیع منعقد نہیں ہوتی۔

وإن لم يذكر الحدود ولم يعرفه المشتري ...... وجهل المشتري يمنع (بزازية، كتاب البيوع، الفصل الثالث فى ما يجوز بيعه وما لايجوز جديد زكريا ١/ ٢٣٥، وعلى هامش الهندية زكريا ٤/ ٣٧٢)

إذ لم يعلم أن العشرة من أي جانب من الدار، فيكون مجهولا جهالة تفضي إلى المنازعة. (عناية شرح هداية، دارالفكر بيروت ٦/ ٢٧٥، كوئٹه ٥/ ٤٧٩، زكريا ٦/ ٢٥٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷ر محرم الحرام ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۱۲۱)

زمین کی فروختگی کی ایک ناجائز شکل

سوال [۸۷۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اپنی زمین حامد کے ہاتھ فروخت کردی، خریدنے والے حامد کے دریافت کرنے پر یہ زمین جو میں نے آپ سے خریدی ہے وہ کس طرف ہے؟ آپ اس کی تعیین کردیں، میں نے حامد کو نقشہ دے کر کہا کہ یہیں کہیں ہوگی، تم پٹواری کے ذریعہ اسے تلاش کرلو، چنانچہ حامد نے پٹواری کے ذریعہ زمین تلاش کی، مگر اس کی تعیین نہیں ہوسکی، گو مجھے یقین تھا کہ زمین اسی موضع میں ہے، ابھی زمین کی تعیین نہیں ہوسکی تھی کہ اسی درمیان میں میرے ہی مشورہ سے حامد نے مذکورہ زمین خالد کے ہاتھ فروخت کردی، واضح رہے کہ حامد نے مذکورہ زمین اپنی ایک متعین زمین کے ساتھ فروخت کی ہے، جب خالد نے زمین کی تعیین چاہی تو حامد نے اپنی متعین زمین کی تو تعیین کردی، مگر مذکورہ زمین کے بارے میں وہی جواب دیا جو میں نے حامد کو دیا تھا، یعنی یہیں کہیں ہوگی، تم نقشہ لو اور پٹواری کے ذریعہ اس کی تعیین کرالو۔ عرض یہ ہے کہ حامد نے جو مجہول زمین مجھ سے خریدی وہ بیع تام ہوئی کہ نہیں اور جو بیع حامد نے خالد کو کی اس کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: مولانا محمد یحییٰ صاحب، استاذ شعبہ عربی مدرسہ فرقانیہ، گونڈہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: مذکورہ صورت میں چونکہ نفس بیع متعین نہیں ہے، کہ وہ کہاں واقع ہے، تاکہ مشتری اس کو اپنے ضمان میں لے کر تصرف کرسکے، اسی طرح اس نے جو فروخت کیا ہے، اس میں بھی ایسی جہالت ہے کہ بائع کے لئے مشتری کے ضمان میں دینا اور مشتری کے لئے اس میں تصرف کرنا ممکن نہیں ہے؛ اس لئے آپ کا حامد کے ہاتھ فروخت کرنا اور حامد کا خالد کے ہاتھ فروخت کرنا دونوں معاملہ ناجائز اور فاسد ہے۔ اور واجب الاسترداد ہے؛ البتہ حامد نے جو اپنی متعین زمین فروخت کی ہے، اس کی قیمت الگ سے لگائی جائے تو درست ہوسکتا ہے۔

اشترى أرضا وذكر حدودها لا ذرعها طولا وعرضا جاز، وإذا عرف المشتري الحدود لا الجيران يصح، وإن لم يذكر الحدود ولم يعرفه المشتري يمنع. (بزازية، كتاب البيوع، الفصل الثالث فيما يجوز بيعه وما لا يجوز، جديد زكريا ١/ ٢٣٥، وعلى هامش الهندية، زكريا ٤/ ٣٧٢، شامي، مطلب ما يبطل الإيجاب سبعة، كراچی ٤/ ٥٢٩، زكريا ٦/ ٤٩)

إذ لم يعلم أن العشرة من أي جانب من الدار، فيكون مجهولا جهالة تفضي إلى المنازعة. (عناية مع الفتح، دارالفكر بيروت ٦/ ٢٧٥، كوئٹه ٥/ ٤٧٩، زكريا ٦/ ٢٥٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۵۰۶۴)

قسطوار زمین کی خرید وفروخت کرنے والی کمپنی کا ممبر بننا

سوال [۸۷۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک کمپنی ہے جو زمینوں کی خرید وفروخت کرتی ہے اور وہ لوگوں کو اپنا ممبر بنا کر ایک متعین رقم قسط وار وصول کرتی ہے، پورا ہوجانے کے بعد اس کو وہ زمین موعود دی جاتی ہے، اگر وہ نہ لینا چاہے تو اس کی قیمت لگا کر رقم دی جاتی ہے، ظن غالب نفع کا ہوتا ہے۔

دوسری اسکیم یہ ہوتی ہے کہ جو ممبران کمپنی کے لئے ایجنٹ کا کام کرتے ہیں، ان کو کمیشن دیتی ہے اور ایجنٹ نے جن لوگوں کو ایجنٹ بنایا ہے، ان کی ممبر سازی پر بھی اول کو کمیشن دیتی ہے، جو سب متعین ہوتا ہے، اسی طرح سلسلہ وار سلسلہ الی غیر النہایہ چلتا رہتا ہے، جسے ''نیٹ ورک'' سسٹم کہا جاتا ہے۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں ذکر کردہ صورت کے مطابق مذکورہ کمپنی کا

لوگوں کو اپنا ممبر بنا کر متعینہ زمین قسطوں پر فروخت کرنا اور تمام اقساط کی ادائے گی کے بعد زمین موعود خریدار کے حوالہ کرنا اس حد تک معاملہ از روئے شرع جائز ہے۔

البيع مع تأجيل الثمن و تقسيطه صحيح. (شرح المجلة رستم باز، اتحاد ديو بند ١/ ١٢٥، رقم المادة: ٢٤٥)

ولو لم يكن الأجل مشروطا في العقد ولكنه منجم معتاد قيل: لا بد من بيانه؛ لأن المعروف كالمشروط. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، قديم ٣/ ٥٨، جديد أشرفي ديوبند ٣/ ٧٤)

وللبائع حبس المبيع إلى قبض الثمن ولو بقي منه درهم. (شامي، مطلب في حبس المبيع لقبض الثمن الخ، كراچی ٤/ ٥٦١، زكريا ٧/ ٩٣)

لیکن معاملہ کی دوسری صورت کہ قسطوں کی ادائے گی کے بعد اگر خریدار کسی وجہ سے زمین نہ لینا چاہے تو اسے زمین کی قیمت لگا کر رقم دی جاتی ہے، وضاحت طلب ہے چنانچہ اگر معاملہ اور ایجاب وقبول کے وقت کاغذی کارروائی کرتے ہوئے اس بات کی صراحت کی جاتی ہے کہ اگر قسطوں کی ادائے گی کے بعد تم زمین نہ لینا چاہو تو تمہیں اس کی موجودہ قیمت واپس مل جائے گی اور اس شرط کے ساتھ معاملہ طے ہوتا ہے، تو اس طرح معاملہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے؛ لیکن اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ ایجاب وقبول کے وقت اس کی صراحت نہ ہو؛ بلکہ مطلق معاملہ کیا جائے، پھر بعد میں خریدار کسی وجہ سے زمین نہ لینا چاہے تو اس کی ضرورت ومجبوری کا خیال کرتے ہوئے قسطوار جتنی رقم ادا کی جاچکی ہے اتنی رقم خریدار کو واپس کردیں اور زمین اپنی ملکیت میں رکھیں، تو یہ معاملہ اقالہ میں داخل ہوکر درست ہوجائے گا۔ اور اگر ادا شدہ قسطوں کا لحاظ نہ کرتے ہوئے موجودہ قیمت کا اعتبار کر کے وہ زمین خریدار سے خرید لی جائے تو یہ بھی جائز ہے؛ اس لئے کہ یہ از سرنو خرید وفروخت کا معاملہ ہے۔

أخرج الطبراني حديثا طويلا طرفه هذا: حدثني عمر بن شعيب عن أبيه عن جده، أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع وشرط. (معجم

الأوسط، دارالفكر بيروت ٣/ ٢١١، رقم: ٤٣٦١، مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٨٥، نصب الراية، كراچی ٤/ ١٧)

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من أقال مسلما، أقاله الله عثرته يوم القيامة. (ابن ماجة، أبواب التجارات، باب الإقالة، النسخة الهندية/ ١٥٩، دارالسلام، رقم: ٢١٩٩، سنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب فضل الإقالة، النسخة الهندية ٢/ ٤٩٠، دارالسلام، رقم: ٣٤٦٠)

الإقالة جائزة في البيع بمثل الثمن، فإن شرط أكثر منه أو أقل، فالشرط باطل ويرد مثل الثمن الأول. (هداية أشرفی ٣/ ٦٩)

زاد في الموسوعة الفقهية: سواء كانت الإقالة قبل القبض أو بعده، وسواء كان المبيع منقولا أو غير منقول. (الموسوعة الفقهية ٥/ ٣٢٧)

كل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين أو للمعقود عليه وهو من أهل الاستحقاق يفسده. (هداية، كراچی ٥/ ١١٦، أشرفي ديوبند ٣/ ٥٩)

وإذا حصل الإيجاب والقبول لزم البيع، ولا خيار لواحد منهما. (هداية، كراچی ٥/ ٦، أشرفي ديوبند ٣/ ٢٠، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٢٢٦، دارالكتاب ديوبند ١/ ٢٢٠، تاتارخانية، زكريا ٨/ ٢٢٢، رقم: ١١٧١٤)

(۲) ممبر سازی کی اجرت میں تفصیل یہ ہے کہ جو ایجنٹ براہ راست لوگوں کو کمپنی کا ممبر بناتے ہیں، اس کے عوض میں جو متعین اجرت انہیں ملتی ہے، یہ کمپنی سے جوڑنے کے عمل کی اجرت ہے، جو جائز ہے؛ لیکن ایجنٹ نے جن لوگوں کو ممبر بنایا ہے ان کے ذریعہ ممبر سازی پر اول ایجنٹ کو کمیشن دینا جائز نہیں؛ اس لئے کہ ان لوگوں نے جو محنت کی ہے اس میں پہلے ایجنٹ کی محنت شامل نہیں ہے؛ اس لئے شریعت اس صورت میں اول کو بلا محنت اجرت لینے کی اجازت نہیں دیتی؛ بلکہ یہ محنت کنندگان کا حق ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يحل لمسلم أن يأخذ مال

أخيه بغير حق. (مجمع الزوائد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٧١، مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به. (شامي، كتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، زكريا٩/ ٨٧، كراچی ٦/ ٦٣)

لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. (شامي، كتاب الحدود، مطلب في التعزير بأخذ المال، زكريا ٦/ ١٠٦، كراچی ٤/ ٦١، البحرالرائق، کوئٹه ٥/ ٤١، زكريا ٥/ ٦٨، هندية زكريا قديم ٢/ ١٦٧، جديد زكريا ٢/ ١٨١، قواعد الفقه ص: ١١٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۳۰ ؍صفر ۱۴۳۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۹۱۲/۳۸)	۱۴۳۱/۳/۲ھ

زمین کو فروخت کرنے کی ایک ناجائز شکل

سوال [۸۷۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک کمپنی جس کا نام ''پیس گرین فوریسٹ لمٹیڈ'' (P.G.F) ہے، اپنے گراہک سے زمین فروخت کرنے کا معاہدہ کرتی ہے، اوراس کے بعد گراہک سے قسطوار پانچ سال چھ سال سات سال یا نو سال تک یا جتنا وقت بھی معاہدہ میں طے ہوتا ہے، اس وقت تک روپئے وصول کرتی ہے، مثال کے طور پر کمپنی اپنے کسی گراہک سے معاہدہ کرتی ہے کہ پچاس گز زمین خریدنے کے لئے گراہک چھ سال تک ماہوار قسط کے ذریعہ ہر مہینہ کمپنی کے پاس دوسو روپئے جمع کرے گا، چھ سال مکمل ہونے پر کل جمع رقم ۱۴۴۰۰؍ روپئے ہوگی، معاہدہ کرتے وقت کمپنی نے ایک بات واضح کردی تھی کہ گراہک چھ سال تک ۱۴۴۰۰؍ روپئے جمع کرنے کے بعد اگر زمین لینے کا خواہش مند نہیں ہے، تو کمپنی واپس اس زمین کو ۲۰۴۰۰؍ روپئے میں خریدنے کے لئے تیار رہے گی؛ لہٰذا محترم اس مسئلہ میں فرمائیں کہ اس صورت میں گراہک کو جو ۴۰۰۰؍

روپئے کا فائدہ ہورہا ہے، وہ جائز اور حلال ہے یا ناجائز اور حرام ہے؟ کمپنی نے اپنا کاروبار چلانے کے لئے الگ الگ عہدوں پر آدمی فائز کرر کھے ہیں جو گراہکوں سے رقم وصول کرنے کے بعد کمپنی کے خزانہ میں جمع کرتے ہیں اوران کی وصول کی گئی رقم میں سے کمپنی ان کے عہدوں کے حساب سے ان کو کمیشن دیتی ہے، کمپنی میں کام کرنے کے بعد آمدنی کا واحد ذریعہ یہی ہے؛ لہٰذا حضرت اس مسئلہ میں بھی فرمائیں کہ ایسی کمپنی میں کام کرنا اوراس سے حاصل شدہ آمدنی کواستعمال کرنا حلال ہے یا حرام؟

یہ واضح رہے کہ کمپنی کے لاکھوں گراہک ہیں، جن سے رقم وصول کرکے کمپنی بڑے پیمانے پر اپنا کاروبار چلاتی ہے، کمپنی زمین پر پیڑ لگاتی ہے، اورلکڑی کا کاروبار کرتی ہے، کاشتکاری کرتی ہے، کھیتی کے لئے بیج تیار کرتی ہے، کھاد بناتی ہے اور کئی مختلف کاروبار کرتی ہے اور جو آمدنی ہوتی ہے اس میں سے ہی اپنے گراہکوں کواور کام کرنے والوں کو فائدہ پہنچاتی ہے، ان تمام صورتوں میں ایسی کمپنی سے وابستہ ہوکر نفع حاصل کرنا کیسا ہے؟ اور یہ بات کمپنی نے معاہدہ کے وقت واضح کردی تھی کہ زمین پر قبضہ اسی وقت دیا جائے گا جب کہ کمپنی کو طے شدہ رقم پوری ادا کردی جائے گی۔

المستفتی: محمد آصف کندرکی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کمپنی کا قانون چہ ہندی اور انگلش دونوں میں شائع شدہ ہے اور قانونچہ سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ اس میں کئی خرابیاں ہیں:

(۱) اگر سال میں ایک دو قسط کسی وجہ سے ادا نہ کرسکے تو ۱۵ ر فیصد سود کے ساتھ اس کو پورا کرنا لازم ہوگا، تو اس سے معلوم ہوا کہ اس میں سودی شرط موجود ہے۔ اور اگر اس درمیان میں قسطیں پوری ہونے سے پہلے پہلے کسی ممبر کا انتقال ہوجائے تو اس کے پسماندگان کو ۱۵۰ ر فیصد کے حساب سے معاوضہ دیا جائے گا، تو یہ شکل جیون بیمہ کی ہوئی، اس میں سود کے ساتھ ''شبہۃ القمار'' بھی ہے، اس طرح کی باطل اور فاسد شرائط کی بنا پر قسطوں پر زمین خریدنا جائز نہیں ہے۔ اور سوال نامہ میں ان باطل اور فاسد شرائط کا ذکر موجود نہیں ہے؛ اس لئے سوال

ناقص اور غیر واضح ہے۔ اور سوال میں ان باطل شرائط کا ذکر بھی آنا چاہئے تھا؛ لہٰذا ان شرائط کی بنا پر مذکورہ کمپنی سے قسطوں پر زمین خرید نا جائز نہیں ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. [البقرة: ۲۷۵]

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. [المائدة: ۹۰]

عن جابر –رضي اللّٰه عنه– قال: لعن رسول اللّٰه ﷺ آكل الربو ومؤكله وكاتبه، وقال: هم سواء. (مسلم شريف، كتاب المساقاة المزارعة، باب الربا، النسخة الهندية ۲/ ۲۷، بيت الأفكار، رقم: ۱۵۸۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ رجب ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۷۷۶/۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۷/۲۳ھ

پتنگ بنانا اور فروخت کرنا کیسا ہے؟

سوال [۱۱۷۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: پتنگ کی فروختگی اور اس کا بنانا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: مولانا حفظ الرحمٰن مدیر ندائے شاہی ونائب مہتمم مدرسہ شاہی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پتنگ بنانا اور فروخت کرنا تعاون علی المعصیت کی وجہ سے ناجائز ہے۔

لقوله تعالى: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ۳] **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۸۳/۲۴)

جانوروں کی تصاویر بنانا اوران کا کاروبار کرنا

سوال [۸۷۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص کا پیتل کے جانوروں کا کاروبار ہے، وہ پیتل کے کتے، بلی، اونٹ، ہاتھی، سور، پرندے وغیرہ بناتا ہے۔

المستفتی: عبد القدیر، شاہی مسجد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جاندار کی تصویروں اور مورتیوں کی تجارت اعانت علی المعصیت کی بناپرنا جائز ہے۔

لقوله تعالى: وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. [المائدة: ۲]

جاندار کی تصویر اور مورتی بنانا حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔

تصوير صورة الحيوان أشد التحريم، وهو من الكبائر. (عمدة القاري، دارإحياء التراث العربي بيروت ۲۲/ ۷۰، زكريا ديوبند ۱۵/ ۱۲٤)

وفي الحديث: قال عبدالله: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: إن أشد الناس عذابا عند الله المصورون. (صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب عذاب المصورين يوم القيامة ۲/ ۸۸۰، رقم: ۵۷۱۷، ف: ۵۹۵۰، صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم صورة الحيوان، النسخة الهندية ۲/ ۲۰۱، بيت الأفكار، رقم: ۲۱۰۹) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۱۵۹)

پیتل کے ہاتھی گھوڑے وغیرہ بنانا

سوال [۸۷۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ شہر مرادآباد میں جیسا کہ آپ کو معلوم ہے پیتل کی صنعت اور اس میں جیسا بیرون ملک سے آرڈر ملتا ہے، اس کو بنایا جاتا ہے، مثلاً ایک آرڈر آیا ہے جس میں ہاتھی، گھوڑے، بلی، کتے وغیرہ کو اس نے مانگا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان ہاتھی وغیرہ (جاندار) کو بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ باحوالہ جواب باشرع عنایت فرمائیں۔

المستفتی: عبیدالرحمٰن پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ناجائز اور حرام ہے، عنداللہ سخت ترین عذاب الٰہی کا مستحق ہوگا، مسلمانوں کو ایسا آڈر واپس اور مسترد کرنا واجب ہے۔

عن عبدالله بن مسعود –رضي الله عنه– قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إن أشد الناس عذابا عند الله المصورون.

(صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب عذاب المصورين يوم القيامة ۲/ ۸۸۰، رقم: ۵۷۱۷، ف: ۵۹۵۰، صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم صورة الحيوان، النسخة الهندية ۲/ ۲۰۱، بيت الأفكار، رقم: ۲۱۰۹، مشكوة شريف ۲/ ۳۸۵)

عن ابن عباس –رضى الله عنه– قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: كل مصور في النار يجعل بكل صورة صورها نفسا، فتعذبه في جهنم. (مسلم شريف، النسخة الهندية ۲/ ۲۰۲، بيت الأفكار، رقم: ۲۱۱۰، مشكوة شريف ۲/ ۳۸۵)

ان احادیث کے تحت محدثین نے حیوانات کی تصویر کشی کو سخت حرام اور گناہ کبیرہ لکھا ہے۔

وهذه الأحاديث صريحة في تحريم تصوير الحيوان، وأنه غليظة التحريم. (نووي ۲/ ۲۰۱، هكذا عمدة القاري، دار إحياء التراث العربي بيروت ۲۲/ ۲۰،

زکریا دیوبند ۱۵/ ۱۲٤، مرقاۃ، باب التصاویر، إمدادیه ملتان ۸/ ۳۳۰، أشعة اللمعات ۳/ ۵۹۳)

قال أصحابنا وغيرهم: تصوير صورة الحيوان حرام أشد التحريم، وهو من الكبائر. (عمدة القاري، دار إحياء التراث العربي بيروت ۲۲/ ۷۰، زکریا دیوبند ۱۵/ ۱۲٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۳/۱۷)

پیتل وغیرہ کی مورتی بنانا کیسا ہے؟

سوال [۸۷۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا ایک پیتل کا کارخانہ ہے، جس میں جانور وغیرہ کی مورتی بنائی جاتی ہیں، تو اس طرح بنانا جائز ہے یا نہیں؟ مفصل جواب تحریر فرمائیں۔

المستفتی: احسان الرحمٰن محلّہ لال مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جانوروں کی صورت اور تصویر بنانے والے کو سخت ترین عذاب دیا جائے گا؛ لہٰذا جانور بنوانے والے اور بنانے والے سب حرام وگناہ کبیرہ اور سخت عذاب الٰہی کے مستحق ہوں گے۔

عن عبدالله بن مسعود -رضي الله عنه- قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إن أشد الناس عذابا عند الله المصورون.
(صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم صورة الحيوان، النسخة الهندية ۲/ ۲۰۱، بيت الأفكار، رقم: ۲۱۰۹، صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب عذاب المصورين يوم القيامة ۲/ ۸۸۰، رقم: ۵۷۱۷، ف: ۵۹۵۰)

عن ابن عباس -رضى الله عنه- قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول:

كل مصور في النار يجعل بكل صورة صورها نفسا، فتعذبه في جهنم. (مسلم شريف، النسخة الهندية ۲/ ۲۰۲، بيت الأفكار، رقم: ۲۱۱۰، مشكوة شريف ۲/ ۳۸۵)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍محرم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۰۶۹)

تانبا پیتل سے جانوروں کا مجسمہ بنانا

سوال [۸۷۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید پیتل کے برتنوں کا کاروبار کرتا ہے اور اپنا مال بیرون ملک سپلائی کرتا ہے، اس کے گاہک یہودی اور نصرانی ہیں، اس کے گاہک ہاتھی، شیر، ہرن اور دوسرے جانور پیتل کے منگوانا چاہتے ہیں۔

(۲) زید کا کوئی اپنا مال بنانے کا کارخانہ ابھی نہیں ہے، زید دوسرے کارخانہ داروں سے کورا مال لے کر صرف اپنی نگرانی میں پالش چاندی اور پیکنگ کرکے مال روانہ کرتا ہے؛ لیکن اگر یہ جانور سپلائی نہیں کرتا تو اس کا گاہک جانور کسی دوسرے سے ضرور خریدے گا اور اس کے ساتھ ہی زید کا دوسرا مال بھی؛ کیوں کہ دوسرے سپلائر اس گاہک کو توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس طرح زید کے گاہک کا چھوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔

(۳) چونکہ زید کا اپنا کوئی کارخانہ نہیں ہے؛ لیکن دوسرے تاجر جانور اور تصویریں بناتے ہیں، کیا ان سے خرید کر مجبوراً خود ہی سپلائی کرسکتا ہے اور اس سے جو نفع حاصل ہوگا اس کا کیا حکم ہے؟

(۴) کیا زید جانوروں کے آرڈر حاصل کرنے کے بعد کسی دوسرے کو آرڈر ٹرانسفر دے دے، دلوادے، زید کا تعلق صرف آرڈر دلوانے سے ہوگا، ایسی صورت میں جزوی رقم جو بطور

نفع کے حاصل ہو، تو اس کا لینا اور اپنی ضروریات میں شرعاً استعمال کرنا کیسا ہوگا؟
(۵) جزوی رقم یا منافع کا کوئی دوسرا استعمال شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ براہ کرم جواب حدیث سے اور سنت کی روشنی میں مطلع فرمائیں۔

المستفتی: اکرام باری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تانبا، پیتل وغیرہ دھات سے ہاتھی، شیر، ہرن دوسرے جانوروں کا مجسمہ بنانا اور بنوانے سے عنداللہ سخت ترین عذاب کا مستحق ہونا ہے۔

عن عبدالله بن مسعود –رضي الله عنه– قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إن أشد الناس عذابا عند الله المصورون.

(صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب تحريم صورة الحيوان، النسخة الهندية ۲/ ۲۰۱، بيت الأفكار، رقم: ۲۱۰۹، صحيح البخاري، كتاب اللباس، باب عذاب المصورين يوم القيامة ۲/ ۸۸۰، رقم: ۵۷۱۷، ف: ۵۹۵۰، مشكوة ۲/ ۳۸۵)

اللہ تعالیٰ آخرت میں ایسے لوگوں کو اس طرح عذاب دیتے رہیں گے اور کہتے رہیں گے کہ اس میں جان ڈال دو اور وہ جان نہ ڈال سکیں گے۔

من صور صورة عذب وكلف أن ينفخ فيها، وليس بنافخ. (صحيح البخاري، باب بلا ترجمة ۲/ ۸۸۱، رقم: ۵۷۲۹، ف: ۵۹۶۳، مشكوة ۲/ ۳۸۶)

اور پالش کرنے والا بھی مستحق عذاب ہوگا، اب اپنا گاہک چھوٹ جانے اور آخرت کے عذاب میں خود ہی تناسب دیکھا جا سکتا ہے۔

(۳) عمل تجارت حرام نہیں ہے، مگر تعاون علی المعصیت ہونے کی وجہ سے کراہت کے درجے میں ہوگا۔ اور تجارت کے منافع حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بلا کراہت حلال ہیں؛ اس لئے کہ اصل شئ فی نفسہٖ مال ہے اور حضرت امام یوسف و محمدؒ کے نزدیک مکروہ ہیں؛ اس لئے کہ معصیت کے تعاون کے ساتھ نفع حاصل کیا گیا ہے۔

ومثله في الشامي: لو آجره دابة لينقل عليها الخمر أو آجره نفسه

لیرعی لہ الخنازیر یطیب الأجر عندہ وعندهما یکرہ. (شامي، کتاب الحظر والإباحة، فصل في البیع، زکریا ۹/ ۵٦۲، کراچی ٦/ ۳۹۲، تبیین الحقائق، إمدادیہ ملتان ٦/ ۲۹، زکریا دیوبند ۷/ ٦٤، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ٤/ ۱۸۸، قدیم ۲/ ۵۳۰)

(۴-۵) آرڈر دلوانے والا دلال کے حکم میں ہوگا۔ اور دلال کی اجرت جس طرح دیگر معاملات میں حلال ہے، اسی طرح یہاں بھی حلال ہوگی؛ اس لئے کہ اصل معاملہ کا تعلق دلال سے نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ ایکسپورٹر اور ایمپورٹر کے ساتھ ہوتا ہے۔

سئل محمد بن سلمة عن أجرة السمسار، فقال: أرجو أنه لا بأس به. (شامي، کتاب الإجارة، مطلب في أجرة الدلال، زکریا ۹/ ۸۷، کراچی ٦/ ٦۳) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۵۰۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲/ ٦/ ۱۴۱۴ھ

چوری کے سامان کی خرید وفروخت کا شرعی حکم

سوال [۸۷۱٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص پرانی گاڑیوں کی مرمت کا کام کرتا ہے، کہ پرانی ایکسیڈنٹل گاڑیاں خریدتا ہے، تو اس گاڑی کو ٹھیک کرنے میں کبھی کھڑکی کی ضرورت پڑتی ہے اور کبھی چھت کی ضرورت پڑتی ہے، تو اگر گاڑی کے ان پارٹس کو ایجنسی سے خریدیں تو یہ چیزیں پرانی گاڑی کے پیسوں کے بمقابلہ ٦۰/ فیصد مہنگی ہوتی ہیں؛ اس لئے ان چیزوں کو کباڑی کی دوکان سے خرید لیتے ہیں، جہاں سے پرانے سامان بہت سستے مل جاتے ہیں اور اس طرح گاڑی کی مرمت کرنے میں بچت اچھی ہوتی ہے؛ البتہ کباڑی کی دوکان جہاں سے ہم پارٹس خریدتے ہیں تو وہاں جو گاڑیاں کاٹی جاتی ہیں وہ عموماً چوری کی ہوتی ہیں اور کچھ گاڑیاں خرید کر بھی کاٹی جاتی ہیں؛ لہٰذا

ہم جو بھی سامان کباڑی کی دوکان سے خریدیں گے اس میں غالب گمان چوری کا ہے اور مغلوب اور احتمال اس بات کا بھی ہے کہ وہ خریدی ہوئی گاڑی کا پارٹ ہے، تو کیا اس احتمال کی وجہ سے مطلقاً پارٹس خریدنا جائز ہوسکتا ہے؟ اور لوگ جواز کی دلیل میں یہ بات پیش کرتے ہیں کہ جس طرح شراب کی بوتلوں کو خریدنا اور پھر اس کو بیچنا جائز ہے، جب کہ اس میں ظن غالب یہی ہے کہ اس میں دوبارہ شراب بھری جاتی ہے؛ لیکن احتمال اس بات کا بھی ہے کہ اس میں تیل وغیرہ بھرا جائے۔ حضرت والا سے گزارش ہے کہ دلائل کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی شایان شان اجر عظیم عطا فرمائے اور آپ کی عمر میں برکت دے۔ آمین

المستفتی: مولانا محمد طارق صاحب نعمانی، قصبہ جویا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جن دوکانوں کے بارے میں یقین سے معلوم ہے کہ چوری کا مال ہے یا ظن غالب یہی ہے کہ چوری کا مال یہاں بکتا ہے، تو وہاں سے مذکورہ سامان خریدنا خریدار کے لئے جائز نہیں ہے، اگر سستے کے لالچ میں وہاں سے خریدے گا تو چوری کے گناہ میں خریدار بھی شامل ہوجائے گا۔ اور جن دوکانوں کے بارے میں یقین ہے یا ظن غالب ہے کہ یہاں چوری کا سامان نہیں بکتا ہے، وہاں سے خریدنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور شراب کی بوتلوں پر اس مسئلے کو قیاس کرنا درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ شراب کی بوتلیں چوری کی نہیں ہوتی ہیں اور یہاں مسئلہ چوری کا ہے۔

قال علیه السلام: من اشترى سرقة وهو يعلم أنها سرقة، فقد شرك في عارها، وإثمها. (شعب الإيمان، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٩، رقم: ٥٥٠٠، المصنف لابن أبي شيبة، جديد موسسة العلوم القرآن بيروت ١١/ ٣٣٨، رقم: ٢٢٤٩٥، فيض القدير ١١/ ٥٦٥٤، رقم: ٨٤٤٣، بحواله محموديه ڈابهيل ١٦/ ٨٦)

والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم

عين الحرام لا يحل له. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب فيمن ورث مالا حراما، كراچی ٥/ ٩٩، زكريا ٧/ ٣٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۱۷)

چوری کا مال خریدنا کیسا ہے؟

سوال [۸۷۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ناجائز طریقہ سے حاصل شدہ مال کا خریدنا واستعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً چوری کا مال یا ایسا کوئی مال جس کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ یہ غلط طریقہ سے آیا ہے، جیسے آج کل آم وغیرہ کے باغات عموماً خلاف شرع انداز پر بیچے جاتے ہیں، لوگ دس دس بیس بیس سال آگے تک کے لئے فصل خرید لیتے ہیں اور پھر وہ مارکیٹ میں آکر فروخت ہوتے ہیں، تو اس طرح کے اموال کی خرید وفروخت میں شرعاً کیا قباحت ہے؟

المستفتی: محمد الیاس، کٹک اڑیسہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چوری کا مال خریدنا ہرگز جائز نہیں ہے، اگر خرید چکا ہے تو واپس کردینا لازم ہے۔ اور اگر اصل مالک معلوم ہوجائے تو اس کے حوالہ کردینا چاہئے، اگر وہ فروخت کرنے پر تیار ہوجائے تو اس سے معاملہ کرسکتے ہیں۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۱/ ۲۸۰، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۸۶)

قال عليه السلام: من اشترى سرقة وهو يعلم أنها سرقة، فقد شرك في عارها، وإثمها. (شعب الإيمان، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٩، رقم: ٥٥٠٠، المصنف لابن أبي شيبة، جديد موسسة العلوم القرآن بيروت ١١/ ٣٣٨، رقم: ٢٢٤٩٥)

والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له. (شامي، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، مطلب فيمن ورث مالا حراما، كراچی ٥/ ٩٩، زكريا ٧/ ٣٠١)

اور بیع فاسد سے حاصل شدہ مال پر جب مشتری بائع کی اجازت سے قبضہ کرلیتا ہے تو شرعاً مشتری مالک ہوجاتا ہے، بس رفع فساد کے لئے واپسی لازم ہوتی ہے؛ اس لئے دوسرے لوگوں کو اس سے خریدنا جائز ہوجاتا ہے اور پھر اس کے بعد واپسی بھی شرعاً لازم نہیں ہوا کرتی ہے۔

وإذا قبض المشتري المبيع في البيع الفاسد بأمر البائع، وفي العقد عوضان كل واحد منهما مال ملك المبيع ولزمته قيمته -إلى قوله- ولكل واحد من المتعاقدين فسخه رفعا للفساد. (وقوله) فإن باعه المشتري نفذ بيعه؛ لأنه ملكه، فملك التصرف فيه وسقط حق الاسترداد لتعلق حق العبد بالثاني، ونقض الأول لحق الشرع. (هداية، باب البيع الفاسد، فصل في أحكامه، اشرفي ديوبند ٣/ ٦٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١١؍صفر ١٤١٣ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٢٨/ ٣٠١٣)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤١٣/٢/١١ھ

مال مسروق کی بیع وشراء کا حکم

سوال [٨٧١٨]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بہت سے حضرات اون کا کام کرتے ہیں (یہ اون نہیں بلکہ ریشمی اون ہے) اون کی چادریں بنا کر فروخت کرتے ہیں، یہی ان کا کاروبار ہے؛ لیکن معلوم ہوا کہ وہ اون جو آتی ہے وہ نمبر دو کا مال ہے؛ کیوں کہ نمبر ایک کی اگر اون لاکر اس کا کچھ بھی مال تیار کر کے فروخت کریں تو اس میں فائدہ نہیں ہے، نمبر دو کی ہی اون کا مال بناتے ہیں، تو فائدہ ہے، نمبر دو کی تفصیل یہ ہے کہ لدھیانہ میں یہ مال بنتا ہے اور وہیں اس کی رنگائی ہوتی ہے، رنگائی کے

بڑے بڑے کارخانہ ہیں، کوئنٹلوں مال رنگا جاتا ہے، رنگنے والے اس مال میں سے جو کسی کا رنگنے کے واسطے مال آیا ہے؛ کیوں کہ وہ سوکھا مال ہوتا ہے، جب رنگائی کر کے وہ مال واپس کرتے ہیں تو اس میں سے کچھ مال اپنے پاس رکھ لیتے ہیں، یہ تو چوری کرتے ہیں، اس طرح سے کوئنٹلوں مال جمع کر کے اس کو فروخت کر دیتے ہیں، ان کا یہ رویہ ہے کہ یہ بڑے بڑے کارخانہ والے سب ہی غیر مسلم ہیں۔ اور اگر کوئی مسلمان بھی رنگنے کے واسطے مال دے تو اس میں سے بھی رکھنا ضروری ہے، یعنی یہ ان کا پیشہ ہے، رنگوانے والوں کو بھی خوب معلوم ہے کہ یہ ایسا کرتے ہیں، اب اس مال کو مسلمان یا غیر مسلم خرید کر دوسروں کو بیچتے ہیں، ہمارے یہاں ایسا کاروبار بہت چل رہا ہے، یہ کاروبار کرنا کیسا ہے؟ کچھ اگر گنجائش ہو تو جواب سے مطلع کریں، اس اون کا تیار کیا ہوا مال لے کر فروخت کرنا یا لے کر جمع کر کے رکھنا کیسا ہے؟ اور اس کو بکری کے اوقات میں ہی بیچنا جیسے کہ گرمیوں میں ستا مل جاتا ہے، سردیوں میں کچھ مہنگا ہو جاتا ہے، اکثر لینے والے ایسا کرتے ہیں، شرعاً یہ کیسا ہے؟

المستفتی: حافظ اشرف علی سہسپور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ براہ راست فیکٹری سے مال خرید رہے ہیں اور مال کے متعلق قطعی علم نہیں ہے کہ یہ چوری کا ہے تو ایسے مال کی خرید وفروخت جائز ہے، نیز ایسے مال کو خرید کر کے جمع کرنا، پھر اسے اس کے موسم میں فروخت کرنا جب کہ آپ کے جمع کرنے سے دوسروں کو کوئی تنگی پیش نہ آتی ہو، تو درست ہے، یہ شکل احتکار میں شامل نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۱۹)

وإن اشترى في ذلك المصر، وحبسه ولا يضر بأهل المصر لا بأس به.

(هندية، كتاب البيوع، الباب العشرون في البياعات المكروهة، فصل في الاحتكار، زكريا قديم ۳/ ۲۱۳، جديد ۳/ ۲۰۰، درمختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ۳۹۸، زكريا ۹/ ۵۷۱، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ۲۱۳، هداية مع فتح القدير، كوئٹه ۸/ ٤۹۱، زكريا ۱۰/ ٦۹)

البتہ اگر آپ کو تحقیق سے معلوم ہو جائے کہ یہ مال چوری کا ہے تو ایسے مال کی خرید وفروخت شرعاً ناجائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ قدیم ۶/۲۸۳، جدید زکریا ۱۰/۲۲۱، محمودیہ قدیم ۱۱/۲۸۰، جدید ڈابھیل ۱۶/۸۶)

قال علیه السلام: من اشترى سرقة وهو يعلم أنها سرقة، فقد شرك في عارها، وإثمها. (شعب الإيمان، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٩، رقم: ٥٥٠٠، المصنف لابن أبي شيبة، جديد موسسة العلوم القرآن بيروت ١١/ ٣٣٨، رقم: ٢٢٤٩٥)

قال: هي لي ظلمني فلان وغصبها مني، فأخذتها منه لا ينبغي للسامع أن يشتري منه؛ لأن الغصب أمر مستنكر. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الأول، الفصل الثاني في العمل بخير الواحد في المعاملات، زكريا قديم ٥/ ٣١١، جديد ٥/ ٣٥٩، البحرالرائق، فصل في البيع، كوئٹه ٨/ ٢٠٠، زكريا ٨/ ٣٦٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۴۲۱/۶/۱۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/۶۰ ۶۷)	۱۴۲۱/۶/۱۴ھ

چوری کی لکڑی کی خرید وفروخت اور عددوں کو تیار کرنے پر مزدوری لینا

سوال [۸۷۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (الف) ہمارے شہر میں لکڑی میں صنعت کاری کا کام ہوتا ہے، مختلف قسم کی لکڑیاں آتی ہیں، ان کو چیر کران کا عدد تیار ہوتا ہے، پھر اس کو فیشن وغیرہ کرکے تھیلی اور ڈبہ میں پیک کرکے باہر بھیجا جاتا ہے، ان ہی لکڑیوں میں ایک لکڑی نمبر دو کی آتی ہے، جو کہ گورنمنٹ کی ہوتی ہے۔ اور چوری سے کاٹ کرلائی جاتی ہے، اور چوری ہی سے بکتی ہے، چوری ہی سے چیری جاتی ہے، پکڑے جانے پر جرمانہ بھی ہوتا ہے اور بے عزتی بھی ہوتی ہے اور یہ لکڑی مناسب قیمت پر ملتی ہے، تو کیا اس لکڑی کو خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ ایسا کرتے

ہیں کہ اس کے کٹے ہوئے عدد ڈبہ یا تھیلی میں پیک تیار مال خرید لیتے ہیں، جب کہ خریدنے والے کو یقینی یہ بات معلوم ہے کہ یہ مال اسی چوری کی لکڑی کا ہے؛ لیکن ایسا خریدنے میں پکڑے جانے کا اور رسوائی کا خطرہ کم ہوتا ہے، تو ایسا مال خریدنا معلوم ہوتے ہوئے جائز ہے یا ناجائز ہے؟

(ب): نیز اسی لکڑی کے عددوں کو تیار کرنے پر مزدوری لینا کیسا ہے؟

المستفتی: حافظ فرید احمد نگینہ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: الف: جس لکڑی کے بارے میں یہ یقین ہو کہ وہ چوری کی ہے جیسا کہ سوال میں ہے، تو ایسی لکڑی کو خریدنا اور بیچنا دونوں ناجائز ہے۔

إن علم أن العين التي يغلب على الظن أنهم أخذوها من الغير بالظلم قائمة وباعوه في الأسواق، فإنه لا ينبغي شراءه منهم، وإن تداولته الأيدي.
(طحطاوي على الدر، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كوئٹه ٤/ ١٩٢)

ب: چوری کی لکڑی کے عددوں کو تیار کرنے پر مزدوری لینا جائز ہے؛ کیوں کہ یہ اپنے کام کی اجرت ہے، چوری میں شرکت نہیں ہے۔

ولو آجر نفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها لا بأس به؛ لأنه لا معصية في عين العمل. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩٢، زكريا ٩/ ٥٦٢)

ولأبي حنيفة وأبي يوسف وكسر الحطب ...... بإيقاع الفعل على المحل بالتجافي، ولكن الكل فيه سواء في صفة الحل شرعاً، فلهذا جاز الاستئجار عليه. (مبسوط سرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١٦/ ٤٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/ ۱/ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۴۰۶)

باغات کی خرید وفروخت

سوال [۸۷۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آم کے باغ کی فصل کو پھول یا پھل آنے سے قبل ہی ایک سال، دو سال یا اور زیادہ عرصہ کے لئے فروخت کیا جائے، پچھلے طویل عرصے سے ہم اپنے باغ کی فصل اسی طرح فروخت کرتے آئے ہیں کہ ماہ ستمبر، اکتوبر میں دو سال کی فصل فروخت کردی جاتی تھی، جب کہ پھول اور پھل فروری کے مہینے میں نکلتے ہیں، اگر چہ یہ علم تھا کہ اس طرح کی فروخت شرعی طور پر جائز نہیں ہے؛ لیکن چونکہ دستور اور رواج اس طرح کا ہے؛ اس لئے بدرجہ مجبوری اسے فروخت کیا جاسکتا ہے؛ لیکن کسی کتاب کے مطالعہ کے دوران یہ علم ہوا کہ اس طرح کی بیع ناجائز ہے اور اس کی آمدنی حرام ہے، چنانچہ ہم نے ارادہ کیا کہ اس بار ہم اس طرح فروخت نہیں کریں گے۔ جو صاحب ہر سال ہمارے باغ کی فصل لیا کرتے تھے وہ پچاس ہزار روپئے نقد لے کر آئے بطور بیعانہ اور کہا کہ پہلے سال کی فصل سے پہلے ایک لاکھ اور دوسرے سال کی فصل سے پہلے ایک لاکھ یعنی کل ملا کر ڈھائی لاکھ روپئے دو سال کی فصل کے لئے ادا کریں گے؛ لیکن ہم نے انہیں سختی سے منع کردیا کہ اب ہم اس طرح فصل نہیں فروخت کریں گے۔ چنانچہ ہم نے باغ کی دیکھ بھال خود شروع کردی اور جتائی، صفائی، تلائی، کھاد وآب پاشی اور کٹر ون اور بیماریوں کی روک تھام کے لئے دواؤں کا چھڑکاؤ وغیرہ کروایا، جس پر تقریباً -/81,000 (اکیاسی ہزار روپے) خرچ کئے۔ اور فروری اور مارچ میں پھول اور پھل بننے کے بعد اسے فروخت کرنے کا ارادہ کیا، بہت لوگوں سے رابطہ کیا؛ لیکن سب نے ایک ہی جواب دیا کہ دو سال کے لئے دیں گے جیسا کہ دستور ہے، تو لے سکتے ہیں ورنہ نہیں، مجبوراً اپریل کے آخر میں صرف -/20,000 (بیس ہزار روپے) میں اس سال کی فصل فروخت ہوئی، اس طرح پہلے سال کی فصل میں ایک لاکھ تیس ہزار کم ملے اور مبلغ اکیاسی ہزار روپے اپنے پاس سے خرچ کئے، جب کہ بصورت دیگر یہ خرچ خریدار کے ذمہ ہوتا ہے۔

اب موجودہ فصل کے اختتام پر پھر وہی حالات درپیش ہوں گے، اگلے دو سال کی فصل کی فروخت کے لئے، ایسی صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہئے کہ ہم شرعی احکامات کی خلاف ورزی کے مرتکب نہ ہوں اور ہمیں مالی طور پر خسارہ بھی نہ برداشت کرنا پڑے۔
نیز یہ کہ ماضی میں جو سالہا سال تک ہم سے غلطی سرزد ہوتی رہی اور اس آمدنی کو ہم اپنے استعمال میں لاتے رہے، تو اس کے کفارہ کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ از راہ کرم مفصل اور مدلل جواب تحریر فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔ فقط

المستفتی: بذل الرحمٰن فاروقی، قصبہ ڈھکہ تحصیل حسن پور، جے پی نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ شروع سے آخر تک پڑھا گیا ہے، باغ کی خرید وفروخت کا جو دستور چلا آرہا ہے، وہ شرعی طور پر جائز نہیں ہے، اس کے لئے متبادل شکل یہی ہے کہ باغ کی فروختگی کے ساتھ مع زمین کے دو سال کے لئے معاملہ طے کیا جائے کہ جس میں خریدار کو اس باغ کے دائرہ میں کسی بھی چیز کے کاشت کرنے کی اجازت ہو اور باغ کے بیچ بیچ میں جو خالی جگہ ہو اس میں جو چیز بھی پیدا ہوسکتی ہے خریدار ان جگہوں میں کوئی بھی چیز بو کر پیداوار حاصل کرسکے، اس طرح زمین سمیت دو سال کے لئے فروخت کردیا جائے اور کھیتی کے ساتھ باغ کی دیکھ ریکھ کر کے اس کے پھلوں سے بھی فائدہ اٹھائے، ایسی شکل اختیار کرنا جائز ہے؛ لہٰذا آئندہ سے آپ اس طرح معاملہ کرسکتے ہیں اور پچھلے سالوں میں جو معاملہ کیا گیا ہے اس سے اللہ سے توبہ کرلیں، اللہ پاک بندوں کی توبہ قبول کرتے ہیں۔

(مستفاد: ایضاح النوادر، ص: ۴۷، انوار رحمت، ص: ۱۸۰)

عن جابر بن عبدالله –رضي الله عنه– قال: نهى النبي ﷺ عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها. (صحيح البخاري، الزكوة، باب من باع ثماره أو نخله ۱/ ۲۰۱، رقم: ۱٤٦٥، ف: ۱٤۸۷، صحيح مسلم، البيوع، باب النهي عن بيع الثمار قبل بدو صلاحها، النسخة الهندية ۲/ ۷، بيت الأفكار، رقم: ۱٥۳٤، سنن أبي داؤد، البيوع،

باب بيع الثمار قبل أن يبدو صلاحها، النسخة الهندية ۲/ ٤٧٨، دارالسلام، رقم: ٣٣٦٧)

ومن استاجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها فهو جائز.

(هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، اشرفی دیوبند ٣/ ٣٠٦، البحرالرائق، کوئٹه ٨/ ٢٤، زكريا ٨/ ٤٣، درمختار مع الشامي، كراچی ٦/ ٦٠، زكريا ٩/ ٨٢)

وإن استأجر دارا سنة بعشرة دراهم جاز، وإن لم يبين قسط كل شهر من الأجرة. (هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٣٠٢)

قال الله تعالىٰ: ﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَأُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾.

[النساء: ١٧] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ر شعبان ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۷۸/۳۹)

بدوصلاح سے قبل پھلوں کی خرید وفروخت

سوال [۸۷۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے ایک عزیز نے باغ کی بہار اس کے مول (پھول) پر ہی فروخت کردی، بغیر دریافت کئے، جب کہ شرعی حیثیت سے خرید وفروخت ناجائز ہے، میں اپنے حصہ کی رقم کو کس مد میں خرچ کروں؟

(۱) اس کو اپنے خرچ میں کروں یا نہیں؟ اگر کی جائے تو کس طرح؟

(۲) مکان کی مرمت میں ہوسکتی ہے یا نہیں؟

(۳) اس کے علاوہ جس مد میں خرچ ہوسکتی ہو تحریر فرمائیں، تاکہ اس وقت کی پکڑ سے محفوظ رہوں، اس کے لئے جو شرعی حیثیت ہو تحریر فرمائیں۔ فقط

المستفتی: محمد حنیف لاجپت نگر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں درج شدہ صورت میں جانبین پر واجب ہے کہ عقد کو فسخ کر کے مشتری ثمن واپس کر لے اور مالک باغ واپس کرے، نہ مالک کو ثمن میں تصرف جائز ہے اور نہ مشتری کو باغ میں تصرف جائز؛ اس لئے مذکورہ رقم باغ کا مالک واپس کر کے مشتری کو لوٹانے کے علاوہ کوئی اور شکل نہیں، جب باغ میں پھل ظاہر ہو جائے تو دوبارہ عقد شرعی کر سکتے ہیں۔

عن جابر بن عبدالله –رضي الله عنه– قال: نهى النبي ﷺ عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها. (صحيح البخاري، الزكوة، باب من باع ثماره أو نخله ١/ ٢٠١، رقم: ١٤٦٥، ف: ١٤٨٧، صحيح مسلم، البيوع، باب النهي عن بيع الثمار قبل بدو صلاحها، النسخة الهندية ٢/ ٧، بيت الأفكار، رقم: ١٥٣٤، سنن أبي داؤد، البيوع، باب بيع الثمار قبل أن يبدو صلاحها، النسخة الهندية ٢/ ٤٧٨، دارالسلام، رقم: ٣٣٦٧)

منها: أن يكون موجودا فلا ينعقد بيع المعدوم (وقوله) وكذا بيع الثمر والزرع قبل ظهوره؛ لأنهما معدوم، وإن كان بعد الطلوع جاز. (بدائع الصنائع، كتاب البيوع، فصل وأما الذي يرجع على المعقود عليه، كراچی ٥/ ١٣٨، زكريا ٤/ ٣٢٦)

وقوله: روى عن النبي عليه الصلاة والسلام، أنه نهى عن بيع الثمار قبل بدو صلاحها. الخ (بدائع الصنائع، كراچی ٥/ ١٣٨، زكريا ٤/ ٣٢٦)

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيوع الفاسدة –إلى قوله– ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه (وقوله) يجب عليه أن يرده على مالكه. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، مطبع سهارنپور ١/ ٣٧، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ١/ ٣٥٩، تحت رقم الحديث: ٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ رجب ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۸۱۸)

بہار انبہ کی فصل کی خرید وفروخت

سوال [۸۷۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: باغ بہار انبہ کی فصل قبل فصل آنے سے بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ کیا اس آمدنی سے حج بیت اللہ کا سفر کرنا درست ہوگا؟

المستفتی: راشد نگم قاضی سرائے

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: فصل آنے سے پہلے باغات کے پھل بیچنا ناجائز ہے؛ البتہ آم وغیرہ چونکہ اس کے پھل ایک مرتبہ میں نہیں پکتے؛ لہٰذا ان کو بعض پھل آنے کے بعد فروخت کرنا جائز ہے اور ناجائز اور حرام طریقہ سے حاصل کردہ مال سے حج واجب نہیں ہوتا ہے؛ لیکن حج کرلے تو ادا ہوجاتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/۱۰۲، احسن الفتاوی ۶/۴۸۶)

عن جابر بن عبدالله –رضي الله عنه– قال: نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها. (صحيح البخاري، الزكوة، باب من باع ثماره أو نخله ۱/ ۲۰۱، رقم: ۱۴٦٥، ف: ۱۴۸۷، صحيح مسلم، البيوع، باب النهي عن بيع الثمار قبل بدو صلاحها، النسخة الهندية ۲/ ۷، بيت الأفكار، رقم: ۱۵۳٤، سنن أبي داؤد، البيوع، باب بيع الثمار قبل أن يبدو صلاحها، النسخة الهندية ۲/ ٤۷۸، دارالسلام، رقم: ۳۳٦۷)

بيع الثمار قبل الظهور لا يصح إتفاقا، فإن باعها بعد أن تصير منتفعا بها يصح. (الهندية، كتاب البيوع، الباب التاسع في ما يجوز بيعه وما لا يجوز، زكريا قديم ۳/ ۱۰٦، جديد ۳/ ۱۰۷، الدر المختار، كتاب البيوع، مطلب في بيع الثمر والزرع والشجر مقصودا، كراچی ٤/ ۵۵۵، زكريا، ۷/ ۸۵)

ولو برز بعضها دون بعض لا يصح في ظاهر المذهب، وأفتى الحلواني بالجواز، وتحته في الشامية: فحيث تحققت الضرورة هنا أيضا

أمکن الحاقة بالمسلم للضرورة. (شامي، کراچی ٤/ ٥٥٥-٥٥٦، زکریا ٧/ ٨٥-٨٦)

لا یجب بالمال الحرام لکن لو حج به جاز. (مجمع الأنهر، کتاب الحج، قدیم ١/ ٢٦١، جدید دارالکتب العلمیة بیروت ١/ ٣٨٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۳۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۷/ ۶/ ۱۴۱۸ھ

باغ خریدنے کی جائز اور ناجائز شکلیں

سوال [۸۷۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے پھل آنے سے پہلے ہی باغ خریدا۔ شکل نمبر ۱/ پھول ابھی نہیں آیا ہے۔ شکل نمبر ۲/ پھول آچکا ہے، یا پھل تو آچکا ہے؛ لیکن نہایت چھوٹے چھوٹے ہیں، جو کسی کام میں نہیں آسکتے، لوگ ایسا کرتے ہیں؛ اس لئے عرض ہے کہ مذکورہ دونوں شکلیں شریعت کی رو سے جائز ہے یا ناجائز۔ اور جواز کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

المستفتی: افسر علی خان بلند شہری، معرفت ظفر دارک بدایوں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) باغ کی ایسی فصل کو خریدنا جس میں ابھی درخت پر پھول بھی نہیں آیا ہے، یا صرف پھول آچکا ہے درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ شئ معدوم کی بیع کے دائرہ میں داخل ہوکر ناجائز اور باطل ہے۔ (فتاوی رشیدیہ قدیم ۴۹۸، جدید زکریا ۶۴۷)

عن جابر بن عبداللہ – رضي اللہ عنه – قال: نهی النبي صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع الثمار حتی یبدو صلاحها. (صحیح البخاري، الزکوة، باب من باع ثماره أو نخله ١/ ٢٠١، رقم: ١٤٦٥، ف: ١٤٨٧، صحیح مسلم، البیوع، باب النهي عن بیع الثمار قبل بدو صلاحها، النسخة الهندیة ٢/ ٧، بیت الأفکار، رقم: ١٥٣٤)

فلم ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم كالحمل واللبن في الضرع والثمر قبل ظهوره. (شامي، كتاب البيوع، مطلب شرائط البيع أنواع أربعة، كراچی ٤/ ٥٠٥، زكريا ٧/ ١٥)

أما قبل الظهور فلا يصح إتفاقا. (شامي، مطلب في بيع الثمر والزرع والشجر مقصودا، زكريا ٧/ ٨٥، كراچی ٤/ ٥٥٥، هندية قديم ٣/ ١٠٦، جديد ٣/ ١٠٧)

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ معاملہ طے ہوچکنے کے بعد دوبارہ خریدار مالک سے یہ اجازت لے لے کہ پکنے تک کے لئے ہمارے پھل آپ کے درخت پر رہیں گےاور مالک زبانی اجازت دےدے، تب پکنےتک کے لئے جائز ہے۔

ولو اشتراها مطلقا وتركها بإذن البائع طاب له الفضل. (هداية، اشرفي ديو بند ٣/ ٢٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیراحمد قاسمی عفااللہ عنہ
۲۴؍ جمادی الاخریٰ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر:۸۴۸۳/۳۷)

الجواب صحیح:
احقرمحمدسلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۷/۲۴ھ

پھل آنے سے قبل باغات کی خرید وفروخت

سوال [۸۷۲۴]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں قصبہ ککرالہ ضلع بدایوں میں امرودوں کی فصل بہت زیادہ ہوتی ہے۔اورایک سال میں امرودوں کی دوفصلیں آتی ہیں اوردونوں فصلیں پھل آنے سے پہلے ہی بک جاتی ہیں۔ دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ یہ خرید وفروخت جائز ہے یانہیں؟ کچھ پرہیزگارلوگ پھل آنے کےانتظارمیں رہتے ہیں؛لیکن تب تک سب باغ فروخت ہوجاتے ہیں،اس حال میں ہم لوگ کیا کریں؟ جب کہ ہمارے یہاں یہی کاروبار ہے،تو پھل آنے سے پہلے بیچنا کیساہے؟خریدنے والا گنہگار ہے یانہیں؟

المستفتی: ابن علی خان جامعہ مراکیٹ، بدایوں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پرہیزگار لوگ جو عمل کرتے ہیں وہ صحیح ہے، شریعت اسلامی میں باغات میں پھل آنے سے قبل ان کی فصل فروخت کرنا ناجائز اور بیع فاسد ہے؛ اس لئے کہ یہ شیٔ معدوم کی بیع ہے، جو کہ شرعاً جائز نہیں ہے۔ اور پھل آنے سے قبل فروختگی کے جواز کی یہ شکل ہوسکتی ہے کہ چھ ماہ یا سال بھر کے لئے باغات مع زمین کے کرایہ پر دے دئے جائیں اور اس درمیان میں لینے والے کو یہ اختیار بھی دیا جائے کہ زمین میں کوئی چیز بو کر اس کی پیداوار سے فائدہ اٹھائے اور ساتھ ساتھ باغ میں جو پھل آئے گا وہ بھی کرایہ دار کی ملکیت میں ہوجائے گا۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۷۴)

عن جابر بن عبدالله – رضي الله عنه – قال: نهى النبي ﷺ عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها. (صحيح البخاري، الزكوة، باب من باع ثماره أو نخله ١/ ٢٠١، رقم: ١٤٦٥، ف: ١٤٨٧، صحيح مسلم، البيوع، باب النهي عن بيع الثمار قبل بدو صلاحها، النسخة الهندية ٢/ ٧، بيت الأفكار، رقم: ١٥٣٤)

ومن استأجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها فهو جائز. (هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، اشرفی دیو بند ٣/ ٣٠٦، البحرالرائق، کوئٹه ٨/ ٢٤، زكريا ٨/ ٤٣، درمختار مع الشامي، كراچی ٦/ ٦٠، زكريا ٩/ ٨٢)

نیز پھل آنے کے بعد فروخت کرنے میں بھی معاملہ طے ہوجانے کے بعد مالک اپنی زبان سے یہ کہہ دیا کرے کہ میں آپ کو پھلوں کے پکنے تک کے لئے درختوں پر چھوڑ دینے کی اجازت دیتا ہوں۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۷۵)

ولو اشتراها مطلقا وتركها بإذن البائع طاب له الفضل. (هداية، اشرفي ديو بند ٣/ ٢٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۵۸۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/۹/۱۴۱۴ھ

پھل آنے سے قبل باغ کی بیع وشراء کی جائز اور ناجائز صورت

سوال [۸۷۲۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ہم اپنی زمین جس میں باغ ہے؛ لیکن کچھ نہ کچھ اس میں پیدا ہوسکتا ہے، اجرت پر دینا چاہتے ہیں، مثلاً بیس بیگہ زمین مع باغ ایک سال کے لئے پندرہ ہزار روپئے میں اور کچھ جنس آم دو کوئنٹل فصل میں طے کرتے ہیں، الحمد للہ باغ میں پھل خوب آتا ہے، کیا اس طرح معاملہ کرنا جائز ہے؟

(۲) یا دوسری شکل پھل آنے سے قبل معاملہ طے کرلیا، مثلاً پندرہ ہزار میں اور کچھ آم دو کوئنٹل، جب کہ یہ بیع درست نہیں ہے۔ اور جب پھل بن کر تیار ہوگیا اس وقت اس سے کہا کہ وہ بیع درست نہیں تھی؛ اس لئے اب ہم دو ہزار روپئے کم کرکے تیرہ ہزار میں معاملہ کرتے ہیں، جس کی حقیقت صرف ایک حیلہ کی ہے، کیا یہ شکل جواز کے لئے صحیح ہے؟

المستفتی: غیاث الدین، مرادآبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) جس زمین میں باغ لگا ہوا ہے، اس کو ایک سال کے لئے مع باغ پندرہ ہزار روپئے کرایہ پر دینا جس میں مشتری کو اس درمیان باغ کے پھلوں کے ساتھ ساتھ زمین میں پیداوار وغیرہ کے ذریعہ فائدہ حاصل کرنے کا مکمل اختیار ہو شرعاً درست ہے؛ اس لئے کہ اس صورت میں اصل عقد اور معاملہ زمین کی کرایہ داری کا ہے اور باغ اس کے تابع ہے۔ اور پندرہ ہزار روپئے کے ساتھ بائع کی طرف سے دو کوئنٹل آم کی بات جزو ثمن و قیمت کے درجہ میں ہوکر اس وقت جائز ہے، جب کہ اس باغ کے آم ہونے کی شرط نہ لگائی جائے؛ بلکہ مشتری کو اختیار رہے کہ وہ کہیں سے بھی دے اور آم کی نوع وقسم بھی متعین کرلی جائے (مثلاً چوسہ، دسہری وغیرہ) ہونا، تاکہ جھگڑے وغیرہ کی نوبت نہ آئے، تو ایسی صورت میں دو کوئنٹل آم کی بات درست ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۵۷، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۱/ ۲۸۶، جدید ڈابھیل ۱۶/ ۷۰۱)

ومن استأجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها فهو جائز. (هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، اشرفی دیوبند ۳/ ۳۰۶، البحرالرائق، کوئٹه ۸/ ۲۴، زکریا ۸/ ۴۳، درمختار مع الشامي، کراچی ۶/ ۶۰، زکریا ۹/ ۸۲)

ولا يجوز أن يبيع ثمرة، ويستثنى منها أرطالا معلومة. (هداية، أشرفي ديوبند ۳/ ۲۷)

وكل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين ...... يفسده. (هداية، أشرفي ديوبند ۳/ ۵۹)

(۲) پھل آنے سے قبل فصل کوفروخت کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ شئ معدوم کی بیع ہے، جوشرعاً درست نہیں ہے، نیز سوال میں ذکرکردہ حیلہ اس وقت درست ہے جب کہ پہلے سابقہ عقد فاسد کومکمل ختم کردیا جائے اوراس کوختم کرنا لازم ہے، اس کے بعد ازسرنوفصل کا معاملہ کریں، اب جس مقدار پر جانبین رضا مند ہوجائیں اس پر فروخت کرنا جائز ہے؛ لیکن اگرصرف بائع کی طرف سے تیرہ ہزار کی بات ہواور مشتری کومنظور نہ ہو یا مشتری کی طرف سے ہواور بائع کومنظور نہ ہو، تو یہ بیع تراضی کے نہ ہونے کی وجہ سے درست نہ ہوگی۔(مستفاد: ایضاح النوادر ا/ ۷۵)

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ. [النساء: ۲۹]

فلم ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم كالحمل ...... والثمر قبل ظهوره. (شامي، البيوع، مطلب شرائط البيع، أنواع أربعة، کراچی ۴/ ۵۰۵، زکریا ۷/ ۱۵)

إن التراضي من الجانبين لا يدل عليه الإيجاب وحده بل هو مع القبول. (شامي، مطلب القبول قد يكون بالفعل، وليس من صور التعاطي، کراچی ۴/ ۵۰۷، زکریا ۷/ ۱۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍ ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۱۷۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۲/۴/۱۸ھ

پھل آنے سے پہلے ان کی بیع کا حکم

سوال [۸۷۲۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل عام آموں کی یا ان پھلوں کی جن کی بیع پھل کے آنے سے پہلے ہی ہو جاتی ہے، تو ایسے پھلوں کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ اور ان پھلوں کو خریدیں یا نہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ اگر مالک بیع مجہول کرے اور بیع مجہول کرتے وقت کچھ ڈالی اپنے لئے متعین کر لے کہ ہم کو اتنے من آم دینے ہیں، اب مالک بطور ہدیہ لائے یا خود استعمال کرے، تو جائز ہے یا نہیں؟ نیز ایک صاحب یہ کہتے ہیں کہ اب تقریباً ننانوے فیصد بیع مجہول ہے؛ لہٰذا بازار کے آم بھی استعمال کرنا جائز نہیں۔ ''للأ کثر حکم الکل''۔

اور ایک بات یہ ہے کہ جو پھل بازار میں آئے اور متعین طور پر معلوم ہے کہ ان کی بیع ناجائز ہے، مثلاً کسی رشتہ دار کا ہے، یا ہم آم وغیرہ خریدنے کے لئے ایسے باغ میں جائیں جن کے بارے میں متعین طور پر معلوم ہو کہ اس کی بیع ناجائز ہوتی تو ایسے آموں کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: حافظ محمد فرحت تجوید القرآن، بلندشہر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: کئی کئی سال پہلے فصل فروخت کر دینا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ یہ شئ معدوم کی بیع ہے، جو کہ ناجائز ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۷۵)

عن جابر بن عبدالله –رضي الله عنه– قال: نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها. (صحيح البخاري، الزكوة، باب من باع ثماره أو نخله ۱/ ۲۰۱، رقم: ۱٤٦٥، ف: ۱٤۸۷)

فلم ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم كالحمل، واللبن في الضرع، والثمر قبل ظهوره. (شامي، كتاب البيوع، مطلب شرائط البيع، أنواع أربعة، زكريا ۷/ ۱٥، كراچی ٤/ ٥۰٥)

ہاں البتہ اگر باغ مع زمین کئی سال کے لئے کرایہ پر لے لیتا ہے وراس میں کھیتی کرتا ہے،تو باغ زمین کے تابع ہوکر عقد کے اندر داخل ہوجائے گا، پھراس میں دیکھ ریکھ اور پھلوں کی پرورش کرکے پھل حاصل کرتا ہے،تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے؛ اس لئے کہ اصل عقد زمین کی کرایہ داری کا ہے، باغ اس کے تابع ہے۔(مستفاد: ایضاح النوادر ۱/ ۷۵)

ومن استاجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها فهو جائز.

(هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، اشرفي ديو بند ٣/ ٣٠٦، البحرالرائق، كوئٹه ٨/ ٢٤، زكريا ٨/ ٤٣، درمختار مع الشامي، كراچی ٦/ ٦٠، زكريا ٩/ ٨٢)

اوراگر بائع کچھ آموں کی مقدار کواس طرح متعین کرتا ہے کہ فصل کی جتنی قیمت ہے اس کے علاوہ اتنے من آم بھی دینا پڑے گا، خواہ وہ آم کی کوئی بھی قسم ہو،تو ایسی صورت میں آم جزو ثمن میں داخل ہوکر جائز ہوجائے گا۔(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۱/ ۲۸۶ ،جدید ڈابھیل ۱۶/ ۱۰۱)

اوراگر اسی باغ کا آم ہونا متعین کرے تو یہ جائز نہیں ہے۔

وكل شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين ...... فسد.

(هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٥٩)

ولا يجوز أن يبيع ثمرة، ويستثنى منها أرطالا معلومة. (هداية، أشرفي ديو بند ٣/ ٥٩)

باغات کی جوخرید وفروخت ہوتی ہے وہ عام طور پر پھل آنے سے پہلے ایک دوسال کے لئے ہوتی ہے اوراس طرح کا عقد شرعاً عقد فاسد ہے، جوکہ واجب الاسترداد ہے؛ لیکن پھر باغبان سے جوتھوک بھاؤ کے خریدار ہوتے ہیں ان کا عقد شرعاً صحیح اور درست ہے، اس کے بعد بازاروں، منڈیوں میں جوپھل آتے ہیں تو وہ جائز عقد کے بعد آتے ہیں، پھراس کے بعد بازاروں منڈیوں میں جوخرید وفروخت کرتے ہیں وہ تمام صحیح اور درست ہے؛ اس لئے بازاروں سے پھلوں کوخرید کر کھانا بلاتردد جائز اور درست ہے۔

فإن باعه المشتري نفذ بيعه؛ لأنه ملكه فملك التصرف فيه، وسقط

حق الاسترداد، ولتعلق حق العبد بالثاني، ونقض الأول لحق الشرع، وحق العبد مقدم لحاجته؛ ولأن الأول مشروع بأصله دون وصفه، والثاني مشروع بأصله ووصفه (وتحته في البناية) وإذا باعه المشتري ليس للبائع إبطاله، وعلى المشتري القيمة أو المثل إن كان مثليا، ويطيب ذلک الملک للثاني؛ لأنه ملكه بعقد صحيح. (بناية، باب البيع الفاسد، فصل في أحكامه، قديم ۳/ ۱۱۳، جديد أشرفيه ۸/ ۲۰۳، فتح القدير، دارالفكر بيروت ٦/ ٤٦٦، كوئٹه ٦/ ٩٨، زكريا ديوبند ٦/ ٤٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۰۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/ ۵/ ۱۴۲۱ھ

پھل آنے سے پہلے فروخت کئے گئے باغوں کے پھلوں کا حکم

سوال [۸۷۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: باغات جواب عام طور پر پھل آنے سے پہلے گویا پتوں پر خریدے گئے ہوں، ان کی اس فروخت کے باعث ان کے آم کا کھانا جائز ہے یا ناجائز حرام ہے، یا کراہت، کراہت ہے، تو تحریمی یا تنزیہی؟

المستفتی: مولوی محمد ظریف قاسمی، امام جامع مسجد میوادہ نوادہ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر بور اور پھل آنے سے قبل باغ فروخت کیا جائے جیسا کہ ہمارے ہندوستان کے اکثر علاقوں میں رائج ہے، تو اس طرح باغ کے پھلوں کو فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ جانبین میں سے ہر ایک کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ اصل عقد اس پھل پر ہورہا ہے کہ جس کے پیدا ہونے کی امید ہے۔ اور ایسی مبیع کا وجود

لازم اورشرط ہے؛ اس لئے ناجائز اور بیع فاسد ہوجاتی ہے، ہاں البتہ اس کی متبادل شکل یہ ہوسکتی ہے کہ زمین مع پیڑوں کے ایک سال یا دوسال کے لئے کرایہ پر دے دے، پھراس درمیان باغ کی زمین میں سبزی وغیرہ کوئی بھی چیز بودے اور پیڑوں کی خدمت بھی کرتا رہے، تو ایسی صورت میں کھیتی اور باغ کے پھل سب خریدار کے لئے جائز ہوجائیں گے۔ (مستفاد: انوار رحمت/۱۸۰)

عن جابر بن عبدالله –رضي الله عنه– قال: نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها. (صحيح البخاري، الزكوة، باب من باع ثماره أو نخله ۱/ ۲۰۱، رقم: ۱٤٦٥، ف: ۱٤۸۷)

ومن استاجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها فهو جائز. (هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، اشرفی ديوبند ۳/ ۳۰٦، البحرالرائق، کوئٹه ۸/ ۲٤، زكريا ۸/ ٤۳، درمختار مع الشامي، کراچی ٦/ ٦۰، زكريا ۹/ ۸۲)

وفي القنية: استأجر أرضا سنة على أن يزرع فيها ماشاء فله أن يزرع فيها زرعين ربيعيا و خريفيا. (البحرالرائق، باب مايجوز من الإجارة وما يكون خلافا فيها، کوئٹه ۸/ ۱۰، زكريا ۸/ ۱۸، هندية زكريا قديم ٤/ ٤۷۱، جديد ٤/ ٥۱۱)

نیز اگر متبادل شکل اختیار نہیں کی ہے اور عقد فاسد کا معاملہ ہوجانے کے بعد باغ والوں سے جب دوسرے لوگ خرید کر بازار میں لاکر فروخت کریں گے، تو عام لوگوں کے لئے ان سے خرید کر کھانا جائز اور حلال ہے، یعنی پہلا عقد فاسد ہوا۔ اور یہ بعد میں جو سلسلہ وار ایک دوسرے سے خریداری ہوئی ہے وہ جائز ہے۔

فإن باعه المشتري بالشراء الفاسد نفذ بيعه؛ لأنه ملكه فملك التصرف فيه، وسقط حق الاسترداد لتعلق حق العبد بالثاني، ونقض الأول لحق الشرع، وحق العبد مقدم لحاجته؛ (هداية، أشرفي ديوبند ۳/ ٦٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍رجب ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۰۶۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴؍۷؍۱۴۲۷ھ

پھلوں کی فروختگی میں پہلا عقد فاسد ہونے کے بعد دیگر عقود کا صحیح ہوجانا

سوال [۸۷۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر پھلوں کی فروختگی کا معاملہ ہو چکا ہے اور یہ عقد فاسد ہوا ہے، اب اس عقد کے بعد خریدار نے پھلوں کو توڑ کر قبضہ کرلیا اور مالک بن گیا اس کے بعد باغ والے نے آڑھت والوں کے ہاتھ آموں کو فروخت کر دیا، تو سوال یہ ہے کہ آڑھت والوں کے ہاتھ جو معاملہ ہوا ہے، یہ فاسد ہے یا یہ عقد صحیح ہو چکا ہے؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مشتری نے جب عقد فاسد میں پھلوں کو توڑ کر قبضہ کرلیا تو وہ ان کا مالک بن گیا؛ لہٰذا اب اگر یہ کسی دوسرے کو یہ پھل بیچے گا تو یہ عقد صحیح ہوگا اور اس کے بعد جتنے عقد ہوں گے تیسرا، چوتھا عقد سب صحیح ہوں گے۔

فإن باعه، أي باع المشتري ما اشتراه شراء فاسدا بيعا صحيحا نفذ بيعه؛ لأنه ملكه فملك التصرف فيه، وسقط حق البائع الأول في الاسترداد. (فتح القدير، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، فصل في أحكامه، اشرفي ٦/ ٤٢٧، دارالفكر بيروت ٦/ ٤٦٦، كوئٹه ٦/ ٩٨)

فإن باعه المشتري نفذ بيعه؛ لأنه ملكه، فملك التصرف فيه.

(هداية، أشرفى ديوبند ٣/ ٦٥، بناية نعميه أشرفيه ديو بند ٨/ ٢٠٣)

يكره للمشتري أن يتصرف فيما اشترى شراء فاسدا بتمليك وانتفاع، فإن تصرف فيه كالبيع أو ما أشبه ذلك نفذ تصرفه ولم ينفسخ.

(تاتارخانية، زكريا ٨/ ٤٥٤، رقم: ١٢٤٧٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۸/۴/۱۴۳۵ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۷۶)

''بیع عرایا'' کی تفسیر میں ائمہ حدیث اور فقہاء کا اختلاف

سوال [۸۷۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ''عرایہ'' کے کیا معنی ہیں؟ اور ''عرایا'' کی تفسیر میں ائمہ محدثین کا اور فقہاء کا کا کیا اختلاف ہے اور اس پر فریقین کے دلائل اس کے جواب کیا ہیں؟

المستفتی: مولانا الطاف الرحمٰن صاحب مدرس مدرسہ امداد الغرباء رام نگر، ضلع پورنیہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حضرات محدثین عام طور پر ''عرایا'' کی تین تفسیریں مذاہب کے اعتبار سے پیش کرتے ہیں:

(۱) حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کچھ لوگ فقیر نادار تھے، جن کے پاس تو کھجوریں خریدنے کے لئے پیسہ نہیں تھا، مگر کھانے کو جی چاہتا تھا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی گئی تو بیت المال سے ان کو خشک کھجور ملتی تھی، اس کے بدلے میں اندازہ کرکے تازہ کھجور خریدنے کے لئے اجازت دے دی جو ابھی درخت پر ہے؛ لیکن یہ معاملہ پانچ وسق (ساڑھے دس کنٹل) سے زائد میں نہ ہو؛ لہٰذا امام شافعی علیہ الرحمہ کے نزدیک عرایا بیع کی قسم میں سے ہے۔

(۲) حضرت امام مالکؒ کے نزدیک یہ ہے کہ کسی کے باغ میں دوسرے شخص کے صرف ایک یا دو درخت ہوں اور اہل مدینہ کی عادت تھی کہ موسم میں بیوی بچوں کو باغ میں لے کر جاکر فروکش ہوجاتے تھے اب جس کے ایک دو درخت ہیں اس کی آمد ورفت صاحب باغ کی عورتوں کی ایذا وتکلیف کا باعث بن جاتی تھی؛ اس لئے صاحب باغ یہ کہہ دیتا کہ تمہارے درخت پر جو تازہ کھجور ہے اس کے عوض میں مجھ سے خشک خرما لے جاؤ اور یہاں مت آیا کرو؛ لہٰذا امام مالک کے نزدیک بھی عرایا بیع کی قسم سے ہے۔

(۳) امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک ''عریہ'' بمعنی عطیہ کے ہے، موسم میں جن کے

پاس باغ و پیسہ نہ ہوتے ان کو اہل باغ ایک دو درخت بطور عطیہ دے دیا کرتے، اور جب موہوب لہ کے آنے جانے پر واہب کو ایذا ہوتی تو واہب وعدہ سے بچنے کے لئے درخت کی تازہ کھجور کے بدلہ میں خشک کھجور فروخت کر دیتے؛ لہٰذا امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک بیع نہیں بلکہ ہبہ اور عطیہ ہے۔ دلائل اور تفصیل ''بذل المجہود'' میں ملاحظہ ہوں: (بذل المجهود، كتاب البيوع، باب في العرايا، مطبع سهارنپور ٤/ ٢٤٩، دارالبشائر الإسلاميه بيروت ١١/ ٦١، فيض الباري، كوئٹه ٣/ ٢٤٤، هداية، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد أشرفي ديوبند ٣/ ٥٣، عويصات ٢/ ١٢٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۶۳۸)

ایسے باغات کی خریداری کا حکم جن کی زمین میں کاشت نہیں ہوتی

سوال [۸۷۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں عام طور سے آم کے باغوں کی خرید وفروخت دو سال یا تین سال کے لئے پیشگی ہوتی ہے اور باغ کا مالک اس شخص کو جس نے باغ خریدا ہے، باغ کی زمین میں کاشت کرنے کی بھی اجازت دیتا ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ باغ کے خریدنے والے اصل میں باغ خریدتے ہیں؛ اس لئے کہ بہت سے باغ ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں کاشت نہیں ہوتی، آیا ایسی صورت میں ان باغوں کی خرید وفروخت کرنا درست ہے یا نہیں مطلع فرمائیں کرم ہوگا۔ فقط والسلام

المستفتی: احقر سلیم الدین غفرلہ، خادم جامع مسجد سہسپور، ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر دو سال یا تین چار سال کے لئے باغ خریدا ہے اور

باغ کی زمین اس لائق ہے کہ باضابطہ اس میں کھیتی کی جاسکتی ہے، تو مالک باغ سے مستقل زمین کو کرایہ پر لینے کی گفتگو کی جائے اور ساتھ میں یہ بھی طے کرلیا جائے کہ پیڑ کی پیداوار کرایہ دار کی ہوگی تو ایسی صورت میں دو تین سال کے لئے زمین اور پیڑ کو کرایہ پر لینے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اور اگر باغ کی زمین کھیتی کے قابل نہیں ہے، تو پھر زمین میں کھیتی کی شرط لگانا بے فائدہ ہے۔

ومن استاجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها فهو جائز.

(هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، اشرفی دیو بند ۳/ ۳۰۶، البحرالرائق، کوئٹه ۸/ ۲٤، زکریا ۸/ ٤۳، درمختار مع الشامي، کراچی ٦/ ٦۰، زکریا ۹/ ۸۲)

وإن استاجر دارا سنة بعشرة دراهم جاز، وإن لم يبين قسط كل شهر من الأجرة. (هداية، أشرفي ديوبند ۳/ ۳۰۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۳۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۷/ ۴/ ۱۴۲۵ھ

کئی سال کے لئے باغات کو ٹھیکہ پر لینا

سوال [۸۷۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے علاقہ میں اکثر باغات کئی کئی سال کے ٹھیکہ پر لوگ خرید لیتے ہیں، جتنے سالوں کے لئے باغ خریدا تھا وہ مدت پوری ہوجانے پر باغ کے مالک کو باغ واپس مل جاتا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اس طرح کئی کئی سال کے ٹھیکہ پر باغات کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں ہے، تو اس طرح کے باغات کے پھل کھانا ناجائز ہے یا نہیں؟ صحیح صورت حال خرید وفروخت کی کیا ہے؟

المستفتی: عبد الرشید قاسمی سیڑھا، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: باغات کی خریداری کا مقصد پیدا ہونے والے پھلوں کی خریداری ہے اور یہ شئ معدوم کی خریداری ہوتی ہے؛ اس لئے حضرات فقہاء نے اس کو بیع فاسد میں شمار کیا ہے؛ البتہ باغبان کے ہاتھوں سے آڑھت والوں کا خریدنا اور پھر آڑھت والوں سے بازار والوں کا خریدنا یہ سب بلاتردد جائز اور درست ہے، اس میں کراہت بھی نہیں ہے۔

فإن باعه المشتري نفذ بيعه؛ لأنه ملكه فملك التصرف فيه، وسقط حق الاسترداد لتعلق حق العبد بالثاني، ونقض الأول لحق الشرع، وحق العبد مقدم لحاجته؛ (هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٦٤)

اور کئی سال کے لئے باغات کی خریداری کے جواز کے لئے متبادل شکل یہ ہے کہ مع زمین کے لے لے اور اس درمیان میں باغبان اس زمین میں کوئی بھی چیز بو کر کے فائدہ اٹھالے تو ایسی صورت میں تبعاً اس درمیان پیڑوں میں جو کچھ پھل پیدا ہوسکتا ہے وہ باغبان کے لئے حلال ہوجائے گا، اس طریقہ سے کئی سالوں کی خریداری کا مسئلہ جواز کے دائرے میں آسکتا ہے۔ (مستفاد: انوار رحمت، ص:۱۸۰)

ومن استأجر أرضا على أن يكربها ويزرعها ويسقيها فهو جائز.

(هداية، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة، اشرفی دیوبند ٣/ ٣٠٦، البحرالرائق، کوئٹه ٨/ ٢٤، زكريا ٨/ ٤٣، درمختار مع الشامي، كراچی ٦/ ٦٠، زكريا ٩/ ٨٢) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/۱۰/۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۷/۹۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/۱۰/۱۴۲۷ھ

باغ کی فصل فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۷۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: میں اپنے باغ آم وامرود، ناشپاتی، لیمو، بیل وغیرہ ان فصلوں کو دوسال کے لئے فروخت کر دیتا ہوں۔ اور ہمارے علاقہ میں خریدار اسی طرح لیتے ہیں، امسال واسطہ نہیں پڑا، لیتے میں ان میں سے ہر قسم کی ڈالی بھی طے کر لیتا ہوں۔

المستفتی: محمد عقیل خان غازی آبادی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح سے باغوں کی بیع جائز نہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ زمین کو ٹھیکہ پر لے لیا جائے، اس کے بعد جو پھل ہوں گے وہ بھی جائز ہوں گے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۴/۱۷۴، جدید ڈابھیل ۱۶/۱۰۱)

عن جابر بن عبدالله –رضي الله عنه– قال: نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها. (صحيح البخاري، الزكوة، باب من باع ثماره أو نخله ١/ ٢٠١، رقم: ١٤٦٥، ف: ١٤٨٧)

بيع الثمار قبل الظهور لا يصح إتفاقا، فإن باعها بعد أن تصير منتفعا بها يصح. (الهندية، كتاب البيوع، الباب التاسع في ما يجوز بيعه وما لا يجوز، الفصل الثاني زكريا قديم ٣/ ١٠٦، جديد ٣/ ١٠٧، الدر المختار، كتاب البيوع، مطلب في بيع الثمر والزرع و الشجر مقصودا، كراچی ٤/ ٥٥٥، زكريا، ٧/ ٨٥) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۴۲۰/۲/۱۹ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۰۳۶)	۱۴۲۰/۲/۱۹ھ

پانچ کوئنٹل آم کے عوض باغ فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۷۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مالکان باغ بہار باغ لینے والے سے یہ طے کر لیتے ہیں کہ پوری فصل میں پانچ کوئنٹل

آم ہمارے یہاں پہنچانے ہیں، بہار باغ خریدار یومیہ آم پہنچا کر پوری فصل میں پانچ کوئنٹل آم طےشدہ پورا کرتا ہے، مالکان باغ کا اس طرح سے آم طے کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: اقبال احمد، شیرکوٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مالکان باغ کا خریداروں سے اس طرح آم طے کر کے لینا جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر کسی خاص اور معین درخت کو بوقت خرید وفروخت الگ کرلیا جائے تو اس کے جواز میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (مستفاد: امدادی الفتاوی ۳/ ۹۸)

ولا يجوز أن يبيع ثمرة ويستثني منها أرطالا معلومة، خلافا لمالك بخلاف ما إذا باع واستثنى نخلا معينا؛ لأن الباقي معلوم بالمشاهدة. (هداية، كتاب البيوع، اشرفي ديو بند ۳/ ۲۷، عناية مع الفتح، دارالفكر بيروت ٦/ ۲۹۱، كوئٹه ٥/ ٤۹۲، زكريا ٦/ ۲٦۹، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ۱/ ۲۳۱، دارالكتاب ديو بند ۱/ ۲۲٥، تاتارخانية، زكريا ۸/ ۳۹۳، رقم: ۱۲۲۷۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/ جمادی الاولی ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۷۳۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۹/۵/۶ھ

بیس کوئنٹل آم پر باغ فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۷۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: باغ مالک فصل لینے والے سے یہ طے کرلیتے ہیں کہ بہار سے فصل میں بیس کوئنٹل آم مثلاً ہمارے گھر پہنچائے، اب فصل لینے والا روزانہ تھوڑے تھوڑے آم دے کر طے شدہ آم پورے کرتا ہے، تو کیا مالک فصل سے آم متعین کر کے فصل لینے والے سے آم گھر منگا سکتا ہے؟ یہ شکل جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: حاجی ضمیر احمد شیرکوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مالکان باغ کا خریداروں سے اس طرح آم طے کر کے لینا جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر کسی خاص اور معین درخت کو بوقت بیع الگ کرلیا جائے تو اس کے جواز میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (مستفاد: إمداد الفتاوی ۳/ ۹۵)

ولا يجوز أن يبيع ثمرة ويستثني منها أرطالا معلومة، خلافا لمالك بخلاف ما إذا باع واستثنى نخلا معينا؛ لأن الباقي معلوم بالمشاهدة. (هداية، كتاب البيوع، اشرفی دیوبند ۳/ ۲۷، فتح القدير، دارالفكر بيروت ٦/ ۲۹۱، كوئٹه ٥/ ٤٩٢، زكريا ٦/ ٢٦٩، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ١/ ٢٣١، دارالكتاب ديوبند ١/ ٢٢٥، تاتارخانية، زكريا ٨/ ٣٩٣، رقم: ١٢٢٧٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۷/ رجب ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۴۷)

”احتکار“ کا مطلب

سوال [۸۷۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ”احتکار“: حاجت شدید ہونے پر لفظ حالت شدید کن حالات میں استعمال کیا گیا ہے؟ (۱) اپنی حاجت (۲) قحط سالی (۳) سرکاری غلہ پر پابندی (۴) یا غرباء کی روزمرہ کی حاجات شدیدہ ہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ”احتکار“ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص غلہ کو اپنے گودام میں اسٹاک کر کے رکھے اور غلہ بازار میں بالکل نایاب ہو اور وہ شخص پھر بھی اپنا غلہ گودام نہیں کھولتا ہے، تو اس کو احتکار کہتے ہیں۔ اور اگر وہی غلہ بازار میں سستا یا مہنگا دستیاب ہے، تو اس

شخص کا اپنے گودام میں مہنگا ہونے تک رکھنا احتکار نہیں ہے، جس کی شریعت میں ممانعت آئی ہے اور اس میں دارالحرب، دارالاسلام اور جمہوریت کا کوئی فرق نہیں ہے۔

الاحتكار هو افتعال من حكر أي حبس، والمراد حبس الأقوات متربصا للغلاء. (حاشية: ٦ على الهداية، كتاب الكراهية، فصل في البيع، اشرفی دیوبند ٤/ ٤٧٠، حاشیه نووی علی المسلم، كتاب المساقاة والمزارعة، باب تحريم الاحتكار فی الأقوات ٢/ ٣١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ذیقعدہ ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۶۰۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۱۱/ ۱۴۲۵ھ

احتکار کی ممانعت کا مصداق

سوال [۸۷۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عوام الناس میں معروف ومشہور ہے کہ چالیس دن سے زائد غلہ کا اسٹاک کرنا منع ہے، کیا یہ درست ہے؟ اس کا ثبوت شریعت مطہرہ سے مل سکتا ہے؟ اس کا حکم خاص مواقع پر ہے یا خاص ملک کے لئے ہے؟

المستفتی: شرف الدین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: عوام الناس میں جو مطلقاً ممانعت کی شہرت ہوگئی ہے وہ درست نہیں ہے؛ بلکہ اس کی صورت یہ ہے کہ جب غلہ مارکیٹ میں دستیاب ہو، جب چاہے مارکیٹ سے خرید کر ضرورت پوری کی جاسکتی ہے، تو ایسے حالات میں اگر کوئی شخص مہنگا ہونے پر بیچنے کے لئے ذخیرہ اندوزی کرتا ہے، تو بلا کراہت جائز ہے، یہ احتکار کے دائرہ میں داخل نہیں۔ اور اگر کسی نے ذخیرہ اندزی کرکے رکھ لیا ہے اور مارکیٹ منڈیوں میں غلہ ختم ہوگیا

ہے اور ختم ہونے کے باوجود یہ شخص اپنا اسٹاک جاری نہیں کرتا ہے، تو یہ شرعاً احتکار کی ممانعت میں داخل ہے، جو شریعت میں جائز نہیں ہے۔

وإن اشترى في ذلك المصر وحبسه ولا يضر بأهل المصر لا بأس به، كذا في التاتارخانية. (عالمگيري، كتاب البيوع، الباب العشرون في البياعات المكروهة، فصل في الاحتكار، زكريا قديم ٣/ ٢١٣، جديد ٣/ ٢٠٠، درمختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩٨، زكريا ٩/ ٥٧١، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٢١٣، تاتارخانية زكريا ٩/ ٤١٤، رقم: ١٣٧٥٤)

وقال أبو يوسف: كل ما أضر بالعامة حبسه فهو احتكار. (هداية، أشرفي ديوبند ٤/ ٤٧٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۷۲۲۸)

بغرضِ تجارت ذخیرہ اندوزی کرنا

سوال [۸۷۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ذخیرہ اندوزی بغرضِ تجارت اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ ہماری معلومات کے مطابق اس غرض سے ذخیرہ کیا جائے کہ قلت کے وقت اشیاء زیادہ منافع سے فروخت کی جائیں، اس کا شرعی حکم واضح کیجئے۔

المستفتی: مولوی محمد الطاف احمد نگر، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: اگر بستی میں یہ اشیاء بکثرت موجود ہیں اور اس شخص کے خریدنے سے کوئی تنگی پیش نہیں آئی اور موسم ختم ہوجانے پر ان کو گراں فروخت کرتا ہے، تو یہ جائز ہے، اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

وإن اشترى في ذلک المصر وحبسه ولا يضر بأهل المصر لا بأس به، كذا في التاتارخانية ناقلا عن التجنيس. (عالمگيري، كتاب البيوع، الباب العشرون في البياعات المكروهة، فصل في الاحتكار، زكريا قديم ۳/ ۲۱۳، جديد ۳/ ۲۰۰، درمختار مع الشامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ۳۹۸، زكريا ۹/ ۵۷۱، مجمع الأنهر، كتاب الكراهية، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ۲۱۳، تاتارخانية زكريا ۹/ ٤١٤، رقم: ۱۳۷۵٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶/۵/۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۶۱۷۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶/۵/۱۴۲۰ھ

غلہ کی ذخیرہ اندوزی کر کے فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۷۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ہمیشہ موسم ارزاں میں غلے وغیرہ خرید کر اسٹاک کر لیتا ہے، پھر کچھ مہینوں کے بعد یعنی موسم گراں میں نفع کی زیادتی کے ساتھ فروخت کر دیتا ہے، ایسا کرنا مسئلہ کی رو سے کیسا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب سے نوازیں۔

المستفتی: محمد اقبال صدیقی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر زید غلہ سستا خرید کر ذخیرہ اندوزی کرتا ہے اور اہل شہر کو اس کی وجہ سے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی ہے، تو پھر زید کا یہ عمل جائز ہے، ورنہ جائز نہیں۔

عن عمر بن الخطاب –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الجالب مرزوق، والمحتكر ملعون. (سنن ابن ماجة، التجارات، باب الحكرة والجلب، النسخة الهندية ۱/ ۱۵٦، دارالسلام، رقم: ۲۱۵۳)

ویکره الاحتکار في أقوات الآدميين والبهائم إذا كان ذلک في بلد يضر الاحتكار بأهله، وكذلک التلقي، فأما إذا كان لا يضر فلا بأس به.

(هداية، كتاب الكراهية، فصل في البيع، أشرفی ديوبند ٤/ ٤٧٠، البحرالرائق، زكريا ديوبند ٨/ ٣٧٠، كوئٹه ٨/ ٢٠١، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٢١٣، شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل فی البيع، كراچی ٦/ ٣٩٨، زكريا ٩/ ٥٧١، تاتارخانية، زكريا ٩/ ٤١٤، رقم: ١٣٧٥٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۳۰۲/۳۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۵/۲۲ھ

اناج اسٹاک کر کے رکھنے کا حکم

سوال [۸۷۳۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک آدمی نے ۱۰۰؍روپئے من چاول یا کوئی چیز اس ارادہ سے خرید کر رکھی ہے کہ کچھ دنوں کے بعد ۱۵۰؍روپئے من فروخت کرے گا، کیا ایسا کرنا درست ہے؟ کیا اس صورت میں غریب محتاج کو ستانا متصور ہوگا یا نہیں؟ مہربانی فرما کر جواب عنایت فرمادیں۔

المستفتی: محمد جسیم الدین محلّہ بروالان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر پورے علاقہ میں وہ چیز بالکل نایاب ہوجائے تو ناجائز ہے، حکام کو زبردستی فروخت کروانا جائز ہے، اگر عام لوگوں کو نقصان نہیں پہنچتا ہے تو جائز ہے، اگر جمع کر کے رکھنے والا مال فروخت کرنے کے باوجود بھاؤ میں کوئی خاص زیادتی نہیں کرتا ہے، تو غریب محتاج کو ستانا نہیں سمجھا جائے گا۔

عن عمر بن الخطاب -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله ﷺ:

الجالب مرزوق، والمحتكر ملعون. (سنن ابن ماجة، التجارات، باب الحكرة والجلب، النسخة الهندية ۱/ ۱۵٦، دارالسلام، رقم: ۲۱۵۳)

وكره احتكار قوت البشر، كتين وعنب، ولوز، والبهائم كتبن وقت في بلد يضر بأهله. (الدرالمختار، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ۳۹۸، زكريا ۹/ ۵۷۱)

وإذا رفع إلى القاضي هذا الأمر يأمر المحتكر ببيع ما فضل عن قوته وقوة أهله على اعتبار السعة في ذلك، وينهاه عن الاحتكار، فإن رفع إليه مرة أخرى حبسه وعزره على ما يرى زجرا له، ودفعا للضرر عن الناس. (هداية، كتاب الكراهية، فصل في البيع، أشرفى ديوبند ٤/ ٤٧١، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٤١٣، تاتارخانية، زكريا ۹/ ٤١٥، رقم: ۱۳۷۵٦)

وإن اشترى في ذلك المصر وحبسه، ولا يضر بأهل المصر لا بأس به. (هندية، كتاب البيوع، الباب العشرون فصل في الاحتكار، زكريا قديم ۳/ ۲۱۳، جديد ۳/ ۲۰۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍شعبان ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۸۳۷)

زیادتی ثمن کے لئے پہلے خریدار سے معاملہ ختم کرنے کا حکم

سوال [۸۷۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید نے اپنی زمین فروخت کرنے کا معاملہ ایک غیر مسلم خریدار سے طے کیا تھا؛ لیکن محض قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے بیع کی تکمیل نہیں ہوسکی؛ چونکہ زید پر قرض کا بہت بار ہوگیا تھا، اس کی فوری ادائیگی کے لئے زمین بیچنا چاہتا تھا، بیع کی تکمیل میں کافی وقت لگ گیا اور قرض کا بار زید پر اور بڑھ گیا، اب صورت حال یہ ہے کہ پہلے زمین کی جو قیمت طے

ہوئی تھی اس رقم میں اب کل قرض کی ادائے گی بھی نہیں ہوسکتی، ادھر قرض خواہوں کی طرف سے بھی سخت تقاضہ ہے، اب ایک دوسرا خریدار ہے جو پہلے طے شدہ قیمت سے زیادہ رقم دے رہا ہے، جس میں پورے قرض کی ادائے گی ہوجائے گی؛ لہٰذا اگر پہلے خریدار سے معاملہ ختم کرکے دوسرے خریدار کو زمین دے دی جائے تو شرعاً اس کی گنجائش ہوسکتی ہے، پہلے خریدار کا تو کوئی نقصان نہیں ہوگا، اگر زید ایسا نہیں کرتا تو کئی قرض خواہوں کا قرض ادا کرنے کی کوئی شکل نہیں ہے۔ اوران تقاضوں سے ذلت وپریشانی کا بھی سخت خطرہ ہے، نیز کھانے پینے کے گذارے کے لئے بھی زید کے پاس کوئی اور ذریعہ نہیں ہے، بالکل اضطراری کیفیت وحالت میں پہلے معاملہ کو ختم کرکے دوسرے خریدار سے معاملہ کرنا چاہتا ہے، اس کے متعلق شرعی حکم سے مطلع فرمائیں۔

(۲) اگر کوئی شخص ایسا معاملہ کرچکا ہے، تو اب اس کی تلافی کی کیا شکل ہوسکتی ہے؟

المستفتی: عبدالرحمٰن

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: (۱) اگر زید کا معاملہ اس غیر مسلم کے ساتھ طے ہوچکا ہے اوراس کا معاہدہ بھی ہوچکا ہے، پھر زیادہ قیمت میں دوسرے کے ہاتھ بیچنے کے لئے اس غیر مسلم سے بدعہدی کرنا شرعاً جائز نہیں ہے اور بدعہدی کی وجہ سے زید گناہ گار ہوگا، ہاں البتہ زیادہ قیمت دینے کے لئے وہ غیر مسلم ازخود راضی ہوجاتا ہے، تو بدعہدی کا گناہ نہیں ہوگا۔

عن ابن عمر –رضي الله عنه– قال: سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقول: لكل غادر لواء ينصب بغدرته. (بخاري، كتاب الجزية والموادعة ١/ ٤٥٢، رقم: ٣٠٨٤، ف: ٣١٨٨)

والصلح بعد الشراء (درمختار) وفي الشامي: وقيده في القنية بأن يكون الثاني أكثر ثمنا من الأول أو أقل أو بجنس آخر، وإلا فلا يصح.

(شامي، كتاب الصلح ٨/ ٤١٧، زكريا ديوبند كراچی ٥/ ٦٣٦)

(۲) اگر کسی شخص نے ایسا معاملہ کرلیا ہے تو اس کی تلافی کی یہی شکل ہے کہ جس کے ساتھ

اس طرح کی بدعہدی کر لی ہے، اس کو کسی بھی طریقے سے راضی کر کے اس سے معافی تلافی کر لے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– قال: قال رسول الله ﷺ: من كانت له مظلمة لأخيه من عرضه أو شيء، فليتحلله منه اليوم قبل أن لا يكون دينار ولا درهم، إن كان له عمل صالح أخذ منه بقدر مظلمته، وإن لم يكن له حسنات أخذ من سيئات صاحبه، فحمل عليه. (بخاري، كتاب المظالم، باب من كانت له مظلمة عند الرجل ۱/ ۳۳۱، رقم: ۲۳۸۵، ف: ۲۴۴۹، مشكوة ۲/ ۴۳۵)

إن كانت المعصية لحق آدمي فلها ركن رابع، وهو التحلل من صاحب ذلك الحق. (شرح النووي على مسلم، كتاب التوبة ۲/ ۳۵۴) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ رجب ۱۴۳۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۷۷۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۵/ ۷/ ۱۴۳۰ھ

سرکاری باغ سے لکڑی چوری کر کے مکتب میں فروخت کرنا

سوال [۸۷۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) لوگ سرکاری باغ سے لکڑی چوری کر کے بیچ رہے ہیں اور ایسی لکڑی کو خرید کر کے لوگ پنجگانہ اور اسلامی مکتب میں استعمال کرتے ہیں، تو اس میں نماز اور تعلیم جائز ہوگی یا نہیں؟

(۲) چوری کا مال جان بوجھ کر اور نہ جان بوجھ کر خریدنا کیسا ہے؟

المستفتی: نور الزماں آسامی مدرس جامعہ اسلامیہ محمودیہ بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: (۱-۲) سرکاری باغات جن کی منجانب حکومت حفاظت ہوتی ہے، ان کے درختوں کی لکڑی چوری کر کے بیچنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ اور چوروں سے جان بوجھ کر کے ایسی لکڑیاں خرید کر مدارس اور مکاتب میں ٹپائی وغیرہ کی شکل میں استعمال کرنا بھی جائز

نہیں ہے، ہاں البتہ اگر خریدنے والوں کو چوری کا علم نہیں ہے، تو ایسی حالت میں لکڑیوں کو خرید کر مدارس اور مکاتب کے استعمال میں کوئی گناہ نہیں ہے؛ بلکہ گناہ چور کے اوپر ہوگا۔

قال علیه السلام: من اشترى سرقة وهو يعلم أنها سرقة، فقد شرك في عارها، وإثمها. (شعب الإيمان، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٩، رقم: ٥٥٠٠، المصنف لابن أبي شيبة، جديد موسسة العلوم القرآن بيروت ١١/ ٣٣٨، رقم: ٢٢٤٩٥)

بخلاف الأشجار؛ لأن الكلأ مالا ساق له، والأشجار لها ساق فلا تدخل فيه حتى جاز بيعها إذا نبتت في أرضه. (عالمگيري، كتاب البيوع، الباب التاسع فيما يجوز بيعه وما لايجوز، الفصل الثاني في بيع الثمار، زكريا قديم ٣/ ١١٠، جديد ٣/ ١١١)

ويدخل في الكلأ جميع أنواع ما ترعاه المواشي رطبا كان أو يابسا، بخلاف الأشجار؛ لأن الكلأ مالا ساق له، والشجر لها ساق فلا تدخل فيه حتى يجوز بيعها إذا نبتت في أرضه لكونها ملكه. (البحر الرائق، باب البيع الفاسد، زكريا ٦/ ١٢٧، كراچی ٦/ ٧٨، شامي، كراچی ٥/ ٦٦، زكريا ٧/ ٢٥٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
یکم رجب ۱۴۲۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۷۲۶۶/۳۵)	۱۴۲۲/۷/۱ھ

جانتے ہوئے چوری کا سامان خریدنا مکروہ

سوال [۸۷۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ ایک شخص یہ جانتے ہوئے کہ یہ سامان چوری کا ہے، پھر اس کو خریدتا ہے تو کیا یہ چوری کا سامان جاننے کے باوجود خریدنا جائز ہے، جب کہ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں، صحیح مسئلہ کیا ہے؟ واضح فرمادیں، عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: محمد اسحاق بیر پور تھان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس چیز کے متعلق یہ معلوم ہے کہ یہ چوری کی ہے تو اس کے خریدار کو حدیث شریف میں چوری میں شریک ہونے والا بتایا گیا ہے۔ اور جو لوگ یہ کہہ رہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے وہ غلط ہے۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمایئے:

عن أبي هريرة –رضی الله عنه– عن النبي ﷺ قال: من اشترى سرقة وهو يعلم أنها سرقة، فقد شرك في عارها، وإثمها. (شعب الإيمان، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٣٨٩، رقم: ٥٥٠٠، المصنف لابن أبي شيبة، جديد موسسة العلوم القرآن بيروت ١١/ ٣٣٨، رقم: ٢٢٤٩٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ رشوال ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۱۶۸۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۱۰/۲۹ھ

پتنگ اور پٹاخوں کی تجارت کا حکم

سوال [۸۷۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) مسلمان کے لئے حلال پتنگ، پٹاخے کی تجارت جائز ہے یا نہیں؟ اور ان روپیوں کا استعمال مسلمان کے لئے حلال ہے یا نہیں؟

(۲) اگر مسلمان تاجر سے پتنگ یا پٹاخے کوئی غیر مسلم خریدے تو کیا حکم ہے؟ مع حوالہ تحریر فرمائیں۔

المستفتی: محمد قاسم گجراتی، شریک دار الافتاء مدرسہ ہٰذا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) پتنگ اور پٹاخے کی تجارت تعاون علی المعصیت کی وجہ سے مکروہ ہیں۔ اور اس سے حاصل شدہ روپئے حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک حلال اور پاک ہیں۔ اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک مکروہ ہے؛ کیوں کہ فساد دونوں میں

مشترک ہے اور اس زمانہ میں فتویٰ اور عمل حضرات صاحبین کے قول پر ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۴/۲۴۳)

قال الله تعالیٰ: ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ [المائدة: ٢]

ومستفاد من الدر المنتقى: ومن حمل لذمي خمرا بأجر طاب له عند الإمام، وعندهما يكره للإعانة. (الدر المنتقى، كتاب الكراهية، فصل في الكسب، دار الكتب العلمية بيروت ٤/ ١٨٨، قديم ٢/ ٥٣٠، شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩٢، زكريا ٩/ ٥٦٢، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٦/ ٢٩، زكريا ديو بند ٧/ ٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸ محرم الحرام ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/۲۰۸۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۱/۸ھ

تصویر والے کپڑوں کی تجارت

سوال [۸۷۴۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ٹی شرٹ اور ریڈی میڈ کپڑوں وغیرہ کی تجارت کرتا ہے، جس میں مختلف قسم کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، ان کپڑوں کی تجارت کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: حشمت الحق متعلم مدرسہ امدادیہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: فی نفسہ تصویر بنانا تو قطعاً حرام ہے، اور کپڑوں میں عام طور پر جو تصویریں بنی ہوئی ہیں، ان کی وجہ سے ان کپڑوں میں نماز پڑھنا تو ممنوع ہے، مگر ان کپڑوں کا پیسہ حرام نہیں ہے؛ اس لئے کہ اس کی فروختگی سے مقصود مالیت ہوتی ہے، تصویر نہیں؛ اس لئے ایسے کپڑوں کی بیع جائز ہے، مگر چونکہ اس میں تعاون علی المعصیت بھی ہے؛ اس لئے اس کی بیع مکروہ ہوگی۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱/۸۲، ایضاح المسائل/ ۱۵۶)

وكذا أيضا تستفاد من عبارة آتية وجاز بيع عصير عنب ممن يعلم أنه يتخذه خمرا؛ لأن المعصية لا تقوم بعينه، بل بعد تغيره، وقيل: يكره لإعانته على المعصية. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ٩/ ٥٦٠-٥٦١، كراچی ٦/ ٣٩١، البحرالرائق، كتاب الكراهية، فصل في البيع، زكريا ٨/ ٣٧١، کوئٹه ٨/ ٢٠٢، هداية، أشرفي ديوبند ٤/ ٤٧٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍جمادی الاولی ۱۴۱۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۳۸۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۸/۵/۱۲ھ

مصور زیورات کی خرید فروخت کی شرعی حیثیت

سوال [۸۷۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایسے زیورات کی تجارت جس میں بتوں اور مورتیوں کی تصویر ہو، جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کی آمدنی حلال ہے یا حرام؟ مدلل ومفصل جواب دیں۔

المستفتی: حبیب الرحمٰن، کلکتہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسے زیورات کی تجارت کرنا جس میں بتوں اور مورتیوں کی تصویر ہو، مسلمان کے لئے سخت مکروہ ہے؛ لیکن اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حرام نہیں کہلائے گی؛ البتہ تعاون علی المعصیت کی وجہ سے کراہت کے دائرہ میں آئے گی۔

(مستفاد: ایضاح النوادر، ص: ۸۳)

ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريما، وإلا فتنزيها. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، كراچی ٦/ ٣٩١، زكريا ٩/ ٥٦١)

إن ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه، وما لا فلا. (البحرالرائق، كتاب السير، باب البغاة، زكريا ٥/ ٢٤٠، کوئٹه ٥/ ١٤٣)

ولو كانت من خشب أو صفر جاز اتفاقا فيما يظهر لإمكان الانتفاع بها. (شامي، كتاب البيوع، باب المتفرقات، كراچی ٥/ ٢٢٦، زكريا ٧/ ٤٧٨، الموسوعة الفقهية الكويتية ١٢/ ١٢٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳؍ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۶۶۰/۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۳/۴/۱۸ھ

خنزیر کے برش میں لگنے والے دیگر آلات کا آرڈر لینا

سوال [۸۷۴۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خنزیر کے برش بنانے والوں کا وہ سامان جو برش سے متعلق ہے، جیسا کہ لکڑی کا دستہ، ٹین کے فول، رنگ یا اس کے ڈلیہ تیار کر کے دینا ان کے آرڈر کو لے کر اجرت لینا کیسا ہے؟

المستفتی: احسان علی صدیقی اصغر منزل شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آلات وسامان بنانے والوں کا واحد مقصد خنزیر کے بالوں کے کام کے لئے ہے، تو اعانت علی المعصیت کی وجہ سے مکروہ ہے۔

ولا تكره إجارة بيت بالسواد ليتخذ بيت نار أو كنيسة، أو بيعة أو يباع فيه الخمر عنده، وعندهما يكره؛ لأنه إعانة على المعصية –إلى قوله– ويكره في المثل إجماعا. (ملتقى الأبحر، كتاب الكراهية، فصل في البيع قديم ٢/ ٥٢٩، جديد، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٨٦، الدرالمختار كراچی ٦/ ٣٩٢، باب البيع)

اگر بنانے والوں کا واحد مقصد یہ نہیں ہے؛ بلکہ دوسرے کاموں میں بھی یہ آلات مستعمل ہوتے ہیں، تو بلا کراہت جائز ہے۔

كما استفاده من الشامي: ولو آجر نفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها لا بأس به؛ لأنه لا معصية في عين العمل، وحمل خمر ذمي (وقوله) وله أن

الإجارة على الحمل وهو ليس بمعصية، ولا سبب لها، وإنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار، وليس الشرب من ضرورات الحمل؛ لأن حملها قد يكون للإراقة أو التخييل. (شامي، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، زكريا ۹/ ۵۶۲، كراچی ۶/ ۳۹۱-۳۹۲، مجمع الأنهر، قديم ۲/ ۵۳۰، جديد دارالكتب العلمية بيروت ۴/ ۸۷، فتاوی قاضي خان زكريا جديد ۲/ ۲۰۵، وعلى هامش الهندية زكريا ۲/ ۳۲۴، الموسوعة الفقهية الكويتية ۳۸/ ۱۵۸، المحيط البرهاني، المجلس العلمي بيروت ۸/ ۷۰، رقم: ۹۶۰۷، تاتارخانية، زكريا ۱۸/ ۱۶۷، رقم: ۲۸۳۷۹)

ولو وقع في ماء قليل نجسه -إلى قوله- وفي زماننا استغنوا عنه أي فلا يجوز استعماله لزوال الضرورة الباعثة للحكم بالطهارة. (شامي، كتاب الطهارة، مطلب في أحكام الدباغة، كراچی ۱/ ۲۰۶، زكريا ۱/ ۳۶۰) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵؍ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۲۹)

نجش فی البیع کا حکم

سوال [۸۷۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک گاؤں کے چند افراد کا یہ پیشہ ہے کہ دیہاتوں یا شہروں میں جانوروں کی بیع وشراء کے لئے بازار لگتے ہیں، یہ پیشہ ور لوگ ان بازاروں میں جاکر بیل وغیرہ خریدتے ہیں یا اپنے گھروں سے لے جاتے ہیں، اور اپنے ہی ساتھیوں میں سے ایک شخص کو جانوروں کو فروخت کے لئے متعین کردیتے ہیں اور باقی ساتھی اسی جگہ گھومتے پھرتے رہتے ہیں، اور جب کوئی شخص ان بیلوں کو یا جانوروں کو خریدنے آتا ہے، تو باقی ساتھیوں میں سے اس جانور کی قیمت ایک شخص نے زیادہ کرکے لگائی، مثلاً اگر اس کی قیمت سو ہے تو پانچ سو لگائے اور وہ لوگ جو اس جانور کو خریدنے کے لئے کھڑے تھے وہ دھوکہ کھاکر اس بیل کی قیمت پانچ سو یا کچھ کم کرکے دینے

کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔اور وہ بیل والے کے ساتھ قیمت اور بڑھا کر یعنی ساڑھے پانچ سو میں خریدنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں، تو وہ شخص جس کے یہ لوگ ساتھی ہیں، کہتے ہیں کہ میں تمہیں بیل نہیں دے سکتا؛ کیوں کہ تم قصائی ہو، اس کو ذبح کر دوگے، میں اسے اپنے کسان بھائیوں کو دوں گا، تو یہ کھڑے ہوئے کسان یہ دھوکہ کھا کر جب قصائی ساڑھے پانچ سو دے رہا ہے، تو کچھ کم کرا کے یا اتنے ہی میں اسے کیوں نہ لیں، پھر یہ کسان لوگ ساڑھے پانچ سو یا چار سو میں خرید لیتے ہیں، اب جو نفع ملتا ہے اس کو یہ سب ساتھی مل کر تقسیم کر لیتے ہیں اور اسی سے گزر بسر کرتے ہیں۔کیا یہ پیشہ اختیار کرنا درست ہے؟ مفصل تحریر فرمائیں عین کرم ہوگا۔

المستفتی: کلیم اللہ سیتا پوری، متعلم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح کی فروختگی شرعاً مکروہ تحریمی ہے؛ کیوں کہ یہ سخت دھوکہ دہی ہے؛ لیکن پیشہ حلال ہوگا، دھوکہ دہی کی بنا پر گنہگار رہوں گے۔(مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۴/۱۷۰، جدید ڈابھیل ۱۷/۶۲۰)

نهى رسول الله ﷺ عن النجش. (بخاري، كتاب البيوع باب النجش ١/ ٢٨٧، رقم: ٢٠٩٥، ف: ٢١٤٢)

لاتفعلوا ذلك وسبب ذلك إيقاع رجل فيه بأزيد من الثمن وهو خداع، والخداع قبيح جاور هذا البيع فكان مكروها. (عناية مع فتح القدير، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد، فصل فيما يكره، دارالفكر بيروت ٦/ ٤٧٦، زكريا ٦/ ٤٣٦، كوئٹه ٦/ ١٠٦، درمختار كراچى ٥/ ١٠١، زكريا ٧/ ٣٠٥، البحرالرائق، كوئٹه ٦/ ٩٩، زكريا ٦/ ١٦٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/ ۱۴۷۰)

۵/ باب حط الثمن و زيادته نقدا ونسيئة

ادھار خرید وفروخت

سوال [۸۷۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گاؤں کے کچھ آدمیوں نے مل کر ایک کمیٹی قائم کی اور کمیٹی والے ایک کوئنٹل چاول دیتے ہیں اور تین مہینہ کے بعد دو ہزار روپئے لیتے ہیں، کیا یہ معاملہ جائز ہے؟ بینوا توجروا

المستفتی: سعید الرحمٰن بھنگنا ماری انچلک دینی تعلیمی بورڈ آسام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: شریعت میں ادھار خرید وفروخت جائز اور درست ہے؛ لہٰذا ایک کوئنٹل چاول کی ادھار خرید وفروخت اس طرح طے ہو جائے کہ تین مہینے کے بعد دو ہزار روپئے قیمت ادا کریں گے جائز اور درست ہے۔

عن عائشة – رضي الله عنها– أن النبي صلى الله عليه وسلم اشترى طعاما من رجل يهودي إلى أجل ورهنه درعا من حديد. (صحيح البخاري، البيوع، باب شراء النبي صلى الله عليه وسلم بالنسيئة، النسخة الهندية ۱/ ۲۷۷، رقم: ۲۰۲۱، ف: ۲۰۶۸)

عن ابن عباس – رضي الله عنه– قال: قدم رسول الله صلى الله عليه وسلم المدينة وهم يسلفون بالثمر السنتين والثلاث، فقال رسول صلى الله عليه وسلم: من أسلف في شيء ففي كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم. (صحيح البخاري، كتاب السلم، باب السلم في وزن معلوم، النسخة الهندية ۱/ ۲۹۹، رقم: ۲۱۸۸، ف: ۲۲۴۰)

ويجوز البيع بثمن حال ومؤجل إذا كان الأجل معلوما. (هداية، كتاب البيوع، أشرفی ۳/ ۲۱، مختصر القدوري / ۷۱، البناية، أشرفيه ۸/ ۱۶، اللباب ۲/ ۶)

وصح بثمن حال وهو الأصل، ومؤجل إلى معلوم لئلا يفضي إلى النزاع.

(شامي، مطلب فی الفرق بين الأثمان والمبيعات، زكريا ۷/ ۵۲، كراچی ۴/ ۵۳۱، مجمع

الأنہر، دار الکتب العلمیة ۳/ ۱۳، مصري قدیم ۲/ ۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/ ۱۰۰۸۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱/ ۶/ ۱۴۳۱ھ

ادھار خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۷۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے علاقہ شہر بنگلور میں اسٹارٹ منٹ کی لوگ تجارت کرتے ہیں، اس کی شکل یہ ہے کہ عید کے موقع پر کپڑے اور دیگر ضروریات روزانہ کی پیش آمدہ اشیاء چاول وغیرہ گھروں کے پاس گاڑی میں لے کر آتے ہیں، پھر وہ لوگ مارکیٹ سے کچھ زائد رقم پر مبیع کو قرض کے طور پر دے دیتے ہیں، آخر میں جتنا سامان خریدا ہے اس کو ایک کارڈ میں قیمت لکھ کر دے کر ہر ہفتہ یا روزانہ کچھ کچھ رقم لیتے ہیں، مثلاً ۵۰۰/ کا سامان یا تو ہر ہفتہ ۵۰/ روپئے روزانہ ۱۰/ روپئے دینا ہوتا ہے، اگر کوئی قسط میں نہ دے تو مزید مہلت دیتے ہیں، یعنی جتنی مبیع خریدتے وقت قیمت لکھی اتنا ہی لیتے ہیں، زائد کچھ نہیں لیتے، تو کیا یہ شرعاً جائز ہے؛ کیوں کہ اکثر عورتیں اپنے خاوندوں کے پیسے کو اپنے پاس رکھ کر اس طرح قرض لیا کرتی ہیں، تاکہ ہاتھ میں روپئے رہیں، حضرت والا اس کا شرعی حکم بیان کر کے باعث ممنون ہوں مہربانی ہوگی۔

المستفتی: مفتی حسن قادری رائے چوٹی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال میں ذکر کردہ صورت قسطوں پر خرید فروخت ہے، جو شرعاً جائز اور درست ہے۔

البیع مع تأجیل الثمن وتقسیطه صحیح -إلی- یلزم أن تکون المدة معلومة في البیع بالتأجیل والتقسیط إذا عقد البیع علی تأجیل الثمن إلی

كذا يوما أو شهرا. (شرح المجلة، رستم مكتبه اتحاد ۱/ ۱۲۴-۱۲۵، رقم المادة: ۲۴۵-۲۴۶)

ويصح البيع بثمن حال، وهو الأصل، وبثمن مؤجل ولا يثبت الأجل إلا بالشرط ما لم يكن ربويا بأجل معلوم. (الدرالمنتقی، کتاب البیوع، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۱۳/ قدیم ۲/ ۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ / جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۵۴۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/ ۵/ ۱۴۳۵ھ

فائننس کا حکم

سوال [۸۷۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک گاڑی فائننس کرانا چاہتا ہے، جس میں زید کو اس وقت گاڑی کی قیمت میں سے ۳۵ / فیصد رقم جمع کرنی ہوگی اور باقی ۶۵ / فیصد رقم ۶ / فیصد بیاج کی در سے چار سال میں قسط وار ادا کرنی ہوگی۔ اور زید اس گاڑی کو کرایہ پر چلائے گا اور جو رقم آمد ہوگی وہ اور اس میں کچھ اور رقم اپنے پاس سے ڈال کر قسط جمع کرے گا۔ اور اگر ایسا نہیں کرتا ہے تو گورنمنٹ کو اتنی رقم کے ٹیکس کے کاغذات اور معلومات چاہئے کہ اتنی رقم کہاں سے آئی اور اس کا ٹیکس جمع کیا یا نہیں؟ تو اس طرح گاڑی فائننس کرانا درست ہے یا نہیں؟ جو اس سے آمد ہوگی وہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: انور خوشید نئی بستی، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اس میں جواز اور عدم جواز کا مدار تحریری معاہدہ پر ہے۔ اور تحریری معاہدہ اس طرح لکھا جائے، مثلاً گاڑی کی قیمت ۲ / لاکھ لکھی گئی ہے اور قسطوار ادائے گی میں ڈھائی لاکھ کر دیا گیا اور پچاس ہزار بیاج لکھا گیا، تو اس طرح جائز نہیں، اس کو پچاس ہزار سود دینا لازم ہے، جو باعث لعنت ہے۔ اور اگر تحریری معاہدہ اس طرح لکھا جائے

کہ گاڑی کی کل ادائے گی ڈھائی لاکھ روپئے ہے، جس کی قسط باندھ دی گئی ہے، جس کی ادائے گی دوسال میں ہوگی، تو یہ جائز اور درست ہے، چاہے گاڑی کی قیمت ۲؍لاکھ ہی کیوں نہ ہو، ایسی صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ گاڑی ڈھائی لاکھ میں ملی۔ (مستفاد: انوار رحمت/ ۲۱۲، ایضاح النوادرا/ ۱۰۹)

البيع مع تأجيل الثمن وتقسيطه صحيح -إلى- يلزم أن تكون المدة معلومة في البيع بالتأجيل والتقسيط إذا عقد البيع على تأجيل الثمن إلى كذا يوما أو شهرا. (شرح المجلة، رستم مكتبه اتحاد ١/ ١٢٤-١٢٥، رقم المادة: ٢٤٥-٢٤٦)

البيع لأجل أو بالتقسيط أجاز الشافعية والحنفية والمالكية والحنابلة والجمهور بيع الشيء في الحال لأجل أو بالتقسيط بأكثر من ثمنه النقدي إذا كان العقد مستقلا بهذا النحو، ولم يكن فيه جهالة بصفقة أو بيعة من صفقتين أو بيعتين ...... جاز البيع، وإن ذكر في المساومة سعران سعر للنقد وسعر للتقسيط، ثم تم البيع في نهاية المساومة تقسيطا. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنیشنل دیوبند ٤/ ٢٤٢، دارالفكر ٥/ ٣٤٦١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍رجب ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۰۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲؍۷؍۱۴۲۷ھ

ادھار پر مونجی کی فصل کسانوں سے خریدنے کا حکم

سوال [۸۷۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اس وقت مونجی کی فصل کٹنے کے بعد اناج گھر میں آ گیا، تجار حضرات نے اس شرط پر معاملہ شروع کردیا کہ اس وقت اناج کی قیمت ۴۰۰؍روپئے ہے، پانچ ماہ کے بعد ہم تم کو ۶۰۰؍روپئے اضافہ کے ساتھ دیں گے، خواہ اس وقت بھاؤ جو بھی ہو، پھر پانچ

ماہ بعد وہ اس زائد رقم کے ساتھ خرید کر لے جاتا ہے؛ لہٰذا اس شرط پر خرید وفروخت کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد فاروق شریف نگر، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں یہ عقد بیع نہیں ہے؛ بلکہ ایک معاہدہ ہے، اور اس طرح معاہدہ کرنا اور پانچ ماہ بعد اضافہ کے ساتھ خریدنا درست ہے؛ کیوں کہ پانچ ماہ بعد جو لین دین ہوگا وہی اصل عقد ہوگا۔

ویجوز للمشتري أن یزید للبائع في الثمن. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، فصل أشرفي ٣/ ٧٥، مختصر القدوري ٨١، البناية، أشرفيه ٨/ ٢٥٤، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٢٩)

زيادة البائع في المبيع والمشتري في الثمن، وحط البائع من الثمن بعد العقد يلتحقان بأصل العقد، فكان العقد وقع على ما حصل بعد الزيادة والحط.

(شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ١/ ١٣٣، رقم المادة: ٢٥٧) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳ر شعبان ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۳/۴۹۷)

قسطوں پر سواری یا سامان کی خریداری

سوال [۸۷۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قسطوں پر سواری یا سامان لینے کا شرعی حکم کیا ہے، جب کہ ایسا کرنے میں بظاہر سود کی شکل نظر آتی ہے؟

المستفتی: زوار احمد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قسطوں پر سواری اور سامان کی بیع اس شرط پر جائز ہے کہ اس میں سود کا معاملہ نہ ہو اور کتنی قسطوں میں اور کتنی مدت میں رقم ادا کرے گا اس کو بھی متعین کرلیا جائے اور جتنی مقدار تمام قسطوں کی بیع کی ہے، خریداری کے وقت میں اسی کی مقدار کی رقم متعین کرلی جائے، مثلاً اگر دو سال میں کل ادائے گی دو لاکھ روپئے کی ہوتی ہے، تو شروع ہی سے گاڑی اور سامان کی قیمت دو لاکھ لگائی جائے اور وقت پر قیمت ادا کرنے کی کوشش کی جائے بس یہی صورت بیع بالتقسیط کی صحیح ہے، باقی تمام شکلیں ناجائز ہیں۔

البيع مع تأجيل الثمن وتقسيطه صحيح. (شرح المجلة، رستم مكتبه اتحاد ١/ ١٢٤رقم المادة: ٢٤٥)

البيع لأجل أو بالتقسيط أجاز الشافعية والحنفية والمالكية والحنابلة والجمهور بيع الشيء في الحال لأجل أو بالتقسيط بأكثر من ثمنه النقدي إذا كان العقد مستقلا بهذا النحو، ولم يكن فيه جهالة بصفقة أو بيعة من صفقتين أو بيعتين ...... جاز البيع، وإن ذكر في المساومة سعران سعر للنقد وسعر للتقسيط، ثم تم البيع في نهاية المساومة تقسيطا. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنيشنل ديوبند ٤/ ٢٤٢، دار الفكر ٥/ ٣٤٦١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ رجب ۱۴۲۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۸۹۰۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۹/ ۷/ ۱۴۲۶ھ

گڑ کی بھیلی بازار کی قیمت سے کم یا زیادہ قیمت پر بنانا

سوال [۸۷۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) ہمارے یہاں عموماً گڑ کا کاروبار ہوتا ہے، اکتوبر سے مارچ تک گڑ کے کارخانے چلتے ہیں اور اپریل میں کارخانے بند ہو جاتے ہیں، مارچ میں عموماً گڑ کا بھاؤ کم ہوتا

ہے اور جولائی میں گڑ اکثر مہنگا ہو جاتا ہے، زید نے دو ہزار بھیلی سترہ روپئے کے بھاؤ سے ڈالی ہیں، اب بکر ان بھیلیوں کا خریدار ہے، بکر کا کہنا ہے کہ میں جون کی پہلی کو بیس روپئے کے بھاؤ سے پیسہ ادا کر دوں گا، بکر کا یہ بھی کہنا ہے کہ جولائی تک اگر زید روک سکتا ہے تو جولائی میں جو بھی بھاؤ ہوگا اس سے دو روپئے فی بھیلی کے حساب سے زائد پیسہ دوں گا۔

(۲) گڑ کا کارخانہ چلنے سے پہلے یعنی ستمبر میں کارخانہ والے کچھ رقم بیوپاریوں سے لے لیتے ہیں کہ ہم اس بھاؤ کی بھیلی تمہیں مارچ میں بنا دیں گے، مثلاً بھیلی کا بھاؤ بیس روپئے ہوتا ہے اور فریقین آپس میں مشورہ کر کے پندرہ روپئے کے بھاؤ سے سودا کر لیتے ہیں، تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کارخانہ والے یہ کہہ کر بھی سودا کرتے ہیں کہ مارچ میں جو بھی بھاؤ ہوگا اس سے دو روپئے کم میں ہم بھیلی بنا دیں گے۔

المستفتی: محمد جاوید قاسمی، مدرسہ مفتاح العلوم ڈڑھیال، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کسی چیز کو نقد بیچنے پر کم قیمت لینا اور ادھار بیچنے پر زیادہ قیمت لینا اس وقت جائز ہے، جب کہ مجلس عقد میں قیمت کی مقدار اور ادائے قیمت کی میعاد متعین کر لی جائے، مذکورہ صورت میں چونکہ یہ دونوں شرطیں موجود ہیں؛ اس لئے بیع درست ہو جائے گی۔

ألا یری! أنہ یزاد في الثمن لأجل الأجل. (ہدایۃ، کتاب البیوع، باب المرابحۃ والتولیۃ، اشرفي ۳/ ۷٤، المحیط البرہاني، المجلس العلمي ۱۰/ ۱۸۷، رقم: ۱۲۷۳۸، مجمع الأنہر، دارالکتب العلمیۃ بیروت ۳/ ۱۱۲، مصري قدیم ۲/ ۷۸، شرح المجلۃ رستم مکتبہ اتحاد ۱/ ۱۱٤-۱۱۵، رقم المادۃ: ۲٤۵-۲٤٦)

اور جولائی میں جو بھاؤ ہوگا اس پر دو روپئے زائد فی بھیلی دینے کے حساب سے معاملہ کرنا جہالت ثمن کی وجہ سے جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ ایسی صورت میں جولائی میں کیا بھاؤ ہوگا،

یقین کے ساتھ کسی کو معلوم نہیں ہے؛ اس لئے یہ شکل جائز نہیں ہے۔

رجل باع علی أنه بالنقد بکذا، وبالنسیئة بکذا، وإلی شهر بکذا، وإلی شهرین بکذا لم یجز. (عالمگیري، الباب العاشر: الشروط التي تفسد البیع والتي لا تفسده، زکریا قدیم ۳/ ۱۳۶، جدید ۳/ ۱۳۷)

ستمبر میں کارخانے والے بیوپاریوں سے یہ کہہ کر پیسہ لیں کہ مارچ میں عام طور سے بیس روپئے کا بھاؤ ہوتا ہے، پیشگی پیسہ دینے پر ۱۵/ روپئے فی بھیلی ستمبر میں پیشگی روپئے دے کر معاملہ طے کرلیا جائے اور مارچ ادا کئے گئے روپئے کے بدلے میں فی بھیلی ۱۵/ روپئے کے حساب سے وصول کرنا بیع سلم کے دائرے میں داخل ہوکر جائز ہے، جب کہ ستمبر میں مجلس عقد میں پیسہ کی ادائے گی ہوچکی ہے؛ لیکن ایسا کرنا جائز نہیں ہے کہ پیشگی پیسہ لے کر یہ کہہ دے کہ مارچ میں جو بھی بھاؤ ہوگا اس سے دو روپئے کم میں بھیلی بنادیں گے؛ اس لئے کہ ثمن کی جہالت کی وجہ سے مسلم فیہ میں بھی جہالت آجاتی ہے، اس لئے یہ شکل جائز نہیں ہے۔

وتحقیقه أن جهالة قدر رأس المال تستلزم جهالة المسلم فیه؛ لأن المسلم إلیه ینفق رأس المال شیئا فشیئا، وربما یجد بعض ذلک زیوفا ولا یستبدله في مجلس الرد، فیبطل العقد بقدر ما ردوه، فإذا لم یکن مقدار رأس المال معلوما لا یعلم في کم انتقص السلم أو في کم بقی، وجهالة المسلم فیه مفسدة بالإتفاق، فکذا ما یستلزمها. (عنایة علی فتح القدیر، کتاب البیوع، باب السلم، زکریا ۷/ ۸۸، دارالفکر ۷/ ۹۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/ صفر ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/ ۸۲۵۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۵/۲/۱۶ھ

سوسائٹی سے کھاد خریدنے کا حکم

سوال [۸۷۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم لوگ سرکاری سوسائٹی سے جو کھاد لیتے ہیں وہ نقد نہیں ملتا ہے، ادھار دیتے ہیں۔ اور سرکار اس ادھار پر تھوڑا سا بیاز لیتی ہے اور سوسائٹی میں اچھا کھاد اور چھوٹ بھی ملتی ہے۔ اور اگر وہی کھاد بازار سے لیتے ہیں تو وہ خراب ہوتا ہے اور بازار والے کھاد میں ملاوٹ بھی ہوتی ہے اور مہنگا بھی ملتا ہے، اس صورت میں ہم لوگ کیا سوسائٹی سے کھاد لے سکتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: حمید اللہ عیسیٰ پور، فرخ آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: مذکورہ صورت بیع نسیئہ (ادھار خریداری) کی ہے، جس میں ادھار کی وجہ سے قیمت میں اضافہ ہوتا ہے، جب کہ مدت متعین ہو اور سائل کو اس کا بیاج سمجھنا درست نہیں ہے۔

وأما الأئمة الأربعة وجمهور الفقهاء والمحدثين فقد أجازوا البيع، والبيع المؤجل بأكثر من سعر النقد. (بحوث قضايا فقهية معاصرة ٥/ ٧، بحواله انوار رحمت ٢٣٢) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲ / ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۱۶)

قیمت بڑھا کر ادھار فروخت کرنا

سوال [۸۷۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے ۵۰۰/ روپئے کوئنٹل کے حساب سے ۱۰۰/ من چاول کا اسٹاک کیا، اب وہ

زید مذکور عمرو کے ہاتھ سے پانچ ماہ کی ادھاری پر آٹھ سو روپئے کے عوض میں فروخت کرتا ہے، حال یہ ہے کہ لینے والا کبھی وقت معینہ پر روپئے دیتا ہے اور کبھی وقت غیر معینہ کے بعد، تو کیا ایسا کاروبار زید کے لئے درست ہے یا نہیں؟ جب کہ زید ایک عالم اور مفتی ہے؟

المستفتی: شاکر حسین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مدت متعین ہے، تو مذکورہ معاملۂ بیع جائز اور درست ہے، اگر چہ وقت مقررہ پر روپئے ادا نہ ہوتا ہو، بس صرف عقد کے وقت میں مدت متعین کر لینا شرط ہے۔

ویجوز البیع بثمن حال ومؤجل إن کان الأجل معلوما. (هداية، کتاب البیوع، أشرفی ۳/ ۲۱، مختصر القدوري، ص: ۷۱، شامي، زکریا ۷/ ۵۲، کراچی ٤/ ٥۳۱، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۱۳، مصري قدیم ۲/ ۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ شوال ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۶۷۳)

ادھار کی صورت میں مبیع کی قیمت بڑھانا

سوال [۸۷۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہم نے ایک تاجر کو ایک لاکھ روپئے کا آرڈر دیا، ایک لاکھ روپئے کی مال کی تیاری میں سات فیصد خرچ آتا ہے۔ اور ہم اس کو دس فیصد خرچ دے رہے ہیں، اس شرط پر کہ ہم اس کو ایک ماہ کے بعد پیمنٹ کریں گے، کیا یہ شرط بیع وشراء میں جائز ہے، یا بیع فاسد ہے؟

المستفتی: سمیع اللہ محلّہ بھٹی اسٹریٹ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ طریقہ سے بیع وشراء درست ہے، نیز ادھار کی صورت میں خرچ میں اضافہ کر کے دینا بھی جائز ہے۔

ألا یری! أنه یزاد في الثمن لأجل الأجل. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، أشرفي ٣/ ٧٤، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٠/ ١٨٧، رقم: ١٢٧٣٨، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١١٢، مصري قديم ٢/ ٧٨)

وإن شرط الأجل في الثمن، والثمن دين، فإن كان الأجل معلوما جاز البيع. (عالمگيري، الباب العاشر في الشروط التي تفسد البيع والتي لا تفسده، زكريا قديم ٣/ ١٤٢، جديد ٣/ ١٤٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/ ذیقعدہ ۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۷۲۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/ ۱۱/ ۱۴۱۴ھ

کیش لے کر کم قیمت پر سامان بعد میں دینا

سوال [۸۷۵۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے ایک اسکیم چلائی ہے، جس میں اس نے چند چیزیں رکھی ہیں اور بازاری قیمت سے بہت کم قیمت پر لوگوں کو دے رہا ہے، مثال کے طور پر بجلی کا پنکھا بازار میں سات سو روپئے کا ہے وہ ۲۴۰/ روپئے کا اپنی اسکیم میں دے رہا ہے، الگ سے دس پرسینٹ کمیشن لیتا ہے، تو کیا ایسی چیز کا خریدنا جائز ہے یا نہیں؟

نوٹ: روپئے جمع کرنے کے ۲۰/ دن بعد وہ آئیٹم دیتا ہے، اور روپئے جمع کرتے وقت دس فیصد کمیشن لیتا ہے، آپ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: حکیم مولوی محمد شاہد صاحب لائن نمبر: ۱۳، آزاد نگر، ہلدوانی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فیصدی اور پرسینٹ کی قید کے ساتھ ناجائز ہے؛ لیکن اگر یوں کرلیا جائے کہ پورے پنکھے کی قیمت ۲۴۰ر کے بجائے ۲۶۴ر قرار دی جائے، یا یوں کرلیا جائے کہ بوقت عقد مشتری بطور انعام خوشی سے فیصدی کی قید لگائے بغیر ۲۴ر روپئے مزید دے دیا کرے تو گنجائش ہے۔ اور یہ دس فیصد یا دس پرسینٹ نہیں سمجھا جائے گا؛ بلکہ مبیع کی اصل قیمت سمجھی جائے گی۔

ویجوز للمشتري أن یزید للبائع في الثمن –إلی قوله– فالزیادة والحط یلتحقان بأصل العقد عندنا. (هدایة، کتاب البیوع، باب المرابحة والتولیة، أشرفي ۳/ ۷۵، مختصر القدوري، ص: ۸۱، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۹/ ۲۹، شرح المجلة رستم، مکتبه اتحاد ۱/ ۱۳۳، رقم المادة: ۲۵۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹ر ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۲۱)

قیمت بڑھا کر قسطوار ادھار بیچنا

سوال [۸۷۵۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: قسطوں پر زیادہ رقم دے کر کوئی چیز خرید سکتے ہیں، جب کہ نقد پر کم قیمت لگ رہی ہو؟

المستفتی: محمد زوار مال پوری، جے پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قسطوں پر خریداری کے وقت اگر تمام قسطیں متعین ہوجائیں اور ہر ایک قسط کی مقدار بھی معلوم ہوجائے اور ادائے گی کی مدت بھی متعین ہوجائے، تو اس طرح قسطوں پر خریداری شرعاً جائز ہے، چاہے نقد کے مقابلہ میں قسطوں کی

شکل میں رقم کی مقدار کتنی ہی بڑھ جائے اس کی وجہ سے شرعی طور پر خریداری میں کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔(مستفاد: امداد الفتاوی ۳/۲۰)

البيع مع تاجيل الثمن وتقسيطه صحيح ...... يلزم أن تكون المدة معلومة في البيع بالتأجيل والتقسيط. (شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ١/ ١٢٤-١٢٥، رقم المادة: ٢٤٥-٢٤٦، مجلة الأحكام العدلية، كراچى ١/ ٥٠، رقم المادة: ٢٤٥-٢٤٦)

ولو لم يكن الأجل مشروطا في العقد، لكنه منجم معتاد كعادة بعض البلاد يشترون بنقد ويسلمون الثمن بعد شهر، إما جملة أو منجما قيل: لا بد من بيانه؛ لأن المعروف كالمشروط. (عناية مع الفتح، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، كوئٹه ٦/ ١٣٤، دارالفكر ٦/ ٥٠٩، زكريا ٦/ ٤٦٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶/۵/۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۶۴۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۹/۵/۱۴۲۳ھ

ادھار ونقد کی صورت میں قیمت میں تفاوت کا حکم

سوال [۸۷۵۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: رائی کے کھیت والے نے تیل والے کو رائی دی، جس پر میل مالک کہتا ہے: اگر دو مہینہ کے بعد پیسہ لوگے تو ۵۰۰/روپئے کوئنٹل اور اگر ۶/مہینہ کے بعد لوگے تو ۶۰۰/روپئے کوئنٹل اور ایک سال بعد لوگے تو ایک ہزار روپئے کوئنٹل کے حساب سے پیسے ملیں گے، تو کیا یہ سود ہے؟

المستفتی: محمد زبیر احمد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: رائی کے کھیت والے نے جس وقت میل مالک کو رائی دی

اسی وقت دو مہینے چھ مہینے یا ایک سال ان میں سے کوئی ایک مدت حتمی طور پر متعین کر لی ہے، تو جائز ہے، اگر ادائے گی میں کچھ تاخیر بھی ہو جائے تو اس متعینہ رقم پر اضافہ نہیں ہوسکتا۔

وأما البطلان فيما إذا قال: بعتكه بألف حالا، وبألفين إلى سنة، فلجهالة الثمن. (فتح القدير، كتاب البيوع، دارالفكر ٦/ ٢٦٢، زكريا ٦/ ٢٤٣، كوئٹه ٥/ ٤٦٩، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢/ ٣٨)

وصح بثمن حال وهو الأصل، ومؤجل إلى أجل معلوم. (شامي، كتاب البيوع، مطلب في الفرق بين الأثمان والمبيعات، زكريا ٧/ ٥٢، كراچی ٤/ ٥٣١، هداية، أشرفي ٣/ ٢١، مختصر القدوري، ص: ٧١، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١٣، مصري قديم ٢/ ٨)

رجل باع على أنه بالنقد بكذا وبالنسيئة بكذا، وإلى شهر بكذا، وإلى شهرين بكذا لم يجز. (عالمگيري، الباب العاشر في الشروط التي تفسد البيع، والتي لا تفسده، زكريا قديم ٣/ ١٣٦، جديد ٣/ ١٣٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ذیقعدہ ۱۴۲۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۱۴۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۳/ ۱۱/ ۱۴۲۷ھ

نقد وادھار کی وجہ سے قیمت میں کمی زیادتی کرنا

سوال [۸۷۶۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے پاس دو شخص کچھ خریدنے کے لئے آئے، ایک نقد دوسرا ادھار، تو ہم نقد والے کو جو بھاؤ ہے اسی میں دیتے ہیں اور ادھار خریدنے والے کو بھاؤ بڑھا کر دیتے ہیں۔

المستفتی: شمس الدین علی پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: نقد اور ادھار کی وجہ سے قیمت میں کمی زیادتی شرعاً وعرفاً درست ہے، مثلاً کوئی تاجر ایک چیز نقد ایک روپۓ میں اور ادھار دو روپۓ میں دیتا ہے، تو

اس میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن شرط یہ ہے کہ خرید وفروخت کرتے وقت قیمت کی مقدار اور ادائے قیمت کی مدت متعین کر لی جائے، مثلاً تاجر یہ کہے کہ میں یہ چیز ایک ماہ کے لئے دو روپئے میں ادھار دے رہا ہوں۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۲۰، محمودیہ قدیم ۱۳/ ۳۳۲، جدید اشرفیہ ۱۶/ ۱۵۲، کفایت المفتی قدیم ۸/ ۴۰، جدید زکریا ۸/ ۵۲، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۱۳۵، رحیمیہ قدیم ۹/ ۲۵۲، جدید زکریا ۹/ ۱۹۸)

ألا يرى! أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ۳/ ۷٤، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ۱۰/ ۱۸۷، رقم: ۱۲۷۳۸، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱۱۲، مصري قديم ۲/ ۷۸، هندية زكريا قديم ۳/ ۱٤۲، جديد ۳/ ۱٤۲)

لیکن اس میں یہ صورت کہ اگر ایک ماہ میں قیمت ادا کرو تو دو روپئے اور تین ماہ میں ادا کرو تو تین روپئے، اس طرح جہالت کے ساتھ یہ معاملہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا؛ بلکہ عقد کے وقت میں جو قیمت طے ہوگئی ہر حال میں اتنی ہی قیمت ملے گی، خواہ زیادہ سے زیادہ تاخیر ہی کیوں نہ ہو۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/ ۲۰، رحیمیہ ۹/ ۲۵۲)

رجل باع على أنه بالنقد بكذا، وبالنسيئة بكذا، وإلى شهر بكذا، وإلى شهرين بكذا، لم يجز كذا فى الخلاصة. (هندية، الباب العاشر في الشروط التي تفسد البيع، والتي لا تفسده، زكريا ۳/ ۱۳٦، جديد ۳/ ۱۳۷، وهكذا في فتح القدير، زكريا ٦/ ۲٤۳، دارالفكر ٦/ ۲٦۲، كوئٹه ٥/ ٤٦۹، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲/ ۳۸)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ٦٦٦٥)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۵/۲۰ھ

نقد وادھار معاملہ میں قیمت میں کمی بیشی کرنا

سوال [۸۷۶۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ زید کی پرچون کی دوکان ہے، اگر کوئی شخص اس سے نقد سامان خریدتا ہے، تو اسے کم پیسوں پر دیتا ہے اور جو قیمت فوراً ادا نہیں کرتا ہے اسے قیمت بڑھا کر دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میں جس دوکان سے سامان لاتا ہوں، اگر اس کو بروقت روپئے سامان کے نہیں ادا کرتا ہوں تو وہ مجھ سے ان روپیوں پر سود لیتا ہے، تو اس کو میں اسی سے ادا کروں گا، اپنی جیب سے میں سود ادا نہیں کروں گا، تو سوال یہ ہے کہ ادھار دینے والے کو سامان کی قیمت بڑھا کر دینا اور اپنے سے اوپر بڑی دوکان کو سود دینا شرعاً کیسا ہے؟ مدلل ومفصل جواب مطلوب ہے۔

المستفتی: محمد اخلاق، خوشحال گنجی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں نقد وادھار میں قیمت کی کمی وزیادتی تو جائز ہے، مثلاً کوئی تاجر ایک چیز نقد لینے والے کو ایک روپئے میں دیتا ہے اور وہی چیز ادھار لینے والے کو دو روپئے میں دے، تو اس میں مضائقہ نہیں، مگر اس کے جواز کے لئے شرط یہ ہے کہ مجلس عقد میں قیمت کی مقدار اور ادائے قیمت کی میعاد مقرر کر لی جائے، بڑی دوکان والوں کے لئے چھوٹی دوکان والوں سے سود لینا جائز نہیں۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/ ۴۰، جدید زکریا ۸/ ۵۲، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۱۳۵، فتاوی رحیمیہ قدیم ۹/ ۲۵۲، جدید زکریا ۹/ ۱۹۸، فتاوی محمودیہ قدیم ۱۳/ ۳۳۲، جدید ۱۶/ ۱۵۲)

ألا يرى! أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ٣/ ٧٤، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٠/ ١٨٧، رقم: ١٢٧٣٨، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١١٢، مصري قديم ٢/ ٧٨، هندية زكريا قديم ٣/ ١٤٢، جديد ٣/ ١٤٢)

رجل باع على أنه بالنقد بكذا، وبالنسيئة بكذا، وإلى شهر بكذا،

وإلى بشهرين بكذا، لم يجز. (هندية، الباب العاشر في الشروط التي تفسد البيع، والتي لا تفسده، زكريا ۳/ ۱۳٦، جديد ۳/ ۱۳۷، وهكذا في فتح القدير، زكريا ٦/ ۲٤۳، دارالفكر ٦/ ۲٦۲، كوئٹه ٥/ ٤٦۹، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲/ ۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۴۴)

نقد ۸۰؍ روپے اور ایک ماہ کی ادھاری پر ۸۵؍ روپے میں فروخت کرنا

سوال [۸۷۶۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عمرو کاروباری آدمی ہے، اپنے یہاں مال تیار کر کے فروخت کرتا ہے، جس میں اس کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی خریدار نقد خریدے تو ۸۰؍ روپئے کلو اور ایک ماہ کے ادھار پر ۸۵؍ روپئے کلو اور دو ماہ کے ادھار پر ۹۰؍ روپئے کلو فروخت کرتا ہے، جو کہ بظاہر استحصال ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ اور کیا مذکورہ صورت ربوا میں داخل نہیں؟

المستفتی: مولانا شمیم احمد، مولانا والی مسجد تمبا کو والان، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ صورت میں نقد اور ادھار کے اندر قیمت کی کمی وزیادتی تو جائز ہے، مگر اس کے جواز کے لئے شرط یہ ہے کہ مجلس عقد میں قیمت کی مقدار اور ادائے قیمت کی میعاد متعین کر لی جائے۔ اور اگر احتمالی صورت بیان کر کے عقد کرے تو جائز نہیں۔

رجل باع على أنه بالنقد بكذا، وبالنسيئة بكذا، وإلى شهر بكذا، وإلى بشهرين بكذا، لم يجز، كذا في الخلاصة. (هندية، الباب العاشر في الشروط التي تفسد البيع، والتي لا تفسده، زكريا ۳/ ۱۳٦، جديد ۳/ ۱۳۷، وهكذا في فتح القدير، زكريا ٦/ ۲٤۳، دارالفكر ٦/ ۲٦۲، كوئٹه ٥/ ٤٦۹، الموسوعة الفقهية الكويتية ۲/ ۳۸)

اور مذکورہ صورتیں ربوا میں داخل نہیں بشرطیکہ ان صورتوں میں میعاد ختم ہونے کے بعد مزید اضافہ نہ کیا جاتا ہو۔

ألا يرى! أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ٣/ ٧٤، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٠/ ١٨٧، رقم: ١٢٧٣٨، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١١٢، مصري قديم ٢/ ٧٨، هندية زكريا قديم ٣/ ١٤٢، جديد ٣/ ١٤٢)

ويزاد في الثمن لأجله إذا ذكر الأجل بمقابلة زيادة الثمن قصدا، فاعتبر مالا في المرابحة. (شامي، قبيل مطلب في الكلام على الرد بالغبن الفاحش، زكريا ٧/ ٣٦٢، كراچی ٥/ ١٤٢، البحرالرائق، كوئٹه ٦/ ١١٥، زكريا ٦/ ١٩١)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۶؍ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۱۲۷)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۶؍۴؍۱۴۲۰ھ

نقد اور ادھار کی صورت میں قیمتوں کے فرق کا حکم

سوال [۸۷۶۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کہ گیہوں ۸۰۰؍روپئے کوئنٹل ملتا ہے، زید بکر کو ایک کوئنٹل گیہوں اس شرط پر دیتا ہے کہ اگر تم ایک ماہ بعد دوگے تو اسی ریٹ کی قیمت تم کو دینا ہوگی، جب کہ ایک ماہ بعد ۷۰۰؍روپئے کوئنٹل گیہوں ملتا ہے، تو کیا زید کا اس طرح بیع کرنا اور اس بھاؤ پر دینا درست ہے یا نہیں؟ (۲) زید بکر کو ایک کوئنٹل گیہوں ادھار اس شرط پر دیتا ہے کہ ۱۲۰۰؍روپئے لوں گا، جب کہ ابھی ۱۰۰۰؍روپئے کوئنٹل گیہوں ملتا ہے، کیا زید کا ادھار دینے کی وجہ سے زیادہ قیمت لینا درست ہے یا نہیں؟ ربوا تو نہیں؟

المستفتی: محمد منصور عالم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ دونوں صورتوں میں اس طرح کی خرید وفروخت کرنا جائز ہے، بشرطیکہ بوقت خرید فروخت متعاقدین بیع کے مؤجل ہونے یا نہ ہونے کی تعیین کرکے ایک ثمن پر متفق ہوجائیں۔ اور اگر متعاقدین تأجیل بیع وعدم تأجیل بیع اور تعیین ثمن یا عدم تعیین ثمن کا فیصلہ کرنے سے قبل جدا ہوجائیں، تو اس صورت میں بیع جائز نہ ہوگی، نیز متعاقدین کے مابین جو قیمت طے ہوجائے وہی معتبر ہے، خواہ مارکیٹ میں کوئی اور قیمت ہو؛ لہٰذا بائع مبیع کو مارکیٹ ریٹ پر دے یا مارکیٹ ریٹ پر نہ دیتے ہوئے اپنے متعین کردہ ریٹ پر دے، بہرصورت بیع جائز ہے۔

لأن للأجل شبها بالمبيع، ألا يرى! أنه يزاد في الثمن لأجل الأجل.

(هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ٣/ ٧٤، البحرالرائق، كوئٹه٦/ ١١٥، زكريا ٦/ ١٩١، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٠/ ١٨٧، رقم: ١٢٧٣٨، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١١٢، مصري قديم ٢/ ٧٨، هندية زكريا قديم ٣/ ١٤٢، جديد ٣/ ١٤٢) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/محرم الحرام ۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۵۹۷۶)

نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق کرنا

سوال [۸۷۶۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کی پرچون کی دوکان ہے، نقد سودا پانچ روپئے میں ایک کلو دیتا ہے اور ادھار آٹھ یا سات روپئے میں ایک کلو دیتا ہے، تو زید کا نقد اور ادھار میں قیمت کا یہ فرق کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبداللہ مقبرہ دوئم کیت والی مسجد، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ادھار کی وجہ سے قیمت زیادہ لینا اور نقد کی صورت میں قیمت کم لینا جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۳/۳۳۳، جدید اشرفیہ ۱۶/۱۵۲)

ألا یری! أنه یزاد في الثمن لأجل الأجل. (هدایة، کتاب البیوع، باب المرابحة والتولیة، اشرفي ۳/ ۷٤، شامی، زکریا ۷/ ۳٦۲، کراچی ٥/ ۱٤۲، البحر الرائق، کوئٹه ٦/ ۱۱٥، زکریا ٦/ ۱۹۱، المحیط البرهاني، المجلس العلمي ۱۰/ ۱۸۷، رقم: ۱۲۷۳۸، مجمع الأنهر، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۱۱۲، مصري قدیم ۲/ ۷۸)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴/۵/۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۴۰۲۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۴/۵/۱۴۱۵ھ

ادھار معاملہ میں کمی وبیشی کا حکم

سوال [۸۷۶۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: لوگ ایسے معاملہ کرتے ہیں کہ تم مجھ سے اس وقت چاول لے جاؤ، اس وقت پندرہ روپئے کے حساب سے لوں گا اگر چہ اس وقت بیس روپئے کیوں نہ ہو۔

المستفتی: محمد اطہر بن عبد الجلیل، ارریہ بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بعض لوگوں کا اس طرح معاملہ کرنا کہ اس وقت چاول لے جاؤ اور اس وقت مثلاً اگہن کے مہینہ میں پندرہ روپئے کے حساب سے چاول لوں گا تو یہ ادھار کی شکل ہے۔ اور ادھار میں کمی زیادتی جائز نہیں ہے۔ اور یہاں ادائے گی کے وقت میں کمی زیادتی لازم آرہی ہے؛ اس لئے جائز نہیں ہے۔ اور اس کے جواز کی صرف یہی شکل

ہے کہ اس وقت تم ایک کوئنٹل چاول لے جاؤ اور اگہن کے مہینہ میں تمہیں ایک ہی کوئنٹل چاول دینے پڑیں گے، چاہے اس وقت چاول کی قیمت کچھ بھی ہو، اس سے کوئی سروکار نہیں۔

وأما بيع المكيل المطعوم بجنسه متفاضلا، وبيع الموزون المطعوم بجنسه متفاضلا –إلى– فلا يجوز بالإجماع. (بدائع الصنائع، كتاب البيوع، مسائل الربا، زكريا ٤/ ٤٠٣، كراچی ٥/ ١٨٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۱۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۴/۲۷ھ

نقد میں کم اور ادھار میں زائد روپئے لینا

سوال [۸۷۶۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک آدمی سلی کا کاروبار اس طرح کرتا ہے کہ نقد ۹۰/ روپئے کلو اور ادھار ۹۲/ روپئے کلو دیتا ہے؛ لیکن اگر ادھار مال کے پیسے ایک ماہ بعد بھی دئے جائیں تب بھی ۹۲/ روپئے کلو کے ہی پیسے لیتا ہے۔ اور دوسرا آدمی اس طرح کاروبار کرتا ہے کہ نقد مال ۹۰/ روپئے کلو اور ادھار ۹۲/ روپئے کلو؛ لیکن ادھار کے ساتھ ساتھ وقت مقرر کرتا ہے، کہ اگر ایک ہفتہ کے اندر پیسے دے دو تب تو یہی قیمت ہے؛ لیکن اگر ایک ہفتہ سے ایک دن بھی آگے بڑھ گیا تو ۹۳/ روپئے کے حساب سے پیسہ لیتا ہے، تو حضرت والا سے درخواست ہے کہ دونوں آدمیوں میں سے کس کا کاروبار جائز ہے اور کس کا حرام؟

المستفتی: مجیب الرحمٰن حیاتی محلّہ پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سلی کی خریداری میں اس طرح کا معاملہ کرنا کہ نقد ۹۰/

روپئے فی کلو اور ادھار ۹۲/ روپئے فی کلو ہے؛ لیکن ادھار مال کے پیسے مدت معینہ سے ایک مہینہ تاخیر سے بھی دئے جائیں تب بھی ۹۲/ روپئے فی کلو ہی رہے گا، تو اس طرح کا معاملہ شرعی طور پر جائز اور درست ہے، ادائے گی میں تاخیر کی وجہ سے مزید کوئی پیسہ زائد لینا شرعاً جائز نہیں ہے۔

ويزاد في الثمن لأجله إذا ذكر الأجل بمقابلة زيادة الثمن قصدا. (البحرالرائق، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، كوئٹه ٦/ ١١٥، زكريا ٦/ ١٩١، شامي، زكريا ٧/ ٣٦٢، كراچی ٥/ ١٤٢)

ألا يرى! أنه يزاد في الثمن لأجله. (هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، اشرفي ٣/ ٧٤، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٠/ ١٨٧، رقم: ١٢٧٣٨، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١١٢، مصري قديم ٢/ ٧٨، هندية زكريا قديم ٢/ ١٤٢، جديد ٢/ ١٤٢)

اور دوسری شکل کہ نقد خریداری میں ۹۰/ روپئے فی کلو اور ایک ہفتہ یا ایک مہینہ کی ادھار خریداری میں ۹۲/ روپئے فی کلو؛ لیکن اس میں ادائے گی میں ایک دن بھی تاخیر ہو جائے تو ۹۳/ روپئے فی کلو تو یہ معاملہ قطعاً جائز نہیں ہے، تاخیر کے عوض میں پیسہ بڑھانا زمانہ جاہلیت کے سود کے مرادف ہے۔

وإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل، فهذا هو الربى الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به. (تفسير كبير ٧/ ٩١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷؍محرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۴۳۰)

٦/ باب المرابحة

شرعاً نفع لینے کی حد کیا ہے؟

سوال [۸۷٦٧]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خرید وفروخت پر کتنا نفع لینا بائع کے لئے درست ہے؟ ہمارے چوڑی کا کاروبار ہوتا ہے، بسا اوقات ٹرک میں مال آنے کی وجہ سے چوڑی کے بہت سے بنڈل ٹوٹ جاتے ہیں، جس سے ہمارا بہت سارا نقصان ہوجاتا ہے، ہم اس نقصان کی تلافی کے لئے چوڑیوں کی قیمت میں اضافہ کرکے فروخت کرتے ہیں، جس سے نقصان کی تلافی ہوجائے، حتی کہ بسا اوقات چوڑیوں کی اصلی قیمت سے زیادہ نفع لیتے ہیں، مثلاً سو روپئے کا ایک بنڈل آیا، ہم نے اس کو تین سو روپئے میں یا ڈھائی سو روپئے میں بیچا، تو کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے اور اتنا نفع لینے کی گنجائش ہے؟ اگر نہیں تو پھر کتنا نفع لے سکتے ہیں؟

المستفتی: محمد عزیز فتح پور، چوڑی بازار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: چیزوں کی خرید وفروخت میں نفع لینے کی مقدار شرعاً متعین نہیں ہے، دوگنی قیمت میں بھی بیچنا جائز ہے اور لینے والوں کو لینے اور نہ لینے میں اختیار ہے؛ البتہ بیچنے والے کو جھوٹ سے احتراز لازم ہے کہ خریدنے والے کے سامنے یہ نہ کہا کرے کہ ہم نے اتنے میں خریدا ہے؛ بلکہ اگر مشتری کے سامنے کہنے کی ضرورت پڑ جائے تو خریدار کے سامنے خرچ اور نقصان سب ملا کر کر یوں کہا کرے کہ ہم کو اتنے کی پڑ گئی ہے اور یہ نہ کہے کہ اتنے میں خریدی ہے۔

عن أبي هريرة –رضي الله عنه– أن رسول الله ﷺ قال: من حمل علينا السلاح، فليس منا، ومن غشنا فليس منا. (صحيح مسلم، الإيمان، باب من غشنا فليس منا، النسخة الهندية ١/ ٧٠، بيت الأفكار، رقم: ١٠١)

عن ابن عمر –رضي الله عنه– أن النبي ﷺ قال: إذا كذب العبد تباعد عنه الملک میلا من نتن ما جاء به. (سنن الترمذي، باب ماجاء في الصدق والکذب، النسخة الهندية ۲/ ۱۸، دارالسلام، رقم: ۱۹۷۲)

عن أنس بن مالک –رضي الله عنه– عن النبي ﷺ قال: أکبر الکبائر: الإشراک بالله، وقتل النفس، وعقوق الوالدین، وقول الزور، أو قال: وشهادة الزور. (صحیح البخاري، التفسیر، باب قول الله تعالیٰ: ﴿ومن احیاها﴾ النسخة الهندية ۲/ ۱۰۱۵، رقم: ۶۶۰۶، ف: ۶۸۷۱، صحیح مسلم، باب بیان الکبائر وأکبرها، النسخة الهندية ۱/ ۶۴، بیت الأفکار، رقم: ۸۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۵/ ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۰۸۹۷)

دوگنے نفع پر فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۷۶۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے ایک چیز کو پچیس روپئے میں خریدا ہے اور اس کو دوگنی قیمت میں بیچتا ہے، تو کیا دوگنی قیمت میں بیچنا جائز ہے؟

المستفتی: جلال الدین پاکبڑہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفیق: نفع لینے کی کوئی حد متعین نہیں ہے، جتنا لینا چاہے لے سکتا ہے، بشرطیکہ گاہک کو دھوکہ نہ دے۔ (فتاوی رشیدیہ ۵۵۷، جدید مبوب ۵۴۰)

الثمن المسمی: هو الثمن الذي یسمیه ویعینه العاقدان وقت البیع بالتراضي سواء کان مطابقا لقیمته الحقیقیة أو ناقصا عنها أو زائدا علیها.

(شرح المجلة رستم، مکتبه اتحاد دیوبند ۱/ ۷۳، رقم المادة: ۱۵۳)

المرابحة بيع بمثل الثمن الأول وزياة ربح ...... والكل جائز. (هندية، الباب الرابع عشر في المرابحة والتولية والوضيعة، زكريا جديد ٣/ ١٥٦، قديم ٣/ ١٦٠، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٢/ ٧٨، الفقه الإسلامي وأدلته، دارالفكر ٥/ ٣٦٠٠، هدى انٹر نيشنل ديوبند ٤/ ٣٥٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/۴/۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/۳۴۴۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۸/۴/۱۴۱۴ھ

سلنڈر بلیک کرنا

سوال [۸۷۶۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گیس کمپنیوں نے کچھ عرصہ سے قانون بنایا ہے کہ بیس دن سے پہلے گیس نہیں ملے گا، نیز کھانے پینے کے ہوٹل اور دوکانوں کے لئے ایک نیا سلنڈر بنایا ہے، جس میں گیس بیس کلو ہوتی ہے اور قیمت گھر والے سلنڈر سے دوگنی ہوتی ہے، اب مثلاً زید کا سلنڈر چالیس دن چلتا ہے تو زید کمپنی کے ضابطہ کے مطابق دو سلنڈر لے کر ایک خود رکھ لیتا ہے، دوسرا ہوٹل والے کو سلنڈر کی متعینہ قیمت سے کچھ زائد رقم لے کر بیچ دیتا ہے، تو اس طرح زید کا گیس اور مٹی کا تیل کچھ قیمت زیادہ لے کر فروخت کرنا جس کو اصطلاح میں ''بلیک'' کرنا کہتے ہیں جائز ہے یا نہیں؟ نیز ہوٹل والوں کا اس طرح گیس لینا صحیح ہے یا نہیں؟ ہوٹل والے مجبور ہیں؛ کیوں کہ ہوٹلوں کا گیس جیسا کہ ذکر کیا گیا مہنگا اور کم ہے۔ واضح ہو کہ اس طرح سلنڈر بلیک کرنا گیس کمپنی کی نظر میں جرم ہے؟

المستفتی: محمد زبیر مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید سلنڈر اور تیل خرید نے کے بعد اس کا مالک بن چکا

ہے اور مالک کو اپنی چیز فروخت کرنے کا حق ہے، جس قیمت پر چاہے فروخت کرے؛ لیکن اس کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ یہ خلاف قانون ہے، تو پھر ہتک عزت کا خطرہ ہے اور ہتک عزت سے بچنا بھی ضروری ہے؛ اس لئے اس کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے؛ لیکن اگر ہتک عزت سے بچ کر اس کام میں نفع حاصل کرلیا ہے، تو وہ نفع جائز اور حلال ہے۔

قال الله تعالیٰ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. [البقرة: ١٩٥]

عن عروة هو البارقي أن النبي ﷺ أعطاه دينارا يشترى له به شاة، فاشترى له به شاتين، فباع إحداهما بدينار، فجاء بدينار و شاة، فدعا له بالبركة في بيعه، فكان لو اشترى التراب لربح فيه. (بخاري شريف، كتاب المناقب، النسخة الهندية ١/ ٥١٤، رقم: ٣٥١٣، ف: ٣٦٤٢)

عن ابن عمر -رضي الله عنه- قال: قال رسول الله ﷺ: لا ينبغي لمؤمن أن يذل نفسه قيل: يا رسول الله! وكيف يذل نفسه؟ قال: أن يتعرض من البلاء لما لا يطيق. (المعجم الكبير للبطراني، دار إحياء التراث العربي ١٢/ ٣١٢، رقم: ١٣٥٠٧، مسند البزار، مكتبة العلوم والحكم ٧/ ٢١٨، رقم: ٢٧٩٠، سنن الترمذي، أبواب الفتن، النسخة الهندية ٢/ ٥١، دارالسلام رقم: ٢٢٥٤، سنن ابن ماجة، باب قول الله تعالى: ﴿يأيها الذين آمنوا عليكم انفسكم﴾ النسخة الهندية ١/ ٢٩٠، دارالسلام، رقم: ٤٠١٦)

ولو باع شيئا مرابحة إن كان الثمن مثليا كالمكيل والموزون جاز البيع إذا كان الربح معلوما سواء كان الربح من جنس الثمن الأول أم لم يكن. (عالمگيري، كتاب البيوع، الباب الرابع عشر في المرابحة والتولية والوضيعة، زكريا قديم ٣/ ١٦٠، جديد ٣/ ١٥٦-١٥٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ؍رجب ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۳۶۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/ ۷/ ۱۴۲۸ھ

لون پر رکشہ لینے کی جائز شکل

سوال [۸۷۷۰]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارے یہاں آٹو رکشہ چلتے ہیں، اب پچھلے ڈیڑھ سال سے گورنمنٹ نے قانون بنا دیا ہے کہ اب صرف ایس این جی (گیس سے چلنے والے رکشے) ہی چلیں گے، یہ رکشہ بہت مہنگا ہونے کے سبب آدمی اسے خرید نہیں سکتا، رکشہ ایک لاکھ پندرہ ہزار کا ہے، اب مثلاً زید کے پاس پندرہ ہزار روپئے ہیں وہ بینک میں گیا تو بینک نے اس سے کہا کہ تم اپنے پسند کا رکشہ خرید لو ہم تم کو ایک لاکھ کا لون بشکل چیک دیتے ہیں؛ لہٰذا بینک نے ایک لاکھ کا چیک دے دیا اور زید رکشہ لے آیا، اب زید کو ایک لاکھ روپئے چار سال میں ادا کرنے ہیں اور مزید پچیس ہزار بھی ادا کرنے ہیں، تو کیا زید کا مذکورہ عمل جائز ہے یا نہیں؟ واضح ہو کہ اگر زید چاہے کہ چار سال کے بجائے دو سال میں رقم ادا کرے تو بینک اس کو قبول نہیں کرتے۔

المستفتی: محمد زبیر مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آٹو رکشہ خریدنے کے لئے بینک سے مذکورہ طریقہ سے لون لینا پھر اس لون کے پیسہ سے کمپنی سے آٹو رکشہ خرید لیا جائے تو جب تک بینک کا قرضہ مع سود کے ادا نہ کر دیا جائے اس وقت تک سود کی وعید میں شامل رہے گا، مگر سود کھانے کی وعید نہ ہوگی؛ بلکہ سود دینے کی وعید ہوگی۔

عن جابر -رضی اللّٰہ عنه- قال: لعن رسول اللّٰہ ﷺ آکل الربو ومؤکله، وکاتبه، وشاهدیه، وقال: هم سواء. (صحیح مسلم، باب لعن أکل الربو وموکله، النسخة الهندیة ۲/ ۲۷، بیت الأفکار، رقم: ۱۵۹۸، سنن أبي داؤد، باب في آکل الربا وموکله، النسخة الهندیة ۲/ ۴۷۳، دارالسلام، رقم: ۳۳۳۳)

اور اس وعید اور لعنت سے بچنے کے لئے متبادل شکل یہ ہے کہ بینک جو ایک لاکھ روپئے کا چیک

کاٹ کر دیتا ہے وہ آٹو رکشہ کی کمپنی کو بینک کا آدمی دے دے اور یہ شخص بینک کے توسط سے کمپنی سے آٹو رکشہ نکلوالے، تو ایسی صورت میں یہ ہوگا کہ بینک نے ایک لاکھ میں آٹو رکشہ کمپنی سے خرید کر ایک لاکھ پچیس ہزار روپئے میں اس شخص کے ہاتھ ادھار فروخت کیا جو چار سال میں ادا ہوگا۔ یہ بیع مرابحہ کی ایک جائز شکل ہے، جس کا اختیار کرنا شرعاً جائز ہے۔

المرابحة بمثل الثمن الأول وزيادة ربح -إلى قوله- جائز.

(عالمگيري، كتاب البيوع، الباب الرابع عشر في المرابحة والتولية والوضيعة، زكريا جديد ٣/ ١٥٦، قديم ٣/ ١٦٠، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٠/ ١٨٣، رقم: ١٢٧٢٩، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٤٦١، كراچی ٥/ ٢٢٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳؍رجب ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۳۵۹/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۷/۳ھ

کمیشن پر کتاب لاکر پوری قیمت میں فروخت کرنا

سوال [۸۷۷۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: پرائمری اسکول میں کورس کی کتابیں کمیشن پر لاکر اسکول میں بچوں سے پوری قیمت لینا کیسا ہے؟ شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی: محمد نصیر الدین نور پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کورس کی کتابیں کمیشن پر لاکر بچوں کو پوری قیمت پر فروخت کرنا جائز ہے؛ اس لئے کہ جو شخص کمیشن پر کتابیں لاتا ہے، وہ اس کا اپنا معاملہ ہے اور پوری قیمت پر نفع کے ساتھ فروخت کرنا اس کا تجارتی نفع ہے جو شرعاً جائز ہے۔

بيع المرابحة: وهو مبادلة المبيع بمثل الثمن الأول وزيادة ربح

معين. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹر نیشنل دیوبند ٤/ ٣٥٧، دارالفكر ٥/ ٣٦٠٠، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٤٦١، كراچى ٥/ ٢٢٠)

المرابحة نقل ما ملكه بالعقد الأول بالثمن الأول مع زيادة ربح.

(هداية، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، أشرفي ٣/ ٧٠، مختصر القدوري، ص: ٨٠)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍صفر المظفر ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۴۹۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۲/۱۶ھ

ایک روپئے کی چیز سو روپئے میں فروخت کرنا

سوال [۸۷۷۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسئلہ یہ ہے کہ مارکیٹ میں دوکاندار لاکھوں روپئے کا مال خریدتے ہیں اور بیچتے ہیں، کیا دوکاندار روپئے کا مال سو روپئے میں بیچے یا سو روپئے کا مال روپئے میں خریدے تو علماء کرام یہ فرمائیں کہ یہ سو کا مال روپئے میں خریدنا یا روپئے کا مال سو میں بیچنا یہ دوکاندار کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: حاجی فرزند صاحب محلّہ سرائے ترین، سنبھل

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بائع اور مشتری میں سے ہر ایک کو اختیار رہوتا ہے کہ آپسی رضا مندی سے روپئے کی چیز سو روپئے میں بیچے یا خریدے، اسی طرح سو روپئے کا مال روپئے میں بیچے یا خریدے؛ لہٰذا بیچنے والے بیوپاری اور دوکان دار کے درمیان جو بھی طے ہوجائے اس پر بیچنا اور دوکان دار کے لئے خریدنا بلاتردد جائز ہے۔

الثمن المسمى: هو الثمن الذي يسميه ويعينه العاقدان وقت البيع

بالتراضي، سواء كان مطابقا لقيمته الحقيقية، أو ناقصا عنها، أو زائدا عليها. (شرح المجلة رستم، مكتبه اتحاد ديوبند ١/ ٧٣، رقم المادة: ١٥٣)

يجوز للمشتري أن يزيد في الثمن، ويجوز للبائع أن يحط من الثمن، وأن يزيد في المبيع ويلتحق بأصل العقد، ويتعلق الاستحقاق بجميع ذلك. (تبيين الحقائق، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية، زكريا ٤/ ٤٢، إمداديه ملتان ٤/ ٨٣، هداية، أشرفي ٣/ ٧٥، مختصر القدوري، ص: ٨١، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٢٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳؍ رجب ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۲۰۲)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/۷/۱۴۳۴ھ

بیس ہزار کا مال ۲۴؍ ہزار میں فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۷۷۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں محمد سراج بن محمد حنیف بالا پور ضلع آکولہ برتنوں کا بیوپاری ہوں، اور میری مالی حیثیت اچھی ہے، مجھ سے بہت سارے لوگ ہفتہ واری مال ادھاری سے لیتے ہیں، تو میں ان سے واضح طور پر بتا دیتا ہوں کہ مثلاً میں دوکان سے -/20,000 (بیس ہزار روپئے) میں خریدوں گا اور تمہیں -/24,000 (چوبیس ہزار روپئے) میں دوں گا، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ میں اس خریدار کو اپنے ساتھ مارکیٹ لے جاتا ہوں، پھر وہ خریدار اپنے پسند کا سامان پسند کر لیتا ہے اور پھر میں اپنے نام سے بل بنواتا ہوں۔ اور وہ سامان اس کے حوالہ (خریدار کے) کرتا ہوں، پھر -/1,000 (ایک ہزار روپئے) ہفتہ اس سے وصول کرتا ہوں، آیا یہ صورت لین دین کی جائز ہے یا نہیں؟ یہ سود میں تو داخل نہیں ہے؟

المستفتی: محمد سراج بالا پور آکولہ، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ بیع مرابحہ ہے، شرعاً اس طرح کی خرید وفروخت جائز ودرست ہے۔

عن أبي بحر عن شيخ لهم، قال: رأيت على علي –رضى الله عنه– إزارا غليظا، قال: اشتريت بخمسة دراهم فمن أربحني فيه درهما، بعته إياه.
(السنن الكبرى للبيهقي، البيوع، باب المرابحة، دارالفكر ٨/ ٢٢٩، رقم: ١٠٩٤٤، دارالحديث القاهرة ٥/ ٦٩٧، رقم: ١٠٧٩٤)

المرابحة بيع بمثل الثمن الأول والزيادة. (الفتاوى التاتارخانية، الفصل السادس عشر في بيع المرابحة، زكريا ٩/ ٢٢١، رقم: ١٣١٨٣، المحيط البرهاني، المجلس العلمي ١٠/ ١٨٣، رقم: ١٢٧٢٩، هندية، زكريا قديم ٣/ ١٦٠، جديد ٣/ ١٥٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍ رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۴۹)

۷/ باب التلجئة

"بیع تلجئه" کا مقصد

سوال [۸۷۷۴]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اپنے والد کی موجودگی میں کپڑے کا کام شروع کیا جس میں کسی طرح کی کوئی مدد میرے والد نے یا بھائیوں نے نہیں کی، بفضلہ تعالیٰ کاروبار میں ترقی ہوتی چلی گئی؛ حتی کہ میں نے ایک مکان اپنی ذاتی کمائی سے والد کی حیات میں خریدا، اس وقت کاروبار میں تیزی سے اتار چڑھاؤ ہوتا تھا، میں نے سوچا کہ خدانخواستہ کبھی مندی آگئی اور مکان بیچنے کی نوبت آگئی تو میرے ساتھ ساتھ میرے بھائی بھی بے گھر ہوجائیں گے۔اوراگر میرے ساتھ ساتھ بھائیوں کا نام بھی ہوگا تو میں مکان بیچنے سے رک جاؤں گا، یہ سوچ کر میں نے مکان میں بھائیوں کا نام بھی داخل کروایا، اس وقت والدصاحب نے کہا بھی کہ جب سب تیرا ہی ہےتو کسی کا نام داخل مت کرو؛ لیکن میں نے مذکورہ بات کو مدنظر رکھتے ہوئے بھائیوں کا نام بھی داخل کروالیا، اب میرا چھوٹا بھائی کہتا ہے کہ جب کاغذات میں میرا نام ہے،تو مکان میں میرا حصہ ہے، اور میں اپنا حصہ لے کر رہوں گا، حالانکہ میں نے مذکورہ وجہ سے بھائیوں کا نام ڈلوایا تھا، کسی بھائی کو مکان ہدیہ نہیں دیا اور نہ ہی نام ڈلواتے وقت ہدیہ کی نیت تھی، نیت صرف یہ تھی اگر مکان صرف میرے نام پر ہوگا تو تنگی کے وقت میں بیچ دوں گا،تو میرے ساتھ ساتھ میرے بھائی بھی بے گھر ہوجائیں گے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا واقعی مذکورہ وجہ کی بناپر بھی بھائی کا نام داخل کرنے پر وہ مکان کا حقدار ہے؟ جب کہ بڑے بھائی کہتے ہیں کہ تو نے اپنی محنت سے کما کر سب لیا تھا؛ لہٰذا سب تیرا ہی ہے،تو جب کہے گا ہم مکان خالی کردیں گے،اگر بھائیوں کا حق مکان میں ہے،تو کس کو کتنا ملے گا،ہم تین بھائی ہیں؟

المستفتی: عبدالرشید، احمد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سائل نے سوال نامہ میں بھائیوں کے نام ڈالنے کی جو صورت ذکر فرمائی ہے وہ ”بیع التلجئہ“ کی حدود میں داخل نہیں ہوئی؛ کیوں کہ بیع التلجئہ حکومت یا کسی دشمن یا کسی طاقتور کی طرف سے خطرہ کی بنا پر ہوا کرتی ہے؛ اس لئے یہی سمجھا جائے گا کہ بھائیوں کو بھی مکان میں شریک کرنا مقصد ہے؛ لہٰذا اس میں رجسٹری کے مطابق ان کا بھی حق ہوگا۔

والتلجئة إنما تكون عن إضطرار. (شامي، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في مبيع التلجئة، زكريا ديوبند ۷/ ۵٤۲، كراچی ۵/ ۲۷۳)

بيع التلجئة: البيع الصوري أن يضطر لإظهار عقد وإبطان غيره مع إرادة ذلك الباطن كأن يظهر بيع داره لابنه لئلا يستولي عليها السلطان.

(معجم لغة الفقهاء، كراچی، ص: ۱۱۳، قواعد الفقه، أشرفي ۲۱۳، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهية، دارالفضيلة ۱/ ٤۰۵، الموسوعة الفقهية الكويتية ۹/ ٦۲) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲رشوال ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۷۱۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/ ۱۰/ ۱۴۲۹ھ

بیع تلجئہ

سوال [۸۷۷۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: نذیر احمد ایک سنی مسلمان ہے، اس کی بیوی سے اس کے دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں، نذیر احمد نے اپنی کمائی سے اور اپنے پیسے سے ہلدوانی لائن نمبر: ا رمحلّہ پنجو پورہ میں زمین کا ایک قطعہ (پلاٹ) خریدا، جس میں ٹین کی چھت کی صرف ایک کوٹھری بنی ہوئی ہے اور اس کوٹھری کے آس پاس صحن کے طور پر کچھ خالی زمین تھی، نذیر احمد نے یہ سب جگہ اپنے ہی پیسے

سے خریدی تھی، اس کے خریدنے میں نذیر احمد کی بیوی مشتری بیگم کا کوئی پیسہ نہیں تھا، مگر نذیر احمد کو چونکہ اپنی بیوی سے بہت محبت تھی؛ اس لئے پیار میں دلداری کی خاطر اس زمین کا بیع نامہ میں نے اپنی بیوی کے نام لکھوادیا تھا، مگر اس کو مالک نہیں بنایا تھا، اس کے بعد نذیر احمد نے اس زمین میں نئے طریقہ سے دومنزلہ مکان تعمیر کیا، اس مکان کی تعمیر میں بھی کل روپیہ صرف نذیر احمد ہی کا خرچ ہوا اور اس کی بیوی مشتری بیگم کا تعمیر میں بھی کوئی پیسہ نہیں لگا، اس مکان کی تعمیر کے بعد مشتری بیگم اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اس مکان میں رہتی رہی اور پھر کئی سال کے بعد مشتری بیگم کا یکم مئی ۱۹۷۷ء کو انتقال ہوگیا، انتقال سے دو مہینے پہلے یکم مارچ ۱۹۷۷ء کو مشتری بیگم نے اس مذکورہ مکان کے بارے میں ایک وصیت نامہ لکھوادیا، جس میں اس نے کھل کر یہ اقرار کیا ہے اور صاف صاف یہ بات لکھوائی ہے کہ پختہ دومنزلہ مکان جس کا نگر پالیکا نمبر ۳۸۰۵/ ہے، اور جو لائن نمبر: امحلّہ پنجو پورہ ہلدوانی میں ہے، ضلع نینی تال میں واقع ہے، اس مکان کی تعمیر میں اور اس مکان کی جگہ خریدنے میں میرا کوئی پیسہ خرچ نہیں ہوا ہے؛ بلکہ اس کے خریدنے اور تعمیر کرانے میں سارا پیسہ میرے شوہر نذیر احمد نے اپنی کمائی کا لگایا ہے، پیار اور محبت کی وجہ سے صرف بیع نامہ میرے نام لکھوادیا تھا، اس مکان کے اصلی مالک میرے شوہر نذیر احمد ہی ہیں، میں مالک نہیں ہوں۔

مشتری بیگم کے انتقال کے بعد نذیر احمد نے اس دومنزلہ مکان پر ایک سہ منزلہ اپنے پیسے سے اور بھی بنالیا ہے، نذیر احمد کے دولڑکے: انیس احمد اور رئیس احمد جو مشتری بیگم ہی سے ہیں، یہ دونوں اپنے باپ نذیر احمد سے بدسلوکی اور بدزبانی کرتے ہیں، اس کے ساتھ والد جیسا اچھا سلوک نہیں کرتے، روزانہ شراب پی کر آتے ہیں اور گالی گلوچ کرتے ہیں اور اس مذکورہ مکان کو اپنی ماں کا بتا کر اسمیں اپنا حصہ مانگتے ہیں، جب کہ اصل اور حقیقت یہ ہے کہ اس مکان کی مالک ان کی ماں نہیں تھی، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) اس صورت میں اس مکان کا اصل مالک صرف نذیر احمد ہی ہے یا اس کی بیوی مشتری بیگم؟

(۲) لڑکوں کا یہ مطالبہ کرنا کہ یہ ہماری ماں کا مکان ہے، ماں کی طرف سے اس میں ہمارا حق

ہے، یہ مطالبہ کرنا شرعاً غلط اور بے بنیاد اور باپ پر ظلم ہے یا نہیں؟

المستفتی: نذیر احمد ولد اللہ بخش، لائن نمبر ا رمحلہ آزاد نگر، ہلدوانی نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح نام کردینے کو شریعت کی اصطلاح میں بیع التلجئہ کہا جاتا ہے۔ اوراس میں جس کے نام کیا جاتا ہے وہ شرعاً مالک نہیں ہوتا؛ اس لئے مذکورہ صورت میں مسمی نذیر احمد کی بیوی مذکورہ زمین وکوٹھری وغیرہ کسی چیز کی شرعاً مالک نہیں ہوتی ہے، اور نہ ہی بعد کے تعمیر کردہ مکان کے کسی حصہ کی مالک ہوتی؛ لہٰذا پوری زمین ومکان سب مسمی نذیر احمد ہی کی ملکیت میں ہیں، اس میں مسماۃ مشتری بیگم کے لڑکے اور دوسرے ورثاء کو مطالبہ کا کوئی حق شرعاً حاصل نہیں ہوسکتا۔

وبيع التلجئة ويأتي متنا في الإقرار، وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل -إلى قوله- ولو تبايعا في العلانية إن اعترفا ببنائه على التلجئة، فالبيع باطل لاتفاقهما أنهما هزلا به. (الدالمختار، كتاب البيوع، باب المصرف، مطلب في بيع التلئجة زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچى ٥/ ٢٧٣، بدائع الصنائع كراچى ٥/ ١٧٦، زكريا ٤/ ٣٨٩، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢، هندية زكريا قديم ٣/ ٢٠٩، جديد ٣/ ١٩٦، قواعد الفقه أشرفي، ص: ٢١٣، الفقه الإسلامي و أدلته، هدى انٹرنیشنل دیوبند ٤/ ١٢٧-١٢٨، دارالفكر ٥/ ٣٣٢٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۱۵ ؍رجب المرجب ۱۴۰۹ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۱۳۲۴/۲۵)

کسی کے نام سے خریدنے کا حکم

سوال [۸۷۷۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے

بارے میں: مسماۃ بشیرن مرحومہ زوجہ جناب عبدالسلام مرحوم صاحب ساکن مرادآباد محلّہ اصالت پورہ اسماعیل روڈ ایک قطعہ مکان کچا غرب رویہ واقع اسماعیل روڈ اصالت پورہ مرادآباد کی تنہا مالک وقابض بذریعہ بیع نامہ بالعوض دین مہر چلی آرہی تھی، انہوں نے اپنے انتقال پر سات پسران دو دختران چھوڑے، مسماۃ بشیرن مرحومہ کاروباری سلسلہ کی وجہ سے مع اہل وعیال کے شہر جالنہ مہاراشٹر میں ہی مقیم رہی۔ ۱۹۷۰ء سے قبل مسماۃ بشیرن مرحومہ مرادآباد اپنے بھائی اللہ بخش مرحوم ودیگر رشتہ داروں کے یہاں آئیں، انہوں نے اپنے بھائی اللہ بخش مرحوم کو مکان مذکورہ کی تعمیر کرانے کے لئے روپئے دے کر تعمیر شروع کروادی، تعمیر کے بعد بھائی اللہ بخش مرحوم نے بہن بشیرن مرحومہ کو بتایا کہ تمہارے مکان کی مکمل تعمیر کرانے میں میرے پاس سے بھی -/5,000 روپئے لگ گئے ہیں، جس پر مسماۃ بشیرن مرحومہ نے کہا کہ یہ -/5,000 روپئے میں جالنہ پہنچ کر بھجوا دوں گی، اس پر بھائی اللہ بخش مرحوم نے کہا کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے، پتہ نہیں زندگی رہی یا نہ رہی آپ یادداشت بطور میرے -/5,000 روپئے کی ایک تحریر لکھ دو؛ لہٰذا اللہ بخش مرحوم بھائی نے اپنی بہن مسماۃ بشیرن مرحومہ کو لے جاکر کچھ کاغذوں پر دستخط وانگوٹھے لگانے کے بعد بہن سے کہا: آپ جاکر -/5,000 روپئے بھیج دوگی تب یہ کاغذ واپس کردوں گا یا پھاڑ دوں گا، مسماۃ بشیرن مرحومہ مکان مذکورہ میں کرایہ دار رکھوانے کے بعد جالنہ چلی گئیں۔

کچھ ہی عرصہ بعد مسماۃ بشیرن مرحومہ بہن نے اپنے لڑکے ولڑکی کی شادی کرنے کے لئے مرادآباد آکر بھائی اللہ بخش مرحوم سے اپنے مکان کے کرایہ دار سے مکان خالی کرنے کے لئے کہا کہ مجھے بچوں کی شادی اپنے مکان مذکورہ سے کرنی ہے، بھائی اللہ بخش مرحوم مکان خالی کرانے کی بات سن سن کر ٹال مٹول کرتے رہے، مزید رشتہ داروں کے ذریعہ کہنے پر اللہ بخش مرحوم بھائی نے کہا کہ میں نے بشیرن مرحومہ سے -/5,000 روپئے قرض کے بعوض تحریر کے بجائے بیع نامہ بحق اپنی زوجہ مسماۃ فاطمہ مرحومہ رجسٹری کرلیا تھا، جس سے میری بیوی مکان کی مالک ہوگئی، یہ سن کر مسماۃ بشیرن مرحومہ کے پسر محمد طاہر نے کچہری جاکر

کاغذات وغیرہ کا معائنہ کرا کرنقل حاصل کر کے قانونی کارروائی کی تیاری شروع کی، مزید مسماۃ بشیرن مرحومہ کی طرف سے بیع نامہ منسوخی کا دعویٰ دائر کر دیا، اس طرح سے کئی مقدمات شروع ہوگئے، جن کا کل خرچ وپیروی تنہا محمد طاہر نے اپنے نجی سرمایہ سے کی جومقدمات کئی سال تک چلتے رہے، کئی سالوں کے بعد محلّہ کے چند معزز اشخاص نے مقدمات کے اخراجات وفریقین کی پیسے کی بربادی پر غور کرتے ہوئے دونوں فریقین کی رضامندی سے یہ فیصلہ کیا؛ چونکہ اللہ بخش مرحوم اپنی بہن مسماۃ بشیرن مرحومہ کا مکان کا بیع نامہ اپنی زوجہ مسماۃ فاطمہ مرحومہ کے نام کرا چکے ہیں اور مسماۃ فاطمہ مرحومہ زوجہ اللہ بخش مرحوم مذکورہ مکان کے برابر کے رقبہ کا مین روڈ کا حصہ حال ہی میں مبلغ: -/30,000 روپئے میں فروخت کر چکی ہیں؛ اس لئے پچھلے حصہ کے عوض میں محمد طاہر پسر بشیرن مرحومہ -/27,000 روپئے مسماۃ فاطمہ مرحومہ کو ادا کریں گے اور بیع نامہ اقراری مسماۃ فاطمہ مرحومہ منسوخ ہوکر مقدمہ میں فیصلہ کی درخواست دی جائے گی، مسماۃ بشیرن مرحومہ نے اپنے موجودہ پسران سے -/27,000 روپئے ادا کرنے کے لئے کہا، اس پر موجودہ پسران نے جواب دیا کہ ہمارے پاس روپئے کا انتظام بالکل نہیں ہے، اس کے بعد مسماۃ بشیرن مرحومہ نے اپنے پسر محمد طاہر سے کہا کہ کسی بیٹے نے مقدمہ میں کبھی کوئی روپئے خرچ نہیں کیا اور نہ ہی اپنا وقت کچہری میں لگایا، اب تک کافی روپئے مقدموں میں تیرا خرچ ہوگیا اور مقدمات میں وقت بھی تو نے ہی لگایا؛ لہٰذا -/27,000 روپئے بھی تو ہی ادا کردے، محمد طاہر نے والدہ مسماۃ بشیرن مرحومہ کے حکم بموجب کچھ روپئے کاروبار میں سے نکال کر اور کچھ زیور نکال کر کل -/27,000 روپئے کا انتظام کر کے مومانی مسماۃ فاطمہ مرحومہ وماموں اللہ بخش مرحوم کو -/27,000 روپئے بھی ادا کردیئے، اس کے بعد والدہ مسماۃ بشیرن مرحومہ نے اپنے پسر محمد طاہر سے کہا کہ مکان تو نے ہی خریدا ہے، تو اس کا مالک ہے، میں یہ نہیں چاہتی کہ تو مکان اپنے پیسے سے خریدے اور مالک سب بنیں، اکیلا منہ میرا گور میں جائے گا، قیامت کے دن اللہ کو میں کیا جواب دوں گی؟ تو مکان کی لکھت بھی اپنے نام کرالے؛ لہٰذا محمد طاہر نے بیع نامہ کے خرچ سے بچنے

کے لئے مقدمہ میں ہی فیصلہ کی درخواست لگا کر مقدمہ ختم کرادیا، مکان مذکورہ میں محمد طاہر مع اہل وعیال اپنی سکونت کر رہا ہے۔

مجھلے گاؤں مہاراشٹر میں مسماۃ بشیرن مرحومہ نے اپنے پسر ابوالکلام کے بچہ کی شادی کے موقع پر اپنے پسران ابوالکلام محمد شمشاد، محمد نوشاد، محمد طاہر کی موجودگی میں مکان مذکورہ کا ذکر کرتے ہوئے محمد طاہر کے تنہا مالک ہونے کی تصدیق کی، مسماۃ بشیرن مرحومہ نے اپنی موت سے چار پانچ دن قبل بھی اپنے پوتے التمش پسر محمد طاہر سے بھی کہا کہ مکان مذکورہ تیرے والد کا ہے۔

محمد نسیم پسر بشیرن مرحومہ اورنگ آباد کی شادی مرادآباد میں ہونے کے موقع پر محمد طاہر نے یہ سوچ کر کہ مکان پر کڑیا پڑی ہیں، اس کو دوبارہ تعمیر کرادوں؛ کیوں کہ شادی کے موقع پر مہمان بھی دیگر شہروں سے آئیں گے؛ لہٰذا مکان مذکورہ کی دوبارہ تعمیرات و بھائی محمد نسیم کی شادی کی تیاری بھی ساتھ ساتھ شروع ہوگئی، محمد نسیم نے اورنگ آباد سے من جملہ ۶۰ر ہزار روپئے بھیجے، جب کہ شادی میں -/65,000 روپئے کا خرچ محمد طاہر نے کیا، مزید مکان کی کل تعمیرات محمد طاہر نے اپنے سرمایہ سے کی۔

برائے کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں مندرجہ بالا حالات کے مدنظر حسب ذیل سوال کے جواب سے آگاہ فرمائیں:

(۱) کیا پسر محمد طاہر مکان مذکورہ کا تنہا مالک بذریعہ والدہ مسماۃ بشیرن مرحومہ ہے؟

(۲) کیا مسماۃ بشیرن مرحومہ کے کسی دیگر وارثوں کو کوئی شرعی حق مکان مذکورہ میں کسی قسم کا یا اس کو فروخت کرنے یا آپس میں ایک دوسرے کو دینے کا پہنچتا ہے؟

المستفتی: محمد طاہر قریشی، اصالت پورہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ کی تفصیل بغور پڑھی گئی، اس کا حاصل یہ نکلا کہ پورا مکان حاصل کرنے میں مکمل رقم محمد طاہر نے اپنے ذاتی پیسے سے ادا کی ہے اور اسی نے اپنے ذاتی پیسے سے پورا مکان واپس خرید لیا ہے؛ اس لئے اس کے نام رجسٹری بیعنامہ کا

انتظام کیا گیا؛ لیکن اس نے رجسٹری خرچ بچانے کے لئے مقدمہ کے ذریعہ اپنے نام ڈگری کرالی ہے، جو بیع نامہ رجسٹری کے قائم مقام ہوجاتا ہے، اوراس نے جو کچھ کیا ہے مکان کی مالک بشیرن کے حکم سے کیا ہے، تو ایسی صورت میں محمد طاہر ہی تنہا اس کا مالک ہوگا، کسی دیگر وارثین کا اس سے حق متعلق نہ ہوگا۔

الآثار المرتبة على البيع أولا: انتقال الملك يملك المشترى المبيع، ويملك البائع الثمن ويكون ملك المشتري للبيع بمجرد عقد البيع الصحيح، ولا يتوقف على التقابض. (الموسوعة الفقهية ۹/ ۳٦)

ففي قبض العقار تكفي التخلية -إلى قوله- لكن لو أذن البائع للمشتري بقبض الدار والمتاع صح التسليم. (الموسوعة الفقهية ۹/ ٤١)

وحكمه (البيع) فثبوت الملك في المبيع للمشتري، وفي الثمن للبائع إذا كان البيع باتا. (عالمگيري، كتاب البيوع، الباب الأول، زكريا قديم ۳/ ۳، جديد ۳/ ٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۰۸۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۵/۴ھ

نام کردینے سے ملکیت کا حکم

سوال [۸۷۷۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک باپ کی چھ اولادیں ہیں، تین لڑکے، تین لڑکیاں اور ماں باپ، بیت اللہ شریف اس سال حج کے لئے جارہے ہیں، والد کا بہت بڑا شوروم ہے، والد نے سب سے بڑے لڑکے کو کاروبار دیا اور لڑکے نے کاروبار کو برباد کیا اور ماں باپ کا نافرمان ہوگیا اور پارٹیوں کا کافی قرض ہوگیا ہے، باپ نے بہت بڑے لڑکے کو سمجھایا، رشتہ داروں نے سمجھایا

وہ برابری نافرمانی کر رہا ہے اور اس کی شادی میں جو خرچ ہوا سسرال والوں کا وہ باپ پر دباؤ ڈالتا ہے اور نوٹس بھجواتا ہے اور خود شراب پیتا ہے اور کافی بینک کا روپیہ قرض ہے اور باپ کی جتنی بھی جائیداد ہے اس جائیداد میں بڑے لڑکے کا نام اور ایک چھوٹے لڑکے کا نام پڑا ہوا ہے اور بڑے لڑکے نے دھوکہ دے کر ماں باپ کے کاغذوں پر دستخط کرا کے بینک سے قرض لیا، اب اس صورت میں بڑے لڑکے نے کروڑوں روپئے برباد کئے، اب بینک کا قرض بڑا لڑکا دینے کا حق دار ہوگا یا باپ ہوگا؟ اور جتنی بھی جائیداد ہے وہ سب باپ نے کما کر بنائی اور صرف بڑے لڑکے کا نام اور چھوٹے لڑکے کا نام ڈلوا دیا، اپنی جائیداد میں اور وہ قرض ادا کرنے سے انکار کر رہا ہے، تو اس صورت میں جو اس کا نام باپ کی جائیداد میں پڑا ہوا ہے تو کیا وہ جائیداد شرعی طور پر بڑے لڑکے کی ہوگی یا باپ کی ہوگی؟ اور قرض بینک کا لڑکا ادا کرے اپنے حصہ سے یا باپ؟ اور ابھی دو لڑکوں کی شادی باقی ہے، پوری باپ کی جائیداد میں نام دو لڑکوں کا پڑ جانے سے رجسٹری میں تو کیا اس صورت میں شرعی طور پر دونوں لڑکے مالک ہوں گے؟ یا پوری جائیداد باپ کی ہوگی؟ اور بڑا لڑکا شوروم پر قبضہ کئے ہوئے ہے اور ایک مکان پر قبضہ کئے ہوئے ہے، جب کہ شوروم میں دو بھائیوں کا نام ہے اور مکان میں باپ کا نام اور ماں کا نام ہے، اور ماں بہت بیمار رہتی ہے، حال تک نہیں پوچھتا ہے، کافی ماں باپ کو دکھ ہے، تو ایسی صورت میں باپ چاہتا ہے کہ میری دنیا وآخرت میں کوئی پکڑ نہ ہو تو شریعت کی روشنی میں مسئلہ کی واضح طور پر وضاحت کر دی جائے شکر گزار رہوں گا۔

المستفتی: محمد اسلام ولد علی احمد مرحوم

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: جب تک باپ باحیات ہے، پوری جائیداد کا مالک تن تنہا باپ ہی ہے، محض نام کر دینے کی وجہ سے بڑا لڑکا اور چھوٹا لڑکا اس کی جائیداد کے مالک نہیں ہوتے، باپ پر لازم ہے کہ سبھی اولاد کے ساتھ برابری کا معاملہ کرے، ورنہ عنداللہ سخت گنہگار ہوگا اور بڑے لڑکے نے جو شوروم اور گھر پر قبضہ جما رکھا ہے، وہ شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔ احادیث مبارکہ میں اس پر سخت وعید آئی ہے۔ اور بڑے لڑکے نے دھوکہ دے

کر باپ کے دستخط سے بینک سے جو قرض اٹھایا ہے اس کی ادائے گی بھی اسی پر واجب ہے نہ کہ باپ پر، آخر باپ اتنا غافل کیوں ہے کہ اس کے دستخط کی وجہ سے کروڑوں روپئے کی بربادی ہورہی ہے؟

وبيع التلجئة هي ما ألجئ إليه الإنسان بغير اختياره، وذلك أن يخاف الرجل السلطان، فيقول لآخر: أني أظهر أني بعت داري منك، وليس ببيع في الحقيقة، وإنما هو تلجئة. (شامي، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في بيع التلجئة، زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، معجم لغة الفقهاء، كراچی، ص: ١١٣، قواعد الفقه أشرفي ٢١٣، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهية، دارالفضيلة ١/ ٤٠٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٦٢، الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنيشنل ديوبند ٤/ ١٢٧-١٢٨، دارالفكر ٥/ ٣٣٢٥، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣٨٩، كراچی ٥/ ١٧٦، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢، هندية زكريا قديم ٣/ ٢٠٩، جديد ٣/ ١٩٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰؍شوال ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۲۷۲/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۱۰/۳۰ھ

محض نام کرنے سے ملکیت کا حکم

سوال [۸۷۷۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری والدہ کلثوم بیگم کو میری دادی موتی بیگم نے بوقت میری والدہ کے نکاح کے اپنے مکان کو ۳؍سہام پر تقسیم کیا، جو کہ کل مکان ۲۰۰؍میٹر کا ہے، ۳؍سہام میں سے ایک سہام میری والدہ کے مہروں میں لکھ دیا، کلثوم بیگم کے چار لڑکے عبدالودود خان، عبدالمعبود، عبدالرؤف، عبدالشہود خان۔ اور ایک لڑکی مشہودی بیگم ہوئی میرے بھائی عبدالرؤف کی شادی کے موقع پر وہ ایک سہام میری والدہ نے عبدالرؤف کی بیوی کے دین مہر میں لکھا اور

زبانی انہوں نے بتلایا کہ اس کی ملکیت سب بچوں کی ہے جو حصہ عبدالرؤف خان کا اس میں نکلتا ہے وہی ان کی بیوی کے دین مہر میں منتقل ہوگا اور باقی اور بچے حصہ رسد کے مالک ہوں گے؛ کیوں کہ اس وقت کوئی تقسیم نامہ نہیں ہوا تھا، اب میری والدہ کا انتقال ہوگیا، عبدالرؤف خان اس حصہ کو اپنا پورا بتلاتے ہیں؛ کیوں کہ میری والدہ نے دین مہروں میں کیا ہے؟ شریعت کی رو سے اور بہن بھائی اس سہام میں سے حق دار ہوتے ہیں یا نہیں؟

المستفتی: عبدالودود فیض گنج مشرق مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اگر آپ کی والدہ نے صراحت کے ساتھ یہ بات کہہ دی ہے کہ نام تو پورے سہام کو کیا جا رہا ہے، مگر اس میں سے عبدالرؤف خان کی بیوی دین مہر میں صرف عبدالرؤف کے حصہ کے بقدر کی مالک ہوسکتی ہے، گویا دین مہر میں صرف عبدالرؤف خان کے حصہ کے بقدر شامل ہوسکتا ہے، بقیہ دیگر اولاد کو اپنے اپنے حصہ کے بقدر ملے گا۔ اور یہ بات آپ کی والدہ نے شرعی گواہوں کے سامنے کہی ہے۔ اور گواہوں سے والدہ کی یہ بات ثابت ہوئی ہے تو محض نام کر دینے سے رؤف خان کی بیوی پورے کی مالک نہ ہوگی؛ بلکہ اس میں سب وارثین کا حق ہوگا اور یہ عقد تلجئہ کے مرادف ہوگا۔

وبيع التلجئة وهو أن يظهر عقدا وهما لا يريدانه يلجأ إليه، وتحته في الشامية: وليس ببيع في الحقيقة، وإنما هو تلجئة ويشهد على ذلك.

(درمختار مع الشامي، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في بيع التلجئة، زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، هندية زكريا قديم ٣/ ٢٠٩، جديد ٣/ ١٩٦، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣٨٩، كراچی ٥/ ١٧٦ قواعد الفقه أشرفي ٢١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/۲/۱۴۱۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۹/ ۲۳۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۲/۱۴۱۴ھ

جائیداد نام کرنے سے ملکیت کا حکم

سوال [۹۸۷۷]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کا انتقال ہوگیا ورثاء میں پانچ لڑکے اور دولڑکیاں ہیں، میت نے متفرق جائیدادیں چھوڑیں، ایک جائیداد کی رجسٹری میں سب کا نام ہے، حتی کہ لڑکیوں کا بھی بھائیوں کے برابر حصہ ہے، دوسری جائیداد میں بعض لڑکوں کا نام ہے، لڑکیوں کا نہیں، اسی طرح تیسری اور چوتھی جائیداد میں بھی بعض کا نام ہے، بعض کا نہیں، رجسٹری میں لڑکیوں کا نام نہ لکھنے کی بابت جب میت سے پوچھا گیا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ لڑکیوں کے پاس سسرالی جائیداد کافی ہے؛ اس لئے انہیں ضرورت نہیں۔ واضح رہے کہ یہ تقسیم محض کاغذی تھی، میت کی وفات سے قبل اولاد کا نہ تو اس پر کسی طرح کا قبضہ تھا اور نہ ہی ان کو کسی تصرف کا اختیار تھا، خرید وفروخت اور دیگر تمام امور میں میت خود مختار تھا، اب سوال یہ ہے کہ یہ ہبہ تام ہوا یانہیں؟ اور مورث کی وفات کے بعد جائیداد کی تقسیم رجسٹری میں لکھائے گئے ناموں کے اعتبار سے ہوگی یا شرعی حصوں کے مطابق؟

المستفتی: محمد نصیر الدین، متعلم دار العلوم دیوبند

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جائیداد کے اولاد کے نام کردینے کے بارے میں اولا دو شکلیں ہیں: (۱) جائیداد خریدی جارہی ہے اور خریدتے وقت اولادوں میں سے بعض یا کل کے نام سے خریدی جائے اور اس وجہ سے اولاد کے نام سے خریدی جارہی ہے تاکہ قانونی پیچیدگیوں سے حفاظت ہو اور مقصد یہ نہیں ہے کہ اولاد کی ملکیت میں دے دی جائے، اس کو بیع تلجئہ کہا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں نام کردینے کے باوجود اولاد مالک نہیں ہوتی؛ بلکہ مالک خریدنے والے ماں باپ ہی ہوتے ہیں، جیسا کہ درمختار، شامی، مجمع الانہر وغیرہ کی عبارات اس سلسلہ میں واضح ہیں۔ اور اگر خریدتے وقت قانونی پیچیدگیوں سے حفاظت

مقصد نہیں ہے؛ بلکہ انہیں اولادوں کی ملکیت میں دینے کے واسطے انہیں کے نام سے خریدی جارہی ہے، تو یہ بیع تلجیہ کے دائرہ میں داخل نہیں ہے؛ بلکہ اس مقصد سے خرید کر نام کردینے کی صورت میں اولادان جائیدادوں کی مالک ہوجاتی ہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ جائیداد پہلے ہی سے باپ یاماں کی ملکیت میں ہوتی ہے اور ماں باپ یہی چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی ہی میں اولاد کے نام منتقل کرکے ان کو مالک بنادیں، اگر اس مقصد کے لئے اولاد کے نام رجسٹری کردی گئی ہے، تو ایسی صورت میں اولاد کے نام رجسٹری کرکے قانونی قبضہ سے دستبردار ہوجانے سے اولاد مالک ہوجاتی ہے اور اولاد کے حق میں قانونی قبضہ حاصل ہوجاتا ہے اور ملک تام حاصل ہونے کے لئے قانونی قبضہ کافی ہے۔اور جائیداداور عقار ہونے کی وجہ سے قبضہ حقیقی لازم نہیں، قبضہ حکمی کافی ہے۔اورقانونی قبضہ قبضہ حکمی ہے اورقانونی قبضہ کے بعد شخص آخر رکاوٹ نہیں بن سکتا، یہی فقہاء کا بنیادی نقطہ ہے۔

ثم لا خلاف بين أصحابنا في أن أصل القبض يحصل بالتخلية في سائر الأموال. (بدائع الصنائع، كتاب البيوع، تفسير التسليم والقبض، زكريا ٤/ ٤٩٨، كراچی ٥/ ٢٤٤)

اتفق الفقهاء على أن قبض العقار يكون بالتخلية والتمكين من اليد والتصرف، فإن لم يتمكن منه بأن منعه شخص آخر من وضع يده عليه، فلا يعتبر التخلية قبضا، كما اشترط الحنفية أن يكون العقار قريبا، فإن كان بعيدا فلا تعتبر التخلية قبضا، وهو رأى الصاحبين؟ وظاهر الرواية والمعتمد في المذهب خلافا لأبي حنيفة. (الموسوعة الفقهية ٣٢/ ٢٥٩)

ولو باع ضيعة في الصحراء وسلمها إليه، فإن كانت قريبة عنه بحيث يتصور فيه القبض الحقيقي في الحال يكون قبضا وإلا فلا، والناس عنه غافلون، وهو الصحيح، وظاهر الرواية. (الحموي على الأشباه كراچی ١/ ٣٢٧)

اس کے بعد اولاد کا باپ کی سرپرستی میں رہنا اور باپ کے حکم کے ماتحت میں چلنا اور باپ کا

اپنے اختیارات چلاتے رہنا اور اولاد کا اس پر اعتراض نہ کرنا محض از قبیل تعظیم ہے، از قبیل تملیک نہیں ہے۔ اور اسی کا عرف اور تعامل جاری ہے، نیز اگر باپ اولاد کے اختیار کے بغیر رجسٹری شدہ جائیداد کو اپنے نام کرانا چاہے تو قانوناً نہیں کراسکتا، پورا اختیار اولاد کو حاصل ہوجاتا ہے۔ سوال نامہ میں جن جائیدادوں کے اولادوں کے نام رجسٹری کردینے کا ذکر ہے، وہ از قبیل بیع تلجئہ نہیں ہے؛ بلکہ از قبیل تملیک رجسٹری ہے، اس کی دلیل خود سوال نامہ میں موجود ہے کہ جب میت سے لڑکیوں کے نام نہ لکھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا تھا کہ لڑکیوں کے پاس سسرالی جائیداد کافی ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مذکورہ رجسٹری از قبیل تلجئہ نہیں ہے؛ بلکہ از قبیل تملیک ہے، ہاں البتہ یہ بات دوسری ہے کہ باپ نے اولاد کے ساتھ یکسانیت کا معاملہ نہیں کیا، بعض کو دیا اور بعض کو نہیں دیا، اسکی وجہ سے باپ گنہگار ہوگا؛ لیکن باپ کی طرف سے تملیک صحیح ہوگئی؛ لہٰذا مرحوم کی وفات کے بعد جو جائیداد جس کے نام سے رجسٹری کی گئی ہے، وہی اس کا مالک ہوگا، اس کے بعد مابقیہ جائیداد اور ترکہ تمام شرعی ورثاء کے درمیان حصص شرعی کے اعتبار سے تقسیم ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۶ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۱۹۲/۳۸)

اولاد کے نام جائیداد خریدنے کا حکم

سوال [۸۷۸۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک صاحب جن کے ایک بیوی سے چار لڑکے ہیں، جن کی عمر گذشتہ وقت میں سات برس سے لے کر بارہ برس کی تھی، ان کے والد نے ایک پلاٹ قریب دس بیگہ کا دہلی روڈ پر ان چاروں کے نام سے خریدا، اس پلاٹ کو خرید کئے ہوئے تقریباً ۲۵ ر سال ہوگئے، ان کے والد نے اپنے دوسرے لڑکوں کے نام سے بھی جائیداد کی خرید وفروخت کی اور اب بھی

کرتے رہتے ہیں، اس پلاٹ کو قریب پانچ سال قبل ایم ڈی اے نے قبضہ میں لے لیا، ایم ڈی اے سے ان کے والد نے مقدمہ بازی اپنے خرچ سے کی، جس میں تقریباً تین لاکھ روپئے خرچ ہوئے، اس پلاٹ کی دیکھ بھال والد کے ذمہ تھی اوراس کی کاشت وغیرہ کی جو کچھ بھی آمدنی آتی تھی وہ والد کے پاس ہی آتی تھی۔ اور یہ پلاٹ بھی والد ہی کے قبضہ ودخل میں تھا، ان چاروں لڑکوں کی پرورش تعلیم وتربیت والد ہی نے کی ہے، ان لوگوں کی شادی بیاہ بھی والد نے اپنے خرچ سے کی ہیں، اب چاروں بیوی بچے والے ہیں، کچھ عرصہ قبل ان کے والد نے ان چاروں کو دولاکھ روپئے فی کس یہ کہہ کر دئے کہ تم لوگ میری مرضی وکہنے پر عمل نہیں کرتے ہو اور ہر بات میں اپنی من مانی کرتے ہو؛ لہٰذا ان روپئے سے جو بھی کاروبار تم لوگ اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہو کرلو۔

ایم ڈی اے سے مقدمہ بازی تقریباً چار سال رہی اور بالآخر ایم ڈی اے پر بہتر لاکھ روپئے کی ڈگری ہوئی ایم ڈی نے اس ڈگری کے خلاف ہائی کورٹ الہ آباد میں اپیل کردی جو کہ چل رہی ہے، اس کی پیروی وخرچ وغیرہ ان لوگوں کے والد ہی کررہے ہیں، ان چاروں کو اس کا پتہ نہ پہلے معلوم تھا اور نہ اب ہے، اب والد نے حتی الامکان کوشش کرکے ساڑھے سترہ لاکھ روپئے ایم ڈی سے جمع کرادیا اور واؤچر بنوا کر بڑے لڑکے کو دلوادیا، روپئے ملتے ہی ان چاروں لڑکوں نے آپس میں سازباز کی کہ کسی طرح سے یہ روپئے والد کو نہ دے کر خود ہڑپ کرلئے جائیں؛ لہٰذا ان چاروں نے اپنے بیوی بچوں کو بھی شامل کرکے یہ پلان بنایا کہ آپس میں جھگڑے کا ناٹک کیا جائے، بہرحال جب ان کے والد آفس سے فارغ ہوکر اپنے کمرے میں آئے تو یہ چاروں معہ اپنی بیوی بچوں کے پلان کے مطابق کمرے میں آئے اور آتے ہی جھگڑا شروع کردیا، جب ان کے والد نے ان کو خاموش کرکے یہ معلوم کیا کہ کیا معاملہ ہے؟ تم لوگ آپس میں جھگڑا کس بات پر کررہے ہو؟ تو تین لڑکوں نے کہا کہ یہ ہمارا بڑا بھائی ہم کو ہمارے روپئے نہیں دیتا، ہم اس کو مار ڈالیں گے، والد نے اس پر سوچا کہ روپئے ان کے قبضہ میں ہیں اور یہ لوگ بدنیت ہوگئے ہیں، پھر بھی والد نے ان تینوں سے کہا کہ تم کو اور تمہارے

بڑے بھائی کو روپئے سے کیا مطلب؟ یہ روپئے تو میرے ہیں تمہارے پاس امانت میری ہے اور مجھے یہ روپئے تم کو دینا چاہئے، والد نے یہ بھی کہا کہ میرے دیگر دوسرے لڑکے ہیں ان کے نام سے بھی خرید وفروخت میں کرتا ہوں، جب بھی کسی پلاٹ وغیرہ کی رقم آتی ہے تو وہ لڑکے یہی کہتے ہیں کہ یہ زمین آپ نے ہی خریدی ہے، اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ رقم بھی میرے ہی پاس رہتی ہے، لڑکے نہیں لیتے۔

(۲) آپ سے درخواست ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ صادر فرمائیں کہ یہ روپئے جو ان چاروں لڑکوں نے بدنیتی سے ہڑپ کئے ہیں، اگر یہ واپس نہیں کرتے ہیں، تو قیامت کے دن یہ لوگ عذاب کے حق دار ہوں گے یا نہیں؟ جب کہ اس پلاٹ کی خریداری میں ان کا ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔

المستفتی: اختر جہاں گلشہید مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: خط کشیدہ عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ والد نے مذکورہ جائیداد سوال نامہ میں ذکر کردہ لڑکوں کے نام سے تو خریدی ہے، مگر ان کو باقاعدہ قبضہ دے کر مالک نہیں بنایا، جیسا کہ والد کا اس کی دیکھ بھال اور مقدمہ کے سلسلہ میں بھاگ دوڑ اور اس کے اخراجات وغیرہ خود اپنی طرف سے کرنے سے صاف واضح ہو رہا ہے، اور اس طرح پر کسی کے نام سے خریدنے کو شریعت میں بیع التلجئہ کہا جاتا ہے۔ اور اس طریقہ پر خریداری میں جن کے نام سے خریدا جاتا ہے وہ شرعی طور پر مالک نہیں ہوتے؛ بلکہ مالک وہی ہوتا ہے جو از خود خریدتا ہے؛ اس لئے مذکورہ جائیداد شرعی طور پر والد ہی کی ملکیت میں داخل ہے، جن لڑکوں کے نام سے خریدی ہے وہ اس جائیداد اور اس کی قیمت کے مالک نہیں ہیں؛ لہٰذا ایم ڈی اے کی طرف سے جو رقم ملی ہے اور جو کچھ آئندہ ملنے والی ہے وہ سب کی سب والد ہی کی ملکیت ہے، ان میں مذکورہ لڑکوں کا شرعی طور پر کوئی حق نہیں ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/۳۶)

وبيع التلجئة ويأتي متنا في الإقرار، وهو أن يظهر عقدا وهما

لایریدانه یلجأ إلیه لخوف عدو، وهو لیس ببیع في الحقیقة، بل کالهزل .
(الدرالمختار مع الرد، کتاب البیوع، باب المصرف، مطلب في بیع التلئجة زکریا ۷/ ۵٤۲، کراچی ٥/ ۲۷۳، هندیة زکریا قدیم ۳/ ۳۰۹، جدید ۳/ ۱۹٦، المبسوط للسرخسي، دارالکتب العلمیة بیروت ۲٤/ ۱۲۲، بدائع الصنائع زکریا ٤/ ۳۸۹، کراچی ٥/ ۱۷٦، الفقه الإسلامي وأدلته، هدی انٹرنیشنل دیوبند ٤/ ۱۲۷-۱۲۸، دارالفکر ٥/ ۳۳۲٥، الموسوعة الفقهیة الکویتیة ۹/ ٦۲، قواعد الفقه أشرفي، ص: ۲۱۳، معجم لغة الفقهاء، کراچی، ص: ۱۱۳، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهیة، دارالفضیلة ۱/ ٤۰٥)

اوراگر مذکورہ لڑکے حیلہ بازی کرکے یاوالدکوایذااورتکلیف پہنچاکران رقوم میں سےکوئی بھی رقم ہڑپ کرلیں گے، تو وہ سب لڑکے عند اللہ سخت گنہگار رہوں گے اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب کے مستحق ہوں گے۔ اور بہت ممکن ہے کہ دنیا میں بھی تنگدستی کی سزا بھگتنی پڑے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی والد کی رضا مندی میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی والدکی ناراضگی پر ہے۔

قال رسول اللہ ﷺ: رضی الرب في رضی الوالد، وسخط الرب في سخط والد. الحدیث. (ترمذي شریف ۲/ ۱۲)

ایک ضروری نوٹ:- اسی مسئلہ کے بارے میں ہمارے دارالافتاء سے۹/ رمضان المبارک ۱۴۱۵ھ کومہتاب عالم، خورشید عالم، آفتاب عالم، منظور عالم کے نام سے جو جواب حاصل کیا گیا ہے وہ اس قید سے مقید ہے کہ اگر باپ نے لڑکوں کو قبضہ دےکر مالک بنا دیا ہے، تب لڑکے مالک ہیں، اب اس سوال سے معلوم ہوا کہ واقعہ اس کے برعکس اور برخلاف ہے؛ اس لئے آج کا لکھا ہوا جواب ہی قابل عمل ہے۔ نیز ۱۹/ رمضان کا لکھا ہوا جواب اور اس کی وضاحت بھی ساتھ میں منسلک ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/۱۰/۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/۶ ۴۱۷۷)

لڑکوں کے نام سے جائیداد خریدی تو وہ کس کی ملک ہوگی؟

سوال [۸۷۸۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عرصہ سے زید ایک کرایہ کے مکان میں رہتا تھا، مکان مالک نے اس سے مکان خالی کرنے کو کہا، تو یہ بات طے ہوئی کہ یا تو آپ ۵۰۰۰۰/روپئے دے دیں یا لے لیں، طے یہ ہوا کہ مکان مالک مذکورہ رقم دے کر کرایہ دار کو مکان فروخت کرنے پر راضی ہوگیا، کرایہ دار کے پاس ادا کرنے کے لئے پیسہ نہیں تھے؛ اس لئے اس مقبوضہ مکان میں سے کچھ زمین فروخت کر کے چالیس ہزار روپئے دے دیئے اور دس ہزار روپئے زید کے دولڑکوں نے ادا کئے اور مکان زید کے دولڑکوں کے نام رجسٹری ہوگیا۔ دریافت طلب یہ امر ہے کہ باقی بھائی بہنوں اور زید کی بقیہ اولاد کو اس مکان میں سے حصہ ملے گا یا نہیں؟۔

المستفتی: صادق حسین منصوری، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مذکورہ جائیداد خریدتے وقت جن لڑکوں نے دس ہزار روپئے ادا کئے ہیں وہ زید ہی کے ساتھ اس کی فیملی میں رہ چکے ہیں، تو صرف نام کردینے سے ملکیت ان لڑکوں کی ثابت نہ ہوگی؛ بلکہ پوری ملکیت شرعاً زید کو حاصل ہوگی اور زید کے مرنے کے بعد زید کے تمام ورثاء اس میں شرعی حصوں کے حق دار ہوں گے۔

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء، فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت فهو بينهما بالسوية، زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥، تنقيح الفتاوى الحامدية ٢/ ١٨)

نیز کسی مصلحت سے اولاد میں سے کسی کے نام کردینے سے جس کے نام کیا جائے وہ مالک

نہیں ہوتا ہے، نیز اگر روپئے دینے والے لڑکے باپ سے الگ تھے تب بھی ان لڑکوں کے لئے ملکیت ثابت نہ ہوگی؛ بلکہ دس ہزار قرض باپ پر اور باپ کی موت کے بعد ورثاء پر ثابت ہوسکتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی زکریا ۳/۳۸۰)

وبيع التلجئة ويأتى متنا في الإقرار، وهو أن يظهر عقدا وهما لا يريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل .

(الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في بيع التلئجة زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچى ٥/ ٢٧٣، هندية زكريا قديم ٣/ ٢٠٩، جديد ٣/ ١٩٦، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹؍ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/۳۱۵۰)

خوف کے سبب عارضی طور پر کسی کے نام جائیداد

سوال [۸۷۸۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک جائیداد رہائش پذیر اب ۲۹؍سال قبل کسی مصلحت کی بنا پر (یعنی والد صاحب بہت زیادہ مقروض ہوگئے تھے، جائیداد پر حملہ ہونے کا خطرہ تھا؛ اس لئے چچا کے نام ۲-۳سال کے لئے کردی تھی، میرے والد حاجی مشیت اللہ مرحوم نے اپنے حقیقی بھائی شمس الدین مرحوم کے نام بیچ کر کے رجسٹری کردی تھی اور زبانی طے تھا کہ ۲-۳سال کے بعد واپس کرنی ہوگی، دونوں فریق اقراری تھے، ۲-۳سال گذر جانے پر قول وقرار کے مطابق میرے والد صاحب نے اپنی مملوکہ جائیداد واپس لینے کی مانگ کی، چچا نے واپس کرنے سے صاف انکار کردیا۔ ۱۹۶۵ء میں میرے والد مرحوم حاجی مشیت اللہ صاحب کا انتقال ہوگیا، ہم پانچ بھائی چار بہنیں ہیں، سب کے سب شادی شدہ اور حیات ہیں، والد صاحب کے زمانہ سے

اسی آراضی میں مقیم ہیں اور قابض ہیں، نام اس طرح ہیں: انوری بیگم، عبدالوحید، عبدالباری، عبدالسلام، شرافت جہاں بیگم، ریاست علی، عابدہ شاہین، زاہدہ شاہین، خورشید عالم۔
نوٹ:- عبدالوحید الگ مکان میں کرایہ پر رہتے ہیں، ایک بھائی ریاست علی لاہور منتقل ہوگئے ہیں، تین بھائی عبدالباری، عبدالسلام، خورشید عالم اسی مکان میں مقیم ہیں۔کل آراضی ۴۱۸ مربع گز ہے، نصف حصہ پر تین منزلہ عمارت ہے اور نصف حصہ میں کھپریل ۷۱ء میں ہم بھائیوں کے بہت زیادہ اصرار پر میرے چچا شمس الدین نے اپنی اولاد کے لئے ۱۳۷ مربع گز روک کر بقیہ حصہ ۲۸۱ مربع گز کی ہم تین بھائیوں کے نام وصیت نامہ اور رجسٹری کردی ہے، ۸۰ء میں چچا محترم شمس الدین صاحب کا بھی انتقال ہوگیا ہے۔
الف: اس عمارت میں شرعاً بہن بھائیوں کا حق نکلتا ہے یا نہیں؟ اگر حق نکلتا ہے تو کتنا؟
ب: قانونی طور پر وصیت نامہ کے مطابق ہم تین بھائی عبدالباری، عبدالسلام، خورشید عالم مالک بنتے ہیں، تو ہم بھائیوں میں کس طرح تقسیم ہوگی؟

المستفتی: منجانب خورشید عالم، حاجی مشیت اللہ مرحوم، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ کے والد مرحوم نے دشمن سے حفاظت ہی کی غرض سے چھوٹے بھائی شمس الدین کے نام کردی تھی، تو شمس الدین اس کا مالک نہیں ہوا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۷-۳۸)

بيع التلجئة: البيع الصوري، أن يضطر لإظهار عقد وإبطان غيره مع إرادة ذلک الباطن، كأن يظهر بيع داره لابنه لئلا يستولى عليها السلطان.

(معجم لغة الفقهاء، كراچی، ص: ۱۱۳)

بيع التلجئة: هو العقد الذى يباشره إنسان عن ضرورة ويصير كالمدفوع إليه، صورته: أن يقول الرجل لغيره: أبيع داري منک بكذا في الظاهر ولا يكون بيعا في الحقيقة، ويشهد على ذلک وهو

نوع من الهزل. (قواعد الفقه، أشرفي ص: ٢١٣، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهية، دارالفضيلة بيروت ١/ ٤٠٥)

لہٰذا وہ حاجی مشیت اللہ کی ملکیت ہے، ان کے مرنے کے بعد ان کی اولاد اس کی حق دار ہوگی، صرف تین بھائیوں کے متعلق وصیت نامہ اس لئے صحیح نہیں ہے کہ شمس الدین خود مالک نہیں ہے؛ بلکہ مشیت اللہ مرحوم کی سب اولاد باپ کی پوری ملکیت میں برابر کی شریک ہوں گی۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۵/ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۳۹۰)

غلطی سے دوسرے کے نام رجسٹری ہونے سے ملکیت کا حکم

سوال [۸۷۸۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک باغ کی زمین تقریباً آٹھ آدمیوں کے درمیان مشترک تھی، جن کے نام یہ ہیں: (۱) شہاب الدین (۲) الحسن (۳) ابن حسن (۴) شفیق (۵) مستا (۶) اسرار دو کا نام مجھے فی الوقت یاد نہیں ہے؛ لیکن غلطی سے مذکورہ زمین رجسٹری دوسرے آٹھ آدمیوں کے نام ہوگئی، جن کے نام یہ ہیں: (۱) ہادیہ (۲) حسن (۳) شہادت (۴) صابر (۵) نایاب (۶) اسد۔ ان میں سے بھی دو نام یاد نہیں ہیں، پھر دونوں فریق کے درمیان لگ بھگ ۲۵/ سال سے مقدمہ چل رہا ہے، آخر میں وہ لوگ مقدمہ جیت گئے، جن کے نام غلطی سے رجسٹری ہوگئی تھی، اور جو لوگ اصل مالک تھے وہ ہار گئے، اس کے بعد اصل مالکوں میں سے دو شخص: (۱) الحسن (۲) شفیق اور دو نئے آدمی: (۱) منا (۲) شمر جھیل نے مل کر مذکورہ زمین ان شرکاء سے خریدی جن کے نام غلطی سے رجسٹری ہوگئی تھی؛ البتہ ان میں سے شہادت نے اپنے حصہ کی زمین فروخت نہ کی؛ بلکہ اپنے حصہ پر قابض رہے، مذکورہ مسئلہ کا قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

نوٹ:- مذکورہ زمین جب مؤخرالذکر چار شخصوں: (۱)الحسن (۲)شفیق (۳)منا (۴)ثمر جمیل نے خریدی،تو بقیہ اصل مالک کو اس معاملہ میں آگاہ کئے بغیر خریدی۔

المستفتی: محمد آصف،ممتاز،آفتاب ہائی وے علی گڑھ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اول الذکر آٹھ افراد کی زمین اگر غلطی سے مؤخرالذکر آٹھ افراد کے نام رجسٹری ہوگئی ہے،تو مؤخرالذکر آٹھ افراد شرعاً مذکورہ زمین کے ہرگز مالک نہیں بن سکتے ہیں، وہ زمین شرعاً اول الذکر آٹھ افراد کی ہے،ان کی ملکیت سے وہ زمین نہیں نکلی ،اگر مقدمہ مؤخرالذکر آٹھ افراد نے جیت لیا تو ان پر واجب ہے کہ جن کی زمین ہے ان کو واپس کردیں۔

عن أبي حميد الساعدي، أن رسول الله ﷺ قال: لا يحل لامرئ أن يأخذ مال أخيه بغير حقه، وذلك لما حرم الله مال المسلم على المسلم.

(مسند أحمد بن حنبل ٥/ ٤٢٥، رقم: ٢٤٠٠٣)

لا يجوز لأحد أن يأخذ مال أحد بلا سبب شرعي. (قواعد الفقه، أشرفي، ص: ١١٠، رقم: ٢٦٩، هندية زكريا قديم ٢/ ١٦٧، جديد ٢/ ١٨١، الموسوعة الفقهية الكويتية ٢١/ ١١٢، ٢٨/ ٢٦٤، ٣٧/ ٣٥٤)

اور مؤخرالذکر افراد کے مقدمہ جیتنے کی بناپر مذکورہ زمین فروخت کرنا ہرگز درست نہیں ہے۔ اور نئے جن دو افراد نے زمین خریدی ہے،ان پر پورا کا پورا واپس کردینا واجب ہے۔اور اصل مالکوں میں سے جن دو افراد نے خریدی ہے،ان پر اپنے حصہ کے بقدر قبضہ کر کے بقیہ واپس کردینا واجب ہے۔ نیز اپنے حصہ کی رقم واپس لینا بھی ان کا حق ہے،اسی طرح نئے دونوں افراد کے لئے زمین واپس کرتے ہوئے اپنی رقم واپس لینے کا حق ہے۔نیز شہادت پر بھی قبضہ شدہ زمین اصل مالکان کو واپس کردینا لازم ہے۔

لا يجوز لأحد أن يتصرف في ملك الغير بغير إذنه. (قواعد الفقه،

أشرفي، ص: ۱۱۰، رقم: ۲۷۰، شرح المجلة رستم، اتحاد ۱/ ۶۲، رقم المادة: ۹۷)

نیز مؤخرالذکر پر مذکورہ زمین کی رقم استعمال کرنا شرعاً حرام ہے۔

صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق، فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد، كالبيوع الفاسدة -إلى- أو بغير عقد، كالسرقة، والغصب، والخيانة، والغلول، ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليهم -إلى- ولكن إن أخذه من غير عقد ولم يملكه يجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك. (بذل المجهود، كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء، سهارنپور ۱/ ۳۷، دارالبشائر الإسلامية ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحديث: ۵۹، هندية زكريا قديم ۵/ ۳۴۹، جديد ۵/ ۴۰۴، تبيين الحقائق، مكتبة إمداديه ملتان ۶/ ۲۷، زكريا ۷/ ۶۰)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸؍شوال المکرم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۴۴۳/۲۵)

مصلحتاً بڑے لڑکے کے نام بیع نامہ کرانے سے ملکیت کا حکم

سوال [۸۷۸۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے مکان خریدا اور اپنے بڑے لڑکے کے نام کردیا اور اس کا بیع نامہ قانوناً کردیا، مگر زبانی بڑے لڑکے کو وصیت کردی کہ میرے مرنے کے بعد اپنے سب بھائی بہن کو حصہ دے دینا، اگر بڑا لڑکا باپ کے مرنے کے بعد اس زبانی وصیت سے منحرف ہوکر انکار کردے اور کہے کہ میرے باپ نے قانوناً مکان مجھے دیا ہے میں کسی کو نہیں دوں گا ایسی صورت میں شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟ اور بیٹی کا باپ کی جائیداد میں کتنا حصہ ہے؟

المستفتی: امینہ بیگم، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: قانوناً مصلحتاً بڑے لڑکے کے نام بیع نامہ کردینے کی وجہ سے بڑا لڑکا اس کا شرعاً مالک نہیں ہوا ہے؛ بلکہ اس میں حسب وصیت سب ورثاء حق دار ہوں گے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی زکریا ۳/ ۳۷)

وبيع التلجئة ويأتي متنا في الإقرار، وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل.

(الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب المصرف، مطلب في بيع التلجئة زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، قواعد الفقه أشرفي، ص: ٢١٣، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٦٢، هندية، زكريا قديم ٣/ ٢٠٩، جديد ٣/ ١٩٦)

نیز بیٹی کو بیٹے کے مقابلہ میں آدھا ملے گا۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ. [النساء: ١١] فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/ محرم ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۰۸۷)

انکم ٹیکس سے بچنے کی غرض سے کاروبار بیوی بچوں کے نام کرنے کا حکم

سوال [۸۷۸۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مستفتی کاروبار کا بانی بھی ہے اور اس نے جملہ بنیادی سرمایہ بھی لگایا ہے۔ اور ۱۹۴۷ء سے تا ایں یوم تقریباً پینتالیس سال تک مسلسل کاروبار میں مصروف کار بھی ہے اور شروع سے اخیر تک جملہ معاملات میں اس کی مرضی واختیار کو دخل بھی رہا ہے، سوائے مختصر اوقات کے جب کہ وہ اور اس کی زوجہ شدید طور سے علیل ہوگئے تھے، اس نے اپنا سارا وقت

کاروبار میں صرف کیا ہے اوراخراجات میں بھی اس نے اپنی ذات پر کوئی نمایاں رقم صرف نہیں کی ہے اور فرزندان میں سے کسی ایک فرد نے مسلسل محنت کے علاوہ ایک پیسہ سرمایہ کی شکل میں نہیں لگایا ہے، ایسی صورت میں مذکورہ بالا حالات کی بنا پر کاروبار متعلقہ کا مستفتی مالک ہے یا نہیں؟ جب کہ مستفتی نے اپنے پورے کاروبار کو اپنے چار فرزندان اور بیوی کے نام انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے کر دیا تھا۔

(۲) اگر دفعہ ایک کا جواب اثبات میں ہو تو فرزندان میں سے کوئی جو رقومات مذکورہ کاروبار سے بلا اجازت مستفتی نکال کر اپنے بچوں کے تصرف میں لے آیا ہے، اس کا یہ فعل جائز ہے یا ناجائز؟ اور وہ اس کی واپسی کا ذمہ دار ہے یا نہیں؟

(۳) اگر فرزندان میں سے کوئی فرزند کوئی شئ مثلاً گاڑی وغیرہ بلا اجازت مستفتی کاروبار مذکور کی منفعت سے حاصل کر کے اپنے استعمال میں لا رہا ہے اور اس کے استعمال میں کاروبار کی جو رقم صرف ہو رہی ہے، اس کا یہ فعل شرع کی روشنی میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟

(۴) فرزندان میں سے جس کے یا جن کے قبضہ میں یا تحویل میں کاروبار سے متعلق جو رقومات یا دیگر اشیاء کسی بھی شکل میں اور کسی بھی جگہ موجود ہیں، تو وہ شرعاً مستفتی کی امانت ہیں اور فرزند یا فرزندان متعلقہ اس کو بحیثیت امین مستفتی کے حق میں منتقل کرنے کے یا اس کو واپس کرنے کے ذمہ دار ہیں یا نہیں؟

(۵) علماء کی رائے میں جب فرزندان کے جملہ اخراجات ودیگر ضروریات بشمول شادیاں وغیرہ پر تصرف کی کفالت شروع سے اخیر تک کاروبار مذکور سے ہوتی رہی ہے، تو فرزندان میں سے کوئی حق المحنت کا بھی حق دار نہیں ہے، کیا علماء کی یہ رائے صحیح اور درست ہے؟

(۶) فرزندان اول ودوئم نے جو علیحدہ کاروبار اپنے یا اپنے بیٹوں کے نام سے بلا اجازت مستفتی کرایا ہے اور اس کے پس پشت مستفتی کے کاروبار مذکور کا سرمایہ ہے، وہ دونوں کاروبار اور اس سے جو منفعت حاصل ہوئی ہے وہ مستفتی کے کاروبار کا جزو متصور ہوگا یا نہیں؟ اور وہ جزو مستفتی کے حق میں منتقل یا اس کو ادا کرنے کے فرزندان متعلقہ یا اس کے بیٹے ذمہ دار ہیں یا نہیں؟

(۷) جیسا کہ دفعہ نمبر: ۵ میں عرض کیا گیا ہے، علماء کی رائے میں فرزندان حق المحنت کے بھی مستحق نہیں ہیں، تاہم اگر کسی زاویہ نظر سے مستفتی کے فرزندان بطور حق المحنت منفعت کے کسی جزو کے حق دار ہیں بھی تو فرزندان مذکور میں سے وہ صرف اس کاروبار کے منفعت کے کسی جزو کے حق دار ہیں، جس میں انہوں نے کام کیا ہے یا جملہ فرزندان مجموعی طور سے جملہ کاروبار کے نفع ونقصان کے حق دار یا ذمہ دار ہیں، ہر کاروبار کے نفع ونقصان کا حساب وکتاب علیحدہ علیحدہ مرتب ہوتا رہا ہے۔

(۸) زکوۃ کے سلسلہ میں فرزندان کی جانب سے مستفتی کی ہدایت پر عدم تعمیل کی صورت میں مستفتی شرعی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جائے گا یا نہیں؟

المستفتی: عین الحسن نمبر: ۳۰؍رانی لچھمی بائی مارگ الگن روڈ کانٹن منیٹ، کانپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر انکم ٹیکس سے حفاظت کی غرض سے مستفتی نے فرزندوں اور بیوی کے نام کاروبار کر دیا ہے اور پھر کاروبار کے جملہ معاملات میں سائل کی مرضی واختیار کا بھی دخل رہا ہے، تو ایسی شکل کو شریعت میں بیع تلجئہ کہا جاتا ہے۔ اور بیع تلجئہ میں جن لوگوں کے نام کیا جاتا ہے وہ لوگ شئ مبیع کے مالک نہیں ہوا کرتے ہیں؛ بلکہ شئ بحالہ اصل مالک کی ملکیت میں رہ جاتی ہے؛ اس لئے سوال نامہ کی درج شدہ شکل میں جمیع کاروبار کا مستفتی خود مالک ہے۔ اور فرزندان اور بیوی کی ملکیت میں کاروبار کا کوئی جزو داخل نہ ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۱)

وبيع التلجئة: وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل. (الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب المصرف، مطلب في بيع التلجئة زكريا ۷/ ۵٤۲، كراچی ۵/ ۲۷۳، هندية، زكريا قديم ۳/ ۲۰۹، جديد ۳/ ۱۹٦ ، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ۳۸۹، كراچی ۵/ ۱۷٦)

بيع التلجئة: البيع الصوري أن يضطر لإظهار عقد وإبطان غيره مع

إرادة ذلک الباطن کأن یظهر بیع داره لابنه لئلا یستولي علیها السلطان. (معجم لغة الفقهاء، کراچی ،ص: ۱۱۳، قواعد الفقه، أشرفي ۲۱۳، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهیة، دارالفضیلة ۱/ ۴۰۵)

اوراگر بالفرض کاروبار میں باپ کی محنت بہت کم شامل رہی ہے، یا بالکل نہیں رہی، مگر باپ کے زیر تحت کاروبار چل رہا ہے، تب بھی سارے کاروبار اور منافع کا تنہا باپ ہی مالک ہوگا۔

الأب وابنه یکتسبان في صنعة واحدة ولم یکن لهما شيء، فالکسب کله للأب إن کان الابن في عیاله؛ لکونه معینا له. (شامي، کتاب الشرکة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واکتسبا ولا یعلم التفاوت فهو بینهما بالسویة، زکریا ۶/ ۵۰۲، کراچی ۴/ ۳۲۵، تنقیح الفتاوی الحامدیة ۲/ ۱۸)

(۲) جب ایک ساتھ ایک فیملی میں مستفتی کے زیر تحت فرزندان رہے ہیں اور فرزندان اپنا وقت باپ کے کاروبار میں لگا رہے ہیں، تو اس درمیان میں سب کے اخراجات کا ذمہ دار مستفتی (باپ) ہی رہا ہے؛ لہٰذا اس دوران باپ نے ان کے بال بچوں کے کما حقہ اخراجات ادا نہیں کئے ہیں، تو بلا اجازت اپنے معیار زندگی کی ضرورت کے بقدر لے کر بال بچوں میں خرچ کرنا جائز تھا۔ حدیث میں اس کی اجازت آئی ہے:

عن عائشة –رضي الله عنه– قالت: دخلت هند بنت عتبة امرأة أبي سفیان –رضي الله عنه– علی رسول الله ﷺ، فقالت: یا رسول الله! إن أبا سفیان رجل شحیح، لا یعطیني من النفقة ما یکفیني، ویکفي بنيّ إلا ما أخذت من ماله بغیر علمه، فهل علي في ذلک من جناح، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: خذي من ماله بالمعروف ما یکفیک، ویکفي بنیک. (مسلم شریف، باب قضیة هند، النسخة الهندیة ۲/ ۷۵، بیت الأفکار، رقم: ۱۷۱۴)

(۳) مذکورہ کاروبار سے بلا اجازت جو گاڑی خریدی ہے شرعاً وہ گاڑی خریدنے والے کی ملکیت میں داخل نہ ہوگی؛ بلکہ مستفتی (باپ) ہی اس کا مالک ہوگا، جیسا کہ جواب نمبر:۱ کی عبارت نمبر:۲/ سے واضح ہوتا ہے۔

وبيـع التلـجئة : وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عـدو، وهـو ليـس ببيـع في الحقيقة، بل كالهزل . (الـدرالـمـختار مع الرد، كتاب البيـوع، بـاب الـمـصرف، مطلب في بيع التلئجة زكريا ۷/ ۵٤۲، كـراچی ۵/ ۲۷۳، هندية، زكريا قديم ۳/ ۳۰۹، جديد ۳/ ۱۹٦ ، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ۳۸۹، كراچی ۵/ ۱۷٦)

بيـع التلـجئة: البيع الصوري أن يضطر لإظهار عقد وإبطان غيره مع إرادة ذلک البـاطـن كأن يظهر بيع داره لابنه لئلا يستولي عليها السلطان.

(مـعـجم لغة الفقهاء، كراچی ،ص: ۱۱۳، قواعد الفقه، أشرفي ۲۱۳، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهية، دارالفضيلة ۱/ ٤۰۵)

(۴) جی ہاں یہ سب رقوم مستفتی کوواپس کردینا لازم ہے۔

(۵) جی ہاں علماء کی مذکورہ رائے درست اور صحیح ہے۔

(٦) فرزنداول ودوئم نے جوکاروبار اپنے اوراپنے فرزندوں کے نام سے الگ قائم کئے ہیں اوراس کا رأس المال اورسرمایہ پہلا کاروبار ہے،جس کا مالک مستفتی ہے،تو اس میں دو صورتیں سامنے آتی ہیں:

(۱)فرزندان دوئم نے یہ کاروبار باپ کی فیملی اور زیرتحت رہ کرقائم کیاہے،تو ایسی صورت میں ان کے قائم کردہ کاروبار بھی مستفتی ہی کی ملکیت میں ہوگا اوراس میں باپ کی وفات کے بعد تمام ورثاءحق دار ہوں گے۔

(۲) مذکورہ فرزندان نے باپ سے الگ ہوکرقائم کیا ہے،تو ایسی صورت میں قائم کردہ کاروبار کے مالک وہی فرزندان ہوں گے؛ البتہ اس میں مذکورہ فرزندوں نے باپ کے کاروبار سے جورأس المال اورسرمایہ لے کرلگایا ہے،اس کا تاوان ادا کرنا لازم ہوسکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

(۸) اگرسنین ماضیہ کی زکوۃ حساب لگا کرنہیں دی گئی ہے اوراس سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے، توتخمینہ لگا کر کچھ زائد دے دیں۔ (مستفاد: فتاوی دارالعلوم ٦/ ۱۴۸)

جب کاروبار میں مستفتی کا اختیار رہا ہے تو مستفتی پر لازم ہے کہ تمام مال میں سے تخمینہ لگا کر سنین ماضیہ کی لازم شدہ زکوۃ ادا کردے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ / جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۸/ ۳۱۹۸)

بیوی کے نام زمین کرانے سے ملکیت کا حکم

سوال [۸۷۸٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے اپنے لئے زمین خریدی اور اپنی ہی ملکیت کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی بیوی کے نام رجسٹری کرائی اور بعد رجسٹری کے بیوی اپنی ملکیت کو ثابت کرتی ہے، جب کہ شوہر انکار کرتا ہے، تو حکم شرع کیا ہے؟ آیا رجسٹری کو اصل ملک مانیں گے یا شوہر کی ملکیت مانیں گے کہ شوہر نے اپنے لئے ہی خریدا ہے؟ ایسی وضاحت مطلوب ہے جس سے یقین محکم حاصل ہو جائے۔

المستفتی: محمد عمران، کٹیہاری، بہار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس صورت میں جب کہ شوہر نے اپنے ہی پیسے سے اپنے لئے زمین خریدی ہے اور کسی مصلحت سے بیوی کے نام کرادی تو محض نام کرانے سے وہ زمین بیوی کی ملکیت نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ خریدی ہوئی چیز زمین شوہر ہی کی ملکیت ہوگی اور اس کو شریعت کی اصطلاح میں ''بیع التلجئہ'' کہا جاتا ہے؛ اس لئے کہ کسی کے نام محض رجسٹری کرا دینے سے وہ زمین اس کی نہیں ہو جاتی، جب تک کہ حقیقتاً اس کو مالک بنانے کی نیت سے اس کے قبضہ میں نہ دے دی جائے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳٦-۳۷، فتاوی محمودیہ قدیم ٦/ ۲۸۰، جدید اشرفیہ ۱٦/ ۳۹)

وبيع التلجئة : وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل . (الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب المصرف، مطلب في بيع التلئجة زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، هندية، زكريا قديم ٣/ ٣٠٩، جديد ٣/ ١٩٦ ، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٣٨٩، كراچی ٥/ ١٧٦، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢)

بيع التلجئة: هو العقد الذى يباشره إنسان عن ضرورة ويصير كالمدفوع إليه، صورته: أن يقول الرجل لغيره: أبيع داري منك بكذا في الظاهر ولا يكون بيعا في الحقيقة، ويشهد على ذلک وهو نوع من الهزل. (قواعد الفقه، أشرفي ص: ٢١٣، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهية، دارالفضيلة بيروت ١/ ٤٠٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ / جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۱۳۰)

بیوی بچوں کے نام بیع نامہ کرانے سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی

سوال [۸۷۸۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: حافظ عبدالحمید صاحب نے ایک بیع نامہ اپنے دو لڑکوں: عبدالباری (اس وقت عمر ۱۲/ سال) وعبدالہادی (اس وقت عمر ۲/ سال) کے نام کرایا تھا، جس کا پیسہ انہوں نے ہی دیا تھا، بعد میں ان کے مزید لڑکے پیدا ہوئے، شرعی طور پر وہ جائیداد جن کے نام ہے، ان کی مانی جاوے گی یا حافظ عبدالحمید (پدر جنہوں نے روپیہ خرچ کیا تھا) کی مانی جاوے گی؟ نیز حافظ عبدالحمید صاحب نے اپنے زمانہ حیات میں بھی کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ جائیداد میں نے عبدالباری یا عبدالہادی ہی کے لئے خریدی ہے اور نہ یہ کہا کہ یہ جائیداد میں انہیں کو دیتا

ہوں، یعنی ہبہ بھی نہیں کیا، نیز خریداری کے وقت جائیداد خام تھی، بعد میں کچھ جائیداد حافظ عبدالحمید ہی نے اپنے پیسے سے تعمیر کرائی اور کچھ جائیداد عبدالہادی ودیگرلڑکوں نے تعمیر کرائی اوراس میں تمام لڑکے سکونت پذیر رہے، عبدالباری صاحب نے دیگر مکان خرید کرتعمیر کرلیا اوروہ اسی میں سکونت رکھتے ہیں، اس خریدی ہوئی جائیداد سے سکونت ترک کردی، عبدالباری صاحب کا انتقال ہوگیا، ان کے بچے اس جائیداد میں سکونت پذیر ہیں، عبدالباری صاحب کا یہ کہنا ہے کہ یہ جائیداد ہمارے باپ نے اپنے پیسے سے خریدی تھی، ہم اس وقت نابالغ تھے، ہمارا کوئی پیسہ بھی والدصاحب کے پاس جمع نہیں تھا؛ اس لئے یہ جائیداد تمام بھائیوں کی ہے، عبدالہادی مرحوم نے یاان کے بچوں نے عبدالباری جیسے الفاظ کبھی نہ کہے، وہ اس معاملہ میں خاموش رہے، مکرر یہ ہے کہ حافظ عبدالحمید صاحب بھی اپنی حیات میں یہی کہتے رہے کہ یہ جائیداد میرے سب بچوں کی ہے۔

المستفتی: محمد یعقوب ومحمد فاروق، پسران حافظ عبدالحمید صاحب مرحوم، باغ بہادرگنج، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفیق: شریعت اسلامی میں بیوی یا بچے کے نام بیعانہ کرانے کی وجہ سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ ملکیت اصل مالک کی باقی رہتی ہے؛ اس لئے مذکورہ صورت میں عبدالحمید نے جس زمین کا بیع نامہ اپنے لڑکے عبدالباری وعبدالہادی کے نام کرایا ہے، وہ عبدالحمید کی ملکیت سے خارج نہیں ہوئی ہے؛ اس لئے اس میں شرعاً عبدالحمید کے تمام ورثاء کا حق وابستہ ہوگا۔اور کسی کو محروم کرنا جائز نہ ہوگا۔ (مستفاد: امدادالفتاوی ۳/ ۳۷،۳/ ۳۹)

وبيع التلجئة : وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل . (الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في بيع التلجئة زكريا ۷/ ۵٤۲، كراچی ۵/ ۲۷۳، هندية، زكريا قديم ۳/ ۳۰۹، جديد ۳/ ۱۹٦، كتاب البيوع، الباب العشرون في البياعات المكروهة والأرباح الفاسدة، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ۳۸۹، كراچی ۵/ ۱۷٦، المبسوط

للسرخسي، دار الكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢، الفقه الإسلامي و أدلته، هدى انٹرنیشنل ديوبند ٤/ ١٢٧-١٢٨، دارالفكر ٥/ ٣٣٢٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٦٢)

بيع التلجئة: البيع الصوري أن يضطر لإظهار عقد وإبطان غيره مع إرادة ذلک الباطن كأن يظهر بيع داره لابنه لئلا يستولي عليها السلطان.

(معجم لغة الفقهاء، کراچی، ص: ١١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳/ ربیع الاول ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۵۸۶)

بیوی کے نام سے زمین خریدنا

سوال [۸۷۸۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے ۱۹۹۰ء میں کبیر نگر رامپور روڈ ریلوے کراسنگ کے نیچے مرادآباد میں دو مکان M.D.A. سے خریدے، ایک اپنے نام ایک اپنی بیوی کے نام، جس کی کل رقم میں نے اپنی جیب سے ادا کی، بیوی کے نام مکان خریدنے کا مقصد بیوی کو مالک بنانا نہیں تھا؛ بلکہ میں سرکاری آدمی تھا، اس لئے ان کے نام مجبوراً لینا پڑا، میں نے دونوں مکان ایک خاتون کو بیوی اوراپنے دستخط کرا کر کچہری میں مختار نامہ کردیا، مکانوں کی رقم ابھی پوری ملی بھی نہیں، بیوی نے میرے ایک دوست جو مکانوں کے بکوانے میں شامل تھے، ان کو ایک پرچہ لکھا تھا کہ یہ مکان میں نے اپنی جیب سے خریدا ہے، جب ان سے کہا گیا کہ رسیدیں اور دستخط دکھاؤ، تو ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے، براہ کرم یہ بتائیں کیا بیوی کو دی جانے والی رقم جائز ہوگی؟

المستفتی: سید اقتدار علی جگر کالونی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر کسی مصلحت کی بنا پر آپ نے اپنی بیوی کے نام سے

مکان خریدا اور یہ مقصد نہیں تھا کہ بیوی کو حقیقی مالک بنانا ہے؛ بلکہ سرکاری اور قانونی پریشانیوں سے بچنے کے لئے یا بیوی کو خوش کرنے کے لئے اس کے نام سے جائیداد خرید لی، تو اس سے شرعی طور پر بیوی جائیداد کی مالک نہیں ہوگی، اس طرح نام کر کے خریداری کو شریعت کی اصطلاح میں ''بیع تلجئہ'' کہا جاتا ہے۔ اور ایسی بیع میں جس کے نام سے خریدا جاتا ہے وہ مالک نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ جو خریدتا ہے وہی اصل مالک ہوا کرتا ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/۳۹)

والإقرار بالبيع تلجئة هي أن يلجئک أن تأتي أمرا باطنه على خلاف ظاهره (وتحته في الشامية) كما لا يجوز بيع التلجئة لا يجوز الإقرار بالتلجئة بأن يقول لآخر: إني أقر لک في العلانية بمال وتواضعا على فساد الإقرار لا يصح إقراره حتى لا يملكه المقر له. (الدر مع الرد، كتاب الإقرار، باب الاستثناء وما في معناه، زكريا ۸/ ۳۷۷-۳۷۸، كراچی ۵/ ۶۰۸)

بيع التلجئة: البيع الصوري أن يضطر لإظهار عقد وإبطان غيره مع إرادة ذلک الباطن كأن يظهر بيع داره لابنه لئلا يستولي عليها السلطان. (معجم لغة الفقهاء، كراچی، ص: ۱۱۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
١٩/رجب ١۴٢٦ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٨/ ٨٨٩٨)	١٩/٧/١۴٢٦ھ

بیوی کی دل جوئی کے لئے مکان اس کے نام سے خریدنے کا حکم

سوال [٨٧٨٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: محمود نے ایک مکان اپنی بیوی اختری بیگم کے نام سے خریدا اور اسی کے نام رجسٹری کرائی، محمود کے اس وقت تین لڑکے اور سات لڑکیاں ہیں، دو لڑکیاں شادی شدہ ہیں، ایک بڑے لڑکے نے اپنی شادی خود کر لی ہے۔ اور ایک چھوٹے بھائی کو قتل بھی کر چکا ہے، دیگر بھائی بہنوں کے ساتھ بھی ظلم وزیادتی کرتا رہتا ہے، پھر اپنی والدہ کو بہلا کر آدھے مکان

(جومیں نے بیوی کے نام سے خریدا تھا) کا اپنے نام بیع نامہ کروالیا، میں نے بیوی سے جب معلومات ہونے پر پوچھا کہ ایسا کیوں کیا؟ تو اس نے کہا مجھے دھمکی دی تھی تو:

(۱) دریافت یہ کرنا ہے کہ بیوی نے جو آدھا مکان بڑے لڑکے کے نام بیع نامہ کردیا ہے، وہ بڑے لڑکے کا ہو گیا یا نہیں؟

(۲) کیا اس طرح صرف ایک لڑکے کے نام آدھا مکان کردینے سے بیوی گنہگار ہوگی یانہیں؟ یا سب کو برابر دینا چاہئے؟

(۳) بڑے لڑکے کا ماں باپ کے ساتھ اور بھائی بہنوں کے ساتھ ظلم وزیادتی کرنا شرعاً کیسا ہے؟ اس کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمود حسین پیرزادہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کسی مصلحت کی بنا پر مثلاً بیوی کی دلجوئی یا کسی قانون سے حفاظت کے لئے شوہر کا اپنے پیسے سے بیوی کے نام سے جائیداد خریدنے سے شرعی طور پر بیوی جائیداد کی مالک نہیں ہوتی؛ بلکہ مالک شوہر ہی ہوا کرتا ہے۔ اور اس طرح کی خرید وفروخت کو بیع تلجئہ کہا جاتا ہے؛ لہٰذا مذکورہ صورت میں محمود کی بیوی اختری بیگم اس مکان کی مالک ہی نہیں ہوئی؛ بلکہ مالک محمود ہی ہے؛ لہٰذا بعد میں اختری بیگم کے دستخط کے ذریعہ سے محمود کی اجازت کے بغیر بڑے لڑکے کے نام اس کا بیع نامہ کردینا شرعی طور پر درست نہیں ہوا؛ اس لئے محمود کو حق ہے کہ اس بیع نامہ اور رجسٹری کو ختم کرا کر مکان اپنی ملکیت میں واپس لے لے، پھر محمود کی مرضی ہے چاہے اپنے پاس رکھے اور چاہے کسی اور کے تصرف میں رکھے، اس میں سوال نامہ کے تینوں اجزاء کا جواب واضح ہو گیا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۷، فتاوی محمودیہ قدیم ٦/ ۲۸۰، جدید اشرفیہ ۳۹/۱٦)

وبیع التلجئة : وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف

عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل. (الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب المصرف، مطلب في بيع التلئجة زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، هندية، زكريا قديم ٣/ ٢٠٩، جديد ٣/ ١٩٦ ، بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٣٨٩، كراچی ٥/ ١٧٦، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١٩/محرم الحرام ١٤٢٣ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٦/ ٧٤٤٥)

انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے بیوی کے نام جائیداد کرنے کا حکم

سوال [٨٧٩٠]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کو اپنے والد کے ترکہ میں سے ٨٨/ گز کا مکان ملا جس میں سے اس نے چوتھائی حصہ اپنی بیوی کے نام لکھ دیا، کچھ عرصہ بعد زید نے ١٧٥/ گز کا ایک مکان خریدا، مکان خریدنے کے بعد زید کے یہاں انکم ٹیکس کا چھاپا لگا، زید کے وکیل نے مشورہ دیا کہ تم یہ سب مکان اپنی بیوی کے نام کردو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، کچھ عرصہ بعد زید کی بیوی کا انتقال ہوگیا، مرحومہ نے ٦/ لڑکیاں اور ٤/ لڑکے چھوڑے۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ مذکورہ جائیداد میں زید کا اور بچوں کا شرع کی رو سے کیا حق ہے؟

المستفتی: عبدالستار بھٹی اسٹریٹ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کسی مصلحت یا قانون سے حفاظت کے لئے شوہر اپنی بیوی کے نام جائیداد کردے، تو بیوی مالک نہیں ہوتی؛ اس لئے جب زید نے انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے اپنا ایک سو پچھتر گز کا مکان وقتی طور سے بیوی کے نام کردیا، تو بیوی اس کی مالک نہیں ہوئی؛ بلکہ مالک بدستور زید ہی ہے؛ لہٰذا بیوی کے مرجانے کے بعد اس کے ورثاء میں

مذکورہ ایک سو پچھتر گز کے مکان کی تقسیم نہیں ہوگی؛ کیوں کہ اس جائیداد کا مالک زید ہے۔ اور یہ صورت بیع التلجئہ کے تحت ہے؛ لیکن زید نے جو دوسرے اٹھاسی گز مکان میں سے چوتھائی حصہ اپنی بیوی کو دے کر مالک بنا دیا تو بیوی اس کی مالک ہوگئ؛ لہٰذا بیوی کے مرنے کے بعد اب چوتھائی حصہ میں جس کی وہ مالک تھی جائیداد تقسیم ہوگی۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۷، فتاوی محمودیہ ۶/ ۲۸۰، جدید اشرفیہ ۱۶/ ۳۹)

وبيع التلجئة : وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل. (الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، مطلب بيع التلجئة، زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، وهكذا في الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹر نيشنل ديوبند ٤/ ١٢٧-١٢٨، دارالفكر ٥/ ٣٣٢٥، الموسوعة الفقهية الكويتية ٩/ ٢٩٦، هندية، زكريا قديم ٣/ ٣٠٩، جديد ٣/ ١٩٦، معجم لغة الفقهاء، كراچی ص: ١١٣، قواعد الفقه أشرفی، ص: ٢١٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
یکم صفر ۱۴۲۳ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۴۸۵)	۱۴۲۳/۲/۱ھ

بیوی کے نام مکان خریدنے سے کیا وہ مالک ہوجائے گی؟

سوال [۸۷۹۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میں نے اپنا مکان ۱۹۵۰ء میں اپنی بیوی کے نام سے خریدا تھا، میرے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہے، سبھی حیات ہیں۔ مکان خریدنے کے وقت دس سال بعد میرے بڑے لڑکے نے مکان کو مبلغ: -/1,000 میں گروی رکھ دیا، جس کو تین سال بعد میرے تیسرے لڑکے نے چھڑالیا، مکان چھڑانے کے بعد اب کچھ سالوں سے وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے اس مکان کا آدھا حصہ اپنی ماں سے اپنے نام کرا رکھا ہے، اور وہ مکان کے آدھے حصہ پر قابض بھی ہے،

باقی آدھا حصہ تم چاروں بھائیوں کا ہے اور میرا بھی ہے، میرے سبھی لڑکوں اور بیٹی کی شادی ہوچکی ہے، جس وقت میرے بڑے لڑکے نے مکان گروی کاروبار کے لئے رکھا تھا، اس وقت میرے چھوٹے دونوں بیٹے بہت چھوٹے تھے جو کہ اب شادی شدہ ہیں اور وہ اس مکان کے بقیہ آدھے حصے میں رہتے ہیں جو کہ انہوں نے اپنے پیسے سے بنوایا ہے، میرے ان دونوں چھوٹے بیٹوں کو میرے بڑے لڑکے بہت پریشان کرتے ہیں، میری آپ سے گزارش ہے کہ اس مکان کو شرعاً کس طرح تقسیم کیا جائے؟

کل آراضی پچاسی گز ہے اور لڑکوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں: (۱) اشتیاق حسین (۲) اشفاق حسین (۳) مختار حسین (۴) ممتاز حسین (۵) انتظار حسین، ایک لڑکی زاہدہ خاتون۔

المستفتی: مشتاق حسین، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ نے اپنے ذاتی پیسہ سے بیوی کے نام سے خریدا ہے، تو شرعاً اس طرح بیوی کے نام سے خریدنے سے بیوی مالک نہیں ہوئی؛ اس لئے شرعاً مذکورہ مکان کے آپ ازخود مالک ہیں، آپ کے مرنے پر آپ کے تمام ورثاء اس مکان میں بطور وارث شریک ہوں گے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/ ۳۷-۳۹)

اور اس طرح خریداری کو بیع التلجئہ کہا جاتا ہے اور اس میں ملکیت اسی کی ثابت ہوتی ہے جو خریدتا ہے اور اپنا پیسہ ادا کرتا ہے۔

وبيع التلجئة: وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل. (الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب بيع التلئجة، زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، وهكذا في الهندية، زكريا قديم ٣/ ٢٠٩، جديد ٣/ ١٩٦، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣٨٩، كراچی ٥/ ١٧٦، معجم المصطلحات والألفاظ الفقهية، دارالفضيلة ١/ ٤٠٥، قواعد الفقه، أشرفي، ص: ٢١٣، معجم لغة الفقهاء، كراچی ص: ١١٣)

نیز اگر جس وقت مذکورہ مکان کو رہن میں رکھا گیا تھا اور پھر چھڑوایا گیا تھا، اس وقت رہن میں رکھنے والے اور چھڑانے والے دونوں لڑکے آپ کے زیر تحت رہے ہیں، تو شرعاً دونوں کو آپ کی طرف سے بطور وکیل ومعین کے کام کرنے والے سمجھے جائیں گے اور سارا تصرف شرعاً آپ کی ملکیت میں ہوا ہے۔

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شيء، فالكسب كله للأب إن كان الابن في عياله؛ لكونه معينا له. (شامي، كتاب الشركة، مطلب اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت فهو بينهما بالسوية، زكريا ٦/ ٥٠٢، كراچی ٤/ ٣٢٥، تنقيح الفتاوى الحامدية ٢/ ١٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶ر ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۷/ ۲۶۴۴)

بیوی کے نام سے جائیداد خریدنے کا حکم

سوال [۸۷۹۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: گلزار احمد نے ۱۹۴۸ء میں مسماۃ رئیسہ خاتون سے شادی کی اور اپنے روپیوں سے آراضی مسماۃ رئیسہ خاتون کے نام سے خریدی، بعدہ گلزار احمد نے دوسری شادی مسماۃ صابرہ خاتون سے کی، جنہوں نے اپنے خرچ سے افتادہ آراضی میں مکان بنوایا، جس کے بعد رئیسہ خاتون کا انتقال ہوگیا، جنہوں نے بعد اپنی وفات چار لڑکے: رئیس احمد، ظہیر احمد عرف بھولا، انیس احمد، حسین احمد اور ایک لڑکی مسماۃ شاکرہ خاتون اور شوہر گلزار احمد چھوڑے، جو بقید حیات ہیں، نیز آراضی افتادہ پر مکان بنوانے والی مسماۃ صابرہ خاتون بھی بقید حیات ہیں، جس کی بھی دو لڑکیاں ہیں، گلبہار اور ناظمہ خاتون اور چار لڑکے: ذوالفقار احمد، گلشاد احمد، دلشاد احمد اور رخسار احمد شوہر موصوف گلزار احمد سے ہیں، ایسی صورت میں مناسب فتویٰ بروئے

شریعت دے کر ممنون فرمائیں کہ تعمیر شدہ مکان میں کیسے کتنا کتنا حق پہنچتا ہے؟ عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: گلزار محمد گوئیاں باغ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: محض بیوی کے نام جائیداد وآراضی خرید نے سے بیوی شرعاً مالک نہیں ہوتی؛ اس لئے مذکورہ آراضی کا مالک گلزار احمد ہی ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/۳۷،۳/۳۹)

وبيع التلجئة : وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل. (الدرالمختار مع الرد، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب بيع التلجئة، زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، كوئٹه ٤/ ٢٧٣، هندية، زكريا قديم ٣/ ٢٠٩، جديد ٣/ ١٩٦)

لہٰذا فی الحال اس کی تقسیم کی بھی ضرورت نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴؍صفر ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۱۸)

قانونی مصلحت کی بناپر بہن کے نام رجسٹری کرانے سے ملکیت کا حکم

سوال [۸۷۹۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک شخص نے جو کہ اپنے بہنوئی کا پارٹنر بھی ہے، اس نے ذاتی طور پر اپنے لئے ایک جگہ خریدی اور اس جگہ کو اپنی بیوی اور بہن کے نام سے اس لئے کرالیا کہ اس میں سرکاری اور قانونی طور پر کوئی مصلحت تھی اور یہ بھی کہا کہ اس زمین میں نفع کا دس فیصد اپنی بہن کو دوں گا، اس مذکورہ بیان وسچائی پر گواہ بھی موجود ہیں، اس کے باوجود کچھ دنوں کے بعد اس شخص کے بھانجے اس زمین میں اپنی ماں کی پارٹنری کا مطالبہ کرتے ہیں، کیا ان لوگوں کے

لئے اس طرح کا دعویٰ کرنا درست ہے؟

المستفتی: محمد ارشد اشتیاق، متعلم مدرسۃ الجنۃ، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ذاتی طور پر اپنے پیسہ سے خریدتے وقت قانونی پیچیدگی سے بچنے کے لئے بیوی یا بہن کے نام رجسٹری کرنے کی وجہ سے خریدار کی ملکیت سے الگ نہیں ہوتا ہے اور ایسی خریداری کو بیع تلجئہ کہا جاتا ہے، جس میں شرعی طور پر وہ لوگ مالک نہیں ہوتے ہیں، جن کا نام رجسٹری میں درج کردیا جاتا ہے۔ اور شرعی طور پر مالک وہی ہوتا ہے جس نے اپنے پیسہ سے خریدا ہو؛ لیکن سوال نامہ میں ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ ''اس کے منافع سے دس فیصد دیں گے''۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ زمین کے دس فیصد میں مالک بنانا مقصود ہے؛ اس لئے بہن یا بہن کے بچوں کا دس فیصدی کا مطالبہ کرنا اس تحریر کی روشنی میں درست ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ۳/۳۱)

وبيع التلجئة هي ما ألجئ إليه الإنسان بغير اختياره، وذلك أن يخاف الرجل السلطان، فيقول لآخر: أني أظهر أني بعت داري منك، وليس ببيع في الحقيقة، وإنما هي تلجئة. (شامي، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب في بيع التلجئة، زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٤)

عن أبي يوسفؒ في رجلين قالا: ما اشترينا من شيء فهو بيننا نصفان، فهو جائز. (تاتارخانية، زكريا ٧/ ٤٧٠، برقم: ١٠٩٠٩)

شركة الملك لا تبطل أي لا يبطل الاشتراك فيها بل يبقى المال مشتركا بين الحي وورثة الميت. (شامي، كتاب الشركة، مطلب يرجح القياس، زكريا ٦/ ٥٠٤، كراچی ٤/ ٣٢٧)

ووجوب أدائه عند طلب مالكه، وشرعية الإيداع إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها. (مجمع الأنهر، كتاب الوديعة، دارالكتب العلمية بيروت

٣/ ٤٦٧، مصري قديم ٢/ ٣٣٨، هندية، زكريا قديم ٤/ ٣٣٨، جديد ٤/ ٣٤٩)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٦ر شوال ١٤٣٢ھ
(الف فتویٰ نمبر: ١٠٤٩٢/٣٩)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٢٦/١٠/١٤٣٢ھ

بڑے بھائی کے نام بیع نامہ ہونے کے باوجود دوسرا بھائی حق دار

سوال [٨٧٩٤]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرے بڑے بھائی محمد مہربان اور میں محمد فرقان نے مل کر ایک پلاٹ ٧٠ر گز لگ بھگ تھا، گنگا سرن بھٹنا گر ایڈوکیٹ سے خرید کیا تھا، معاہدہ کے وقت اس کی کل قیمت ١١٠٠٠ر روپئے طے ہوئی۔ مالک کو -/5000 روپئے دے کر معاہدہ کرلیا تھا، جس میں -/3000 روپئے بڑے بھائی نے اور -/2000 روپئے میں نے دیئے تھے، ہم دونوں بھائیوں میں آپس میں بہت میل تھا اور مجھے اپنے بڑے بھائی پر پورا بھروسہ تھا؛ اس لئے معاہدہ میں صرف بڑے بھائی کا نام ہی لکھوادیا گیا؛ کیوں کہ بڑے بھائی کو رہنے کی پریشانی تھی اور ان کی مالی حالت بہت کمزور تھی؛ اس لئے عارضی طور پر چاردیواری کراکر میں نے اوپر ٹین شیڈ ڈلوادیا تھا، جس میں -/3000 روپئے خرچ ہوا تھا، جو میں نے اپنے پاس سے دیئے، اس کے علاوہ -/1600 روپئے ان کو ضرورت پڑنے پر دیئے تھے؛ لہٰذا جس وقت اس کا مختار نامہ ہوا بھائی نے مجھ سے روپیوں کے لئے کہا، تو میں نے ان سے کہا کہ میرے آپ کے پاس -/6600 روپئے پہنچ چکے، آپ اس میں سے میرے حصے کے روپئے جمع کردیں؛ کیوں کہ -/11000 کل قیمت کے آدھے -/5500 روپئے ہوتے ہیں، اس طرح میرے حصہ کی آدھی سے زیادہ قیمت ان کے پاس پہنچ چکی تھی۔

بہر کیف آپسی بھروسہ کی وجہ سے مختار نامہ میں بڑے بھائی کا نام لکھوا دیا تھا؛ کیوں کہ بڑے

بھائی برابراس میں رہتے رہے ہیں، میں کرایہ کے مکان پر رہتا تھا، اس درمیان میں مکان مالک نے مجھ سے مکان خالی کرنے کے لئے کہا، تو مجھے اس کی فکر ہوئی، میں نے بڑے بھائی سے مشورہ کیا، تو انہوں نے کہا یہ زمین آدھی تمہاری ہے، اس پر اپنا مکان بناؤ اور رہو؛ کیوں کرایہ دیتے ہو، میری بڑی بہن اور چچا وغیرہ سے بھی میرے بڑے بھائی نے کہا کہ محمد فرقان سے کہو کہ کیوں پریشان ہوتا ہے، اب اس کی زمین موجود ہے، تو اس میں مکان بنوا کر رہے، پھر میں نے اپنے زیور وغیرہ فروخت کر کے اور کچھ قرض لیکر اس جگہ پر -/75,000 روپئے خرچ کئے، پہلے بڑے بھائی کے لئے نیچے کا لینٹر ڈلوایا اس کے بعد اپنے رہنے کے لئے اوپر کمرہ بنوایا، اس کے بعد وہاں رہنے لگا، بڑے بھائی کے بھروسہ کی وجہ سے میں نے کسی قسم کی کوئی بھی تحریر نہ تو گنگا سرن سے لی اور نہ ہی بڑے بھائی سے اب تک حاصل کی، اب جب کہ بڑے بھائی کے بار بار اصرار کرنے پر میں نے اپنا کافی روپیہ اس جگہ پر لگا دیا، بڑے بھائی مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ اس میں تمہارا کچھ نہیں، یہ ساری زمین میرے نام ہے، میں اس معاملہ کو عدالت میں لے جانا نہیں چاہتا، کوئی شرعی تصفیہ اس میں چاہتا ہوں، اس زمین کے بارے میں میرے چچا جناب عثمان صاحب اور میرے سب سے بڑے بھائی محمد عمران کو بھی معلوم ہے، اور میرے بڑے بہنوئی علی حسین مرحوم نے ساری کارروائی اس زمین کی خریداری وغیرہ کی کرائی تھی، میری بڑی بہنیں بھی یہ بات جانتی ہیں۔ آپ مجھے شرعی مشورہ دیں، مجھے کیا کرنا ہے؟

المستفتی: محمد فرقان، لالباغ نئی آبادی، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب دونوں بھائیوں نے مشترکہ طور پر خریدا ہے اور پیسے بھی دونوں بھائیوں کے خرچ ہوئے ہیں اور سوال نامہ کے اعتبار سے ایک بھائی کے اوپر پانچ ہزار پانچ سو روپئے آئے ہیں، جب چھوٹے بھائی نے پانچ ہزار پانچ سو کے بجائے چھ ہزار چھ سو دے دیئے تو گیارہ سو روپئے زیادہ پہنچے اور ایسے حالات میں بڑے

بھائی پر بھروسہ واعتماد کی بنا پر بیع نامہ میں صرف بڑے بھائی کے نام ڈال دینے کی وجہ سے تنہا وہ مالک نہیں ہوگا؛ بلکہ مالک دونوں بھائی برابر کے ہیں۔ اور نیز بڑے بھائی کا یہ کہنا کہ اس میں آدھی زمین تمہاری ہے، اس پر تم اپنا مکان بناؤ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ بڑا بھائی بھی آدھا حصہ چھوٹے بھائی کا تسلیم کرتا تھا اور پھر چھوٹے بھائی کا اس کے اوپر پچھتر ہزار روپئے خرچ کر کے تعمیر کروانا اور اس تعمیر کے لئے بڑے بھائی کی طرف سے ترغیب دینا یہ مشترکہ ہونے کا ثبوت ہے؛ لہٰذا اب بڑے بھائی کا محض اس وجہ سے انکار کر دینا کہ بیع نامہ میں صرف میرا ہی نام پڑا ہے، جائز نہیں ہے؛ بلکہ دونوں کا حق برابر کا ہے۔ اور پھر تعمیر میں جو خرچ ہوا ہے، اس کے ذمہ دار بھی دونوں برابر کے ہوں گے، محض بیع نامہ میں نام ڈلوانے سے پورا مکان بڑے بھائی کی ملکیت میں نہیں ہوسکتا۔ (مستفاد: امداد المفتیین /۸۹۰، احسن الفتاوی ۶/۴۰۰، امداد الفتاوی ۳/ ۳۸)

وبيع التلجئة: وهو أن يظهر عقدا وهما لايريدانه يلجأ إليه لخوف عدو، وهو ليس ببيع في الحقيقة، بل كالهزل. (درمختار، كتاب البيوع، باب الصرف، مطلب بيع التلئجة، زكريا ٧/ ٥٤٢، كراچی ٥/ ٢٧٣، هندية، زكريا قديم ٣/ ٢٠٩، جديد ٣/ ١٩٦، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٤/ ١٢٢، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٣٨٩، كراچی ٥/ ١٧٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۷۳۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲؍۷؍۱۴۲۳ھ

۸/ باب الصرف

سونے کی ادھار بیع کا حکم

سوال [۸۷۹۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے پاس پندرہ ہزار -/15,000 روپئے کی رقم تھی، جس سے وہ اپنی ایک عزیزہ کی شادی کے لئے سونا خرید کر رکھنا چاہتا تھا؛ کیوں کہ سونے کی قیمتیں بہت تیزی سے بڑھ رہی تھیں، اس وقت بکر کو کاروبار کے سلسلہ میں رقم کی ضرورت تھی، بکر نے زید سے کہا کہ تم مجھے پندرہ ہزار روپئے ابھی دیدو اور سونے کی قیمت جو بھی ہو ایک سال بعد میں تمہیں دو تولہ سونا دے دوں گا، زید اور بکر کا اس طرح کا معاملہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

المستفتی: حکیم محمد مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سونے کی بیع کرنسی کے عوض میں ادھار جائز ہے؛ اس لئے پندرہ ہزار روپئے کے بدلے سونے کی ادھار بیع درست ہوگئی؛ لہٰذا وعدہ کے مطابق مقررہ وقت پر پندرہ ہزار روپئے کے عوض میں دو تولہ سونا دینا جائز ہے۔

قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: المسلمون علی شروطهم.

(ترمذي، الأحكام، باب ما ذكر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في الصلح بين الناس، النسخة الهندية ۱/ ۲۵۱، دارالسلام، رقم: ۱۳۵۲، المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي، بيروت ۱۷/ ۲۲، رقم: ۳۰، سنن الدارقطني البيوع، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۲۳، رقم: ۲۸۶۹، المستدرك للحاكم، مكتبه نزار مصطفى الباز بيروت ۷/ ۲۵۲۳، رقم: ۷۰۵۹، قديم ٤/ ۱۰۱)

سئل الحانوتي عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة، فأجاب بأنه يجوز إذا

قبض أحد البدلین. (شامي، کتاب البیوع، باب الربا، مطلب في استقراض الدراهم عددا، کراچی ٥/ ١٨٠، زکریا ٧/ ٤١٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۳۰ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۹/۱۰۳۳۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۲/۴/۶ھ

سونے اور چاندی کے زیورات کی ادھار خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۷۹٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) کیا چاندی اور سونے کی یا پھر چاندی اور سونے کے زیورات کی ادھار خرید وفروخت قطعی ناجائز ہے؟ (۲) کیا چاندی اور سونے کے زیورات کی ادھار خرید وفروخت ایک معینہ مدت کے لئے جائز ہے؟

المستفتی: ماسٹر افتخار احمد علوی، چوہان بانگر، دہلی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ملک میں رائج نوٹوں اور سکوں کے ذریعہ سونے چاندی اور ان کے زیورات کی ادھار خرید وفروخت شرعاً جائز ہے؛ لیکن اگر سونے کے بدلے سونے یا چاندی کے بدلے چاندی کو خریدا جائے یا بیچا جائے تو اس وقت ادھار خرید وفروخت ناجائز ہوگی۔

سئل الحانوتي عن بیع الذهب بالفلوس نسیئة، فأجاب بأنه یجوز إذا قبض أحد البدلین. (شامي، کتاب البیوع، باب الربا، مطلب في استقراض الدراهم عددا، زکریا ٧/ ٤١٤، کراچی ٥/ ١٨٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/۹۲۵۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۸/۴/۱۳ھ

سونے چاندی کی ادھار بیع وشراء کی شرعی حیثیت

سوال [۸۷۹۷]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سونے چاندی کی ادھار بیع وشراء جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد افتخار سیندھولی، شاہجہاں پور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سونے چاندی کی ادھار بیع وشراء جائز ہے۔

وإن اشترى خاتم فضة أو خاتم ذهب فيه فص، أو ليس فيه فص بكذا فلسا وليست الفلوس عنده، فهو جائز تقابضا قبل التفرق، أولم يتقابضا؛ لأن هذا بيع وليس بصرف. (عالمگيري، كتاب الصرف، الباب الثاني، الفصل الثالث في بيع الفلوس، زكريا قديم ۳/ ۲۲٤، جديد ۳/ ۲۰۹، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ١٤/ ٢٥) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۳ رمحرم الحرام ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۴۲۵)

قسطوں پر سونے چاندی کی خرید وفروخت کا حکم

سوال [۸۷۹۸]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سونا چاندی قسطوں پر خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً زید نے عمر کے پاس سے رقم لے کر سونا خریدا اور پھر عمر کو اتنی رقم قسطوں پر ادا کرے، تو ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد زبیر مظاہری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سونا چاندی خریدنا چونکہ بیع صرف میں داخل ہے اور بیع

صرف میں مبیع اور ثمن پر عاقدین کا مجلس میں قبضہ کرنا ضروری ہے۔ اور قسطوں پر خرید نے سے ثمن ادھار ہوتا ہے۔ اور مشتری بعد میں تھوڑا تھوڑا ثمن ادا کرتا ہے؛ اس لئے سونا چاندی قسطوں پر خریدنا جائز نہیں۔

ویشترط عدم التأجیل، والخیار، والتقابض بالبراجم لا بالتخلیة قبل الافتراق، وفي الشامي: أي افتراق المتعاقدین بأبدانهما، والتقیید بالعاقدین یعم المالکین والنائبین، وتقیید الفرقة بالأبدان یفید عموم اعتبار المجلس، وهو شرط بقائه صحیحا علی الصحیح. (شامي، کتاب البیوع، باب الصرف، کراچی ۵/ ۲۵۷-۲۵۸، زکریا ۷/ ۵۲۱، سکب الأنهر في شرح ملتقی الأبحر، دارالکتب العلمیة بیروت ۳/ ۱۶۱، تاتارخانیة، زکریا ۱۰/ ۴-۵، رقم: ۱۳۸۷۸)

ہاں البتہ کسی سے رقم بطور قرض لے لی جائے اور اس سے نقد سونا خرید لیا جائے اور قرض کی رقم قسطوں پر ادا کی جائے جس پر کوئی سود نہ ہو تو جائز ہے اور درست ہے۔

﴿وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَیْسَرَةٍ﴾ الآیة. المراد به الإمهال والتأخیر. (روح المعاني، سورة البقرة، تحت رقم الآیة: ۲۸۰، زکریا دیوبند ۳/ ۸۷)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ رجب ۱۴۲۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۳۶۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۸/ ۷/ ۱۴۲۸ھ

سونے کو سونے کے عوض چاندی کو چاندی کے عوض کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنا

سوال [۸۷۹۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری ایک چاندی سونے کی دوکان ہے، اس میں بہت سے گراہک ایسے آتے ہیں جو پرانے زیورات لے کر آتے ہیں، بعض دفعہ وہ پرانے زیورات ٹوٹے پھوٹے ہوتے ہیں اور بعض دفعہ ٹوٹے نہیں ہوتے؛ لیکن پرانے ہوتے ہیں، جن کو گلا کر ہم نئے

زیورات بنواتے ہیں، آپ کو معلوم ہوگا سونے چاندی کے جوز یورات بنتے ہیں وہ خالص سونا چاندی سے نہیں بن سکتے، ہر جوڑ پرٹانکا دوسری کئی دھاتوں کو ملا کر ایک دھات بنتی ہے، جس کے ذریعہ لگتا ہے، مثلاً دس گرام کا کوئی زیور ہے، تو ایک گرام اس میں ٹانکا والی دھات ہوتی ہے، اسی وجہ سے جب ہم خریدتے ہیں تو اس چاندی یا سونے کے علاوہ والی دھات کو گھٹا کر اصل چاندی کی قیمت دیتے ہیں، یا کوئی زیور دیتے ہیں، اسی طرح جب مال فروخت کرتے ہیں، تو اس میں بھی ٹانکا والی دھات چاندی سونے کے علاوہ موجود ہوتی ہے؛ لیکن جتنے وزن کا پورا زیور ہوتا ہے، اتنی ہی چاندی یا سونے کی قیمت لیتے ہیں، ٹانکا والی دھات کو گھٹا کر قیمت نہیں لیتے ،اسی کو کردا سے تعبیر کیا جاتا ہے، واضح رہے کہ ہر چاندی اور سونا میں کتنی دھات ٹانکے والی ہوتی ہے، اس کو ہم ایک پتھر (کسوٹی) کے ذریعہ پتہ لگا لیتے ہیں، اسی حساب سے کردا کاٹتے ہیں، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ اس طرح کردا کاٹ کر پرانی چاندی سونے کے بدلہ میں نئے زیورات دینا یا رقم دینا درست ہے یا نہیں؟ یا شریعت نے کوئی دوسری شکل بتائی ہو تو وہ تحریر فرما دیں۔

المستفتی: محمد اعلم، سیتاپور (یوپی)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: کردا کاٹ کر چاندی کو چاندی کے بدلہ میں یا سونے کو سونے کے بدلہ میں لین دین کرنا کمی زیادتی کے ساتھ جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر کردا کاٹ کر لینے میں عوض میں روپئے دیا جائے اور دینے میں روپئے لیا جائے تو جائز ہوسکتا ہے۔

فإن باع فضة بفضة، وذهبا بذهب لا يجوز إلا مثلا بمثل، وإن اختلفت في الجودة والصياغة (وقوله) وإن باع الذهب بالفضة جاز التفاضل لعدم المجانسة. (هداية، كتاب الصرف، أشرفي ٣/ ١٠٤) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۵/ ذیقعدہ ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۴۲۰۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۵/۱۱/۱۴۱۵ھ

۲۰/ ہزار کے زیورات ۲۴/ ہزار میں فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۸۰۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بہت سارے لوگ مجھ سے ادھاری میں سونا (زیورات) مانگتے ہیں، میں ان سے بھی واضح طور پر کہہ دیتا ہوں کہ دوکان سے میں مثلاً:-/20,000 روپئے کا سونا خریدوں گا اور تمہیں-/24,000 (چوبیس ہزار روپئے) میں دوں گا، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ میں سونا خریدکران کے حوالہ کردیتا ہوں، اور ہر ہفتہ -/1,000 (ایک ہزار روپئے) وصول کرتا ہوں، یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد سراج بالاپورآ کولہ، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: روپئے، پیسے، فلوس کی طرح ثمن عرفی ہیں، ثمن حقیقی نہیں۔ اور سونا چاندی کو فلوس کے عوض میں ادھار فروخت کرنا اور ادھار خریدنا جائز اور درست ہے؛ اس لئے روپئے پیسے اور کرنسی کے عوض میں بھی ادھار خرید وفروخت شرعاً جائز ہے؛ لہٰذا سوال نامہ میں جو شکل لکھی ہے وہ شرعاً جائز اور درست ہے، جو فقہاء کی عبارات سے واضح ہوتا ہے:

وإذا اشترى الرجل فلوسا بدراهم، ونقد الثمن ولم تكن الفلوس عند البائع، فالبيع جائز؛ لأن الفلوس الرائجة ثمن كالنقود، وقد بينا أن حكم العقد في الثمن وجوبها ووجودها معا، ولا يشترط قيامها في ملك بائعها لصحة العقد كما لا يشترط ذلک في الدراهم والدنانير -إلى- وبيع الفلوس بالدراهم ليس بصرف. (المبسوط للسرخسي بيروت ١٤/ ٢٤، هندية، كتاب الصرف، الباب الثاني، الفصل الثالث في بيع الفلوس، زكريا قديم ٣/ ٢٢٤، جديد ٣/ ٢٠٨) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴/ رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۲۴۹)

ریال کا تبادلہ اس سے کم مالیت کے سکوں سے کرنے کا حکم

سوال [۸۸۰۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) سعودی وغیرہ میں گاڑی وغیرہ کی پارکنگ کے لئے ریال سکے کی شکل میں درکار ہوتے ہیں؛ لیکن بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ریال نوٹ کی شکل میں ہوتا ہے، سکہ حاصل کرنے کے لئے نوٹ دے کر سکہ کم لینا پڑتا ہے، تو کیا اس طریقہ سے تبادلہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟ سود کی تعریف تو اس پر صادق نہیں آرہی ہے۔

(۲) جیسے اپنے یہاں ہندوستان میں لوگوں کو ریزگاری روپیوں کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً ہوٹل والوں کو پھیری کرنے والے کو ۱۰۰ر کا نوٹ دے کر ۹۵ر روپئے ریزگاری نکال لیتے ہیں، ایسا کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

المستفتی: محمد راشد فتح پوری، متعلم جامعہ عربیہ معراج العلوم چیتا کیمپ، ممبئی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) ریال ہوں یا ہندوستانی نوٹ ان کا تبادلہ اگر اسی ملک کے سکوں سے کیا جائے تو ریال کی مالیت کے بقدر سکے سے تبادلہ لازم ہے، اسی طرح ہندوستانی سو روپئے کے نوٹ کا سو روپئے کے سکے سے تبادلہ لازم ہے۔ اور ۹۰ر روپئے کے سکوں سے تبادلہ ناجائز ہے، اسی طرح ریال کا تبادلہ اس سے کم مالیت کے سکوں سے جائز نہیں ہے۔ (مستفاد: فقہی مقالات زمزم بک ڈپو ۳۱، ومسائل سود/ ۱۷۵)

علة القدر مع الجنس فإن وجدا حرم الفضل والنساء، وإن عد ما حلا، وإن وجد أحدهما حل الفضل، وحرم النساء. (درمختار مع الشامي، باب الربا، كراچی ٥/ ١٧٢، زكريا ٧/ ٤٠٣-٤٠٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر ربیع الاول ۱۴۳۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۰۱۰/۴۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۴/۳/۱۷ھ

دوملکوں کی کرنسیوں کے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کا حکم

سوال [۸۸۰۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: سعودی ریال کے پانچ سو روپئے کے نوٹ کی قیمت فی الحال -/57000 روپئے ہے، ایک شخص نے دوسرے شخص سے پانچ سو کا نوٹ -/6,000 میں اس لئے لیا ہے کہ وہ رقم تین چار ماہ کے بعد ادا کرے گا، یعنی اصل قیمت اول الذکر سے زیادہ قیمت صرف رقم تاخیر سے ادا کرنے کی وجہ سے رکھی ہے، قیمت ادا کرنے کا وقت مقرر ہو چکا ہے، اس معاملہ میں نرخ ایک ہی رہا یہ نہیں کہا کہ ادھار لوگے تو زیادہ قیمت کا ہے اور نقد میں اس قیمت کا بلکہ صرف ایک بھاؤ ہی طے کرلیا گیا ہے کہ چار ماہ کے بعد رقم ادا کردی جائے گی اور قیمت -/6,000 ادا کی جائے گی، تو یہ معاملہ جائز ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: عبدالولی ولد حاجی عبدالکریم شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: دو مختلف ملکوں کی کرنسیاں ثمن حقیقی نہیں؛ بلکہ ہر ایک ملک کی کرنسی مستقل طور پر ثمن عرفی ہے؛ لہٰذا قدر وجنس کے مختلف ہونے کی وجہ سے کمی زیادتی اور ادھار دونوں طرح کا تبادلہ جائز ہے؛ البتہ فی الحال ایک جانب سے قبضہ کرنا لازم ہے، جو عام طور پر ہوتا ہے؛ اس لئے سعودی ریال کا ہندوستانی رقم کے ساتھ ہر طرح کی کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے، بس شرط یہ ہے کہ ایک جانب سے قبضہ ہو جائے، خواہ پانچ سو ریال کو پانچ ہزار سات سو میں لیا جائے جو سرکاری بھاؤ یا مارکیٹ کا بھاؤ ہے، یا پانچ سو ریال کو چھ ہزار میں لیا جائے، دونوں طرح جائز ہے۔ (مستفاد: ایضاح النوادر ۱۲۳، احسن الفتاوی ۷/ ۱۰۰)

إن الأوراق النقدية ثمن عرفي ليست ثمنا حقيقيا، والربا يجري في الثمن الخلقي الذاتي إذ في الأوراق النقدية من مختلف الدولة ينفي القدر والجنس، أما الجنس فظاهر لاختلاف الدولة، وأما القدر لأنها ليست من جنس الأثمان الخلقية بل عرفية، فيجوز التفاضل والنسيئة إلا أن القبض على أحد البدلين ضروري لئلا يقع في بيع الكالي بالكالي. (التبيان في زكوة الأثمان، بحواله مجله فقه اكيڈمي ٤/ ٥٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۸/۷/۱۴۲۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/۲/۶۲۷۲)

دوسو روپئے کے نوٹوں کے ہار کو تین سو روپئے میں بیچنا

سوال [۸۸۰۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میری دوکان جنرل اسٹور کی ہے، میں نوٹوں کا ہار بیچتا ہوں اور نوٹوں کی گڈی خرید کر لاتا ہوں، دوسو روپئے والی گڈی دوسو ۲۷۰/روپئے کی لاتا ہوں اور ہار اپنے ہاتھ سے بناتا ہوں، تین سو روپئے کا بیچتا ہوں، قرآن وحدیث کی روشنی میں بتائیں کہ یہ صحیح ہے یا غلط؟

المستفتی: نیاز محمد مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: دوسو روپئے کی گڈی دوسو ستر میں خریدنا جائز نہیں ہے، یہ شرعی طور پر سودی کاروبار میں داخل ہوگا اور دوسو کے نوٹوں کے ہار کو تین سو روپئے میں فروخت کرنا جائز ہے؛ اس لئے کہ دوسو روپئے تو ہار کے دوسو کے عوض میں ہوگا اور باقی سو روپئے ہار کی بیل وغیرہ کے عوض میں ہوگا۔

عن ابن عباس -رضي الله عنه- حديث طويل وطرفه: فقال:

ردوه لا حاجة لي فيه، التمر بالتمر، والحنطة بالحنطة، والشعير بالشعير، والذهب بالذهب، والفضة بالفضة، يدا بيد عينا بعين، مثلا بمثل، فمن زاد فهو ربا. الحديث. (المستدرك للحاكم، البيوع، جديد دارالبشائر الإسلاميه، بيروت ۳/ ۸٦۲، قديم ۲/ ٤۳، رقم: ۲۲۸۲)

ولا يجوز بيع الزيتون بالزيت، والسمسم بالشيرج حتى يكون الزيت والشيرج أكثر مما في الزيتون، والسمسم فيكون الدهن بمثله، والزيادة بالثجير. (هداية، كتاب البيوع، باب الربا، اشرفي ديوبند ۳/ ۸۵، ملتقى الأبحر، دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱۲٦-۱۲۷، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ۱/ ۲٦۱، دارالكتاب ديوبند ۱/ ۲۵٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲/ ربیع الاول ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۹۱۳)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۲/ ۳/ ۱۴۱۵ھ

بوسیدہ نوٹ کم قیمت میں فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۸۰۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: جب نوٹ بوسیدہ ہوجاتا ہے یا پھٹ جاتا ہے، تو سو کا پھٹا ہوا نوٹ ستر یا اسی روپئے میں چلتا ہے، بتلایئے یہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: قمر الدین قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: اگر ملکی کرنسی پھٹ جانے کی وجہ سے مارکیٹ میں اس کی حیثیت عرفیہ گھٹ جائے اوراس روپئے سے کوئی دوسری چیز خریدی نہ جاسکتی ہو کوئی تاجر لینے کے لئے تیار نہ ہو، تو اگر بآسانی بینک میں دے کرنئی اور صحیح کرنسی حاصل کی جاسکتی ہو تو کم

قیمت میں فروخت کرنا جائز نہ ہوگا؛ لیکن اگر آسانی کے ساتھ بینک سے صحیح کرنسی حاصل نہیں کی جاسکتی ہے؛ بلکہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے تو گویا کہ علاقہ میں اس کی حیثیت عرفیہ گھٹ گئی ہے اور چونکہ یہ ثمن عرفی ہے، اس کی ثمنیت کا مدار عرف پر ہے، تو جس قدر اس کی حیثیت گھٹ جائے گی اسی قدر کم پیسے میں اس کو فروخت کرنا جائز ہوگا، مگر اس میں شرط یہ ہے کہ معاملہ اور لین دین دست بدست ہو؛ اس لئے کہ اس کی حیثیت عرفیہ گھٹ جانے کی وجہ سے اگرچہ مختلف القدر ہوگیا ہے؛ لیکن فی الجملہ کسی حد تک یعنی سرکاری سطح پر ثمنیت باقی ہونے کی وجہ سے اتحاد جنسیت باقی ہے۔ (ایضاح النوادر ۱/۱۲۲)

فلا يجوز مبادلة الأوراق النقدية بجنسها متفاضلة، ويجوز إذا كانت متماثلة، والمماثلة ههنا أيضا تكون بالقيمة لا بالعدد، كما في الفلوس، فيجوز أن يباع ورق نقدي قيمته عشر روبيات، بعشرة أوراق قيمة كل واحد روبية واحدة، ولا يجوز أن يباع الأول بأحد عشر ورقا من الثانية.

(تكمله فتح الملهم، كتاب البيوع، باب الصرف، وبيع الذهب بالورق نقدا، أشرفيه ديوبند ۱/ ۵۹۰) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ ذیقعدہ ۱۴۲۴ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۱۹۶)

۹۵؍ روپئے ریزگاری کا سو روپئے سے تبادلہ کرنا

سوال [۸۸۰۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عام طور سے ہوٹل یا دوکان والوں کو ریزگاری اور کھلے ہوئے روپیوں اور سکوں کی ضرورت ہوتی ہے؛ اس لئے وہ نوٹ کا ریزگاری سے تبادلہ کرتے ہیں؛ لیکن کمی زیادتی کے ساتھ مثلاً سو کا نوٹ دیا، تو ریزگاری والا صرف ۹۰؍ روپئے یا ۹۵؍ روپئے

بمشکل ریزگاری دے گا، کیا اس طریقہ سے زرمبادلہ کمی بیشی کے ساتھ درست ہے؟ علت ربوا کاتحقق ہے یا نہیں؟

المستفتی: ابواسامہ قاسمی

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوروپئے کا نوٹ دے کر ٩٠ یا ٩٥/روپئے کی ریزگاری دینے میں صراحتاً سود کاتحقق ہوتا ہے؛ اس لئے کمی بیشی کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرنا حرام وناجائز ہے۔ (مستفاد: عزیز الفتاوی، ص: ٦٤٤)

ومن أعطى صيرفيا درهما، وقال: أعطني بنصفه فلوسا وبنصفه نصفا إلا حبة جاز البيع في الفلوس، وبطل فيما بقي عندهما، وعلى قياس قول أبي حنيفة –رحمه الله– بطل في الكل. (هداية، كتاب الصرف، أشرفي ٣/ ١١٠، البناية، أشرفيه ٨/ ٤١٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
١١/ جمادی الثانیہ ١٤١٩ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٣/ ٥٨١١)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١١/٦/١٤١٩ھ

۹/ باب السلم

بیع سلم کی تعریف اور شرائط

سوال [۸۸۰۶]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ''بیع سلم'' کیا ہے؟ اس کی شرطیں تحریر فرمادیں، نیز یہ شرط کہ مسلم فیہ موجود ہو اس سے کیا مراد ہے؟ کہاں موجود ہونا ضروری ہے، مجلس عقد میں یا بائع کے پاس گھر میں یا بازار میں؟

المستفتی: محمد انوار

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اصطلاح فقہ میں بیع سلم اس کو کہا جاتا ہے کہ پہلے روپئے دے کر غلہ کا نرخ معین کر کے ٹھہرالیا جائے۔

وشرعا بيع آجل، وهو المسلم فيه بعاجل وهو رأس المال. (شامي، كتاب البيوع، باب السلم، كراچی ۵/ ۲۰۹، زكريا ۷/ ٤٥٤)

بیع سلم کے صحیح ہونے کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کالحاظ رکھنا ضروری ہے:

(۱) غلہ کی جنس بیان کردی جائے کہ گیہوں ہے یا جو۔

(۲) نوع بیان کردی جائے کہ غلہ کس قسم کی زمین کا ہوگا۔

(۳) صفت بیان کردی جائے کہ عمدہ ہوگا یا گھٹیا۔

(۴) مقدار بیان کردی جائے کہ کتنا غلہ لینا ہے۔

(۵) مدت معین کرلی جائے۔

(٦) جس قدر غلہ لینا ہو اس کی پوری قیمت کا روپیہ جو ان کے باہمی طے شدہ نرخ سے متعین ہوتا ہے، پہلے ہی یعنی بوقت عقد دے دیا جائے۔

(۷) غلہ کس جگہ پر حوالہ کیا جائے گا اس کو بھی معین کرلیا جائے۔ اور جس قسم کے غلہ کی بات

چیت ہوتی ہے، اس کو ’’مسلم فیہ‘‘ کہتے ہیں، اس کا مارکیٹ میں یا علاقہ میں پوری مدت کے زمانہ میں کہیں نہ کہیں دستیاب ہونا ضروری ہے۔

ولا يصح السلم عند أبي حنيفة إلا بسبع شرائط: جنس معلوم، كقولنا: حنطة، أو شعير، ونوع معلوم، كقولنا سقية أو نجسية، وصفة معلومة، كقولنا: جيد أو ردي، ومقدار معلوم، كقولنا: كذا كيلا بمكيال معروف، أو كذا وزنا وأجل معلوم، ومعرفة مقدار رأس المال إذا كان يتعلق العقد على مقداره كالمكيل والموزون والمعدود، وتسمية المكان الذي يوفيه فيه إذا كان له حمل ومؤنة. (هداية، باب السلم، أشرفی دیوبند ۳/ ۹۵، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ۱/ ۲۶۶، دارالكتاب ديوبند ۱/ ۲۵۹، درمختار كراچی ۵/ ۲۱۴، تا ۲۱۶، زكريا ديوبند /۷/ ۴۶۱ تا ۴۶۴)

ولا يجوز السلم حتى يكون المسلم فيه موجودا من حين العقد إلى حين المحل. (هداية، أشرفی دیوبند ۳/ ۹۳) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۱۴۲۵/۶/۲۴ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۷/۸۴۲۳)	۱۴۲۵/۶/۲۵ھ

پیشگی رقم لے کر مبیع بعد میں دینا

سوال [۸۸۰۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک مسلمان کا دوسرے کو فصل سے پیشگی رقم دینا اس شرط کے ساتھ کہ بھاؤ بازار کا فصل آنے پر کچھ بھی ہو، مگر اس وقت جو بھاؤ مقرر ہو رہا ہے اسی بھاؤ میں جنس کو دینا ہوگا، کیا اس طرح سے خریداری کرنا شرعاً صحیح ہے؟ اور جانبین کے بارے میں کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد یعقوب علی موضع چوہا نگلہ، مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر عقد مجلس میں رقم پر قبضہ ہو چکا ہے اور فصل میں غلہ دینے کے لئے بات طے ہوگئی ہے کہ وہ کس قسم کا غلہ ہوگا اس کی صفت ومقدار وغیرہ بیان کردی ہے اور فی الحال آپس میں بھاؤ بھی مقرر کرلیا ہے، تو یہ شرعاً بیع سلم ہے، جوکہ جائز ہے، اس میں کسی قسم کی قباحت نہیں ہے۔

ولا يصح السلم عند أبي حنيفة إلا بسبع شرائط: جنس معلوم، كقولنا: حنطة، أو شعير، ونوع معلوم، كقولنا سقية أو نجسية، وصفة معلومة، كقولنا: جيد أو ردي، ومقدار معلوم، كقولنا: كذا كيلا بمكيال معروف، أو كذا وزنا وأجل معلوم، ومعرفة مقدار رأس المال إذا كان يتعلق العقد على مقدار كالمكيل والموزون والمعدود، وتسمية المكان الذي يوفيه فيه إذا كان له حمل ومؤنة. (هداية، باب السلم، أشرفی ديوبند ۳/ ۹۵، الجوهرة النيرة، إمداديه ملتان ۱/ ۲٦٦، دارالكتاب ديوبند ۱/ ۲۵۹، درمختار كراچی ۵/ ۲۱٤، تا ۲۱٦، زكريا ديوبند / ۷/ ٤٦۱ تا ٤٦٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/ ۱۱۷۵)

پیشگی رقم لے کر مبیع کو فروخت کرنے کی چار شکلوں کا حکم

سوال [۸۸۰۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عوام الناس میں یہ طریقہ رائج ہے کہ کسان تجار سے پیشگی رقم لے کر اپنی کھیتی باڑی کے کام میں صرف کرتے ہیں اور تجار سے ایک نرخ مقرر کر لیتے ہیں کہ بازار میں جو بھاؤ ہو مگر ہم تم کو ۵۰۰/ روپئے کوئنٹل گندم دیں گے، یا بازاری نرخ سے سو روپئے کم میں گندم دیں گے،

گندم کی نوع وجنس مقام سب کچھ مقرر ہو جاتا ہے، اس طرح پیشگی رقم دے کر کم نرخ میں کیل گندم دینا یا بھٹے والے طے کر لیتے ہیں کہ رقم پیشگی دے دو، جب بھٹہ کی نکاسی ہوگی تو پیشگی رقم دینے والے کو ۲۰۰ر فی ہزار کم اینٹ دی جائے گی، یا بھینس والے دودھ کے خریدار سے پیشگی رقم لے لیں کہ جب بھینس بیائے گی تو تم کو دودھ عام قیمت سے دو روپئے کم فی کیلو دیا جائے گا، یہ شکلیں جواز کی ہیں یا نہیں؟

المستفتی: حاجی ضمیر احمد شیر کوٹ، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) سوال میں چار شکلیں ذکر کی گئی ہیں: (۱) کسان سے پانچ سو روپئے فی کوئنٹل پر بات متعین ہوگئی ہے، یہ شکل بیع سلم کے دائرہ میں داخل ہو کر جائز ہوگئی۔

(۲) فصل کے زمانہ میں فصل کا جو بھی بھاؤ ہوگا اس سے سو روپئے کم میں دیا جائے گا، یہ شکل غلہ کی قیمت صحیح طور پر متعین نہ ہونے کی وجہ سے جائز نہ ہوگی۔

(۳) بھٹہ کی نکاسی کے وقت میں ایک ہزار اینٹ دو سو روپئے فی ہزار کم کی شرط بھی جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ نکاسی کے وقت میں ایک ہزار اینٹ کی قیمت کتنی ہوگی یہ اس معاملہ کے وقت متعین نہیں ہے، ہاں البتہ اگر یوں معاملہ کیا جاتا کہ بھٹہ کی نکاسی کے وقت میں بارہ سو اینٹ کی قیمت کا جو اندازہ ہوسکتا ہے اس اندازہ سے کم کر کے ایک ہزار اینٹ کی قیمت اسی وقت متعین کر لی جائے تب جائز ہوسکتا ہے۔

(۴) یہ شکل بھی دودھ کی قیمت صحیح طور پر متعین نہ ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ دودھ لینے کے زمانہ میں عام قیمت کیا ہوگی وہ آج معلوم نہیں ہے۔

وجملة الشروط جمعوها في قولهم إعلام رأس المال، وتعجيله، وإعلام المسلم فيه، وتأجيله، وبيان مكان الإيفاء والقدرة على تحصيله، فإن أسلم مائتي درهم في كرّ حنطة مائة منها دين على المسلم إليه ومائة

نقد، فالسلم في حصة الدين باطل لفوات القبض، ويجوز في حصة النقد لاستجماع شرائطه. الخ (هداية، كتاب البيوع، باب السلم، أشرفي ديوبند ٣/ ٩٧، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ١٤٥) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۷؍رجب ۱۴۱۹ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۵۸۴۷)

مال کے لئے آرڈر دے کر نہ لینے کا حکم

سوال [۸۸۰۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ضروری گزارش یہ ہے کہ ایک شخص ثمین یورپ کے کسی ملک میں رہتا ہے، دوسرا شخص ہندوستانی ہے ثمین نے ہم سے پانچ لاکھ روپئے کا سامان تیار کرنے کے لئے کہا اور ایک لاکھ روپئے نقد دیئے، ہم نے آرڈر لے لیا اور ایک لاکھ روپئے بھی لے لئے، ہم نے ہندوستان میں مال تیار کروالیا، اب ہم نے مال کی تیاری کے بعد ثمین سے کہا کہ اپنا مال منگوا لیجئے مال تیار ہے، مال کی تیاری کے بعد ثمین کہتا ہے کہ کسی مجبوری میں مال نہیں لوں گا، میرا ایک لاکھ روپئے واپس بھیج دیجئے، ادھر ہم ایک لاکھ سے زائد رقم لگا کر تقریباً پانچ لاکھ کا مال تیار کروا چکے ہیں، ایسے میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ہم ثمین کو وہ ایک لاکھ روپئے کی رقم واپس کرنے کے مکلّف ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر ہم تو اس سے زائد رقم مال کی تیاری میں خرچ کر چکے ہیں، اس نقصان کی تلافی کا کون ذمہ دار ہوگا؟ اور کیا صورت ہوگی؟ اور اگر واپسی کے مکلّف نہیں ہیں تب پھر مال مصنوع کا کون مالک ہوگا؟ اگر ہم ہی مالک ہے تو کیا اس کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کا اختیار ہے؟ تشفی بخش جواب مطلوب ہے۔

المستفتی: مظاہر حسین، مدرسہ شاہی مراد آباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب پانچ لاکھ کا مال تیار کرنے کے لئے پیشگی ایک لاکھ

روپئے دے کر آرڈر فائنل کر دیا ہے اور اسی کے مطابق ہندوستان میں مال تیار کروا لیا ہے، اس کے بعد یورپ والا شخص مال لینے سے معذرت خواہی کر رہا ہے، تو ایسی صورت میں تیار شدہ مال نہ بھیجنے سے تیار کرنے والے کا بڑا نقصان ہوسکتا ہے؛ اس لئے اس کو یہ حق ہے کہ یورپ والے شخص کو مال لینے پر مجبور کرے۔ اور اگر وہ لینے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہے، تو وصول شدہ ایک لاکھ روپئے میں سے نقصان کے بقدر تلافی نقصان کے لئے لے سکتا ہے۔ اور بقیہ روپئے واپس کر دینا ضروری ہوگا۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ زکریا ۳/۱۴۱)

لا خيار لهما أما الصانع فلما ذكرنا أولا، وأما المستصنع فلأن الصانع أتلف ماله بقطع الصرم وغيره ليصل إلى بدله، فلو ثبت له الخيار تضرر الصانع؛ لأن غيره لا يشتريه بمثله، ألا ترى! أن الواعظ إذا استصنع منبرا ولم يأخذه فالعامي لا يشتريه أصلا. (عناية مع الفتح، باب السلم قبيل مسائل نشوره، كوئٹه ٦/ ٢٤٤، زكريا ديوبند ٧/ ١٠٩)

إذا أتى الصانع بالمستصنع على الصفة المشروطة روي عن أبي يوسف إنه لازم في حقهما حتى لا خيار لأحدهما لا للصانع ولا للمستصنع أيضا، إن في إثبات الخيار للمستصنع إضرارا بالصانع؛ لأنه قد أفسد متاعه، وأتى بالمستصنع على الصفة المشروطة، فلو ثبت له الخيار لتضرر به الصانع فيلزم دفعا للضرر عنه. (بدائع الصنائع، باب حكم الاستصناع، زكريا ديو بند ٤/ ٤٤٤)

عن أبي يوسف أنه لا خيار لواحد منهما، أما الصانع فلما ذكرنا، وأما المستصنع فلأن في إثبات الخيار له إضرارا بالصانع فربما لا يرغب فيه غيره. (تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٤/ ١٢٤، زكريا ديوبند ٤/ ٥٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸/ ذیقعدہ ۱۴۲۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۳۹۴)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۷/۱۱/۱۴۲۲ھ

تاریخ اور کھیت متعین کئے بغیر فصل سے پہلے گیہوں خریدنا

سوال [۸۸۱۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عبدالرحیم نے فصل سے پہلے سو روپئے کوئنٹل گیہوں کے لئے روپئے پہلے ہی ادا کردئے، تاریخ کوئی مقرر نہیں کی کہ کب تک گیہوں لینا ہے اور کس کھیت کا گیہوں لینا ہے، صرف گیہوں طے کئے، اس طرح پہلے روپئے دے کر اور بھاؤ بازار سے کم شرح پر گیہوں طے کرنا عبدالرحیم کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ بیع سلم کی صورت ہے اور بیع سلم کے جواز کے لئے چند شرطیں لازم ہیں جن کے بغیر صحیح نہیں ہوسکتی:

(۱) جس چیز کی بیع کی جارہی ہے اس کی جنس معلوم ہونا (۲) اس کی قسم معلوم ہونا (۳) اس کی صفت معلوم ہونا (۴) اس کی مقدار معلوم ہونا (۵) ادائے گی کی مدت معلوم ہونا (۶) نرخ معلوم ہونا (۷) ادائے گی کی جگہ معلوم ہونا۔ صورت مذکورہ میں شرط نمبر: ۲، ۳، ۵، ۷/ مفقود ہیں؛ اس لئے ناجائز ہے۔

وشرطه بيان الجنس، والنوع، والصفة، والقدر، والأجل، وأقله شهر، وقدر رأس المال في المكيل والموزون والمعدود، ومكان الإيفاء فيما له حمل من الأشياء. (كنز الدقائق مع البحر، كتاب البيوع، باب السلم، كوئٹه ٦/ ١٦٠، زكريا ٦/ ٢٦٥، درمختار كراچى ٥/ ٢١٤-٢١٦، زكريا ديوبند ٧/ ٤٦١-٤٦٤، الفقه على المذاهب الأربعة، دارالفكر بيروت ٢/ ٣٠٤، بدائع الصنائع، كراچى ٥/ ٢٠٧، زكريا ديوبند ٤/ ٤٤٠، هداية أشرفي ديوبند ٣/ ٩٥)

لہٰذا دوبارہ شرائط مذکورہ کے مطابق عقد کرنا لازم ہوگا یا فسخ کردیں۔ فقط واللہ سبحانہ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲/ ربیع الاول ۱۴۰۸ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۳/ ۵۸۶)

فصل کاٹنے سے پہلے کاشتکار کو روپئے دینے کا حکم

سوال [۸۸۱۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فصل کاٹنے سے پہلے ایک امام کا کاشتکاروں کو اس شرط پر روپئے دینا اور یہ کہنا کہ بازاری ریٹ جو بھی نکلے اس سے ہمیں کوئی مقصد نہیں ہے، بازاری ریٹ سے پچاس روپئے کم میں مال لوں گا، اگر اس طرح کوئی امام تجارت کرے تو اس امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟

المستفتی: ابودرداء، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ بیع سلم ہے، جس کے شرائط میں یہ ہے کہ معاملہ طے کرتے وقت بھاؤ متعین کرلیا جائے اور مذکورہ صورت میں بھاؤ متعین نہیں ہوا ہے، جس کی وجہ سے قیمت مجہول ہوگئی ہے؛ لہٰذا قیمت مجہول ہونے کی وجہ سے یہ معاملہ ناجائز ہے، ممکن ہے امام صاحب نے ایسا معاملہ عدم علم کی وجہ سے کیا ہو ان کو بتا دیا جائے کہ معاملہ کے وقت بھاؤ متعین کرلینا اور آپس کی رضامندی سے جو بھی ریٹ متعین ہوجائے اس کے مطابق عمل کرنا جائز ہے، چاہے بازاری بھاؤ سے بہت ہی کم کیوں نہ ہو۔ اور امام صاحب اگر سابقہ معاملہ سے باز آجائیں اور آئندہ ایسا معاملہ نہ کریں، تو ان کے پیچھے نماز بلا کراہت جائز اور درست ہوگی۔ (فتاوی محمودیہ ۶/۲۸۱، جدید ڈابھیل ۱۶/۲۰۴، ایضاح النوادر ۱/۲۲)

ولا یصح السلم عند أبي حنیفة إلا بسبع شرائط (إلی قوله) ومعرفة رأس المال. (هدایة، کتاب البیوع، باب السلم أشرفي دیوبند ۳/ ۹۵، کنز الدقائق مع البحر کوئٹه ۶/ ۱۶۰، زکریا ۶/ ۲۶۵، درمختار کراچی ۵/ ۲۱۴-۲۱۶، زکریا ۷/ ۴۶۱-۴۶۴، الفقه علی مذاهب الأربعة، دارالفکر بیروت ۲/ ۳۰۴، بدائع الصنائع، کراچی ۵/ ۲۰۷، زکریا ۴/ ۴۴۰)

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲ رجمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/۴۸۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲/۵/۱۴۱۷ھ

فصل کی کٹائی سے پہلے سو روپئے کوئنٹل گیہوں خریدنا

سوال [۸۸۱۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عبداللہ صاحب فصل سے پہلے لوگوں کو سو روپئے کوئنٹل گیہوں یا دھان پر پیسے دیتے ہیں، یعنی ایک مہینے پہلے پیسے دیتے ہیں اور فصل میں اناج وصول کرتے ہیں، یہ پیسے دینا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: عبدالمجید ہدایت پور، ضلع بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: یہ شرعاً بیع سلم ہے، جو شرعاً جائز ہے۔

فالسلم عقد يثبت به الملك في الثمن عاجلا، وفي المثمن آجلا. (عالمگيري، كتاب البيوع، الباب الثامن عشر في السلم، زكريا قديم ٣/ ١٧٨، جديد ٣/ ١٧١)

وقوله: وأما بيان حكم السلم فهو ثبوت الملك لرب السلم في المسلم فيه مؤجلا بمقابلة ثبوت الملك في رأس المال المعين، أو الموصوف معجلا للمسلم إليه. (فتاوى عالمگيري، زكريا قديم ٣/ ١٨١، جديد ٣/ ١٧٣، درمختار كراچى ٥/ ٢٠٩، زكريا ٧/ ٤٥٥)

اس میں یہ لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ ایک کوئنٹل گیہوں کس قسم کا ہے؟ کب ادا کرے گا؟ بوقت معاملہ عادل کے سامنے تحریر بھی کر لینا چاہئے، تاکہ بعد میں کوئی اختلاف نہ پیدا ہو۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳ رصفر ۱۴۱۰ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۵۴۲/۲۳)

بیع سلم میں مسلم فیہ کی مقدار کا متعین نہ ہونے کا حکم

سوال [۸۸۱۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: خریدار نے کسان سے پیشگی رقم اس شرط پر لی یا دی کہ فصل کے موقع پر جو بھی بازار کا بھاؤ ہوگا، اس سے کچھ کم پر لوں گا، تو کیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: نصیر احمد قاسمی بھاگلپوری

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: اس میں مسلم فیہ کی مقدار متعین نہ ہونے کی وجہ سے بیع جائز نہ ہوگی۔

وشروطه: أي شروط صحته التي تذكر في العقد سبعة: بيان جنس، ونوع، وصفة، وقدر -إلى- وبيان قدر رأس المال. (تنوير الأبصار مع الدر المختار، كتاب البيوع، باب السلم، كراچی ٥/ ٢١٤-٢١٥، زكريا ٧/ ٤٦١، ٤٦٢، هداية أشرفي ديوبند ٣/ ٩٥، هندية، زكريا قديم ٣/ ١٧٩، جديد ٣/ ١٧٢) **فقط** واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹ رصفر المظفر ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۱۴۴/۲۴)

بیع سلم کی ایک صورت

سوال [۸۸۱۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: فصل آنے سے پہلے ایک شخص ۱۵۰ر روپئے فی کوئنٹل کے حساب سے کسی مجبور انسان کو اس شرط پر دیتا ہے کہ جب فصل آئے تو مجھ کو غلہ دے دینا، جب کہ فصل میں سرکاری ریٹ

۲۲۰/ دوسوبیس روپئے فی کوئنٹل پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے، تو کیا اس طرح پیشگی روپئے دے کر معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ فقط

المستفتی: نسیم احمد، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: صورت مسئولہ شرعاً بیع سلم میں داخل ہے اور بیع سلم کا مطلب یہی ہے کہ پیسہ والا مالدار شخص پیسوں سے مجبور شخص کو اس شرط پر پیسہ دے دے کہ فصل پر طے شدہ معاہدہ کے مطابق غلہ حاصل کرے، چاہے طے شدہ معاہدہ میں غلہ کی قیمت فصل کے بھاؤ کے بنسبت بہت کم کیوں نہ ہو اور اس طرح معاہدہ اور معاملہ کرنا قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔

عن ابن عباس – رضي الله عنه – قال: قدم رسول الله ﷺ المدينة وهم يسلفون بالثمر السنتين والثلاث، فقال رسول الله ﷺ: من أسلف في شيء ففي كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم. (صحيح البخاري، كتاب السلم ۱/ ۲۹۹، رقم: ۲۱۸۸، ف: ۲۲۴۰، صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب السلم، النسخة الهندية ۲/ ۳۱، بيت الأفكار، رقم: ۱۶۰۴)

السلم عقد مشروع بالكتاب وهو آية المداينة ...... قوله عليه السلام: من أسلم منكم فليسلم في كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم. (هداية، كتاب البيوع، باب السلم، اشرفي ديوبند ۳/ ۹۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷/ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۶/ ۲۱۷۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۱/۳/۲۷ھ

بیع سلم کی ایک جائز صورت

سوال [۸۸۱۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: ہماری طرف عام طور سے لوگ پیشگی رقم اس شرط پر لیتے ہیں، مثلاً دھان کا موسم ہے تو پیشگی رقم لے لی اور یہ طے کرلیا کہ اس وقت آپ کو ساٹھ ستر روپئے من دھان دوں گا۔

المستفتی: نصیر احمد قاسمی، بھاگلپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر معاملہ اس طرح پر کیا جاتا ہے کہ مثلاً ساٹھ روپئے اس وقت وصول کر لئے جائیں اور ایک یا دو ماہ کے بعد فصل کے موقع پر ایک من دھان دیا جائے گا تو یہ شرعاً بیع سلم ہے اور جائز ہے۔

ولا يصح السلم عند أبي حنيفة إلا بسبع شرائط: جنس معلوم، كقولنا: حنطة، أو شعير، ونوع معلوم، كقولنا سقية أو نجسة، وصفة معلومة، كقولنا: جيد أوردي، ومقدار معلوم، كقولنا: كذا كيلا بمكيال معروف. الخ (هداية، كتاب البيوع، باب السلم، أشرفی ديو بند ٣/ ٩٥، كنز الدقائق مع البحر، كوئٹه ٦/ ١٦٠، زكريا ٦/ ٢٦٥، درمختار كراچی ٥/ ٢١٤، زكريا ديو بند / ٧/ ٤٦١، بدائع الصنائع، كراچی ٥/ ٢٠٧، زكريا ديوبند ٤/ ٤٤٠)

وفي الهندية: الرابع: أن يكون معلوم القدر بالكيل أو الوزن. (فتاوى عالمگيري زكريا قديم ٣/ ١٧٩، جديد ٣/ ١٧٢) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹؍صفر ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۴/۱۱۴۴)

بیع سلم کا مشہور معاملہ

سوال [۸۸۱۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید ایک کاشتکار ہے، اسے کچھ روپیوں کی ضرورت ہے، اس نے ایک تاجر سے معاملہ کیا کہ وہ اسے پانچ ہزار روپئے دے دے غلہ کی فصل آنے پر وہ اسے پانچ کوئنٹل غلہ دے دے گا،

چاہے اس وقت غلہ کا بھاؤ کچھ بھی ہو، تو کیا اس طرح کا معاملہ کرنا شرعاً درست ہے؟

المستفتی: رکن الدین پا کبڑہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: سوال نامہ میں ذکر کردہ معاملہ بیع سلم کا معاملہ ہے۔ اور اس طرح رقم دے کر وقت مقررہ پر متعین مقدار غلہ لینا شرعاً جائز اور درست ہے، غلہ کی وصولیابی کے دن اس کی موجودہ قیمت کا کوئی اعتبار نہیں۔

أخرج البخاري عن ابن عباس –رضي الله عنه– حديثا طويلا طرفه هذا: من سلف في تمر فليسلف في كيل معلوم، ووزن معلوم. (الحديث) وأخرج أيضا تعليقا عن ابن عمر –رضي الله عنه– قال: لا بأس بالطعام الموصوف بسعر معلوم إلى أجل معلوم. (بخاري، كتاب السلم، باب السلم في كيل معلوم ۱/ ۲۹۸، رقم: ۲۱۸۷، ف: ۲۲۳۹، باب السلم إلى أجل معلوم ۱/ ۳۰۰، رقم الباب: ۷، صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب السلم، النسخة الهندية ۲/ ۳۱، بيت الأفكار، رقم: ۱۶۰۴)

بيع السلم: هو شرعاً بيع أجل، وهو المسلم فيه بعاجل وهو رأس المال. (شامي، كتاب البيوع، باب السلم، كراچی ۵/ ۲۰۹، زكريا ۷/ ۴۵٤، هندية، زكريا قديم ۱۷۸، جديد ۳/ ۱۷۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۴؍ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۹۹۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۳۱/۴/۶ھ

قیمت کی ادائے گی کے چھ ماہ بعد مال وصول کرنا

سوال [۸۸۱۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید لوہے کا کاروبار کرتا ہے، خالد نے لوہے کا سریا خریدنے کے لئے تین ہزار روپے

کوئنٹل کے حساب سے پیسے جمع کئے اور سریا کون سی کمپنی کا ہوگا، کتنے سوت کا ہوگا سب باتیں طے ہوگئیں اور چھ مہینے کے بعد لینا طے ہوگیا۔ اور ایک بات یہ طے ہوئی کہ اگر چھ مہینے کے بعد سریے کی قیمت چار ہزار روپئے کوئنٹل بھی ہوگئی تب بھی تین ہزار روپئے کوئنٹل ہی کے حساب سے لین دین ہوگا، اس کے ساتھ زید جو بائع ہے، اس نے خالد سے کہا: اگر چھ مہینے کے بعد سریے کی قیمت تین ہزار سے کم ہوگئی، تو میں آپ سے کم ہی کے پیسے لوں گا، اس پر معاملہ طے ہوگیا، معلوم یہ کرنا ہے، کیا یہ معاملہ بیع وشراء کا درست ہے؟

المستفتی: سعید احمد امام مسجد کاشی واڑی پونہ، مہاراشٹر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامہ میں مذکورہ معاملہ خرید وفروخت کی ایک قسم بیع سلم کا معاملہ ہے اور بیع سلم میں رأس المال یعنی قیمت کا متعین اور حتمی ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اور ذکر کردہ صورت میں فریقین کے درمیان قیمت کی حتمی تعیین نہیں ہوئی؛ بلکہ یہ طے قرار پایا ہے کہ چھ مہینے بعد مال کی سپردگی کے وقت اگر اس کی قیمت مقرر کردہ قیمت سے کم ہوگئی ہو تو خریدار خالد کو اسی کے حساب سے قیمت ادا کرنی ہوگی۔ اور اسی شرط کے ساتھ معاملہ ہوا، بریں بنا یہ معاملہ قیمت کی عدم تعیین اور جہالت کے سبب ناجائز قرار دیا جائے گا؛ البتہ اگر اس طرح کی شرط نہ لگائی ہو بلکہ صرف یہ طے ہوا ہو کہ تین ہزار روپئے فی کوئنٹل ادا کردیا جائے اور مال کی سپردگی کے وقت اس کی جو کچھ بھی قیمت ہو اس کا اعتبار نہ کیا جائے، تو یہ معاملہ جائز اور درست ہوگا۔

يشترط بيان قدر رأس المال. (كنز الدقائق، كتاب البيوع، باب السلم، درمختار كراچى ٥/ ٢١٥، زكريا ٧/ ٤٦٢، هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٩٥)

شرطه: بيان قدر رأس المال إذا كان العقد يتعلق على مقداره. (تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٤/ ١١٦، زكريا ٤/ ٥١٠) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۲۲۰/۳۹)

دھان پر پیسہ دینا

سوال [۸۸۱۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: دھان پر پیسہ دینا اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ستمبر، اکتوبر کے مہینے میں ہمارے یہاں مزدور لوگ مزدوری نہ ملنے کی وجہ سے مالداروں سے قرض لینے جاتے ہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ قرض اس شرط پر دوں گا کہ ابھی پچاس روپئے لے جاؤ دو ماہ بعد جب دھان کی فصل کٹے گی تو ایک من دھان لوں گا، حالانکہ جس وقت روپئے دے رہا ہے اس وقت ایک من دھان کی قیمت ۳۰۰/ روپئے ہے۔ اور جس وقت دھان لے گا اس وقت بھی کم از کم ایک من دھان ۱۵۰/ روپئے کا ہوگا، یعنی قرض کے اس پچاس روپئے کا دھان کی قیمت سے کچھ بھی برابری نہیں ہے؛ لیکن بیچارے غریب لوگ مجبوراً لیتے ہیں، تو کیا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے؟ ہمارے علاقہ میں یہ سودی معاملہ مشہور ہے۔

المستفتی: محمد عبداللہ رشیدی جامعہ اشاعت سنیہ رام گنج، مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ بیع سلم کی شکل ہے کہ مزدور نے مالدار سے پچاس روپئے اس شرط پر لئے کہ دھان کی فصل آنے پر وہ ایک من دھان اس مالدار کو دے گا، تو یہ شرعاً جائز اور درست ہے۔ اور علاقہ والوں کا اس کو سودی معاملہ کہنا شرعی مسئلہ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

وشرطه: قبض رأس المال قبل أن يتفرقا؛ لأن السلم ينبئ عن أخذ عاجل بآجل، وذلک بالقبض قبل الافتراق. (البحرالرائق، کتاب البيوع، باب السلم، کوئٹه ٦/ ١٦٢، زکريا ٦/ ٢٧١، هداية، أشرفي ديوبند ٣/ ٩٦، درمختار، کراچی ٥/ ٢١٦، زکريا ٧/ ٤٦٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/ ۷۶۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۹ھ

بیع سلم میں روپئے کے عوض دھان لینے کی شرط کا حکم

سوال [۸۸۱۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) گیہوں کے سلسلہ میں ہم لوگ یہ کاروبار کرتے ہیں کہ ہم نے کسی سے کہا کہ ہمیں پچاس ہزار روپئے دے دو، ہم تمہیں اس کے عوض میں گیہوں دے دیں گے، مثلاً ۵۰۰/ روپئے کے حساب سے ۱۰۰/کوئنٹل گیہوں دیں گے، پھر بعض دفعہ گیہوں کے ریٹ کم زیادہ ہوتے ہیں، تو روپئے لینے والا دیتے وقت گیہوں کی جو قیمت (ریٹ) ہوتے ہیں اسی حساب سے دیتا ہے، تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

(۲) اس مسئلہ میں ایک بات یہ بھی دریافت طلب ہے کہ اگر گیہوں دے تو ۱۰۰/کوئنٹل جو طے ہیں، اتنے ہی دینے پڑیں گے، یا ادائے گی کے وقت جو ریٹ ہوں گے اس کے حساب سے پچاس ہزار روپئے کے گیہوں کم یا زیادہ دے سکتے ہیں؟

(۳) اور اگر روپئے لینے والا گیہوں ادا نہ کر کے صرف ادائے گی کے وقت ریٹ لگا کر ۱۰۰/ کوئنٹل کی رقم ادا کرے جو پچاس ہزار سے کم بھی ہوسکتی ہے، زیادہ بھی ہوسکتی ہے، تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: شرف الدین ہیبت پور، جویا، جے پی نگر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر روپیوں کا معاملہ کرتے وقت مجلس عقد میں گیہوں وغیرہ کی مقدار نیز ان کا وصف ادائے گی کا مقام بیان کر دیا جائے تو یہ معاملہ شرعاً بیع سلم کے دائرہ میں داخل ہو کر جائز ہوتا ہے۔ اور اگر معاملہ کے وقت مذکورہ شرائط واضح نہ ہوں، تو پھر معاملہ درست نہ ہوگا؛ لہٰذا سوال نامہ میں جو شقیں لکھی گئیں ہیں ان میں سے جس شق میں یہ بات مذکور ہے کہ آپ ہم کو پچاس ہزار روپئے دے دو ہم آپ کو سو کوئنٹل گیہوں دیں گے، یہ معاملہ بیع سلم کے دائرہ میں داخل ہو کر جائز ہوگا، ادائے گی کے وقت گیہوں کا بھاؤ کم وزیادہ

کچھ بھی ہو اس کا اعتبار نہیں ہے، سو کوئنٹل ہی ادا کرنے ہوں گے، باقی جو شقیں سوال نامہ میں درج ہیں ان میں سے کوئی بھی شق شرعاً جائز نہیں ہے۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قدم رسول الله ﷺ المدينة وهم يسلفون بالثمر السنتين والثلث، فقال رسول الله ﷺ: من أسلف في شيء ففي كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم. (صحيح البخاري، كتاب السلم ۱/ ۲۹۹، رقم: ۲۱۸۸، ف: ۲۲٤۰، صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب السلم، النسخة الهندية ۲/ ۳۱، بيت الأفكار، رقم: ۱٦۰٤، سنن الترمذي، أبواب البيوع، باب ماجاء في السلف في الطعام والتمر، النسخة الهندية ۱/ ۲٤٥، دارالسلام، رقم: ۱۳۱۱)

هو جائز في الميكلات والموزونات لقوله عليه السلام: من أسلم منكم فليسلم في كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم. (هداية، كتاب البيوع، باب السلم، أشرفي ديوبند ۳/ ۹۲، درمختار، كراچی ٥/ ۲۰۹، زكريا ۷/ ٤٥٥، البحرالرائق، كوئٹه ٦/ ۱٥٥، زكريا ٦/ ۲٥۹، مجمع الأنهر، قديم ۲/ ۹۷، جديد دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ؍ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۷۹۹)

قرض کی رقم کے عوض میں دھان لینا

سوال [۸۸۲۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید عمر سے ۳۰۰؍ روپئے قرض لینا چاہتا ہے، عمر یہ شرط رکھتا ہے کہ آپ ان ۳۰۰؍ کے بدلہ ایک کوئنٹل دھان دے دینا جب کہ قرض کے وقت دونوں فریق کو معلوم ہے کہ دھان کا سرکاری بھاؤ پانچ سو روپئے ہے۔ اور جب دھان ادا کرنے ہوں گے، اس وقت بھی پانچ سو

روپئے کوئنٹل کا بھاؤ ہے، تو دریافت یہ کرنا ہے کہ اس طرح قرض کے بدلہ ایک کوئنٹل دھان متعین کرنا، جب کہ وہ قرض پر لی ہوئی رقم سے زائد قیمت کے ہیں، تو یہ شریعت کی روشنی میں جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال میں مذکور معاملہ بیع سلم کے دائرہ میں داخل ہوکر اس وقت جائز ہوسکتا ہے جب کہ معاملہ کرتے وقت دھان کا وصف مثلاً باسمتی، ہنسراج، سرجو باون، سرجو۴۹/ نیز ادائے گی کا مقام وغیرہ بیان کردیا جائے، اگر یہ شرائط عقد کے وقت واضح نہ ہوں، تو پھر یہ معاملہ جائز نہ ہوگا۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قدم رسول الله ﷺ والناس يسلفون، فقال لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أسلف فلا يسلف إلا في كيل معلوم، ووزن معلوم. (صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب السلم، النسخة الهندية ۲/ ۳۱، بيت الأفكار، رقم: ۱۶۰۴، صحيح البخاري، كتاب السلم ۱/ ۲۹۸، رقم: ۲۱۸۷، ف: ۲۲٤۰، سنن الترمذي، أبواب البيوع، باب ماجاء في السلف في الطعام والتمر، النسخة الهندية ۱/ ۲٤۵، دارالسلام، رقم: ۱۳۱۱)

هو جائز في الميكلات والموزونات لقوله عليه السلام: من أسلم منكم فليسلم في كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم. (هداية، كتاب البيوع، باب السلم، أشرفي ديوبند ۳/ ۹۲، درمختار، كراچی ۵/ ۲۰۹، زكريا ۷/ ٤۵۵، البحرالرائق، كوئٹه ٦/ ۱۵۵، زكريا ٦/ ۲۵۹، مجمع الأنهر، قديم ۲/ ۹۷، جديد دارالكتب العلمية بيروت ۳/ ۱۳۸) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۹/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۴/ ۶۷۷۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۶/۱۹ھ

بیع سلم میں روپئے کے عوض دھان لینے کی شرط

سوال [۸۸۲۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے عمر سے پانچ ہزار روپئے کی رقم طلب کی اوراس کے عوض فصل کا دھان پانچ سو روپئے فی کوئنٹل کے حساب سے دس کوئنٹل دھان دینے پر اپنی رضامندی ظاہر کی، اوراس پر دونوں میں اتفاق ہوگیا، جب کہ ابھی دھان بویا جارہا ہےاور فصل آنے میں تین یا چار ماہ باقی ہیں، اس طرح یہ بیع قرآن وحدیث کی روشنی میں جائز ہے یانہیں؟

المستفتی: محمد الیاس نگلیا عاقل، رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ شرعی طور پر بیع سلم ہے جو جائز اور درست ہے۔

وجملة الشروط جمعوها في قولهم: إعلام رأس المال، وتعجيله، وإعلام المسلم فيه، وتأجيله، وبيان مكان الإيفاء، والقدرة على تحصيله.

(هداية، كتاب البيوع، باب السلم، أشرفي ديوبند ۳/ ۹۷) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰ رربیع الاول ۱۴۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۳/ ۵۶۸۶)

ادھار معاملہ میں قیمت میں زیادتی اور بیع سلم سے متعلق ایک سوال

سوال [۸۸۲۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) گیہوں کی قیمت پانچ روپئے ہے، بکر نے زید سے چھ مہینے کے ادھار پر گیہوں خریدے، زید نے بکر کو اس شرط پر گیہوں دیئے کہ آپ کو آٹھ سو روپئے کے دام دینے ہوں گے، یہ معاملہ شریعت کی رو سے جائز ہے یانہیں؟

(۲) بکر نے زید سے آٹھ سو روپئے کے حساب سے ادھار گیہوں خریدے، زید نے اس شرط پر گیہوں دیئے کہ آپ کو تین سو روپئے کے حساب سے مونجی دینی ہوگی، بکر نے اس شرط کو منظور کرلیا؛ حالاں کہ فصل آنے پر مونجی کا بھاؤ پانچ روپئے کو ہے، تو اس طرح بیع کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: شمس الدین علی پور، بجنور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) مسئولہ صورت میں خرید وفروخت کا اس طرح ادھار معاملہ کرنا جائز ہے؛ اس لئے کہ ادھار کی وجہ سے قیمت میں زیادتی کرنا شرعاً وعرفاً درست ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی قدیم ۸/۴۰، جدید زکریا مطول ۱۱/۱۳۴-۱۳۶، امداد الفتاوی ۳/۲۰، محمودیہ قدیم ۱۳/۳۱۳، جدید ڈابھیل ۱۶/۱۵۱، رحیمیہ قدیم ۹/۲۵۲-۲۵۴، جدید زکریا ۹/۱۹۶)

ألا یری! أنه یزاد في الثمن لأجل الأجل. (هدایة، کتاب البیوع، باب المرابحة والتولیة، اشرفی دیوبند ۳/ ۷۴، البحرالرائق، کوئٹه ٦/ ١١٤، زکریا ٦/ ١٩٠، شامي، زکریا ۷/ ۳٦۱، کراچی ٥/ ١٤٢)

(۲) فی نفسہ خرید وفروخت کا سوال میں ذکر کردہ معاملہ فاسد ہے؛ البتہ اگر خرید وفروخت کا معاملہ کرتے وقت تمام گیہوں کی مقدار اور اس کا پیسہ متعین ہو جائے، پھر اس پوری مقدار میں سے تین سو روپئے کے حساب سے فصل میں فی کوئنٹل مونجی وصول کرنے کی بات اسی مجلس میں طے ہو جائے، تو ایسی صورت میں اس کو بدل سلم قرار دے کر بیع سلم کے دائرہ میں داخل کرکے جائز کہا جا سکتا ہے۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قدم رسول الله ﷺ والناس یسلفون، فقال لهم رسول الله صلی الله علیه وسلم: من أسلف فلا یسلف إلا في کیل معلوم، ووزن معلوم. (صحیح مسلم، کتاب المساقاة والمزارعة، باب السلم، النسخة الهندیة ۲/ ۳۱، بیت الأفکار، رقم: ١٦٠٤)

هو جائز في المیکلات والموزونات لقوله علیه السلام: من أسلم

منكم فليسلم في كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم. (هداية، كتاب البيوع، باب السلم، أشرفي ديوبند ٣/ ٩٢، درمختار، كراچی ٥/ ٢٠٩، زكريا ٧/ ٤٥٥، البحر الرائق، كوئٹه ٦/ ١٥٥، زكريا ٦/ ٢٥٩) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۰ رجمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۶۶۴)	۱۴۲۱/۵/۲۰ھ

باغات کی فصل فروخت کرنے کی ایک شکل

سوال [۸۸۲۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) زید نے اپنے آم کے باغ کی فصل کو اس شرط پر فروخت کیا کہ قیمت کے علاوہ خریدار زید کو دو کوئنٹل آم ۵/ روپئے فی کلو کے حساب سے دے گا۔

(۲) یا دوسری صورت میں کل قیمت کے علاوہ دو کوئنٹل آم خریدار مالک باغ زید کو دے گا، ان دونوں صورتوں میں کون سی صورت جائز ہے؟ برائے کرم تحریری جواب سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی: محمد اکبر امام علی مسجد شیر کوٹ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: باغات کی فصل فروخت کرنے کی بہت سی شکلیں ہیں، ان میں سے بعض شکلیں جائز ہیں۔ اور بعض شکلیں ناجائز ہیں۔ سوال نامہ میں جس شکل کا ذکر ہے، اگر یہ جواز کی شکل ہے، تو اس میں فصل کی فروختگی کے ساتھ دو کوئنٹل آم پانچ روپئے فی کلو کے حساب سے لینے کی جو بات کہی گئی ہے، اگر یہ معاملہ اس طرح ہوا ہے کہ فصل کی قیمت الگ سے متعین ہو چکی ہے، پھر الگ سے بائع اور مشتری کے درمیان یہ معاملہ طے ہوا ہے کہ مشتری چونکہ باغ والا بن چکا ہے، پانچ روپئے فی کلو کے حساب سے دو کوئنٹل آم مالک باغ کے ہاتھ فروخت کرنے کی بات طے ہوگئی اور آم کی قسم بھی بیان کردی گئی ہے، دیسی ہے،

دسہری ہے، یا چوسہ ہے وغیرہ اور مالک نے دو کوئنٹل آم کی قیمت معاملہ کے وقت نقد ادا کردی ہے اور آم کے بارے میں یہ شرط نہیں لگائی ہے کہ اسی باغ میں سے دینا ہوگا؛ بلکہ کہیں سے بھی دے سکتا ہے، تو ایسی صورت میں دو کوئنٹل آم کا معاملہ بیع سلم کے دائرہ میں داخل ہوکر جائز ہوجائے گا اور جو شرائط اوپر ذکر کی گئی ہیں، اگر یہ شرائط معاملہ میں موجود نہیں ہیں، تو یہ شکل جائز نہ ہوگی۔

عن ابن عباس –رضي الله عنه– قال: قدم رسول الله ﷺ والناس يسلفون، فقال لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم: من أسلف فلا يسلف إلا في كيل معلوم، ووزن معلوم. (صحيح مسلم، كتاب المساقاة والمزارعة، باب السلم، النسخة الهندية ۲/ ۳۱، بيت الأفكار، رقم: ۱٦۰٤)

هو جائز في الميكلات والموزونات لقوله عليه السلام: من أسلم منكم فليسلم في كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم. (هداية، كتاب البيوع، باب السلم، أشرفي ديو بند ۳/ ۹۲، البحرالرائق، كوئٹه ٦/ ۱۵۵، زكريا ٦/ ۲۵۹)

(۲) یہ صورت اس طرح جائز ہے کہ فصل کی قیمت جو متعین کی گئی ہے۔اور ساتھ میں مالک کو دو کوئنٹل آم دینے کی شرط لگائی ہے، تو دو کوئنٹل آم جزو ثمن بن جائے گا؛ لہٰذا دو کوئنٹل آم اور وہ قیمت جو فریقین کے درمیان طے ہوتی ہے دونوں مل کر فصل کی قیمت بن گئی ہے؛ اس لئے یہ صورت شرعاً معتبر و جائز ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ قدیم ۱۱/ ۲۸٦، جدید ڈابھیل ۱٦/ ۱۰۱)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۵۲۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۹/۳/۱۴۲۱ھ

۱۰/ باب الاستصناع

بیع استصناع

سوال [۸۸۲۴]: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (۱) شہر مالیگاؤں میں کپڑوں کے بنکروں اور بیوپاریوں نیز سوت کے بیوپاریوں کے درمیان ایک طریقۂ تجارت رائج ہے، جسے''فارورڈ ڈیلیوری'' یعنی مستقبل میں مال فراہم کرنے کا طریقہ، اس طرز تجارت میں ہوتا یہ ہے کہ آج مثلاً ۲۵/ جون کو بنکر اور کپڑے کا بیوپاری دونوں آپس میں مستقبل کی کسی تاریخ پر سودا طے کرتے ہیں، اس طور پر کہ بنکر، بیوپاری کو (مثلاً) کپڑے کی ایک سو گانٹھ فلاں تاریخ تک تیار کر کے دے گا، کپڑے کی کوالیٹی، قیمت اور مقدار وغیرہ سب اسی وقت متعین کرلیا جاتا ہے، مدت بسا اوقات متعین کی جاتی ہے اور بعض مرتبہ طے نہیں کی جاتی، اس صورت میں بیوپاری بنکر کو خام مال نہیں دیتا اور نہ ہی پیشگی (ایڈوانس یا ڈپازٹ کے طور پر) کچھ رقم دیتا ہے؛ بلکہ بنکر کو خود ہی خام مال حاصل کر کے آرڈر کے مطابق تیار مال دینا ہوتا ہے، یہ خام مال بنکر کے پاس کبھی موجود ہوتا ہے اور کبھی موجود نہیں ہوتا، خام مال موجود نہ ہونے کی صورت میں بنکر کو یہ مال بازار سے''فارورڈ ڈیلیوری'' ہی کی صورت میں سوت کے بیوپاری سے خریدنا پڑتا ہے اور بیوپاری کے آرڈر کے مطابق بنکر حسب سہولت مال تیار کر کے کئی قسطوں میں دیتا ہے، بیوپاری جب مال وصول کرتا ہے، تو اس کو جانچتا ہے، اگر کپڑے کی کوالیٹی وغیرہ طے شدہ شرائط کے مطابق ہوتی ہیں تو جتنی مقدار میں مال اس کو پہنچتا ہے، اتنے مال کا پیسہ وہ طے شدہ قیمت کے مطابق چیک یا نقد کی صورت میں ادا کر دیتا ہے، بیوپاری جس وقت مال وصول کرتا ہے، تو وہ اس موقع پر طے شدہ قیمت کے مطابق ہی اس مال کا پیسہ دیتا ہے، چاہے اس زمانہ میں اس مال کی بازاری قیمت طے شدہ قیمت کی بہ نسبت بہت گھٹ گئی ہو یا بہت بڑھ گئی ہو۔ اس کے برعکس اگر وہ مال آرڈر اور طے

شدہ شرائط کے مطابق نہ ہوا اور اس میں عیب وغیرہ ہو، تو وہ اس مال کو رد کر دیتا ہے، چنانچہ بنکر کو ازسرنو مال تیار کر کے دینا پڑتا ہے، اور جس مال کو بیوپاری نے رد کر دیا ہے، اسے بنکر کو مجبوراً کم داموں میں نقصان کے ساتھ بازار میں فروخت کرنا پڑتا ہے۔

(۲) کبھی بازار کا بھاؤ اچھا ہو تو بنکر آرڈر سے زیادہ مال تیار کرتا ہے اور دوسرے بیوپاریوں کو اپنی قیمت میں وہ مال دے کر زیادہ نفع حاصل کر لیتا ہے، اس صورت میں یہ بنکر جس بیوپاری سے مستقبل کی تاریخوں میں سودا کر چکا ہوتا ہے، اس کو یا تو معاہدہ کے مطابق مال دے نہیں پاتا یا اگر دیتا ہے، تو مقررہ مقدار سے کم دیتا ہے۔

(۳) اور کبھی ایسا موقع بھی آتا ہے کہ بیوپاری اپنے آرڈر کے مطابق مال لینے سے انکار کر دیتا ہے، یعنی بنکر اس بیوپاری کو جتنی مدت میں مال کی جو مقدار دینے کا پابند ہوتا اس قدر مال تیار ہونے اور مدت پوری ہونے سے پہلے ہی بیوپاری اس معاہدہ کو منسوخ کر دیتا ہے، اس صورت میں اگر اس تیار مال کی قیمت بازار میں اچھی ہو یا وہی قیمت ہو جو دونوں کے درمیان طے ہوئی تھی، تو ٹھیک۔ اور اگر اس قیمت سے کم میں اسے فروخت کرنا پڑے تو بعض بنکر اس کمی کی تلافی کا مطالبہ (ڈیفرینس کے نام سے) بیوپاری سے کرتا ہے اور بیوپاری کو اس کا ضمان اس تلافی اور ڈیفرینس کے نام پر دینا پڑتا ہے، بعض بنکر اس ڈیفرینس کو چھوڑ بھی دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا تینوں صورتوں میں وضاحت طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) یہ کاروبار بیع کی کس قسم سے تعلق رکھتا ہے؟

(۲) اس کاروبار کو ''استصناع'' کا عنوان دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(۳) استصناع کے صحیح ہونے کی شرطیں کیا ہیں؟ اور اس کاروبار میں استصناع کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں یا نہیں؟

(۴) استصناع میں جن باتوں کا ہونا ضروری ہے، ان میں سے اگر کوئی ایک شرط نہ پائی جائے تو اس وقت کیا حکم ہوگا؟

(۵) ''فارورڈ ڈیلیوری'' کے مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق کپڑے اور سوت کی خرید وفروخت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

(٦) معاہدہ کی مدت میں ایک جگہ بیوپاری سے ملے ہوئے مال کے آرڈر سے زیادہ مقدار میں مال تیار کرنا اور اسے کسی اور بیوپاری کے ہاتھوں زیادہ منافع کے ساتھ فروخت کرنا، تاکہ نفع زیادہ حاصل ہو اور جس بیوپاری سے معاہدہ ہے، اس کو معاہدہ کی مدت میں مال نہ دینا یا طے شدہ مقدار سے کم مال دینے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اس طریقہ سے حاصل ہونے والا نفع حلال ہوگا یا حرام؟

(۷) بیوپاری اگر اپنے آرڈر کا پورا مال لینے سے انکار کردے اور مدت پوری ہونے سے پہلے معاہدہ کو توڑ دے، تو پھر وہ مال کم قیمت میں فروخت ہونے کی صورت میں بیوپاری سے اس فرق کی رقم بطور ڈیفرینس لی جاسکتی ہے یا نہیں؟ فقط والسلام—**بینوا بالکتاب والسنة توجروا إن شاء الله تعالىٰ**—

المستفتی: الحاج محمد ایوب، مالیگاؤں

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: سوال نامہ میں ذکر کردہ طریقۂ تجارت میں بیع استصناع کی شکل معلوم ہوتی ہے۔ اور بیع استصناع کے صحیح ہونے کے لئے مبیع کی جنس ونوعیت اور مقدار وصف کا اس طرح معلوم ہونا شرط ہے کہ مبیع مکمل طور پر متعین ہوجائے؛ لہٰذا سوال میں ذکر کردہ طریقۂ تجارت کے مطابق معاملہ کرنا شرعاً صحیح اور درست ہے۔

إنما جاز الاستصناع فيما للناس فيه تعامل إذا بين وصفا على وجه يحصل التعريف. (هندية، كتاب البيوع، الباب التاسع عشر، مطلب الاستصناع، زكريا قديم ٣/ ٢٠٧، جديد ٣/ ١٩٥)

أما صورة الاستصناع فهي أن يقول إنسان لصانع من خفاف أو صفار أو غيرهما: إعمل لي خفا، أو آنية من أديم، أو نحاس من عندك بثمن كذا، ويبين نوع ما يعمل، وقدره، وصفته، فيقول الصانع: نعم. (بدائع الصنائع، كتاب الاستصناع، كراچی ٥/ ٢، زكريا ديوبند ٤/ ٩٣)

أما شرائط جوازه: فمنها: بيان جنس المصنوع، ونوعه، وقدره، وصفته؛ لأنه لا يصير معلوما بدونه. (بدائع الصنائع، زكريا ديوبند ٤/ ٩٤)

صانع کا مال تیار کر کے مستصنع یعنی بیوپاری کے علاوہ دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا شرعاً درست ہے؛ اس لئے کہ وہ اسی کا مال ہے، وہ اپنا مال کسی کے بھی ہاتھ فروخت کرسکتا ہے؛ لیکن اس نئے آرڈر دینے والے کے ساتھ وعدہ خلافی اور دھوکہ کا معاملہ کیا ہے؛ اس لئے وہ سخت گنہ گار ہوگا۔

عن عبدالله قال: قال رسول الله ﷺ: لا دين لمن لا عهد له، والذي نفس محمد بيده لا يستقيم دين عبد حتى يستقيم لسانه، ولا يستقيم لسانه حتى يستقيم قلبه. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي بيروت ١٠/ ٢٢٧، رقم: ١٠٥٥٣)

فيجبر الصانع على عمله، ولا يرجع الآمر عنه. (الدرالمختار، مطلب في الاستصناع زكريا ٧/ ٤٧٥، كراچى ٥/ ٢٢٤)

وأما بعد الفراغ من العمل قبل أن يراه المستصنع، فكذلك حتى كان للصانع أن يبيعه ممن شاء. (بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٩٤، هندية، زكريا قديم ٣/ ٢٠٨، جديد ٣/ ١٩٥، هداية أشرفي ديوبند ٣/ ١٠١)

(۳) بیوپاری کے لئے مدت پوری ہونے سے پہلے معاملہ کو ختم کرنے کا حق ہے اور اس وقت نقصان کی صورت میں کاریگر کے لئے بیوپاری پر کوئی ضمان لازم نہ ہوگا؛ لیکن اس میں کاریگر کو نقصان ہو رہا ہے اور بیوپاری کی طرف سے وعدہ خلافی اور دھوکہ بھی ہے؛ اس لئے بیوپاری سخت گنہگار ہوگا۔

عن عبدالله قال: قال رسول الله ﷺ: لا دين لمن لا عهد له، والذي نفس محمد بيده لا يستقيم دين عبد حتى يستقيم لسانه، ولا يستقيم لسانه حتى يستقيم قلبه. (المعجم الكبير للطبراني، دار إحياء التراث العربي بيروت ١٠/ ٢٢٧، رقم: ١٠٥٥٣)

فيجبر الصانع على عمله، ولا يرجع الآمر عنه. (الدرالمختار، مطلب في الاستصناع زكريا ٧/ ٤٧٥، كراچی ٥/ ٢٢٤)

مذکورہ بالا تحریر میں سوال کے اندر ذکر کردہ تمام شقوں کے جوابات آگئے ہیں؛ اس لئے ہر شق کو الگ الگ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
٢٦؍محرم الحرام ١٤٣١ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ٣٨/٩٨٦٧)	٢٦/١/١٤٣١ھ

عقدِ استصناع کا مدار عرف وتعاملِ ناس پر ہے یا نصوص پر؟

سوال [٨٨٢٥]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: عقدِ استصناع کا مدار نصوص پر ہے یا عرف وتعامل ناس پر؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: عقدِ استصناع کا مدار عرف اور تعاملِ ناس پر ہے، نصوص پر نہیں ہے؛ بلکہ نصوص سے اصول حاصل کیا گیا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انگوٹھی بنوانے کی حدیث سے اصول مل گیا ہے۔

عن نافع أن عبدالله -رضي الله عنه- حدثه أن النبي صلى الله عليه وسلم اصطنع خاتما من ذهب، وجعل فصه في بطن كفه إذا لبسه، فاصطنع خواتيم من ذهب فرقي المنبر، فحمد الله وأثنى عليه، فقال: إني كنت اصطنعته، وإني لا ألبسه فنبذه، فنبذ الناس، وقال جويرية: ولا أحسبه إلا قال في يده اليمنى. (بخاری شریف ٢/ ٨٧٣، رقم: ٥٦٤٧)

عن أنس بن مالك -رضى الله عنه- قال: اصطنع رسول الله صلى الله عليه وسلم خاتما، فقال: إنا قد اصطنعنا خاتما، ونقشنا فيه نقشا فلا

ینقش أحد علیه. (مسند أحمد ۳/ ۱۰۱، رقم: ۱۲۰۱۲، السنن الکبری للنسائي، دارالکتب العلمیة بیروت ۵/ ٤٥٦، رقم: ۹٥٤٥)

ولکنا جوزناه إستحسانا للتعامل الراجع إلی الإجماع العمليّ من لدن رسول الله صلی الله علیه وسلم إلی الیوم بلا نکیر، والتعامل بهذه الصفة أصل مندرج في قوله صلی الله علیه وسلم: لا تجتمع أمتي علی ضلالة. (فتح القدیر، کتاب البیوع، باب السلم، کوئٹه ٦/ ۲٤۲، زکریا ۷/ ۱۰۷)

جاز لأن الناس تعاملوه في سائر الأعصار من غیر نکیر، فکان إجماعا منهم علی الجواز. (بدائع الصنائع زکریا ٤/ ٤٤٤)

أما الاستصناع فبالتعامل ومخصوص مما فیه تعامل. (البحرالرائق، کوئٹه ٦/ ۱۷۱، مکتبه دارالکتاب ٦/ ۲۸٥)

أما الاستصناع: فللإجماع الثابت بالتعامل من لدن النبي إلی یومنا هذا، وهو من أقوی الحجج. (تبیین الحقائق، زکریا ٤/ ٥۲٦، إمدادیه ملتان ٤/ ۱۲۳)

وجه الاستحسان الإجماع الثابت بالتعامل، فإن الناس في سائر الأعصار تعارفوا الاستصناع فیما فیه تعامل من غیر نکیر، والقیاس یترک بمثله کدخول الحمام. (عنایة مع فتح القدیر، مکتبه أشرفیه ۷/ ۱۰۸، کوئٹه ٦/ ۲٤۲، الموسوعة الفقهیة ۳/ ۳۲۹)

عن أنس بن مالک -رضي الله عنه- قال: اصطنع رسول الله صلی الله علیه وسلم خاتما فقال: إنا قد اصطعنا خاتما ونقشنا فیه نقشا فلا ینقش أحد علیه. (السنن الکبری للنسائي، دارالکتب العلمیة بیروت ۵/ ٤٤٦، رقم: ۹٥٥٤، مسند أحمد ۳/ ۱۰۱، رقم: ۱۲۰۱۲) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۴/۱۲/۲۷ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۳۴۴/۴۰)

عقدِ استصناع اجارہ ہے یا بیع؟

سوال [٨٨٢٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ بیع استصناع بوقت عقد بیع ہے، یا معاہدہ بیع یا اجارہ، قولِ راجح کیا ہے؟ تحریر فرمائیں۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: صحیح اور راجح قول کے مطابق معاملہ استصناع کی حیثیت بیع کی ہے، استصناع معاہدہ بیع یا اجارہ نہیں ہے۔

ثم هو بيع عند عامة مشايخنا، وقال بعضهم: هو عدة وليس بسديد؛ لأن محمد ذكر القياس والاستحسان في جوازه، وذكر القياس والاستحسان لا يليق بالعدات، وكذا ثبت خيار الرؤية للمستصنع وأنه خصائص البيوع. (بدائع الصنائع، كتاب البيوع، حكم الاستصناع، زكريا ديوبند ٤/ ٤٤٤)

واختلفوا فى جوازه هل هو بيع أو عدة؟ والصحيح أنه بيع لا عدة، وهو مذهب عامة مشايخنا، وكان الحاكم الشهيد يقول: هو مواعدة ينعقد العقد بالتعاطي، وجه العامة: أنه سماه في الكتاب بيعا، وأثبت فيه خيار الرؤية. (عناية مع فتح القدير، أشرفيه ديوبند ٧/ ١٠٨، كوئٹه ٦/ ٢)

صح الاستصناع بيعا لاعدة على الصحيح. (شامي، زكريا ٧/ ٤٧٥، كراچى ٥/ ٢٢٤)

اختلف المشايخ فيه، فقال بعضهم: هو مواعدة وليس ببيع، وقال بعضهم: هو بيع لكن للمشتري فيه خيار، وهو الصحيح. (الموسوعة الفقهية بيروت ٣/ ٣٢٦)

والصحيح الراجح في المذهب الحنفي: أن الاستصناع بيع للعين المصنوعة لا لعمل الصانع فهو ليس وعدا ببيع ولا إجارة على العمل. (الفقه

الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنیشنل دیوبند ٤/ ٣٩٢، تاتارخانية زكريا ٩/ ٤٠٠، رقم: ١٣٧١٧، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٤/ ١٢٣، زكريا ديوبند ٤/ ٥٢٧، مجمع الأنهر، فقيه الأمت ٣/ ١٥٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲/۱۲/۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۲۵)

کئی واسطوں سے معاملہ استصناع

سوال [۸۸۲۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ معاملۂ استصناع میں مستصنع (مشتری) نے براہ راست صانع (بائع) کو آرڈر نہیں دیا؛ بلکہ درمیان میں کئی واسطے ہیں، مثلاً مرادآباد میں یہ معاملہ بہت زیادہ ہوتا ہے کہ ایکسپورٹر نے بایر سے آرڈر لیا، پھر داخلی لوگوں کو مال بنانے کا آرڈر دیا اور جس کارخانہ دار کو آرڈر دیا اس نے اپنے بعد کے لوگوں کو آرڈر دیا، درحقیقت صانع کم ازکم دوسرے یا تیسرے نمبر پر ہوتا ہے اور اس صانع سے اس کے خریدار نے لیا، اس سے ایکسپورٹر نے اور اس نے لے کر باہر کے بایر کو دیا، تو یہ کئی واسطوں سے عقد استصناع جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: معاملۂ استصناع میں مستصنع اور صانع کے درمیان اگر کئی واسطے ہوں تب بھی استصناع صحیح اور درست ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ صحت استصناع کا مدار عرف وعادت پر ہے۔ اور بالواسطہ استصناع کا عرف عام ہے؛ لہٰذا مرادآباد میں جو عقد استصناع کی شکل رائج ہے، وہ بلاشبہ جائز اور درست ہے۔

الثابت بالعرف كالثابت بالنص. (رسم الفتي ١٧٦)

استعمال الناس حجة يجب العمل بها. (شرح المجلة رستم باز مكتبة اتحاد ديو بند ۱/ ۳۵، المادة: ۳۷)

العادة تجعل حكما إذا لم يوجد التصريح بخلافه. (الفوائد البهية ۱۹۳)

العادة محكمة. (شرح المجلة، اتحاد ۱/ ۳۴، المادة: ۳۶)

يجوز فيما فيه تعامل لافيما لا تعامل فيه. (عناية مع فتح القدير، أشرفيه ۷/ ۱۰۸، كوئٹه ۶/ ۲۴۳)

للاستصناع شروط هي: أن يكون مما جرى فيه التعامل بين الناس. (الموسوعة الفقهية ۳/ ۳۲۸، بيروت) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۴/۱۲/۳ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۲۶)

باہر کے بایر سے آرڈر لینے والے ایکسپورٹر کو صانع کہا جائے یا مستصنع ؟

سوال [۸۸۲۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے باہر کے بایر سے آرڈر لیا جس میں اس نے یہ وعدہ کیا کہ ۳/ ماہ کے اندر اندر مال بنوا کر پیش کردوں گا، پھر زید نے کارخانہ دار بکر کو آرڈر دیا کہ اس نمونہ کا بنا کر کے دینا ہے اور بکر نے اپنی لیور کے ذریعہ اس کا مال بنا کر دیا، تو ایسی صورت میں بایر بہر حال مستصنع ہے اور بکر جس نے مال بنا کر دیا ہے وہ صانع ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ زید کیا ہے، کیا زید کو صانع کہا جائے گا یا مستصنع کہا جائے گا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید جس نے بایر سے آرڈر لیا اور کارخانہ دار بکر کو آرڈر دیا، اس کو من وجہ (مشتری) مستصنع اور من وجہ (بائع) صانع دونوں کہا جائے گا؛ اس لئے کہ یہ بایر کے لئے صانع ہے اور کارخانہ دار بکر کے لئے مستصنع ہے، جیسے کہ بیع سلم میں کوئی شخص کسی دوسرے

سے کوئی چیز خرید وفروخت کرے تو اس کو بائع اور مشتری دونوں کہا جاتا ہے۔

وهو في اصطلاح الفقهاء: طلب العمل من الصانع في شيء مخصوص، وينعقد الاستصناع بالإيجاب والقبول من المستصنع والصانع ويقال للمشتري مستصنع، وللبائع صانع، وللشيء مصنوع. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنیشنل دیوبند ٤ / ٣٩١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۴/۱۲/۲۷ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۴۳۶)

غیر منقول اشیاء میں استصناع کا معاملہ

سوال [۸۸۲۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ استصناع کا معاملہ منقول اشیاء میں ثابت ہے، اب سوال یہ ہے کہ غیر منقول اشیاء عقار میں بھی معاملہ استصناع جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً مکانات بنانے کے لئے آرڈر دیا جائے اور بلڈر شرائط کے مطابق مکان بنا کر دے دے تو یہ معاملہ استصناع کے دائرے میں ہو کر جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: چونکہ استصناع کا مدار تعامل ناس اور عرف وعادت پر ہے اور اس جدید دور میں غیر منقول اشیاء میں بھی استصناع کا عرف عام ہے؛ لہٰذا غیر منقول اشیاء میں بھی معاملہ استصناع بلا شبہ جائز ہے اور آڈر پر مکان اور فلیٹ وغیرہ بنوانا یہ سب معاملہ استصناع کے دائرے میں ہو کر جائز ہوگا۔ (مستفاد: چند اہم عصری مسائل/۲۸۳)

ثم انتشر الاستصناع إنتشارا واسعا في العصر الحديث، ولم يقتصر الأمر على الصناعات المختلفة ما دام يمكن ضبطها بالمقاييس

والمواصفات المتنوعة، وإنما يشمل أيضا إقامة المباني وتوفير المساكن المرغوبة. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنیشنل دیوبند ٤/ ٤٠٢)

كل شيء تعومل استصناع يصح فيه الاستصناع على الإطلاق. (شرح المجلة رستم باز، مطبع اتحاد ديوبند ١/ ٢٢٠، مادة: ٢٨٩)

يجب أن يعلم بأن الاستصناع جائز في كل ماجرى التعامل فيه. (تاتارخانية، زكريا ٩/ ٤٠٠، رقم: ١٣٧١٦)

للاستصناع شروط هي: أن يكون مما جرى فيه التعامل بين الناس. (الموسوعة الفقهية بيروت ٣/ ٣٢٨، بدائع، زكريا ٤/ ٤٤٤، عناية مع فتح القدير أشرفيه ٧/ ١٠٨، كوئٹه ٦/ ٢٤٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱/۱/۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۵۳)

گاڑی وغیرہ بڑی چیزوں میں استصناع کا معاملہ

سوال [۸۸۳۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ جوتا، چپل، برتن وغیرہ جیسی چھوٹی اشیاء کے بارے میں معاملۂ استصناع نصوص سے ثابت ہے، سوال یہ ہے کہ آج کے زمانے میں بڑی چیزوں مثلاً ٹرک، گاڑی وغیرہ میں بھی استصناعت ہوتی ہے، تو کیا ایسی بڑی چیزوں میں بھی معاملۂ استصناع جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: معاملۂ استصناع کا مدار تعامل ناس اور عرف وعادت پر ہے، بریں بناء جن چیزوں میں بھی استصناع کا عرف ہوگا، اس میں معاملۂ استصناع جائز ہوگا، خواہ وہ چیزیں چھوٹی ہوں یا بڑی؛ لہٰذا آج کے زمانے میں جو گاڑی وغیرہ میں استصناعت جاری ہے بلا شبہ جائز اور درست ہے۔

منها: أن يكون ما للناس فيه تعامل كالقلنسوة، والخف، والآنية ونحوها، فلا يجوز فيما لا تعامل لهم فيه. (بدائع الصنائع، كتاب البيوع، حكم الاستصناع، زكريا ديوبند ٤/ ٤٤٤)

كل شيء تعومل استصناع يصح فيه الاستصناع على الإطلاق. (شرح المجلة رستم باز، مطبع اتحاد ديو بند ١/ ٢٢٠، مادة: ٢٨٩)

ولأنه يجوز فيما فيه تعامل لا فيما لا تعامل فيه. (عناية مع فتح القدير، أشرفيه ديو بند ٧/ ١٠٨، كوئٹه ٦/ ٢٤٣)

للاستصناع شروط هي: أن يكون مما يجرى فيه التعامل بين الناس. (الموسوعة الفقهية بيروت ٣/ ٣٢٨، بدائع، زكريا ٤/ ٤٤٤، عناية مع فتح القدير أشرفيه ٧/ ١٠٨، كوئٹه ٦/ ٢٤٣)

يجب أن يعلم بأن الاستصناع جائز في كل ماجرى التعامل فيه. (تاتارخانية، زكريا ٩/ ٤٠٠، رقم: ١٣٧١٦)

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۱/۱۲/۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۰۶۷)

عقدِ استصناع کی شکل میں مکان، فلیٹ وغیرہ کا معاملہ

سوال [۸۸۳۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسئلہ یہ ہے کہ فلیٹ وغیرہ کا باضابطہ نقشہ، نمونہ، سائز سب کچھ ہوتا ہے، پھر اس کا آرڈر دیا جاتا ہے، پھر تیاری کے بعد لین دین بھی وعدہ کے مطابق ہو جاتا ہے، تو یہ معاملہ استصناع میں داخل ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب فلیٹ وغیرہ کا نقشہ، نمونہ، سائز سب کچھ دکھا کر کے آرڈر دیا گیا، پھر وعدہ کے مطابق لین دین بھی ہو گیا تو یہ معاملہ استصناع کے دائرہ میں داخل ہو کر جائز ہے۔

ومن أبرز الأمثلة والتطبيقات لعقد الاستصناع بيع الدور، والمنازل، والبيوت السكنية على الخريطة ضمن أوصاف محددة. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹر نيشنل ديوبند ٤/ ٤٠٢)

ولا يصح السلم فيما لا يمكن ضبطه بالوصف كالدور، والعقارات، والجواهر، واللآلي، والجلود، والخشب لتفاوت آحادها تفاوتا فاحشا في المالية، أما الاستصناع فيصح في الأمرين إذا تعامل الناس به. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹر نيشنل ديوبند ٤/ ٤٠١)

ولا يجوز فيما لا تعامل فيه للناس كالثياب لعدم المجوّز، وفيما فيه تعامل إنما يجوز إذا أمكن إعلامه بالوصف ليمكن التسليم. (هداية، مكتبة الأمين، كتاب البيوع، باب السلم ٣/ ١٠١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۴/۱۲/۲۷ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۳۴۴)

(صانع) کاریگر کو اجیر کب قرار دیا جائے؟

سوال [۸۸۳۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: صانع کو اجیر کب قرار دیا جائے گا، جب کہ معاملے کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں: (۱) سارا مال اور عمل صانع کی طرف سے ہوں (۲) سارا مال مستصنع کی طرف سے ہو اور صانع نمونہ کے

مطابق مال تیار کر کے دے دے، تو سوال یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں یہ معاملہ اجرت کا ہوگا یا بیع کا؟ اگر اجرت کا ہے تو اجیر خاص کا ہے یا اجیر مشترک کا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مال مستصنع کا ہو اور عمل صانع کا ہو، تو یہ عقدِ اجارہ ہوگا، عقدِ استصناع نہیں ہوگا اور اس صورت میں عمل کرنے والا اجیر قرار دیا جائے گا اور وہ اجیر مشترک ہوگا۔ (مستفاد: اسلام اور جدید معاشی مسائل ۵/ ۱۵۵-۱۵۶)

فإذا كانت العين من المستصنع لا من الصانع، فإن العقد يكون إجارة لا استصناعا. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنيشنل ديوبند ٤/ ٣٩١)

والاستصناع أن يكون العين والعمل من الصانع، فأما إذا كان العين من المستصنع لا من الصانع يكون إجارة ولا يكون استصناعا. (تاتارخانية، زكريا ١٥/ ٣٤٧، رقم: ٢٣٣٢٣)

شرطه: أن تكون العين والعمل من الصانع، فإن كانت العين من المستصنع كان العقد إجارة. (شرح المجلة، إتحاد ١/ ٦٩، مادة: ١٢٤)

حتى لو كان العين من المستصنع كان إجارة لا استصناعا. (مجمع الأنهر، فقيه الأمت ٣/ ١٤٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۴۸)

ایک ماہ سے زیادہ مدت ہو تو کیا معاملہ استصناع سلم میں تبدیل ہو جاتا ہے؟

سوال [۸۸۳۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کہ معاملہ استصناع اگر ایک ماہ اس سے زیادہ کی مدت کے لئے ہو تو وہ معاملہ استصناع باقی رہے گا یا سلم ہو جائے گا؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: چونکہ معاملۂ استصناع کا مدار عرف اور تعامل ناس پر ہے اور عرف میں ایک ماہ اور اس سے زائد کے لئے بھی استصناع کا معاملہ کرنا رائج ہے؛ لہٰذا ایک ماہ یا زیادہ کی تحدید کی بنا پر یہ معاملہ سلم نہ ہوگا؛ بلکہ استصناع ہی باقی رہے گا۔

وخالف في ذلک أبو يوسف ومحمد إذ أن العرف عندهما جرى بضرب الأجل في الاستصناع، والاستصناع إنما جاز للتعامل، ومن مراعاة التعامل بين الناس، رأي الصاحبين: أن الاستصناع قد تعورف فيه على ضرب الأجل فلا يتحول إلى السلم بوجود الأجل. (الموسوعة الفقهية ٣/ ٣٢٩)

وقال الصاحبان: ليس هذا بشرط، والعقد استصناع على كل حال حدد فيه أجل أو لم يحدد؛ لأن العادة جارية بتحديد الأجل في الاستصناع، فيكون شرطا صحيحا لذلک، وهذا القول هو المتفق مع ظروف الحياة العملية، وحاجات الناس. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹر نيشنل ديوبند ٤/ ٣٩٦)

وقالا: الأول: أي ما فيه تعامل استصناع؛ لأن اللفظ حقيقة للاستصناع فيحافظ على قضيته، ويحمل الأجل على التعجيل بخلاف مالا تعامل فيه؛ لأنه استصناع فاسد، فيحمل على السلم الصحيح. (شامي، مطلب الاستصناع كراچى ٥/ ٢٢٤، زكريا ٧/ ٤٧٤)

وقال أبو يوسف ومحمد: إنه لا يصير سلما بل يبقى استصناعا، وهذا في استصناع للناس فيه تعامل. (محيط البرهاني، كوئٹه ٨/ ٢٥٧، المجلس العلمي بيروت ١٠/ ٣٦٦، رقم: ١٣٠٤٧) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۱۴۳۵/۲/۵ھ

(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۴۲۳)

عقدِ استصناع اجارہ کب ہوگا؟

سوال [۸۸۳۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آپ نے شروع میں جمہور کا قول نقل کیا ہے کہ استصناع کا معاملہ نہ اجارہ ہے نہ معاہدہ؛ بلکہ نفس بیع ہے، تو اس صورت میں اجیر خاص یا اجیر مشترک کی مثال پیش کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جمہور کا قول عقدِ استصناع کے بیع ہونے کا اس صورت میں ہے، جب سارا سامان اور عمل صانع کا ہو، اس صورت میں اجیر خاص یا اجیر مشترک کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی؛ لیکن اگر سامان مستصنع کا ہو اور عمل صانع کا ہو، تو اجیر مشترک کی مثال پیش کرنا درست ہے۔

الاستصناع: أن یکون العین والعمل من الصانع. (تاتارخانية، زكريا ١٥/ ٣٤٧، رقم: ٢٣٣٢٣)

إن الاستصناع بيع للعين المصنوعة لا لعمل الصانع، فهو ليس وعدا ببيع، ولا إجارة على العمل. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹر نيشنل ديوبند ٤/ ٣٩٢)

الصحيح أنه يجوز بيعا لا عدة. (هداية مع فتح القدير، كتاب البيوع، باب السلم، كوئٹه ٦/ ٢٤٢، زكريا ديوبند ٧/ ١٠٨)

شرطه: أن تكون العين والعمل من الصانع، فإن كانت العين من المستصنع كان العقد إجارة. (شرح المجلة رستم باز، مطبع إتحاد ديوبند ١/ ٦٩، مادة: ١٢٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/۱۲/۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۴۹)

مدت متعینہ میں مال تیار نہ کرنے سے آرڈر کینسل کرنے کا حق

سوال [۸۸۳۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مستصنع نے نمونہ بتلاکر کے آرڈر دیا اور صانع نے اس کی شرائط کے مطابق آرڈر لے لیا اور اس کی مدت متعین ہوگئی، اس کے بعد اگر مدت کے اندر اندر مال تیار کر کے صانع مستصنع کے حوالہ نہیں کر پایا، تو ایسی صورت میں مستصنع کو مدت کے ختم ہونے پر آرڈر کینسل کرنے کا حق ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورت مسئولہ میں صانع شرائط کے مطابق مقررہ مدت میں مال تیار کر کے مستصنع کے حوالہ نہ کر سکے، تو ایسی صورت میں مستصنع (مشتری) کو آرڈر کینسل کرنے کا حق ہے۔

إذا انعقد الاستصناع فليس لأحد العاقدين الرجوع، وإذا لم يكن المصنوع على الأوصاف المطلوبة المبينة كان المستصنع مخيرا. (مجلة الأحكام، ص: ٧٦، بحواله كتاب الفتاوى ٥/ ٢٣٩)

وإذا حددت مدة لتقديم المصنوع، فانقضت دون أن يفرغ الصانع منه ويسلمه، فالظاهر أن يتخير المستصنع بين الانتظار والفسخ كما هو المقرر في عقد السلم. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹر نيشنل ديوبند ٤/ ٣٩٦)

ولا يجبر المستصنع على إعطاء الدراهم وإن شرط تعجيله؛ لأن الإجارة في الأجرة شراء ما لم يره كان له أن يفسخ العقد ولا يعطى البدل.

(المحيط البرهاني، كوئٹه ٨/ ٢٥٦-٢٥٧، المجلس العلمي بيروت ١٠/ ٣٦٦، رقم: ١٣٠٤٦)

إذا تعذر تسليم المسلم فيه عند المحل، إما لغيبة المسلم إليه أو عجزه عن التسليم حتى عدم المسلم فيه، أو لم تحمل الثمار تلك السنة،

فالسلم بالخيار بين أن يصبر إلى أن يوجد فيطالب به، وبين أن يفسخ العقد ويرجع بالثمن إن كان موجودا أو بمثله إن كان مثليا وإلا قيمته. (المغني لابن قدامة بيروت ٤/ ١٩٦، رقم: ٣٢٢٩، بدائع الصنائع، زكريا ٤/ ٤٤٤) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۴/۱۲/۲۸ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۴۵)

استصناع میں مال صانع کا ہو تو وہ بائع ہو جائے گا

سوال [۸۸۳۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: استصناعت کے معاملے میں صانع اجیر مشترک قرار دیا جائے گا یا اجیر خاص؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: معاملہ استصناع میں جب مال اور عمل دونوں صانع کے ہوں، تو اس صورت میں صانع کو بائع قرار دیا جائے گا، اجیر مشترک یا اجیر خاص قرار نہیں دیا جائے گا؛ کیوں کہ اجیر کا صرف عمل ہوتا ہے عین نہیں ہوتا۔

يقال للمشتري: مستصنع، وللبائع صانع، وللشيء مصنوع. (الفقه الإسلامي وأدلته، هدى انٹرنيشنل ديوبند ٤/ ٣٩١)

صح الاستصناع بيعا لا عدة. (شامي، باب السلم، مطلب في الاستصناع، زكريا ٧/ ٤٧٥، كراچی ٥/ ٢٢٤، هداية أشرفي ديوبند ٣/ ١٠٠)

الاستصناع أن يكون العين والعمل من الصانع. (تاتارخانية، زكريا ١٥/ ٣٤٧، رقم: ٢٣٣٢٣) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۳۴/۱۲/۲۹ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۵۰)

مال کے لئے انکار پر پیشگی رقم کا ضبط کرنا

سوال [۸۸۳۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: استصناعت کے معاملہ میں اگر خریدار نے پیشگی کچھ رقم بطور بیعانہ کے دیدی اور شرائط کے مطابق صانع نے مال تیار کر دیا، مگر اب مستصنع لینے سے انکار کرتا ہے، تو کیا اس صورت میں اس پیشگی رقم کو ضبط کر سکتا ہے یا نہیں؟ جب کہ شرائط میں یہ طے تھا کہ مال نہ لینے کی صورت میں پیشگی رقم ضبط ہو جائے گی۔

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: استصناعت کے معاملہ میں خریدار نے پیشگی رقم دی تھی اور یہ شرط لگائی تھی کہ مال نہ لینے کی صورت میں صانع کو یہ رقم ضبط کرنے کا حق ہوگا، اب جب مال تیار ہونے کے بعد خریدار مال لینے سے انکار کرتا ہے تو چونکہ اس میں صانع کا کافی پیسہ لگ چکا ہے اور مال نہ بکنے میں اس کا ضرر اور نقصان ہے؛ اس لئے نقصان کے بقدر اس پیشگی رقم میں سے ضبط کر سکتا ہے۔ (مستفاد: اسلام اور جدید معاشی مسائل ۴/۱۶۱)

إذا أتى الصانع بالمستصنع على الصفة المشروطة. روي عن أبي يوسف رحمه الله إنه لازم في حقهما حتى لا خيار لأحدهما لا للصانع ولا للمستصنع أيضا أن في إثبات الخيار للمستصنع إضرار بالصانع؛ لأنه قد أفسد متاعه، وفرى جلده وأتى بالمستصنع على الصفة المشروطة، فلو ثبت له الخيار لتضرر به الصانع، فيلزم دفعا للضرر عنه. (بدائع الصنائع، باب حكم الاستصناع، زكريا ٤/ ٤٤٤)

عن أبي يوسف أنه لا خيار لواحد منهما، أما الصانع فلما ذكرنا، وأما المستصنع فلأن في إثبات الخيار له إضرار بالصانع فربما لا يرغب فيه غيره. (تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٤/ ١٢٤، زكريا ديوبند ٤/ ٥٢٨)

والعربون في البيع هو أن يشتري السلعة فيدفع إلى البائع درهما أو

غيره على أنه إن أخذ السلعة احتسب به من الثمن، وإن لم يأخذ فذلك للبائع يقال: عربون وأربون وعربان وأربان قال أحمد: لا بأس به، وفعله عمر رضي الله عنه وعن ابن عمر أنه أجازه، قال ابن سيرين: لا بأس به.
(المغني بيروت ٤/ ١٦٠، رقم: ٣١٢٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۹/۱۲/۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۵۱)

داخلی لوگوں نے مال کی تیاری میں تاخیر کردی، جس سے باہر کے خریدار نے آرڈر کینسل کردیا، تو نقصان کی تلافی کون کرے؟

سوال [۸۸۳۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر مشتری ایسے وقت میں آرڈر کینسل کردے جس وقت بائع نے مال کی تیاری میں لاکھوں روپئے خرچ کردیا ہے، تو ایسی صورت میں اس کے نقصان کا بھگتان کون کرے گا؟ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وعدہ کے مطابق مال بھیجنا لازم ہوتا ہے اور وقت کے اندر تیار نہ ہونے کی وجہ سے ایکسپورٹر مارکیٹ سے اسی نمونہ کا تیار شدہ مال زیادہ قیمت کا خرید کر کے روانہ کردیتا ہے، تاکہ اس کی طرف سے وعدہ خلافی نہ ہو اور جو مال تیار ہوا ہے، اس کے لئے کوئی دوسرا گراہک نہیں ملتا، تو ایسی صورت میں بائع کا نقصان ہوجاتا ہے، تو اس نقصان کی تلافی تاخیر کرنے والوں سے کرائی جاسکتی ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مال کی تیاری میں تاخیر کی وجہ سے بائع نے اسی نمونہ کا مال مارکیٹ سے خرید کر مشتری کے پاس روانہ کردیا اور اس آرڈر دئے گئے مال کا کوئی دوسرا گراہک نہیں ملا جس کی وجہ سے بائع کا لاکھوں کا نقصان ہوگیا، تو ایسی صورت میں اس نقصان

کی تلافی بائع ان داخلی لوگوں سے وصول کرسکتا ہے جنہوں نے مال بنانے میں تاخیر کی ہے، یا داخلی لوگوں کو تیارشدہ مال واپس کردے اورنقصان داخلی لوگ خود برداشت کریں۔

إما إذا كانت المنفعة المعقود عليها هي إنجاز عمل من الأعمال كالبناء والخياطة ونحوهما، فإن الضمان يختلف بحسب صفة العامل وهو الأجير في اصطلاحهم؛ لأنه إما أن يكون أجيرا خاصا أو مشتركا أي عاما. (الموسوعة الفقهية بيروت ٢٨/ ٢٥٥)

تعدى الأجير هو أن يعمل عملا أو يتصرف تصرفا مخالفين لأمر الموجر صراحة كان أو دلالة لزمه الضمان. (شرح المجلة رستم باز، إتحاد ديوبند ١/ ٣٢٦، مادة: ٦٠٨)

الأجير المشترک يضمن الضرر والخسار الذي تولد عن فعله وصنعه إن كان بتعديه وتقصيره أو لم يكن. (شرح المجلة رستم باز، إتحاد ديوبند ١/ ٣٣٠، مادة: ٦١١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۸/۱۲/۱۴۳۴ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۱۱۳۴۶/۴۰)

لوکل اور بین الاقوامی مارکیٹ میں عقدِ استصناع کے مسائل

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ أَمَّا بَعْد!

آج کے زمانہ میں عقدِ استصناع کا معاملہ عالمی سطح پر وسیع تر ہو چکا ہے، مقامی اور لوکل مارکیٹوں سے تجاوز کر کے ممالک بعیدہ تک عقدِ استصناع کا تجارتی معاملہ پھیل چکا ہے، اس لئے موضوع کی اہمیت اور اس میں پیدا ہونے والے نئے مسائل کی وجہ سے اس نوع کی تجارت کے بعض جزئی مسائل وضاحت طلب ہیں، اسی کے تناظر میں یہ مضمون پیش خدمت ہے۔

عقدِ استصناع کا معاملہ خود صاحبِ شریعت پیغمبر انسانیت ﷺ نے کیا ہے، جو اس حدیث شریف میں صراحت کے ساتھ ثابت ہے۔ حدیث شریف ملاحظہ فرمائیے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: اصْطَنَعَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاتَمًا، فَقَالَ: إِنَّا قَدِ اصْطَنَعْنَا خَاتَمًا وَنَقَشْنَا فِيْهِ نَقْشًا فَلا يَنْقُشُ أَحَدٌ عَلَيْهِ. (مسند أحمد، ۳/ ۱۰۱، رقم: ۱۲۰۱۲، السنن الكبرى للنسائي ۵/ ۴۵۶، رقم: ۹۵۴۵)

حضرت انس بن مالک ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے معاملہ استصناع کے طور پر انگوٹھی بنوائی ہے، پھر آپ نے فرمایا کہ بے شک ہم نے ایک انگوٹھی بنانے کا آرڈر دیا ہے اور اس میں ایک خاص نقش بنوایا ہے؛ لہٰذا کوئی شخص اس جیسا نقش نہ بنوائے۔

معاملۂ استصناع کے جواز کا مدار تعامل ناس پر

استصناع کا معاملہ ایسی شئ کا عقد ہے جو شئ معدوم ہوتی ہے، عقد کے وقت اس شئ کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہوتا ہے۔ اور شرعی ضابطہ اور اصول کے مطابق ایسی شئ کی خرید و فروخت جائز اور مشروع نہیں ہوتی ہے، جس شئ کا خارج میں کوئی وجود نہ ہو؛ اس لئے اصول اور ضابطہ

کے مطابق استصناع کا معاملہ جائز نہیں ہونا چاہئے،مگر شریعت نے تعاملِ ناس اورلوگوں کی ضرورت کی وجہ سے عقد استصناع کواصول وضوابط سے مستثنیٰ کر کے جائز قرار دیا ہے؛اس لئے استصناع کا معاملہ ہر ایسے اموراور ایسی اشیاء میں جائز ہوگا جن اشیاء کو آرڈر دیکر بنوانے کالوگوں کے درمیان تعارف اورتعامل ہو چکا ہواور ایسی اشیاء میں جائز نہیں ہوگا جن اشیاءکو آرڈر دے کر تیار کروانے کالوگوں کے درمیان تعامل نہ ہو،اس کوحضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے بیان فرمایا ہے۔اس کوعنایہ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

يَجُوزُ اسْتِحْسَانًا وَالْقِيَاسُ يَقْتَضِي عَدَمَ جَوَازِهِ لِأَنَّهُ بَيْعُ الْمَعْدُومِ وَقَدْ نَهَى النَّبِيُّ ﷺ عَنْ بَيْعِ مَا لَيْسَ عِنْدَ الإِنْسَانِ (إلى قوله) وَجْهُ الاسْتِحْسَانِ الإِجْمَاعُ الثَّابِتُ بِالتَّعَامُلِ، فَإِنَّ النَّاسَ فِيْ سَائِرِ الأَعْصَارِ تَعَارَفُوا الاسْتِصْنَاعَ فِيْ مَا فِيهِ تَعَامُلٌ مِنْ غَيْرِ نَكِيرٍ، وَالْقِيَاسُ يُتْرَكُ بِمِثْلِهِ (وقوله) وَلِأَنَّهُ يَجُوزُ فِيْمَا فِيْهِ تَعَامُلٌ لَا فِيْمَا لَا تَعَامُلَ فِيْهِ. (عناية مع فتح القدير زكريا ديوبند ٧/ ١٠٨، كوئٹه ٦/ ٢٤٢، دالفكر ٧/ ١١٦)

استصناع کا معاملہ استحساناً جائز ہے اور قیاس اس کے عدم جواز کا مقتضی ہے؛ اس لئے کہ یہ معاملہ شئ معدوم کی بیع کا ہے اور یقیناً حضور ﷺ نے ایسی چیز کے بیچنے سے منع فرمایا ہے جو انسان کے پاس نہ ہو۔اور استحساناً جواز کی دلیل ایسا اجماع ہے جو تعاملِ ناس سے ثابت ہے؛ اس لئے کہ بے شک لوگ ہر زمانہ میں ایسی چیزوں میں بلانکیر استصناع کا معاملہ کرنے کو متعارف جانتے ہیں، جن چیزوں میں معاملہ کرنے کا تعامل ہو چکا ہواور اس جیسے تعامل کی وجہ سے قیاس کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور مصنف کا قول: بے شک معاملۂ استصناع ان چیزوں میں جائز ہے جن میں معاملہ کرنے کا تعامل ہے اور ان چیزوں میں جائز نہیں ہے جن میں تعامل نہیں ہے۔

اسی کوامام زیلعیؒ نے ’’تبیین الحقائق‘‘ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

وَأَمَّا الاِسْتِصْنَاعُ فَلِإِجْمَاعِ الثَّابِتِ بِالتَّعَامُلِ مِنْ لَدُنْ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم إِلٰى يَوْمِنَا هٰذَا، وَهُوَ مِنْ أَقْوَى الْحُجَجِ. (تبيين الحقائق ملتان ٤/ ١٢٣، زكريا ٤/ ٥٣٦، هكذا في البدائع زكريا ديوبند ٤/ ٩٣، كراچی ٥/ ٣، مبسوط سرخسي ١٢/ ١٣٨)

اور بہر حال استصناع کا معاملہ اس اجماع کی وجہ سے مشروع ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر ہمارے اس زمانہ تک تعاملِ ناس کے ذریعہ سے ثابت ہے اور یہ قوی ترین حجت شرعیہ میں سے ہے۔

عقدِ استصناع اور عقدِ سلم کا فرق

عقدِ استصناع اور عقدِ سلم میں کیا فرق ہے؟ اس سلسلے میں کتب فقہ میں کافی تفصیلات موجود ہیں اور دونوں عقد اس بات میں مشترک ہیں کہ دونوں میں شئ معدوم کی بیع ہوتی ہے اور تعاملِ ناس اور ضرورت کی وجہ سے ان دونوں عقدوں میں شئ معدوم کی خرید وفروخت کی اجازت دی گئی ہے۔ اور دونوں عقدوں میں سے ہر ایک میں ثمن کا متعین ہونا اور مبیع کی جنس کا متعین ہونا اور اس کی قسم کا متعین ہونا اور اس کی مقدار اور صفت کا متعین ہونا لازم ہے، ورنہ عقد فاسد ہوجائے گا۔ چند امور میں دونوں عقد کے درمیان فرق ہے:

(۱) عقدِ سلم میں رأس المال یعنی ثمن اور قیمت کا مکمل طور پر نقد ادا کرنا لازم ہوجاتا ہے اور مجلسِ عقد میں ثمن پر قبضہ کرنا بھی لازم ہوجاتا ہے، اس کے برخلاف عقد استصناع میں ثمن اور قیمت کا پیشگی ادا کرنا لازم نہیں ہے؛ جانبین کی تراضی سے جیسا طے ہوجائے ویسا ہی عمل کرنا جائز ہے، چاہے ساری قیمت پیشگی ادا کردے یا کچھ پیشگی ادا کردے، باقی بعد میں ادا کردے، یا کچھ بھی ادا نہ کرے؛ بلکہ مبیع کی وصولی کے وقت میں ادا کرے، تو یہ ہر طرح سے جائز ہے۔ (شرح المجلۃ رستم باز ۱/ ۲۲۱، رقم المادۃ: ۳۹۱، الفقہ الإسلامی وأدلتہ ۴/ ۳۹۹)

(۲) عقدِ سَلَم میں خیارِ شرط کا ثبوت نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ عقد کے وقت سے لازم ہوجاتا

ہے،اس میں کسی کو خیار نہیں ہوتا ہے۔ اور عقدِ استصناع غیر لازم ہوتا ہے،اس میں عقد کے بعد عمل سے پہلے خیار ثابت ہوتا ہے۔

(۳) عقدِ سَلم میں جنس مسلم فیہ جس کو مبیع کہا جاتا ہے،اسی قسم کی اشیاء کا بازار کے اندر ہر زمانہ میں موجود ہونا لازم ہے اور عقدِ استصناع میں شئ مصنوع کی قسم کی اشیاء کا بازار میں ہر وقت موجود ہونا لازم نہیں ہے۔

(۴) عقدِ سَلم میں مسلم فیہ کا از قبیل ذوات الامثال ہونا لازم ہے اور اس کے برخلاف عقدِ استصناع میں ذوات الامثال ہونا لازم نہیں ہے؛ بلکہ مبیع ذوات القیم بھی ہوسکتی ہے،جب کہ ایسی شئ میں معاملہ کرنے کا لوگوں کے درمیان تعامل ہو۔

(۵) عقدِ سَلم ایسی چیزوں میں جائز ہے جن کا لوگوں کے درمیان میں تعامل ہے اور ایسی چیزوں میں بھی جائز ہے جن کا لوگوں میں تعامل نہیں ہے، اس کے برخلاف عقدِ استصناع صرف ایسی چیزوں میں جائز ہے جن میں معاملہ کرنے کا لوگوں کے درمیان میں تعامل ہے اور ایسی چیزوں میں جائز نہیں ہے جن کا لوگوں میں تعامل نہیں ہے۔ یہ پوری تفصیل ''الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۳۹۹ سے ۴۰۱'' تک کے اندر موجود ہے۔

عقدِ استصناع بیع ہے یا وعدۂ بیع؟

معاملۂ استصناع کے بارے میں غور طلب بات یہ ہے کہ جب آرڈر دینے والا مال کا نمونہ اور سائز دکھا کر مال بنانے کیلئے آرڈر دیتا ہے اور صانع اور کاریگر طے شدہ معاہدہ کے مطابق آرڈر قبول کرلیتا ہے تو یہ معاملہ عقدِ بیع ہے یا وعدۂ بیع ہے؟ تو اس سلسلے میں مسلکِ حنفی کے فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، چناں چہ اس بارے میں دو فریق ہیں:

فریقِ اول: حضرت امام حاکم شہید مروزیؒ، امام محمد بن سلمہؒ، امام صفّارؒ۔ صاحبِ منثور امام ابوالقاسم ناصر الدین سمرقندیؒ وغیرہ نے اس طرح کے معاملہ کا نفسِ بیع ہونے سے انکار کیا ہے۔ اور انہوں نے یہ ثابت فرمایا ہے کہ یہ بیع نہیں ہے؛ بلکہ آئندہ چل کر عقدِ بیع کرنے

کا معاہدہ اور وعدہ ہے؛ لہٰذا استصناع کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد جانبین میں سے ہر ایک کو معاملہ ختم کرنے کا حق ہوگا۔ اور عقدِ بیع اس وقت منعقد ہوگا کہ جب صانع (کاریگر) طے شدہ شرائط کے مطابق مال تیار کر کے خریدار کو پیش کر دے، اس کو حضرات فقہاء نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

ثُمَّ اخْتَلَفَ الْمَشَايِخُ أَنَّهُ مُوَاعَدَةٌ أَوْ مُعَاقَدَةٌ؟ فَالْحَاكِمُ الشَّهِيدُ وَالصَّفَّارُ وَمُحَمَّدُ بْنُ سَلَمَةَ وَصَاحِبُ الْمَنْثُوْرِ مُوَاعَدَةٌ، وَإِنَّمَا يَنْعَقِدُ عِنْدَ الْفَرَاغِ بَيْعًا بِالتَّعَاطِي، وَلِهٰذَا كَانَ لِلصَّانِعِ أَنْ لَا يَعْمَلَ وَلَا يُجْبَرُ عَلَيْهِ بِخِلَافِ السَّلَمِ، وَلِلْمُسْتَصْنِعِ أَنْ لَا يَقْبَلَ مَا يَأْتِي بِهٖ وَيَرْجِعُ عَنْهُ وَلَا تَلْزَمُ الْمُعَامَلَةُ.

(فتح القدير زكريا ۱۰۸/۷، كوئٹه ۲۴۲/۶، دارالفكر ۱۱۶/۷، البحر الرائق، زكريا ۲۸۴/۶، كوئٹه ۱۷۱/۶، الفاظ كے فرق كے ساتھ مجمع الأنهر بيروت ۱۴۹/۳، مبسوط سرخسي ۱۳۹/۱۲، تبيين الحقائق ملتان ۱۲۳/۴، زكريا ۵۲۷/۴)

پھر مشائخ کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ استصناع کا معاملہ وعدۂ بیع ہے یا عقدِ بیع ہے؟ تو حاکم شہیدؒ، امام صفارؒ، محمد بن سلمہؒ اور صاحبِ منثورؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ وعدۂ بیع ہے اور یقیناً عقدِ بیع منعقد ہوگی مال کی تیاری کے بعد لین دین کے وقت۔ اور اسی وجہ سے کاریگر کو اس بات کا اختیار رہے کہ وہ مال نہ بنائے اور نہ ہی اس پر جبر کیا جا سکتا ہے، برخلاف معاملۂ سلم کے اور مستصنع (آرڈر دینے والے) کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ جو مال بنا کر لائے اسے قبول نہ کرے اور اس معاملہ سے رجوع کر لے اور معاملہ ان دونوں کے درمیان میں لازم نہیں ہوتا ہے۔

فریق ثانی: جمہور فقہاء کے نزدیک معاملۂ استصناع وعدۂ بیع نہیں ہے؛ بلکہ نفسِ عقدِ بیع ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ امام محمدؒ نے استصناع کے اندر قیاس اور استحسان دونوں کو ذکر فرمایا ہے اور قیاس واستحسان وعدہ میں جاری نہیں ہوتے ہیں، نیز اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ معاملۂ استصناع ایسی چیزوں میں جائز ہے جن میں معاملہ کرنے کا لوگوں کے درمیان میں تعامل ہے اور جن چیزوں میں تعامل نہیں ہے اس میں استصناع جائز نہیں ہے، اس کو صاحبِ

عنایہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

وَالصَّحِيحُ أَنَّهُ بَيْعٌ لَاعِدَةٌ وَهُوَ مَذْهَبُ عَامَّةِ مَشَايِخِنَا. (عنايه مع فتح القدير زكريا ديوبند ٧/ ١٠٨، كوئٹه ٦/ ٢٤٢، دارالفكر ٧/ ١١٦)

اور صحیح یہی ہے کہ معاملۂ استصناع عقدِ بیع ہے نہ کہ وعدۂ بیع، یہی ہمارے عامۃ المشائخ کا مذہب ہے۔

اور اس کو تبیین الحقائق میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

ثُمَّ فِي الصَّحِيحِ أَنَّ الاسْتِصْنَاعَ يَجُوزُ بَيْعًا (إلى قوله) وَجْهُ قَوْلِ الْجُمْهُورِ أَنَّ مُحَمَّدًا سَمَّاهُ شِرَاءً، وَذَكَرَ فِيهِ الْقِيَاسَ وَالاسْتِحْسَانَ، وَفَصَلَ بَيْنَ مَافِيهِ تَعَامُلٌ وَمَا لَاتَعَامُلَ فِيهِ. (تبيين الحقائق ملتان ٤/ ١٢٣، زكريا ٤/ ٥٢٧)

پھر صحیح یہی ہے کہ معاملۂ استصناع عقدِ بیع بن کر کے جائز ہے اور جمہور کے قول کی دلیل یہ ہے کہ امام محمدؒ نے معاملۂ استصناع کا نام خرید وفروخت رکھا ہے اور اس میں قیاس اور استحسان دونوں کو ذکر کیا ہے اور جن چیزوں میں تعامل ناس ہے ان کے درمیان اور جن چیزوں میں تعامل ناس نہیں ہے ان کے درمیان میں فرق بیان فرمایا ہے۔

پہلے خریدار کا دوسرے خریدار کو دوسرے خریدار کا تیسرے خریدار کو فروخت کرنے کا معاملہ

عقدِ استصناع کے جواز کا سارا مدار عرف وعادت اور تعاملِ ناس پر ہے اور عقدِ استصناع میں شئ معدوم ہی کی خرید وفروخت ہوتی ہے اور مبیع کا فی الحال وجود ہی نہیں ہوتا ہے، جب کہ عقدِ سلم میں بوقت عقد اگر چہ مبیع معدوم ہوتی ہے؛ لیکن تسلسل کے ساتھ بازاروں اور مارکیٹوں میں مدت پوری ہونے تک مبیع کا دستیاب ہونا لازم ہے اور اس کے برخلاف عقدِ استصناع میں شئ مصنوع (مبیع) کا تسلسل کے ساتھ مارکیٹ میں پایا جانا بھی لازم نہیں ہے، بس عقدِ استصناع کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ سائز، نمونہ اور ڈیزائن کے ساتھ آرڈر دیگر لوگوں کے درمیان معاملہ کرنے کا تعامل جاری ہوجائے اور بوقت عقد مبیع کا وجود میں ہونا لازم نہیں ہے؛

اس لئے مالیاتی ادارہ کے لئے ایسا کرنا جائز ہے کہ وہ اپنے لئے نمونہ اور سائز اور ڈیزائن وغیرہ کی شرائط کے ساتھ مال بنوانے کا آرڈر لے لے اور اسی ڈیزائن اور نمونہ کی شرائط کے ساتھ وہ مالیاتی ادارہ اپنے ماتحت کاریگروں کو مال بنوانے کا آرڈر دے دے اور اس میں اپنے منافع کی شرح کی رعایت رکھے اور اسی طرح جس بائع اور خریدار نے مالیاتی ادارہ کو آرڈر دیا ہے وہ اپنے منافع کی رعایت کرتے ہوئے سائز، نمونہ اور ڈیزائن دکھا کر اپنے خریدار کے ساتھ استصناع کا معاملہ کرے، اسی طرح دوسرے خریدار بھی اپنے نفع کی رعایت کرتے ہوئے تیسرے خریدار سے نمونہ اور ڈیزائنوں کی شرائط کے ساتھ معاملۂ استصناع کرتے جائیں۔ اور سارے ڈیزائن اور نمونہ اور طے شدہ شرائط کاغذوں میں درج ہوں تو اس طرح کا معاملہ بلاشبہ جائز اور درست ہے کیوں کہ اس طرح معاملہ کرنے کا تعامل لوگوں کے درمیان جاری ہو چکا ہے؛ اس لئے کہ معاملۂ استصناع میں دو چیزیں بنیادی ہوتی ہیں:

(۱) معاملہ کرنے کا عرف اور تعامل لوگوں کے درمیان میں جاری ہو۔

(۲) جس شئ پر معاملہ کیا جاتا ہے وہ شئ وجود میں نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ معدوم ہوتی ہے اور یہاں پر یہ دونوں بنیادی چیزیں موجود ہیں؛ اس لئے اس طرح کا معاملہ شرعاً جائز اور درست ہے۔

یہ حکم حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے بیان فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

يَجُوزُ اسْتِحْسَانًا وَالْقِيَاسُ يَقْتَضِي عَدَمَ جَوَازِهِ لِأَنَّهُ بَيْعُ الْمَعْدُومِ (قوله) وَجْهُ الاسْتِحْسَانِ الإِجْمَاعُ الثَّابِتُ بِالتَّعَامُلِ، فَإِنَّ النَّاسَ فِي سَائِرِ الْأَعْصَارِ تَعَارَفُوا الاسْتِصْنَاعَ فِي مَا فِيهِ تَعَامُلٌ مِنْ غَيْرِ نَكِيرٍ، وَالْقِيَاسُ يُتْرَكُ بِمِثْلِهِ. (عنايه مع فتح القدير على الهداية زكريا ديوبند ٧/ ١٠٨، كوئٹه پاكستان ٦/ ٢٤٢، دارالفكر ٧/ ١١٦)

اور عقد استصناع استحساناً جائز ہے اور قیاس اس کے عدم جواز کا تقاضہ کرتا ہے؛ اس لئے کہ یہ شئ معدوم کی بیع ہے اور استحساناً جواز کی وجہ وہ اجماع ہے جو تعاملِ ناس سے ثابت ہے؛ اس لئے کہ بے شک لوگوں میں ہر زمانہ میں ان چیزوں میں عقدِ استصناع بلا کسی نکیر کے متعارف رہا ہے، جن میں عقدِ استصناع کا تعامل ہو اور اس جیسے تعاملِ ناس کی وجہ سے قیاس کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

’’الفقہ الاسلامی میں یہ بات وضاحت سے ذکر کی گئی ہے کہ عقد استصناع میں مبیع کا مارکیٹوں میں موجود ہونا بھی لازم نہیں ہے۔

وَيُشْتَرَطُ فِيْ عَقْدِ السَّلَمِ عِنْدَ الْحَنَفِيَّةِ كَوْنُ جِنْسِ الْمُسْلَمِ فِيْهِ (الْمَبِيْع) مَوْجُوْدًا فِي الأَسْوَاقِ بِنَوْعِهِ وَصِفَتِهِ مِنْ وَقْتِ الْعَقْدِ إِلٰى وَقْتِ حُلُوْلِ أَجَلِ التَّسْلِيْمِ (قوله) وَلَا يُشْتَرَطُ ذٰلِكَ فِيْ عَقْدِ الاسْتِصْنَاعِ. (الفقه الإسلامي ٤/ ٤٠١)

اور حنفیہ کے نزدیک عقدِ سلم میں مسلم فیہ (مبیع) کا اپنی جنس اور صفت کے ساتھ عقد کے وقت سے سونپنے کے زمانہ تک بازاروں اور مارکیٹوں میں موجود ہونا شرط ہے اور عقدِ استصناع میں یہ شرط نہیں ہے۔

چھوٹی منقول اشیاء کی طرح بڑی چیزوں میں استصناع کا معاملہ

جس طرح جوتا، چپل، اوانی، برتن اور گھریلو اشیاء کو استصناع کے طور پر آرڈر دے کر بنوانا جائز ہے، اسی طرح استصناع کا معاملہ بڑی بڑی منقول چیزوں میں بھی جائز اور درست ہے، مثلاً بحری جہاز، ہوائی جہاز، چھوٹی بڑی گاڑیاں اور ٹرین کے ڈبے وغیرہ جب ایسی چیزوں میں سائز، نمونہ اور ڈیزائن کے ساتھ آرڈر دے کر بنوانے کا تعامل ہو تو عقد استصناع کا معاملہ ایسی بڑی بڑی چیزوں میں بھی جائز اور درست ہو جائے گا۔

اس کو الفقہ الاسلامی میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

ثُمَّ انْتَشَرَ الاسْتِصْنَاعُ انْتِشَارًا وَاسِعًا فِي الْعَصْرِ الْحَدِيْثِ، فَلَمْ يُعَدّ مَقْصُوْرًا عَلٰى صِنَاعَةِ الْأَحْذِيَةِ وَالْجُلُوْدِ وَالنَّجَارَةِ وَالْمَعَادِنِ وَالْأَثَاثِ الْمَنْزِلِيِّ مِنْ مَفْرُوْشَاتٍ وَغَيْرِهَا مِنَ الْخزَائِنِ

پھر استصناع کا معاملہ دورِ حاضر میں وسیع تر ہو کر پھیلتا چلا گیا؛ لہٰذا جوتے، چپل، چمڑے کی اشیاء، بڑھئی کی اشیاء، دھات کی اشیاء اور لوگوں کے صندوق، صوفے، کرسیاں، لاکر بچھونے اور گھریلو سامان وغیرہ کے دائرہ

وَالْمَقَاعِدِ وَالْمَسَانِدِ وَالصَّنَادِيْقِ، وَإِنَّمَا شَمُلَ صِنَاعَاتٍ مُتَطَوِّرَةٍ وَمُهِمَّةٍ جِدًّا فِي الْحَيَاةِ الْمُعَاصِرَةِ كَالطَّائِرَاتِ وَالسُّفُنِ وَالسَّيَّارَاتِ وَالْقِطَارَاتِ وَغَيْرِهَا، مِمَّا أَدّٰى إِلٰى تَنْشِيْطِ الْحَرَكَةِ الصِّنَاعِيَّةِ.

(الفقه الإسلامي ٤/ ٤٠٢)

میں محدود کر کے شمار نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ یقینی طور معاملۂ استصناع دور حاضر میں بہت زیادہ اور ترقی یافتہ مصنوعات کو بھی شامل ہے، جیسا کہ ہوائی جہاز، بحری جہاز، گاڑیاں، ٹرین کے ڈبے وغیرہ، جو صنعتی سرگرمیوں کی ترقی کو شامل ہیں۔

غیر منقول عقار میں استصناع کا معاملہ

جس طرح چھوٹی بڑی منقول اشیاء میں نمونہ کے ساتھ آرڈر دے کر استصناع کا معاملہ جائز اور درست ہوتا ہے، اسی طرح جب غیر منقول عقار کو نمونہ اور سائز کے ساتھ آرڈر دے کر بنوانے کا لوگوں کے درمیان عرف اور تعامل جاری ہو جائے تو ایسی صورت میں غیر منقول عقار میں بھی استصناع کا معاملہ جائز اور درست ہو جائے گا؛ نمونہ اور نقشہ تیار کر کے عمارت، مکانات، فلیٹ وغیرہ کا بنوانا بھی معاملۂ استصناع کے دائرہ میں داخل ہو کر جائز اور درست ہو جائے گا اور آج کے زمانہ میں بڑے شہروں میں نقشہ اور نمونہ کے مطابق فلیٹ بنوایا جاتا ہے، کتنے کمرے، کس سائز کے کمرے، کتنے بیت الخلاء ہوں گے، کتنے غسل خانہ ہوں گے اور ان کا سائز کیا ہوگا اور کچن کتنا بڑا ہوگا؟ ان سب چیزوں کی تفصیل کے ساتھ جب فلیٹ بنانے کا آرڈر دیا جائے اور اسی کے مطابق جب فلیٹ تیار ہو جائے تو یہ معاملہ استصناع کے دائرہ میں داخل ہو کر جائز اور درست ہو جائے گا، اسی طرح چھوٹے شہروں میں پلاٹنگ کا سلسلہ جاری ہے، پھر ان پلاٹوں میں نقشہ اور نمونہ کے مطابق عمارت بنانے کا، مکان بنانے کا آرڈر دیا جاتا ہے، تو یہ بھی معاملۂ استصناع کے دائرہ میں داخل ہو کر جائز ہو جائے گا۔ اس کو ''الفقہ الاسلامی'' میں اس طرح کے الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

وَإِنَّمَا يَشْمُلُ أَيْضًا إِقَامَةَ الْمَبَانِي وَتَوْفِيرَ الْمَسَاكِنِ الْمَرْغُوبَةِ، وَقَدْ سَاعَدَ كُلُّ ذٰلِكَ فِي التَّغَلُّبِ عَلٰى اَزْمَةِ الْمَسَاكِنِ، وَمِنْ أَبْرَزِ الْأَمْثِلَةِ وَالتَّطْبِيْقَاتِ لِعَقْدِ الاسْتِصْنَاعِ بَيْعُ الدُّوْرِ وَالْمَنَازِلِ وَالْبُيُوْتِ السَّكِيْنَةِ عَلَى الْخَرِيْطَةِ ضِمْنَ أَوْصَافٍ مُحَدَّدَةٍ. (الفقه الإسلامي ٤/ ٤٠٢)

اور بے شک عقدِ استصناع مکانات کی تعمیر کرنے اور پسندیدہ رہائش کے حاصل کرنے کو بھی شامل ہے اور یقیناً یہ سب کے سب رہائشی بحران پر غلبہ حاصل کرنے میں معاون ہیں اور عقدِ استصناع کو عملی تشکیل دینے اور اس کی مثالوں کو عام کرنے میں نقشوں کے مطابق متعین اوصاف کے ضمن میں رہائشی کمروں اور گھروں اور مکانوں کی خرید وفروخت بھی شامل ہے۔

عقدِ استصناع میں بیعانہ ضبط کرنے کا حکم

معاملۂ استصناع چونکہ وسیع ترین دائرہ میں پھیلا ہوا ہے، مقامی اور ملکی دائرہ میں وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ ممالکِ بعیدہ کے ساتھ بھی بین الاقوامی مارکیٹ میں استصناع کا معاملہ عام ہو چکا ہے اور ایسے حالات میں جب خریدار صانع کو آرڈر دیتا ہے، تو بسا اوقات ایسی بھی نوبت آجاتی ہے کہ نمونہ، سائز اور ڈیزائن دکھا کر آرڈر کا معاملہ مکمل ہو جاتا ہے اور بائع آرڈر اور طے شدہ شرائط کے مطابق مال تیار کر لیتا ہے، اس کے بعد خریدار بسا اوقات لینے سے مکر جاتا ہے، جس سے صانع اور بائع کو خطیر رقم کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے، تو اس نقصان اور خطرہ سے بچنے کے لئے صانع (آرڈر لینے والا) مستصنع (آرڈر دینے والا) سے بطور بیعانہ کے پیشگی متعین رقم کا مطالبہ کرتا ہے اور اس میں یہ شرط لگاتا ہے کہ اگر مستصنع (آرڈر دینے والا) بعد میں لینے سے انکار کر دے تو بائع (آرڈر لینے والا) بیعانہ کی پیشگی رقم ضبط کر لے گا، اس کو شرعی اصطلاح اور لغت میں ''عربون'' کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (بذل المجہود بیروت ۱۱/ ۲۲۱، مکتبہ مظاہر العلوم قدیم ۴/ ۲۸۷)

اب یہاں زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ استصناع کے معاملہ میں پیشگی رقم جو بطور بیعانہ لی جاتی ہے، طے شدہ شرائط کے مطابق مال تیار ہو جانے کے بعد خریدار کے لینے سے انکار کرنے پر صانع (آرڈر لینے والے) کے لئے وہ رقم شرائط کے مطابق ضبط کر کے اپنے استعمال میں لانا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس بارے میں حنفیہ اور جمہور کے نزدیک شرعی حکم یہ ہے کہ بیعانہ کی رقم ضبط کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لئے کہ شریعت میں مالی جرمانہ لینا جائز نہیں ہے؛ لیکن حضرت امام احمد بن حنبلؒ، امام سعید بن المسیبؒ، امام محمد بن سیرینؒ وغیرہ کے نزدیک بیعانہ ضبط کرنا شرائط کے مطابق جائز اور درست ہے اور مال تیار کرنے والے کے لئے اس رقم کا استعمال بھی جائز ہے اور اس سلسلے میں امام احمد بن حنبلؒ، حضرت عمرؓ کا فیصلہ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فتوی دلیل میں پیش کرتے ہیں، اب حنفی مسلک کے علماء کو عصرِ حاضر کی بین الاقوامی تجارت پر نظر رکھتے ہوئے غور کرنا ہے کہ عقدِ استصناع کا سارا مدار عرف اور تعاملِ ناس پر ہے اور مقامی، ملکی، بین الاقوامی مارکیٹ میں خطرہ اور نقصان سے بچنے کے لئے پیشگی رقم لینے اور خریدار کی طرف سے انکار کی صورت میں پیشگی دی ہوئی رقم ضبط کرنے کا تعامل اور تعارف ہو چکا ہے، تو اس تعامل ناس کے پیش نظر امام احمد بن جنبلؒ وغیرہ کے قول پر عمل کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ تو اس بارے میں دورِ حاضر کے مفکر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ کی رائے بھی یہی ہے کہ تعاملِ ناس اور ضرورت کی بناء پر ''عربون'' (بیعانہ) کی رقم امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ کے قول پر عمل کرتے ہوئے ضبط کرنے کی گنجائش ہے اور جہاں ضرورت نہ ہو وہاں جمہور کے قول پر عمل کیا جائے گا؛ اسی لئے احقر کی رائے بھی یہی ہے کہ تعاملِ ناس کی وجہ سے عقدِ استصناع میں عربون (بیعانہ) کی رقم خریدار کے مبیع کو رد کرنے کی صورت میں ضبط کرنے کی گنجائش ہوگی۔ حنفی مسلک کے علماء سے گزارش ہے کہ مسئلہ کے اسی نقطہ پر غور فرمائیں، اگر سارے علماء ایک بات پر متفق ہو جاتے ہیں تو بہتر ہوگا؛ لہٰذا ایسی صورت میں آرڈر دے کر فلیٹ اور مکان بنوانے میں یا چھوٹی چیزیں بھاری تعداد میں بنوانے کی صورت میں عربون (بیعانہ) کا مسئلہ انتہائی قابل غور ہے۔ (مستفاد اسلام اور جدید معاشی مسائل ۴/ ۱۶۱، ۱۶۲)

اس کے جواز سے متعلق حسبِ ذیل دلائل ملاحظہ فرمایئے: مغنی ابن قدامہ میں اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

وَالْعَرَبُوْنُ فِي الْبَيْعِ هُوَ أَنْ يَشْتَرِيَ السِّلْعَةَ فَيَدْفَعُ إِلَى الْبَائِعِ دِرْهَمًا أَوْ غَيْرَهُ عَلٰى أَنَّهُ إِنْ أَخَذَ السِّلْعَةَ اُحْتُسِبَ بِهٖ مِنَ الثَّمَنِ، وَإِنْ لَمْ يَأْخُذْهَا فَذٰلِكَ لِلْبَائِعِ ...... قَالَ أَحْمَدُؒ: لَا بَأْسَ بِهٖ وَفَعَلَهُ عُمَرُؓ، وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ أَنَّهُ أَجَازَهُ، وَقَالَ ابْنُ سِيْرِيْنَؒ: لَا بَأْسَ بِهٖ، وَقَالَ سَعِيْدُ بْنُ الْمُسَيِّبِؒ وَابْنُ سِيْرِيْنَؒ: لَا بَأْسَ إِذَا كَرِهَ السِّلْعَةَ أَنْ يَرُدَّهَا وَيَرُدَّ مَعَهَا شَيْئًا. (المغني ٤/١٦٠)

عقدِ بیع میں عربون (بیعانہ) وہ اس طرح سے ہے کہ مشتری سامان کی خریداری کا معاملہ کرکے بائع کو درہم (روپیہ) وغیرہ اس شرط پر دے دے کہ اگر سامان لے گا تو یہ روپیہ ثمن میں شمار ہوجائے گا اور اگر سامان (مبیع) نہیں لیتا ہے تو یہ بیعانہ کی رقم بائع کے لئے ہوجائے گی۔ امام احمدؒ نے فرمایا کہ اس طرح کا معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اس کو حضرت عمرؓ نے بھی کیا ہے اور ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اس کی اجازت دی ہے۔ اور امام محمد بن سیرینؒ نے فرمایا کہ اس طرح کا معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور امام سعید بن المسیبؒ اور ابن سیرینؒ نے کہا کہ جب مشتری سامان لینے سے انکار کرکے ردکردے تو اس کے ساتھ کوئی چیز بھی رد کرنے کے ساتھ واپس دے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اس بارے میں حسبِ ذیل روایات ان کی طرف سے پیش کی جاتی ہیں:

عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَؓ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَحَلَّ الْعُرْبَانَ فِي الْبَيْعِ. (المصنف لابن أبي شيبة ١١/ ٦٧١، رقم: ٢٣٦٥٦، ٢٣٦٦١)

زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع میں عربان (بیعانہ) کو حلال رکھا ہے۔

عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ فَرُّوْخٍ أَنَّ نَافِعَ بْنَ عَبْدِالْحَارِثِ اشْتَرَی دَارَ السِّجْنِ مِنْ صِفْوَانَ بْنِ أُمَيَّةَ بِأَرْبَعَةِ آلَافِ دِرْهَمٍ، فَإِنْ رَضِيَ عُمَرُؓ فَالْبَيْعُ لَهُ، وَإِنْ عُمَرُؓ لَمْ يَرْضَ، فَأَرْبَعُ مِائَةٍ لِصَفْوَانَؓ.

(المصنف لابن أبي شيبة ۱۱/ ٦٧٢، رقم: ٢٣٦٦٦)

عبدالرحمٰن بن فروخ کہتے ہیں کہ نافع بن عبدالحارث نے صفوان بن امیہ سے اس شرط پر قید خانہ کا گھر چار ہزار درہم میں خریدا کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس عقد پر راضی ہوجائیں، تو مبیع ان کے لئے ہے اور اگر حضرت عمرؓ راضی نہ ہوں تو صفوان بن امیہ کے لئے چار سو درہم ہوں گے۔

اور بخاری کے ترجمۃ الباب میں اس روایت کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

وَاشْتَرَی نَافِعُ بْنُ عَبْدِالْحَارِثِ دَارًا لِلسِّجْنِ بِمَكَّةَ مِنْ صَفْوَانَ بْنِ أُمَيَّةَ عَلٰی إِنْ عُمَرُؓ رَضِيَ بِالْبَيْعِ فَالْبَيْعُ بَيْعُهُ، وَإِنْ لَمْ يَرْضَ عُمَرُؓ فَلِصَفْوَانَؓ أَرْبَعُ مِائَةِ دِيْنَارٍ.

(بخاري شريف ۱/ ۳۲۷)

نافع بن عبدالحارث نے قید خانہ کے لئے مکہ مکرمہ میں ایک گھر صفوان بن امیہ سے اس شرط پر خریدا کہ اگر حضرت عمرؓ بیع پر راضی ہوجائیں تو عقد بیع اسی طرح قائم رہے گا اور اگر حضرت عمرؓ راضی نہ ہوں تو صفوان بن امیہ کے لئے چار سو دینار ہیں۔

ضروری وضاحت

اس مسئلہ میں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ہم نے جو بیعانہ کی رقم ضبط کرنے کی گنجائش کی طرف رجحان ظاہر کیا ہے وہ صرف عقدِ استصناع کے دائرہ میں محدود ہے اور ملکی اور بین الاقوامی مارکیٹ میں آرڈر دے کر مال بنوانے اور مال ایکسپورٹ کرنے اور ایمپورٹ کرنے کا معاملہ عقدِ استصناع کے ساتھ متعلق ہوتا ہے، اور اس میں آرڈر کینسل کرنے کی صورت میں آرڈر لینے والے کا بھاری نقصان ہوجاتا ہے اور اس نقصان کی تلافی بیعانہ کی رقم کے ذریعہ سے جہاں تک ممکن ہو کرنے کی گنجائش ہے، مثلاً بائع نے دیگر ممالک کے خریدار سے

بیس لاکھ روپئے کا مال طے شدہ شرائط کے مطابق ایکسپورٹ کرنے کا معاملہ طے کرلیا ہے اور بیعانہ کے طور پر کچھ رقم پیشگی وصول کرلی ہے اور اس نے بیس لاکھ روپیہ کا مال تیار کرلیا ہے اس کے بعد باہر کے بایر (خریدار) نے آرڈر کینسل کردیا، تو ایسی صورت میں بائع نے مال کی تیاری میں جو بھاری رقم خرچ کی ہے، اس کا بھاری نقصان بائع کے سر پڑتا ہے، تو ایسے بڑے نقصان سے بچنے کیلئے عربون (بیعانہ) کی پیشگی رقم ضبط کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، اسی طرح اندرون ملک میں بھی کثرت کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور بائع کو نقصان بھگتنا پڑ جاتا ہے، اس طرح کے نقصانات کے پیشِ نظر حضرت امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ کے قول پر عمل کی گنجائش قرار دی جارہی ہے اور یہ بات بھی یاد رکھیں کہ اندرونِ ملک میں زمین کی خریداری اور پلاٹ کی خریداری، تیار شدہ مکان کی خریداری میں جو بیعانہ پیش کیا جاتا ہے، مشتری بعد میں لینے سے مکر جائے اور لینے سے انکار کردے تو بیعانہ کی رقم مکمل طور پر واپس کردینا بائع کے اوپر لازم اور ضروری ہے؛ اس لئے کہ یہ عقود عقدِ استصناع کے دائرہ میں داخل نہیں ہیں، نیز ایسے معاملات میں مشتری کے انکار کرنے کی صورت میں بائع کا عمومی طور پر کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اور پھر بھی اگر کسی کو نقصان ہوجاتا ہے اور پھر اس طرح کے نقصان کا سلسلہ عام ہونے کا خطرہ ہے، تو اس سے بچنے کے لئے حضرت مفتی شفیع صاحب عثمانیؒ نے امداد المفتیین میں ایک حیلہ نقل فرمایا ہے اور وہ حیلہ یہ ہے کہ ظاہری حالات کے اعتبار سے بائع بیعانہ کی رقم ضبط کرلے؛ لیکن خفیہ طور پر کسی بھی حیلہ سے مشتری کے پاس وہ رقم پہنچادے، مثلاً کسی دوسرے کے واسطے سے بطورِ ہدیہ یا ہبہ واپس کردے، یا ایک مدت کے گذر جانے کے بعد بطور تحفہ وغیرہ کے عنوان سے واپس کردے، ملاحظہ فرمایئے (امداد المفتیین کراچی ۲/۸۴۳)

معاملۂ استصناع اجارہ کب بن سکتا ہے؟

استصناع کا معاملہ مال اور سامان کے اعتبار سے دو طرح سے وجود میں آتا ہے:

(۱) مال بنانے کا سامان، اوزار اور عمل یہ سب کے سب کاریگر کے ذمہ ہوں گے، ایسی صورت میں یہ معاملۂ استصناع حاکم شہیدؒ وغیرہ کے قول کے مطابق وعدۂ بیع ہے اور عامۃ المشائخ اور جمہور کے نزدیک عقد بیع ہے، جس کو استصناع کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس کو معاملۂ اجارہ میں کسی نے بھی داخل نہیں کیا (جیسا کہ اس کی تفصیل عقدِ استصناع بیع ہے یا وعدۂ بیع ہے کے عنوان کے ذیل میں مفصل طور پر آچکی ہے)

(۲) مال تیار کرنے کا سامان اور مٹیریل خریدار کی طرف سے ہو اور کاریگر کا کام صرف یہی ہے کہ طے شدہ شرائط کے مطابق مال بنا کر تیار کردے اور اس میں اس کو اپنی طرف سے کوئی سامان نہیں لگانا ہے، تو ایسی صورت میں استصناع کی یہ شکل عقد بیع یا معاہدۂ بیع نہیں رہے گی؛ بلکہ استصناع کی شکل میں اجارہ بن جائے گی۔ اور صانع (کاریگر) اجیر مشترک بن جائے گا اور آرڈر دینے والا مستصنع مستاجر بن جائے گا۔ اس سلسلے میں حضرات فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمایئے، اس کو فتاویٰ تاتارخانیہ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

وَالْاسْتِصْنَاعُ أَنْ يَكُوْنَ الْعَيْنُ وَالْعَمَلُ مِنَ الصَّانِعِ، فَأَمَّا إِذَا كَانَ الْعَيْنُ مِنَ الْمُسْتَصْنِعِ لَا مِنَ الصَّانِعِ يَكُوْنُ إِجَارَةً وَلَا يَكُوْنُ اسْتِصْنَاعًا. (تاتارخانية، زكريا ١٥/ ٣٤٧، رقم: ٢٣٣٢٣)

استصناع کی شکل یہ ہے کہ عین (مال کا سامان) اور عمل دونوں کاریگر کی طرف سے ہو، پس بہر حال جب سامان مستصنع (آرڈر دینے والے) کی طرف سے ہو، کاریگر کی طرف سے نہ ہو، تو یہ معاملہ اجارہ بن جائے گا اور بیع استصناع باقی نہیں رہے گا۔

اور ''شرح المجلہ'' میں اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

وَشَرْطُهُ أَنْ يَكُوْنَ الْعَيْنُ وَالْعَمَلُ مِنَ الصَّانِعِ، فَإِنْ كَانَتِ الْعَيْنُ مِنَ الْمُسْتَصْنِعِ كَانَ الْعَقْدُ إِجَارَةً. (شرح المجلة١/ ٦٩)

اور استصناع کی شرط یہی ہے کہ سامان اور عمل دونوں کاریگر کی طرف سے ہو؛ لہٰذا اگر سامان مستصنع (آرڈر دینے والے) کی طرف سے ہو تو عقد اجارہ بن جائے گا۔

بین الاقوامی تجار جن کی فیکٹریاں بڑی اور وسیع ہوتی ہیں، ان کے یہاں یہی شکل زیادہ پیش آتی ہے، وہ لوگ باہر سے خام مال ایمپورٹ کرکے لاتے ہیں اور کارخانہ دار اور کاریگروں کو اپنی ہی فیکٹری میں ٹھیکہ پر رکھتے ہیں اور اسی فیکٹری میں ہی کاریگروں کو ایکسپوٹر نمونہ اور سائز دکھا کر مال بنانے کا آرڈر دیتے ہیں اور کچا مال بھی اپنی طرف سے ان کو دیتے ہیں، پھر ٹھیکہ دار اپنے کاریگروں کے ذریعہ سے اسی خام مال کو گلا کر طے شدہ شرائط کے مطابق مال کا آرڈر تیار کرکے ایکسپوٹر کو پیش کرتے ہیں، پھر ایکسپوٹر اس مال کی پیکنگ وغیرہ کرکے اپنے خریداروں کو ایکسپورٹ کرتے ہیں، تو ایسی صورت میں ان بڑے تاجروں کے یہاں اپنے کاریگروں سے مال بنوانے کا معاملہ اجارہ ہی کا ہوگا، بیع یا معاہدہ بیع کا نہیں ہوگا، ہاں البتہ ایکسپوٹر اور اس کے خریدار کے درمیان میں بیع استصناع کا معاملہ جاری رہے گا۔

طے شدہ شرائط اور نمونہ کی خلاف ورزی پر نقصان کا بھگتان کس پر؟

طے شدہ شرائط اور نمونہ کی خلاف ورزی کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں:

(۱) استصناع کی شکل خریدار نے بائع کو نمونہ اور سائز پیش کردیا اور مال بنانے کے لئے سارے شرائط جانبین میں طے ہوگئے، اس کے بعد کاریگر نے اپنے مٹیریل کے ذریعہ سے مال بنا کر تیار کردیا ہے، مگر جو مال تیار کردیا ہے وہ نمونہ اور شرائط کے خلاف ہے، ایسی صورت میں مشتری کو اختیار رہے کہ مال قبول کرے یا واپس کردے اور واپسی کی صورت میں جو بھی نقصان ہوگا، اس کا پورا بھگتان کاریگر کو اٹھانا پڑے گا، آرڈر دینے والا خریدار نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔ اس کو شرح مجلہ رستم باز میں مادہ ۳۹۲ر میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

وَإِذَا لَمْ يَكُنِ الْمَصْنُوْعُ عَلَى الأَوْصَافِ الْمَطْلُوْبَةِ الْمُبَيَّنَةِ كَانَ الْمُسْتَصْنِعُ مُخَيَّرًا لِفَوَاتِ الْوَصْفِ الْمَرْغُوْبِ فِيْهِ. (شرح المجلة ١/ ٢٢١، رقم: ٣٩٢، الفقه الإسلامی ٤/ ٣٩٨)

اور جب بنا ہوا مال طے شدہ اور واضح اوصاف کے مطابق نہ ہو تو آرڈر دینے والے خریدار کو ایسے پسندیدہ اوصاف کے نہ ہونے کی وجہ سے اختیار حاصل ہوگا، جس کی شرط اس میں لگائی گئی تھی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مطلوبہ شرائط اور نمونہ کے مطابق مال نہ بنانے کی وجہ سے مستصنع (آرڈر دینے والے خریدار) کوصرف اتنا اختیار ہوگا کہ وہ مال لینے سے انکار کردے اوراس مال کے بنانے میں کاریگر کی محنت وغیرہ کے نقصان کا بھگتان خود کاریگر برداشت کرے گا اور خریدار کو اس مال سے متوقع منافع میں جو نقصان ہوا ہے اس نقصان کی تلافی کاریگر سے نہیں کرسکتا۔

(۲) اجارہ کی شکل ایکسپوٹر نے کاریگراور ٹھیکیدار کونمونہ کے مطابق مال بنانے کے لئے مٹیریل اور خام مال اپنی طرف سے پیش کردیا ہے،تو دوصورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) ٹھیکیدار اور کاریگر نے مال تیار کرنے میں نمونہ اور شرائط کی خلاف ورزی کی ہے،تو ایسی صورت میں ٹھیکیدار اور کاریگر خام مال اور مٹیریل کا ضامن ہوگا کہ مٹیریل جیسا آیا تھا ویسا ہی اسی کے ہم مثل واپس کردے گا اور آرڈر دینے والے ایکسپوٹر کا جو مال خراب ہوا ہے وہ ٹھیکیدار اور کاریگر کومل جائے گا اور محنتانہ کا جو نقصان ہوا ہے اس کا بھگتان ٹھیکیدار اور کاریگر کو برداشت کرنا پڑے گا اوراس نقصان میں آرڈر دینے والا ایکسپوٹر شریک نہیں ہوگا۔

اس کو صاحبِ بدائع نے اس طرح کے الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

فَإِنْ سَلَّمَ إِلٰى حَدَّادٍ حَدِيْدًا لِيَعْمَلَ لَهُ إِنَاءً مَعْلُوْمًا بِأَجْرٍ مَعْلُوْمٍ، أَوْ جِلْدًا إِلٰى خِفَافٍ لِيَعْمَلَ لَهُ خُفًّا مَعْلُوْمًا بِأَجْرٍ مَعْلُوْمٍ، فَذٰلِكَ جَائِزٌ، وَلَا خِيَارَ فِيْهِ؛ لِأَنَّ هٰذَا لَيْسَ بِاسْتِصْنَاعٍ بَلْ هُوَ اسْتِئْجَارٌ فَكَانَ جَائِزًا، فَإِنْ عَمِلَ كَمَا أَمَرَ اسْتَحَقَّ الْأَجْرَ، وَإِنْ فَسَدَ

پس اگر لوہا وغیرہ دھات کے کاریگر کو لوہے کی دھات سونپ دی ہے، تاکہ اس کے لئے متعین اجرت کے عوض میں متعین برتن بنا کردے، یا جوتا موزہ کے کاریگر کو چمڑا سونپ دیا ہے،تاکہ اس کے لئے متعین اجرت کے بدلہ میں متعین شرائط کے مطابق جوتا موزہ بنا کر تیار کردے،تو ایسا معاملہ جائز ہے اوراس میں کسی قسم کا خیار نہیں ہے؛ اس لیے کہ یہ عقد استصناع نہیں ہے؛ بلکہ وہ اجارہ بن کر کے جائز ہوگیا ہے؛ لہٰذا اگر حکم کے مطابق مال بنادیا ہے،تو طے شدہ اجرت کا مستحق ہو جائے گا اور اگر مال کو بگاڑ دیا ہے، تو آرڈر دینے والے

فَلَهُ أَنْ يُضَمِّنَهُ حَدِيْدًا مِثْلَهُ؛ لِأَنَّهُ لَمَّا أَفْسَدَهُ، فَكَأَنَّهُ أَخَذَ حَدِيْدًا لَهُ وَاتَّخَذَ مِنْهُ آنِيَةً مِنْ غَيْرِ إِذْنِهِ، وَالإِنَاءُ لِلصَّانِعِ؛ لِأَنَّ الْمَضْمُونَاتِ تُمْلَكُ بِالضَّمَانِ. (بدائع زکریا دیوبند ۴/ ۹۶، کراچی ۵/ ۴)

کے لئے اسی کے ہم مثل لوہے کی دھات کا تاوان وصول کرنا جائز ہے، اس لئے کہ جب کاریگر نے اسے بگاڑ دیا ہے، تو گویا کہ کاریگر نے اس کے لوہے کی دھات لے کر اس دھات سے اس کی اجازت کے بغیر برتن بنا دیا ہے اور برتن کاریگر کو مل جائے گا؛ اس لئے کہ بنے ہوئے برتن کا ضمان اور تاوان کے بدلہ میں کاریگر مالک ہو جاتے ہیں۔

(۲) دوسری صورت اجارہ کی شکل میں یہ ہوسکتی ہے کہ ایکسپوٹر اور مالیاتی ادارہ نے مال بنانے کے لئے سارا مٹیریل اپنی طرف سے کاریگر کو دیا ہے اور کاریگر نے مال بنانے میں نمونہ، سائز اور ڈیزائن کی خلاف ورزی کی ہے کہ مال کا ڈیزائن خراب کر دیا، یا مال کو چھوٹا بڑا کر دیا، تو ایسی صورت میں مالیاتی ادارہ کے ذمہ دار ایکسپوٹر وغیرہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ بنا ہوا مال اسی حالت میں کاریگر کو دے دے اور اپنے دیئے ہوئے مٹیریل کے ہم مثل مٹیریل اس سے وصول کر لے، یا تیار شدہ وہی مال قبول کر لے، اگر مال کی قیمت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، تو اس کو پوری اجرت ادا کر دے؛ لیکن اگر مال خراب بنانے کی وجہ سے مال کی قیمت گھٹ گئی ہے، تو جتنی گھٹی ہے اتنے نقصان کی تلافی کاریگر کی اجرت میں سے وصول کر لے۔

یہ حکم مبسوط سرخسی کی اس عبارت سے واضح ہوتا ہے:

وَلَوْ أَسْلَمَ غَزْلًا إِلَى حَائِكٍ لِيَنْسَجَ لَهُ سَبْعًا فِي أَرْبَعٍ، فَحَاكَهُ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ أَوْ أَصْغَرَ فَهُوَ بِالْخِيَارِ إِنْ شَاءَ ضَمَّنَهُ مِثْلَ غَزْلِهِ وَسَلَّمَ لَهُ الثَّوْبَ، وَإِنْ

اور اگر کپڑا بننے والے کو سوت اور دھاگا پیش کر دیا ہے، تاکہ اس کے لئے چار بائی سات طول وعرض میں کپڑا بنا کر دے، تو کپڑا بننے والے نے اس سے بڑا بنا دیا، یا اس سے چھوٹا تو آرڈر دینے والے کو اختیار ہے کہ اگر چاہے اپنے دیئے ہوئے سوت اور دھاگے کے ہم

شَاءَ أَخَذَ ثَوْبَهُ وَأَعْطَاهُ الْأَجْرَ إِلَّا فِي النُّقْصَانِ؛ فَإِنَّهُ يُعْطِيهِ الأَجْرَ بِحِسَابِ ذٰلِكَ وَلاَ يُجَاوَزُ بِهٖ مَا سَمَّى. (مبسوط سرخسي ١٥/ ٨٦)

مثل تاوان میں وصول کرلے اور بنا ہوا کپڑا بننے والے کو دے دے اور اگر چاہے تو اسی کپڑے کو لے کر اس کی اجرت ادا کر دے، الا یہ کہ قیمت کا نقصان ہو جائے تو بے شک وہ اس نقصان کو مجری کر کے اجرت دے گا۔ اور اس میں متعین قیمت سے تجاوز نہیں کرے گا۔

معاملۂ استصناع کو منسوخ کرنے کی شکلیں

نمونہ، سائز اور طے شدہ شرائط کے مطابق فریقین کے درمیان استصناع کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد پھر اس معاملہ کو جانبین میں سے کسی ایک کی طرف سے فسخ کر کے ختم کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس کی تین شکلیں پیش آ سکتی ہیں:

شکل (۱): طے شدہ شرائط کے مطابق معاملۂ استصناع جانبین کے درمیان طے ہو جانے کے بعد ابھی مال بنانے کی تیاری شروع نہیں ہوئی ہے، تو اس حالت میں جانبین میں سے کسی کو بھی معاملہ منسوخ کرنے کا اختیار ہے، ایسی صورت میں کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے، اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

وَأَمَّا صِفَةُ الاسْتِصْنَاعِ فَهِيَ: أَنَّهُ عَقْدٌ غَيْرُ لَازِمٍ قَبْلَ الْعَمَلِ فِي الْجَانِبَيْنِ جَمِيعًا بِلَا خِلَافٍ حَتّٰى كَانَ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا خِيَارُ الامْتِنَاعِ قَبْلَ الْعَمَلِ. (بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٩٥، كراچی ٥/ ٣)

جانبین کے درمیان عمل سے پہلے بالاتفاق عقد غیر لازم ہے، یہاں تک کہ مال کی تیاری سے پہلے دونوں میں سے ہر ایک کے لئے معاملہ کو ختم کرنے کا اختیار ہے۔

شکل (۲): مال بنانے کی تیاری شروع ہو گئی ہے، مگر ابھی مال نمونہ کے مطابق مکمل تیار نہیں ہو پایا ہے، تو ایسی صورت میں خریدار کو معاملہ ختم کرنے کا اختیار ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں

جمہور کی رائے یہی ہے کہ چوں کہ آرڈر دینے والے خریدار کے نمونہ کے مطابق ابھی مال تیار نہیں ہوا ہے؛ اس لئے آرڈر کینسل کر دینے کا خریدار کو اختیار رہے گا۔ اس کو صاحب بدائع نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

إِذَا قَطَعَ الْجِلْدَ وَلَمْ يَعْمَلْ فَقَالَ الْمُسْتَصْنِعُ: لَا أُرِيْدُ لِأَنَّا لَا نَدْرِيْ أَنَّ الْعَمَلَ يَقَعُ عَلَى الصِّفَةِ الْمَشْرُوْطَةِ أَوْ لَا فَلَمْ يَكُنِ الامْتِنَاعُ مِنْهُ إِضْرَارًا بِصَاحِبِهِ، فَثَبَتَ الْخِيَارُ. (بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٩٦، كراچی ٥/ ٤)

جب چمڑے کو جوتا یا موزہ بنانے کے لئے کاٹ لیا ہے اور ابھی بنایا نہیں ہے، تو آرڈر دینے والے خریدار نے کہا: میں لینے کا ارادہ نہیں رکھتا؛ اس لئے کہ ہم نہیں جانتے ہیں کہ تمہارا کام ہمارے طے شدہ شرائط کے مطابق ہو پائے گا یا نہیں؟ لہٰذا اس حالت میں لینے سے منع کر دینا اپنے فریق کو نقصان پہنچانے کے مرادف نہیں ہوگا؛ اس لئے اس کو فسخ کا اختیار حاصل ہوگا۔

شکل (۳): طے شدہ شرائط اور نمونہ کے مطابق مال تیار ہو چکا ہے اب مکمل تیار ہو جانے کے بعد یہ معاملہ ختم کرنے کا اختیار ہوسکتا ہے یا نہیں؟ تو ایسی صورت میں اگر مال مکمل تیار کر کے کاریگر نے آرڈر دینے والے مشتری کے پاس پیش کر دیا ہے اس کے بعد کاریگر معاملہ ختم کر کے مال واپس لے جانا چاہے، تو کسی کے نزدیک بھی واپس لے جانا جائز نہیں ہے، مگر اختلاف اس بارے میں ہے کہ آرڈر دینے والے خریدار کو ایسی حالت میں واپس کر دینے کا اختیار رہے یا نہیں؟ تو جمہور احناف کے نزدیک ایسی صورت میں بھی آرڈر دینے والے خریدار کو خیار رؤیت حاصل رہے گا، چنانچہ خریدار مال دیکھنے کے بعد یہ کہہ کر واپس کرسکتا ہے کہ اگرچہ طے شدہ شرائط اور نمونہ کے مطابق مال بن گیا ہے؛ لیکن مال مجھے پسند نہیں ہے میں نہیں لوں گا، یہ قول ظاہر الروایہ کے مطابق ہے؛ لیکن حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مال تیار ہونے سے پہلے پہلے عقد غیر لازم رہتا ہے اور مال مکمل تیار ہو جانے کے بعد یہ عقد خود بخود لازم ہو جاتا ہے اور آرڈر دینے والے مشتری کو خیار رویت حاصل نہیں ہوگا؛

اس لئے کہ ایسی حالت میں مشتری کو اگر خیار رؤیت کے نام سے اختیار دیا جائے اور وہ مال لینے سے انکار کردے تو بائع (کاریگر) کو بڑا نقصان ہوسکتا ہے اور شریعت چھوٹے نقصان کے مقابلے میں بڑے نقصان سے بچنے کو اہمیت دیتی ہے؛ اس لئے خریدار پر لازم ہوجائے گا کہ مال کو واپس نہ کرے اور بلا کسی اڑچن لگائے اس کو قبول کر لے، اس کو حضرات فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔ بدائع کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

فَأَمَّا إِذَا أَحْضَرَ الصَّانِعُ الْعَيْنَ عَلَى الصِّفَةِ الْمَشْرُوطَةِ فَقَدْ سَقَطَ خِيَارُ الصَّانِعِ وَلِلْمُسْتَصْنِعِ الْخِيَارُ؛ لِأَنَّ الصَّانِعَ بَائِعٌ مَا لَمْ يَرَهُ فَلا خِيَارَ لَهُ، وَأَمَّا الْمُسْتَصْنِعُ فَمُشْتَرِي مَا لَمْ يَرَهُ، فَكَانَ لَهُ الْخِيَارُ (إلى قوله) هٰذَا جَوَابُ ظَاهِرِ الرِّوَايَةِ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَؒ وَأَبِي يُوسُفَؒ وَمُحَمَّدٍؒ، وَرُوِيَ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَؒ أَنَّ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا الْخِيَارُ، وَرُوِىَ عَنْ أَبِي يُوسُفَ: أَنَّهُ لا خِيَارَ لَهُمَا، وَجْهُ رِوَايَةِ أَبِي يُوسُفَ أَنَّ الصَّانِعَ قَدْ أَفْسَدَ مَتَاعَهُ وَقَطَعَ جِلْدَهُ وَجَاءَ بِالْعَمَلِ عَلَى الصِّفَةِ

اور بہر حال جب کاریگر سامان کو طے شدہ شرائط کے مطابق بنا کر پیش کردے تو کاریگر کا اختیار ختم ہوجائے گا اور آرڈر دینے والے خریدار کو اختیار باقی رہے گا؛ اس لئے کہ کاریگر ایسی چیز کا بیچنے والا ہے جس کو اس نے نہیں دیکھا ہے (پھر بنا کر تیار کرنے کے بعد) اس کے لئے خیار ثابت نہیں ہوگا اور بہر حال آرڈر دینے والا خریدار ایسی چیز کا خریدنے والا ہے جس کو اس نے دیکھا نہیں ہے؛ اس لئے اس کو خیار رؤیت حاصل ہوگا، یہ ظاہر الروایہ کا جواب ہے جو امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ سے مروی ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک کو اختیار حاصل ہوگا اور امام ابو یوسفؒ سے ایک روایت یہ ہے کہ دونوں میں سے کسی کو بھی فسخ کا اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ اور امام ابو یوسفؒ کی روایت کی وجہ یہ ہے کہ کاریگر نے اپنا

الْمَشْرُوطَةِ فَلَوْ كَانَ لِلْمُسْتَصْنِعِ الامْتِنَاعُ مِنْ أَخْذِهِ لَكَانَ فِيهِ إِضْرَارٌ بِالصَّانِعِ.

(بدائع الصنائع زکریا دیوبند ٤/ ٩٥، ٩٦، کراچی ٥/ ٣، ٤)

سامان مال بنانے کے لئے توڑ دیا اور چمڑا کاٹ دیا اور اس کے بعد طے شدہ شرائط کے مطابق مال بنا کر تیار کرلیا ہے، پھر اگر آرڈر دینے والا خریدار اس کو لینے سے انکار کردیگا تو کاریگر کو بڑا نقصان پہنچ جائے گا۔

اور اسی کو عنایہ میں اس طرح کے الفاظ سے نقل کیا گیا ہے:

وَعَنْ أَبِي يُوسُفَؒ أَنَّهُ لا خِيَارَ لَهُمَا، أَمَّا الصَّانِعُ فَلِمَا ذَكَرْنَا أَوَّلا، وَأَمَّا الْمُسْتَصْنِعُ فَلأَن الصَّانِعَ أَتْلَفَ مَالَهُ بِقَطْعِ الصَّرْمِ وَغَيْرِهِ لِيَصِلَ إِلَى بَدَلِهِ، فَلَوْ ثَبَتَ لَهُ الْخِيَارُ تَضَرَّرَ الصَّانِعُ؛ لِأَنَّ غَيْرَهُ لا يَشْتَرِيهِ بِمِثْلِهِ، أَلا تَرَى! أَنَّ الْوَاعِظَ إِذَا اسْتَصْنَعَ مِنْبَرًا وَلَمْ يَأْخُذْهُ فَالْعَامِيُّ لا يَشْتَرِيهِ أَصْلاً.

(عنایة مع فتح القدیر زکریا دیوبند ٧/ ١٠٩، کوئٹہ پاکستان ٦/ ٢٤٢، دارالفکر ٧/ ١١٦)

اور امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ دونوں میں سے کسی کو فسخ کا اختیار نہیں ہے، بہر حال صانع کو اس لئے نہیں ہے کہ جو ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے اور بہر حال آرڈر دینے والے خریدار کو اس لئے اختیار حاصل نہیں ہے کہ کاریگر نے اپنا مال چمڑا وغیرہ کاٹنے کے ذریعہ سے خراب کردیا ہے، تاکہ اس کا بدل (قیمت) حاصل کرلے؛ لہٰذا اگر خریدار کے لئے اختیار ثابت ہوجائے تو کاریگر کو نقصان پہنچ جائے گا؛ اس لئے کہ اس خریدار کے علاوہ دوسرا آدمی اس جیسی چیز خریدتا نہیں ہے، کیا نہیں دیکھتے ہو کہ بے شک خطیب نے جب منبر بنوا کر اس کو نہیں لیا تو عام آدمی اسے بالکل نہیں خریدے گا۔

امام ابو یوسفؒ کے قول کی ترجیح

امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق عقدِ استصناع بیع لازم ہے اور جب نمونہ اور شرائط کے مطابق مال تیار ہوجائے اس کے بعد اگر آرڈر دینے والے خریدار کو مال قبول نہ کرنے کا اختیار دیا جائے، تو کاریگر کا زبردست نقصان ہوسکتا ہے اور بلا کسی شرعی وجہ کے کاریگر کو اتنے بڑے نقصان کا مکلّف شریعت نہیں بناتی؛ اسی لئے حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول کو راجح قرار

دیا جائے اور آرڈر دینے والے خریدار پر لازم کردیا جائے کہ اس کو قبول کرنے کا پابند ہوجائے۔ اور خیار رؤیت استعمال کرنے کا حق اس کو حاصل نہیں ہوگا، اسی کو مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ نے بھی ''اسلام اور جدید معاشی مسائل ۵/ ۱۵۵'' میں واضح فرما کر ترجیح دی ہے؛ اسی لئے امام ابو یوسفؒ کی رائے کو ترجیح دینے میں علماء متفق ہوجائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ نیز فتاویٰ تاتارخانیہ میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ امام ابو یوسفؒ شروع میں امام ابوحنیفہؒ کی طرح اس بات کے قائل تھے کہ عقدِ استصناع عقد غیر لازم ہے؛ لہٰذا معاملہ ہوجانے کے بعد فریقین میں سے ہر ایک کو اختیار رہے گا، چاہے عقد کو باقی رکھے یا ختم کردے، اس کے بعد امام ابو یوسفؒ نے اپنے اس قول سے رجوع کر کے فرمایا کہ صانع پر جبر نہیں کیا جاسکتا اور مستصنع کو قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا، پھر اس کے بعد امام ابو یوسفؒ نے اپنے اس قول سے بھی رجوع کر کے فرمایا کہ استصناع کا معاملہ منعقد ہوجانے کے بعد عقد لازم ہوجائے گا اور جانبین میں سے کسی کو بھی مسترد کرنے کا حق نہیں ہوگا؛ بلکہ کاریگر کو عمل پر مجبور کیا جائے گا اور آرڈر دینے والے خریدار کو مبیع کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ اور آج کے زمانہ میں حضرت امام ابو یوسفؒ کے اس قول سے کوئی مفر نہیں ہے، ورنہ جانبین کو نقصان اٹھاتے رہنا پڑے گا۔ حضرت امام ابو یوسفؒ کے قول ہی کو مفتی بہ قرار دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ عبارت ملاحظہ فرمائیے:

وَرَوَى أَبُو يُوسُفَ عَنْ أَبِيْ حَنِيْفَةَؒ: الصَّانِعُ لَا يُجْبَرُ عَلَى الْعَمَلِ بَلْ يَتَخَيَّرُ إِنْ شَاءَ فَعَلَ وَإِنْ شَاءَ لَمْ يَفْعَلْ، وَإِذَا أَتَى الصَّانِعُ بِالْمَصْنُوْعِ لَا يُجْبَرُ الْمُسْتَصْنِعُ عَلَى الْقَبُوْلِ بَلْ هُوَ بِالْخِيَارِ إِنْ شَاءَ قَبِلَ وَإِنْ شَاءَ لَمْ يَقْبَلْ ......

حضرت امام ابو یوسفؒ امام ابوحنیفہؒ سے روایت کرتے ہیں کہ کاریگر کو عمل پر مجبور نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ اس کو اختیار رہے گا، چاہے کرے اور چاہے نہ کرے اور جب کاریگر شرائط کے مطابق مال بنا کر کے لے آئے تو آرڈر دینے والے خریدار کو قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ اس کو اختیار ہے چاہے قبول کرلے اور چاہے قبول نہ کرے۔ اور امام ابو یوسفؒ نے شروع

وَقَالَ أَبُويُوسُفَ أَوَّلًا: يُجبَرُ الْمُسْتَصْنِعُ دُوْنَ الصَّانِعِ، وَهُوَ رِوَايَةٌ عَنْ أَصْحَابِنَا، ثُمَّ رَجَعَ عَنْ هٰذَا وَقَالَ: لاَ خِيَارَ لِوَاحِدٍ مِّنْهُمَا، بَلْ يُجْبَرُ الصَّانِعُ عَلَى الْعَمَلِ، وَيُجْبَرُ الْمُسْتَصْنِعُ عَلَى الْقَبُوْلِ.

(الفتاوى التاتارخانية زكريا ۹/ ۱۰٤، رقم: ۱۳۷۱۹)

میں یہ فرمایا تھا کہ آرڈر دینے والے خریدار کو قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا، صانع کو عمل پر مجبور نہیں کیا جائے گا، یہ ہمارے اصحاب کی ایک روایت ہے، پھر امام ابویوسفؒ نے اس قول سے رجوع کر کے فرمایا کہ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اختیار نہیں ہے؛ بلکہ صانع (کاریگر) کو عمل پر مجبور کیا جائے گا اور آرڈر دینے والے (مستصنع) کو قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

اور یہ حکم ملتقی الابحر کی ذیل کی عبارت سے بھی واضح ہوتا ہے:

وَهُوَ بَيْعٌ لَا عِدَةٌ، فَيُجْبَرُ الصَّانِعُ عَلٰى عَمَلِهٖ وَلَا يَرْجِعُ الْمُسْتَصْنِعُ عَنْهُ. (ملتقي الابحر مع مجمع الأنهر بيروت ۳/ ۱٤۹)

اور وہ عقد بیع ہے وعدۂ بیع نہیں ہے؛ لہٰذا کاریگر کو عمل پر مجبور کیا جائے اور آرڈر دینے والے مستصنع کو اس عقد سے رجوع کا حق نہیں ہوگا۔

عقدِ استصناع میں مدت کی تعیین کا مسئلہ

عقدِ سَلم میں مسلم فیہ (مبیع) کے سونپنے کے زمانہ اور مدت کی تعیین لازم ہے، مگر عقدِ استصناع میں زمانہ اور مدت کی تعیین کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر مدت متعین کر دی جائے، تو عقدِ استصناع عقدِ سلم میں تبدیل ہو جائے گا؛ لیکن حضرات صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ ایسی کوئی شرط مشروط نہیں ہے؛ اس لئے کہ عقدِ استصناع کا سارا مدار تعاملِ ناس اور عرف پر ہے اور جب تعاملِ ناس اور عرف میں عقدِ استصناع کے اندر مدت متعین کرنے کا سلسلہ جاری ہو جائے تو اس کا اعتبار کرنا ضروری ہو جائے گا؛ لہٰذا اگر عقدِ استصناع میں مبیع کو سونپنے کی مدت متعین کر دی جائے تو وہ سلم میں تبدیل نہیں ہوگا؛ بلکہ بدستور معاملہ عقدِ استصناع کے طور پر باقی رہے گا؛ اس لئے عقدِ استصناع دونوں طرح جائز ہوگا کہ اگر مدت متعین کر دی جاتی ہے تب بھی عقدِ استصناع ہی رہے گا اور مدت متعین نہ کرے تب بھی

استصناع ہی کے دائرہ میں رہے گا۔ اور دورِ حاضر میں استصناع کے معاملہ میں عام طور پر مدت متعین کرنے کا دستور ہے، تاکہ جانبین کے لوگ اس کی پابندی کی کوشش کریں اور زیادہ تاخیر کی وجہ سے آرڈر دینے والے کو نقصان نہ پہنچے اور اس زمانہ کے تعامل کے لحاظ سے صاحبینؒ کے قول کو ترجیح حاصل ہوگی۔

اس کو صاحب بدائع نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

وَمِنْهَا أَنْ لايَكُوْنَ فِيْهَا أَجَلٌ، فَإِنْ ضَرَبَ لِلْاسْتِصْنَاعِ أَجَلاً صَارَ سَلَمًا (قوله) وَهٰذَا قَوْلُ أَبِي حَنِيْفَةَ، وَقَالَ أَبُوْيُوْسُفَ وَمُحَمَّدٌ: هٰذَا لَيْسَ بِشَرْطٍ وَهُوَ اسْتِصْنَاعٌ عَلٰى كُلِّ حَالٍ، ضَرَبَ فِيْهِ أَجَلاً أَوْ لَمْ يَضْرِبْ. (بدائع الصنائع زكريا ٤/ ٩٤، كراچی ٥/ ٣، اسی طرح کی عبارت البحر الرائق زکریا دیوبند ٦/ ٢٨٥، کوئٹہ ٦/ ١٧١، مبسوط سرخسی ١٢/ ٣٩، تبيين الحقائق ملتان ٤/ ١٢٤، زکریا ۴/ ۵۲۸ میں موجود ہے)

اور ان شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ استصناع کے اندر مدت متعین نہ ہو؛ لہٰذا اگر استصناع میں مدت متعین کردے گا، تو وہ سلم میں تبدیل ہوجائے گا اور یہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ شرط مشروط نہیں ہے اور یہ عقد ہر حال میں استصناع ہی رہے گا، اس میں مدت متعین کردی ہو یا نہ کی ہو۔

اور اس حکم کو ''الفقہ الإسلامی'' میں مزید واضح الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

وَقَالَ الصَّاحِبَانِ: لَيْسَ هٰذَا بِشَرْطٍ، وَالْعَقْدُ اسْتِصْنَاعٌ عَلٰى كُلِّ حَالٍ حُدِّدَ فِيْهِ أَجَلٌ أَوْ لَمْ يُحَدَّدْ؛ لِأَنَّ الْعَادَةَ جَارِيَةٌ بِتَحْدِيْدِ الْأَجَلِ فِي الاسْتِصْنَاعِ، فَيَكُوْنُ شَرْطًا صَحِيْحًا لِذٰلِكَ. (الفقه الإسلامي ٤/ ٣٩٦)

اور صاحبینؒ نے فرمایا کہ ایسی کوئی شرط مشروط نہیں ہے اور عقد ہر حال میں استصناع کے طور پر باقی رہے گا، اس میں مدت متعین کردی ہو یا نہ کی ہو؛ اس لئے کہ عادت وعرف عقد استصناع میں مدت متعین کرنے کے بارے میں جاری ہوچکی ہے؛ لہٰذا شرعی طور پر یہ جائز اور صحیح ہوجائے گا۔

عقدِ استصناع میں طے شدہ مدت سے تاخیر کے نقصان کا عوض

عقدِ استصناع میں مال تیار کر کے پیش کرنے کی مدت کا تعین لازم اور ضروری نہیں ہے؛ بلکہ اس میں جانبین کو اختیار ہے کہ مدت متعین کریں، یا نہ کریں؛ لہٰذا اگر جانبین کی تراضی سے مدت متعین ہو جاتی ہے اور مال تیار کنندہ اس کی فراہمی میں طے شدہ وقت سے تاخیر کر دے، تو آرڈر دینے والے خریدار کو اختیار ہے کہ قیمت ادا کر کے اسے قبول کر لے، یا اس کو قبول کرنے سے انکار کر دے، تو اس بات کو یقینی بنانے کے لئے آپس کی تراضی سے معاملہ کے وقت یہ طے کر لیں کہ بائع مال تیار کر کے فراہم کر دینے میں اگر متعین وقت سے تاخیر کرے گا تو اس پر جرمانہ عائد ہوگا، جیسا کہ بین الاقوامی مارکیٹ میں اس طرح کی تاخیر کی صورت میں کلم کاٹنے کا تعامل اور دستور جاری ہے، تو سوال یہ ہے کہ شریعت میں بھی اس طرح کسی تعزیری جرمانے کی گنجائش ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں مبسوط سرخسی میں مسئلہ اجارہ کی بحث کے تحت میں تاخیر کے نتیجہ میں کلمِ کاٹنے کی شرط کو جائز قرار دیا ہے، چنانچہ حضرات فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے کپڑوں کو سلائی کے لئے کسی خیاط کو یہ کہہ کر کے کپڑا پیش کرتا ہے کہ اگر خیاط ایک دن میں یہ کپڑا تیار کر دے، تو اس کی اجرت سو روپیہ ہوگی اور اگر دو دن میں تیار کرتا ہے، تو اجرت سو روپیہ کے بجائے پچاس روپیہ ہو جائے گی، تو اس طرح کی تاخیر کی کلم کاٹنا مسئلۂ اجارہ کے ذیل میں فقہاء نے جائز لکھا ہے، تو اس طرح سے عقد استصناع میں بھی مال کی قیمت کو فراہمی کے وقت کے ساتھ منسلک کیا جا سکتا ہے؛ لہٰذا اگر فریقین اس بات پر متفق ہو جائیں کہ فراہمی میں تاخیر کی صورت میں فی یوم یا فی ہفتہ قیمت میں سے متعین مقدار کم ہوتی جائے گی، تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہوگا۔ اور اس زمانہ کے مفکر حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ نے بھی اس کو جائز لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو ”اسلام اور جدید معاشی مسائل ٥/ ١٥٦“۔ اب فقہاء کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

لَوْ دَفَعَ إِلَيْهِ ثَوْبًا لِيَقْطَعَهُ قَمِيْصًا، وَاشْتَرَطَ عَلَيْهِ إِنْ خَاطَهُ الْيَوْمَ فَلَهُ دِرْهَمٌ، وَإِنْ لَمْ يَفْرُغْ مِنْهُ الْيَوْمَ فَلَهُ نِصْفُ دِرْهَمٍ، عِنْدَ أَبِي حَنِيْفَةَ إِنْ خَاطَهُ الْيَوْمَ فَلَهُ دِرْهَمٌ، وَإِنْ لَمْ يَفْرُغْ مِنْهُ الْيَوْمَ فَلَهُ أَجْرُ مِثْلِهِ، لَا يَنْقُصُ عَنْ نِصْفِ دِرْهَمٍ وَلَا يُجَاوِزُ بِهِ دِرْهَمًا. وَقَالَ أَبُوْيُوْسُفَ وَمُحَمَّدٌ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰى: وَهُوَ عَلَى مَااشْتَرَطَ إِذَا فَرَغَ مِنْهُ الْيَوْمَ فَلَهُ دِرْهَمٌ، وَإِنْ فَرَغَ مِنْهُ بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهُ نِصْفُ دِرْهَمٍ (إلى قوله) ثُمَّ رَجَعَ أَبُوْحَنِيْفَةَ فَقَالَ: الشَّرْطَانِ جَائِزَانِ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي يُوْسُفَ وَمُحَمَّدٍ. (مبسوط سرخسي ۱۵/ ۹۹، ۱۰۰)

اور اگر درزی کو کوئی کپڑا یہ کہہ کر دیا ہے کہ اسے کاٹ کر قمیص بنا دے اور اس پر یہ شرط لگائی ہے کہ اگر اس کو آج سی کر تیار کر دے گا، تو اس کے لئے ایک درہم ہے اور اگر آج اس سے فارغ نہیں ہو پاتا ہے تو اس کے لئے نصف درہم ہوگا، تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اگر اس نے اس کو آج ہی سی کر کے تیار کر دیا ہے، تو اس کو ایک درہم ملے گا اور اگر آج اس سے فارغ نہیں ہو پایا ہے، تو اس کے لئے اس کے ہم مثل اجرت ہوگی، جو نصف درہم سے کم نہ ہوگی۔ اور ایک درہم سے تجاوز بھی نہیں کرے گی۔ اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے فرمایا کہ وہ معاملہ لگائی ہوئی شرط کے مطابق رہے گا کہ جب اس سے آج فارغ ہو جائے گا، تو اس کے لئے ایک درہم ہے۔ اور اگر اس کے بعد سی کر فارغ ہوتا ہے تو اس کو نصف درہم ملے گا، پھر امام ابوحنیفہؒ نے اپنے قول سے رجوع کر کے فرمایا کہ دونوں شرطیں جائز ہیں اور وہی امام ابو یوسفؒ اور امام محمد رحمہما اللہ کا قول ہے۔

مقالہ کا خلاصہ اور جوابات کا حاصل

(۱) عقدِ استصناع شئ معدوم پر منعقد ہوتا ہے اور یہ عقد شرعی اصول اور قیاس کے تناظر میں

شئ کے معدوم ہونے کی وجہ سے ناجائز ہونا چاہئے ؛ لیکن شریعت نے اس عقد کو اصول اور قیاس سے مستثنیٰ کر کے ایک ضابطہ کے دائرہ میں رکھا ہے۔ اور وہ ضابطہ یہی ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں لوگوں کے درمیان شئ معدوم پر عقدِ استصناع کا معاملہ کرنے کا عرف اور تعامل جاری ہو چکا ہو، ان تمام چیزوں میں عقدِ استصناع جائز اور درست ہے۔

(۲) عقدِ استصناع اور عقدِ سلم دونوں میں شئ مبیع معدوم ہوتی ہے، مگر فرق یہ ہے کہ عقدِ سلم میں مسلم فیہ (مبیع) کی جنس کی اشیاء کا حلول مدت تک بازاروں میں ہر وقت دستیاب ہونا لازم ہے، مگر عقد استصناع میں شئ (مبیع) کا بازاروں میں موجود ہونا لازم نہیں ہے۔ اور عقدِ سلم میں مجلس عقد میں رأس المال (ثمن اور قیمت) کا ادا کرنا لازم ہے۔ اور عقدِ استصناع میں لازم نہیں ہے، اسی طرح عقدِ سلم میں خیار شرط کا ثبوت نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ بر وقت عقد لازم ہو جاتا ہے اور عقدِ استصناع میں لازم نہیں ہوتا۔ اور اسی طرح عقدِ سلم میں مسلم فیہ (مبیع) کا مثلی اور ذوات الامثال میں سے ہونا لازم ہے اور عقدِ استصناع میں شئ (مبیع) کا ذوات الامثال میں سے ہونا لازم نہیں، نیز عقدِ سلم ایسی چیزوں میں جائز ہے جن کا لوگوں کے درمیان تعامل ہے۔ اور ایسی چیزوں میں بھی جائز ہے جن کا تعامل نہیں ہے، اس کے برخلاف عقدِ استصناع صرف ایسی چیزوں میں جائز ہے جن میں عقدِ استصناع کا معاملہ کرنا لوگوں کے درمیان میں تعامل ہے اور جن میں تعامل نہیں ہے ان میں جائز نہیں ہے۔

(۳) معاملۂ استصناع عقدِ بیع ہے یا وعدۂ بیع؟ تو اس سلسلے میں امام حاکم شہید مروزیؒ، امام محمد بن سلمہؒ، امام صفارؒ، امام ابوالقاسمؒ، ناصر الدین سمرقندیؒ صاحبِ منثور وغیرہ کے نزدیک معاملہ استصناع عقد بیع نہیں ہے؛ بلکہ وعدۂ بیع ہے۔ اور حضرات جمہور کے نزدیک معاملۂ استصناع وعدۂ بیع نہیں ہے؛ بلکہ نفس بیع ہے، دونوں فریق کے دلائل مقالہ میں مفصل موجود ہیں۔

(۴) پہلے خریدار کا دوسرے خریدار کو اور اسی طرح دوسرے خریدار کا تیسرے خریدار کو نمونہ

اور ڈیزائن دکھا کر معاملۂ استصناع کے طور پر فروخت کرنا جائز اور درست ہے، تو ایسی صورت میں مالیاتی ادارہ عام طور پر درمیان کا خریدار ہوتا ہے، وہ اپنے کاریگروں سے مال بنوا کرخریدتا ہے، اور پھر اپنے بائروں کے ہاتھ نمونہ اور آرڈر کے مطابق فروخت کرتا ہے، اسی طرح بائر جس نے مالیاتی ادارہ سے معاملہ کیا ہے، تیار ہونے سے پہلے دوسروں کو وہی نمونہ دکھا کر کے استصناع کا معاملہ کرسکتا ہے؛ اس لئے کہ عقدِ استصناع کے جواز کا سارا مدار تعاملِ ناس پر ہے اور اسی طرح کا معاملہ کرنے کا ملکی اور بین الاقوامی مارکیٹوں میں تعامل ہو چکا ہے؛ اس لئے اس کے جواز میں کسی قسم کا تردد نہیں ہے۔

(۵) جس طرح چھوٹی چھوٹی منقول چیزوں میں معاملۂ استصناع جائز اور درست ہے، جیسا کہ جوتے، چپل، دھات کے برتنوں وغیرہ میں، اسی طرح بڑی بڑی منقول چیزوں میں بھی معاملۂ استصناع جائز اور درست ہے، مثلاً بحری جہاز، ہوائی جہاز، چھوٹی بڑی گاڑیاں اور ٹرین کے ڈبے وغیرہ، جب ایسی چیزوں میں سائز اور نمونہ وڈیزائن کے ساتھ آرڈر دے کر بنوانے کا تعامل ہوتو عقدِ استصناع کا معاملہ ایسی بڑی بڑی چیزوں میں بھی جائز اور درست ہے۔

(۶) جس طرح چھوٹی بڑی منقول اشیاء میں سائز اور نمونہ کے ساتھ آرڈر دے کر استصناع کا معاملہ جائز اور درست ہے، اسی طرح غیر منقول عقار میں بھی جائز اور درست ہے۔ تفصیل مقالہ میں موجود ہے۔

(۷) عقدِ استصناع میں بیعانہ کب ضبط کرسکتے ہیں؟ جب ڈیزائن اور سائز اور طے شدہ شرائط کے مطابق مال تیار ہوجائے اس کے بعد بلا کسی خامی کے مستصنع (آرڈر دینے والا خریدار) لینے سے مکر جائے، تو پیشگی دی ہوئی بیعانہ کی رقم ضبط کرنے کی گنجائش ہے۔

(۸) معاملۂ استصناع اجارہ کب بن سکتا ہے؟ اگر مالیاتی ادارہ عقد استصناع کا معاملہ کرتے وقت سارے مٹیریل کاریگر کو دے دے اور کاریگر اسی مٹیریل سے شرائط کے مطابق مال بنا کر پیش کردے تو یہ معاملہ عقدِ استصناع سے بدل کر عقدِ اجارہ بن جائے گا۔

(۹) طے شدہ شرائط اور نمونہ کی خلاف ورزی پر نقصان کا بھگتان کس پر ہوگا؟ ایسی صورت میں نقصان کا بھگتان کاریگر کو برداشت کرنا پڑے گا، استصناع کی شکل میں اس نے اپنے مٹیریل سے جو مال بنایا ہے اور نمونہ اور ڈیزائن کے خلاف بنایا ہے، تو اس طرح مال کے خراب ہوجانے کا نقصان اسے خود برداشت کرنا پڑے گا۔ اور اگر مٹیریل مالیاتی ادارہ نے اپنی طرف سے پیش کردیا ہے، تو ایسی صورت میں مالیاتی ادارہ کو اختیار رہے کہ اپنے مٹیریل کے مثل کاریگر سے وصول کرلے اور بنا ہوا مال کاریگر کے پاس چھوڑ دے اور چاہے بنا ہوا مال اسی حالت میں قبول کرلے، اگر اس مال کی قیمت میں کوئی کمی نہیں آتی ہے، تو پوری اجرت ادا کردے۔ اور اگر مال کی قیمت میں کمی آتی ہے، تو اس مال کے وصول کے ساتھ ساتھ کمی کے بقدر نقصان کی تلافی اسی کی اجرت میں سے کاٹ لے۔

(۱۰) معاملۂ استصناع کو منسوخ کرنے کی شکلیں: اگر طے شدہ شرائط کے مطابق معاملۂ استصناع جانبین کے درمیان طے ہوجائے اور ابھی مال کی تیاری شروع نہیں ہوئی ہے، تو ابھی جانبین میں سے ہر ایک کو معاملہ منسوخ کرنے کا اختیار رہے۔ اور اگر طے شدہ شرائط کے مطابق معاملہ طے ہوچکا ہے، اور کاریگر نے اپنے مٹیریل کے ذریعہ سے مال کی تیاری شروع کردی ہے، مگر ابھی مال مکمل تیار نہیں ہوا ہے، تو ایسی صورت میں جمہور کے نزدیک آرڈر منسوخ کرنے کا اختیار ہے؛ لیکن حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مال تیار ہوجانے کے بعد آرڈر کینسل کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور اس سلسلے میں امام ابو یوسفؒ کا آخری قول یہی ہے کہ طے شدہ شرائط کے ساتھ عقد استصناع منعقد ہوجانے کے بعد یہ عقد لازم ہوجاتا ہے، جانبین میں سے کسی کو بھی معاملہ منسوخ کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور عقد ہوجانے کے بعد کاریگر مال بنانے کا پابند ہوجائے گا اور مستصنع (آرڈر دینے والا) مال مصنوع (مبیع) کو قبول کرنے کا پابند ہوجائے گا۔ اور آج کے زمانہ میں امام ابو یوسفؒ کا قول ہی زیادہ راجح ہے۔

(۱۱) عقدِ استصناع میں مدت کی تعیین کا حکم کیا ہے؟ تو اس بارے میں راجح قول یہی ہے کہ

عقدِ استصناع میں مدت متعین نہ کرے، تب بھی جائز ہے۔ اور مدت متعین کردے تب بھی جائز ہے اور مدت متعین کرنے کی وجہ سے عقد استصناع سلم میں تبدیل نہیں ہوگا۔

(۱۲) عقدِ استصناع میں طے شدہ مدت سے تاخیر کے نقصان کا عوض وصول کرنا جائز ہے یانہیں؟ عقدِ استصناع میں اگر جانبین کے درمیان اس طرح شرائط طے ہوجائیں کہ طے شدہ مدت کے اندر کاریگر مال تیار کرکے فراہم نہ کرے اور مالیاتی ادارہ نے جس خریدار سے آرڈر دے رکھا ہے وہ خریدار تاخیر کی وجہ سے طے شدہ قیمت میں کلم کاٹ کرکمی کرتا ہے، تو اس کمی کی تلافی کاریگر سے کی جائے گی، اگر بوقت عقد اس طرح کے شرائط طے ہوجائیں اور پھر کاریگر نے مال کی فراہمی میں تاخیر کردی ہے، تو یومیہ یا ہفتہ کے حساب سے کمی کے نقصان کی تلافی اس کے مال یا اس کی اجرت میں سے کرنے کی گنجائش ہے۔

و الله الموفق و المعین.

خادم: دارالافتاء جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد (الہند)

۲/محرم الحرام ۱۴۳۵ھ

❁❁❁

١١/ باب بیع الوفاء

بیع الوفاء

سوال [٨٨٣٩]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید کے پاس مکان بھی ہے اور دوکان بھی، مگر پیسہ کی سخت ضرورت ہے، کوئی شخص اس کو قرض بھی دینے کو تیار نہیں، زید اپنی دوکان فروخت کرنا بھی نہیں چاہتا۔ اور اگر قرض کے لئے دوکان کو رہن رکھ کر قرض لیتا ہے تو قرض دینے والا شرعاً دوکان مرہون سے فائدہ بالکل نہیں اٹھا سکتا ہے، تو ایسی تباہ کن حالت میں مالک دوکان (کتاب ایضاح النوادر ص:٦٨-٦٩) پر جولکھا ہے: دو گواہوں کے روبرو بیع الوفاء، بیع الامانت، بیع الرہن کے تحت یہ معاملہ طے ہوا ہے کہ مجھے مبلغ تیس ہزار روپئے آپ دے دیں بطور قرض میں اس کے عوض اپنی دونوں دوکانیں آپ کے سپرد کرتا ہوں، جب میں قرض ادا کردوں گا تو اپنی دوکانیں واپس لے لوں گا، تو کیا شرعاً اس طریقے سے قرض دینے والا زید کی دوکانوں سے کرایہ وغیرہ سے فائدہ حاصل کرسکتا ہے یا نہیں؟ مکمل ومدلل جواب سے نوازیں مہربانی ہوگی، اس کے باوجود بھی کچھ اعتراض سامنے آرہے ہیں، اس لئے فتویٰ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

المستفتی: شمشاد احمد رام نگر، نینی تال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر زید کو قرض حسنہ کے طور پر کوئی قرض دینے والا نہیں ہے اور وہ بہت سخت ضرورت مند ہے، تو ایسی صورت میں مشائخ سمرقند اور مشائخ بلخ اور مشائخ بخاری کے فتوی پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔ اور عقد کے وقت میں اس معاملہ کا نام قرض نہ رکھا جائے؛ بلکہ خریداری اور فروختگی کے الفاظ استعمال کریں، مالک دوکان اس طرح کہے کہ میں ۳۰ ر ہزار روپئے کے عوض یہ مکان یا دوکان بیع امانت اور بیع رہن کے طور پر آپ کو

دیتا ہوں اور جب میں آپ کی پوری رقم ادا کردوں گا تو آپ مکان مجھے واپس کردیں گے۔ اوراس درمیان آپ مکان یا دوکان سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ اور اس سلسلہ میں ایک اگریمنٹ بھی تحریر کرکے رکھ لیں، تاکہ جانبین اس تحریر کے پابند رہیں۔

ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، منهم الإمام نجم الدين النسفي، فقال: اتفق مشايخنا في هذا الزمان، فجعلوه بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، وهو الانتفاع به دون البعض، وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه -إلى قوله- وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى.

(تبيين الحقائق، كتاب الإكراه، مكتبه إمداديه ملتان ٥/ ١٨٣-١٨٤، زكريا ديوبند ٦/ ٢٣٧)

ومن هذا القبيل بيع الأمانة، المسمى ببيع الوفاء جوزه مشايخ بلخ وبخارى توسعة. (الأشباه والنظائر، القاعدة الرابعة: المشقة تجلب التيسير، قديم ص: ١٣٠، جديد زكريا ١/ ٢٦٥-٢٣٦)

ومنها: الإفتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على أهل بخارى، وهكذا بمصر وقد سموه بيع الأمانة، والشافعية يسمونه الرهن المعاد.

(الأشباه والنظائر القاعدة الخامسة: الضرر يزال، قديم، ص: ١٤٩، وهكذا ١٦١، جديد زكريا ١/ ٢٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۸۴۹۰/۳۷)

بیع الوفاء کا حکم

سوال [۸۸۴۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: آج کل ممبئی اور بنگلور جیسے بڑے شہروں میں ہیوی ڈپازٹ یا میںٹینس پر مکان لئے جاتے ہیں، جس میں مالک مکان کو ڈپازٹ کے طور پر ایک بڑی رقم دی جاتی ہے اور بجائے

کرائے کے صرف میٹنینس کی رقم ادا کرنی ہوتی ہے اور متعین مدت کے بعد ڈپازٹ کی رقم بغیر کمی بیشی کے واپس مل جاتی ہے،اس طرح مکان لینا ازروئے شریعت کیسا ہے؟

بعض علماء کے نزدیک مندرجہ بالا صورت جائز نہیں ہے۔اور بعض کے نزدیک ڈپازٹ کی رقم کے ساتھ کرایہ بھی طے کرنا چاہئے ،جن حضرات نے اس صورت کو ناجائز قرار دیا ہے ان کی دلیل مندرجہ ذیل ہے:

''کسی کو قرض دے کر بطور ضمانت اس کی کوئی منقولہ یا غیر منقولہ چیز قرض دہندہ اپنی تحویل میں لے لے، تاکہ اگر قرض لینے والا ادائے گی نہ کرسکے تو قرض دینے والا اسے فروخت کرکے اپنی رقم وصول کرسکے،اسے شرعاً رہن کہتے ہیں؛ لیکن اس دوران قرض دینے والا اس چیز سے کسی قسم کا نفع حاصل نہیں کرسکتا ،اگر نفع حاصل کرے گا تو سود ہوگا۔ اوراس صورت مسئولہ میں مکانوں کو ہیوی ڈپازٹ پر دینے کی نوعیت بھی وہی ہے؛ لہٰذا یہ شخص مکان اپنی تحویل میں تو لے سکتا ہے،تاکہ ادائے گی کی ضمانت رہے؛ لیکن نفع حاصل کرنا جائز نہ ہوگا۔

اس فتوی پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں :

(۱) مالک مکان اگر اپنا مکان رہن رکھنا چاہے تو کیا کوئی اس شرط پر بڑی رقم دے گا کہ وہ اس مکان کو استعمال نہ کرے؟

(۲) کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی ہیوی ڈپازٹ ادا کرے اور مکان استعمال نہ کرے، جب کہ اقرارنامہ میں''اگریمنٹ'' استعمال کی اجازت درج کرائی جاتی ہے؟

(۳) کیا مالک مکان کی رضا مندی اوراجازت سے مکان استعمال کرنا بھی سود میں داخل ہے؟

(۴) اگر بالفرض کوئی استعمال نہ کرنے والا ہوتو مکان کا میٹنینس کون ادا کرے؟

(۵) کیا ڈپازٹ کی رقم متعین مدت میں واپس نہ ملے تو مکان فروخت کیا جاسکتا ہے؟

(٦) جو شخص کرایہ ادا کرنے کی استعداد نہیں رکھتا وہ کیا کرے؟

(۷) اگر ہیوی ڈپازٹ کے ساتھ کرائے کی رقم طے بھی کرنا چاہیں تو کس بنیاد پر کریں؟ اور

اس کا تناسب کیا ہو، جب کہ زیادہ ڈپازٹ تو کرایہ کم اور کم ڈپازٹ تو کرایہ زیادہ کا اصول چلن میں ہو؟ مثلاً زید نے چار لاکھ روپئے ڈپازٹ کے طور پر دیئے ہوں اور وہ ہر ماہ ۵۱۰/ روپئے بلاناغہ مینٹینس کے طور پر بھی ادا کرر ہا ہوں، اب زید کتنا کرایہ دے؟ وغیرہ

المستفتی: اسلم ملا

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو معاملہ سوال نامہ میں درج ہے وہ بنیادی طور پر شرعاً جائز نہیں ہے۔ اور جن حضرات نے اس کو ناجائز کہا ہے اور ناجائز ہونے پر دلیلیں پیش کی ہیں، وہ اپنی جگہ درست ہیں؛ لیکن بعض فقہاء نے اس طرح کے معاملہ کو ''بیع الوفاء'' کے دائرہ میں داخل کر کے گنجائش قرار دی ہے۔ اور بیع الوفاء کو بیع الامانت اور بیع رہن بھی کہا جاتا ہے، انتہائی مجبوری کی حالت میں بیع الوفاء اور بیع الامانت کے جواز کی گنجائش قرار دی گئی۔ اور بیع الوفاء میں یہی شرط ہے کہ جتنے پیسے میں جائیداد خریدار کے ہاتھ میں دی جاتی ہے اتنے ہی پیسے میں اصل مالک کو واپس کیا جائے اور اس درمیان میں جس نے جائیداد لی ہے وہ جائیداد سے نفع حاصل کرسکتا ہے۔ اور جب مالک لیے ہوئے پیسہ واپس دے گا تو لینے والے پر لازم ہے کہ ان ہی پیسوں پر جائیداد واپس کرے اور اس معاملہ میں اگر پکی رجسٹری ہوجائے، تو واپسی کی شرائط کے ساتھ پکی رجسٹری ہونی چاہئے، ورنہ معمولی اسٹامپ پر کچی رجسٹری ہونی چاہئے، تاکہ مالک کو واپس لینے کے وقت میں کوئی دشواری پیش نہ آجائے۔

ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، منهم الإمام نجم الدين النسفي، فقال: اتفق مشايخنا في هذا الزمان، فجعلوه بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، وهو الانتفاع به دون البعض، وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه –إلى قوله– وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى.

(تبيين الحقائق، كتاب الإكراه، مكتبه إمداديه ملتان ٥/ ١٨٣–١٨٤، زكريا ديوبند ٦/ ٢٣٧)

ومن هذا القبيل بيع الأمانة، المسمى ببيع الوفاء جوزه مشايخ بلخ

وبخاری توسعة. (الأشباه والنظائر، القاعدة الرابعة: المشقة تجلب التيسر، قديم ص: ١٣٠، جديد زكريا ١/ ٢٣٥-٢٣٦)

ومنها: الإفتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على أهل بخارى، وهكذا بمصر وقد سموه بيع الأمانة، والشافعية يسمونه الرهن المعاد.

(الأشباه والنظائر، القاعدة الخامسة: الضرر يزال، قديم، ص: ١٤٩، وهكذا ١٦١، جديد زكريا ١/ ٢٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ	الجواب صحیح:
۲۲/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۲ھ	احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۰۴۴۲/۳۹)	۱۴۳۲/۶/۲۲ھ

''بیع الوفاء'' کا جواز

سوال [۸۸۴۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مجھے دو لاکھ روپئے کی فوری ضرورت ہے اور قرض ملنا دشوار ہے، تو کیا میں اپنی دو بیگہ زمین ایک صاحب ثروت کو یہ کہہ کر دے سکتا ہوں کہ تم یہ زمین اپنے استعمال میں رکھ لو، جب میرے پاس پیسوں کا انتظام ہوگا میں پیسہ ادا کرکے اپنی زمین واپس لے لوں گا، اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نظر نہیں آرہا ہے، حکم شرعی سے مطلع فرمادیں عین نوازش ہوگی۔

المستفتی: مفتی سمیر عثمان آباد مہاراشٹر، استاذ مدرسہ فلاح دارین

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس طرح کا معاملہ کرنا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ سخت ضرورت کی وجہ سے سود سے بچنے کے لئے ''بیع الوفاء'' کی صورت اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔ اور اس کی شکل یہ ہے کہ: صاحب ثروت سے یوں کہے کہ: یہ زمین اتنے پیسوں کے عوض میں تمہارے ہاتھ اس وقت تک کے لئے بیچ دیتا ہوں جب تک میرے پاس پیسوں کا

انتظام ہوجائے اور جب میرے پاس پیسوں کا انتظام ہوجائے گا، تو اتنے ہی پیسوں پر میرے ہاتھ واپس فروخت کرنا ہوگا، اس طرح ’’بیع الوفاء‘‘ کی شکل اختیار کرلی جائے، تو مجبوری میں اس کی گنجائش ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاوی ٣/ ١٠٧، فتاوی خلیلیہ ١/ ٣٩٥، انوار رحمت ص: ٢١٩، ایضاح النوادر ١/ ٧٣)

لا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه، وإن أذن له الراهن؛ لأنه أذن له في الربا، لأنه يستوفى دينه كاملا، فتبقى له المنفعة فضلا، فيكون ربا، وهذا أمر عظيم. (شامي، كراچى ٦/ ٤٨٢، زكريا ١٠/ ٨٣)

ومن هذا القبيل بيع الأمانة، المسمى ببيع الوفاء جوزه مشايخ بلخ وبخارى توسعة. (الأشباه والنظائر، القاعدة الرابعة: المشقة تجلب التيسير، قديم ص: ١٣٠، جديد زكريا ١/ ٢٣٥-٢٣٦)

ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، منهم الإمام نجم الدين النسفي، فقال: إتفق مشايخنا في هذا الزمان، فجعلوه بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، وهو الانتفاع به دون البعض، وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه -إلى قوله- وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى.

(تبيين الحقائق، كتاب الإكراه، مكتبه إمداديه ملتان ٥/ ١٨٣-١٨٤، زكريا ديوبند ٦/ ٢٣٧)

ومنها: الإفتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على أهل بخارى، وهكذا بمصر وقد سموه بيع الأمانة. (الأشباه والنظائر، القاعدة الخامسة: الضرر يزال، قديم، ص: ١٤٩، وهكذا، ص: ١٦١، جديد زكريا ١/ ٢٦٧) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٣ر جمادی الثانیہ ١٤٣٥ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٤١/ ١١٥٧٩)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
٢٣/ ٦/ ١٤٣٥ھ

کیا ہندوستان میں عقودِ فاسدہ جائز ہیں؟

سوال [۸۸۴۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: مسئلہ درپیش ہے۔ امید ہے کہ قرآن وحدیث اور فقہ کی روشنی میں حوالہ اور عبارت کے ساتھ جواب مرحمت فرمائیں گے۔

سوال: زید نے ایک زراعت کی زمین پچاس لاکھ روپئے کی غیر مسلم سے خریدی، پیسے دے دئے ، رجسٹری بھی کرالی، اس شرط پر کہ جب غیر مسلم کے پاس پچاس لاکھ روپئے آویں گے تو غیر مسلم زید کو پیسے دے دیگا اور اپنی زمین واپس لے لے گا۔ اور جب تک پیسے نہیں دے گا وہاں تک ماہانہ زمین کا ۵۰۰۰۰/ ہزار روپئے کرایہ دے گا ، زمین غیر مسلم کے قبضہ میں ہی ہے، رجسٹری اگرچہ زید کے نام کرادی، تو کیا اس طرح معاملہ کرنا درست ہے؟ تو کیا زید اس طرح غیر مسلم سے ماہانہ کرایہ لے سکتا ہے؟ کسی نے زید سے منع کیا، تو اس کا کہنا ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے، برائے کرم مدلل جواب عطا فرمائیے۔

سوال: زید نے غیر مسلم سے پچاس لاکھ روپئے میں اس شرط پر زمین خریدی کہ جب میرے پاس پیسے آویں گے تو یہ زمین پچاس لاکھ میں ہی تجھے مجھ کو لوٹانی پڑے گی، تو کیا اس شرط کے ساتھ خریدنا جائز ہے؟

سوال: غیر مسلم نے زید سے اس زمین کو ماہانہ پچاس ہزار روپئے کرایہ پر لے لی، حالانکہ اس علاقہ میں اتنی زمین کا کرایہ پچاس ہزار سالانہ چلتا ہے، تو کیا اس طرح کرایہ پر دینا جائز ہے؟

مسئلہ مذکورہ میں غیر مسلم نے زید کو زمین کا قبضہ دیا ہی نہیں ہے، صرف پیسے لے کر شرطیہ رجسٹری کرالی ہے، قبضہ غیر مسلم کا ہی ہے اور ماہانہ پچاس ہزار روپئے کرایہ دیتا ہے۔

المستفتی: محمد یونس

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ہندوستان کو دارالحرب کہہ کر عقودِ فاسدہ کو جائز کہنا

درست نہیں ہے؛ کیوں کہ دارالحرب میں بھی عقودِ فاسدہ جائز نہیں ہیں اور ہندوستان جمہوری ملک ہے، اس کو دارالحرب کہنا درست نہیں ہے۔ اب رہا مسئلہ زیر بحث یہ مسئلہ ’’بیع الوفاء‘‘ کے دائرہ میں شامل ہے۔ اور بیع الوفاء کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، فقہاء میں سے بعض جیسے امام ظہیر الدین صدر الشہید حسام الدین اور صدر السعید تاج الاسلام وغیرہ نے اس کو عقد فاسد قرار دیا ہے۔ اور اس کے برخلاف دوسرے فقہاء نے سودی قرض سے بچنے کے لئے حاجت ناس اور تعامل ناس کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ مشائخ بلخ اور مشائخ بخاری اور مشائخ سمرقند وغیرہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ اور اسی کو مفتی بہ قرار دیا گیا ہے؛ لہٰذا مذکورہ معاملہ کی شرعاً گنجائش ہے، بس اتنی بات ہے کہ مشتری کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی؛ لیکن مذکورہ جائیداد سے خود فائدہ اٹھا سکتا ہے، یا دوسرے کو کرایہ پر دے سکتا ہے۔ اور جس سے خریدا ہے اس کے ہاتھ بھی کرایہ پر دیا جا سکتا ہے؛ اس لئے کہ خریدار نے پچاس لاکھ روپئے کی بھاری رقم دے کر خریدا ہے، پھر اس کو پچاس ہزار روپئے ماہانہ کے حساب سے کرایہ پر دینے کی بھی گنجائش ہے، جب اس علاقے میں اس طرح کی جائیداد پچاس ہزار روپئے میں کرایہ پر دینا لوگوں کے درمیان متعارف ہے، اس میں کسی قسم کا غبن فاحش بھی نہیں ہے، جیسا کہ سوال نامہ میں خود اس کا ذکر موجود ہے۔ (مستفاد: انوار رحمت، ۲۱۷، فتاوی عثمانی ۳/ ۱۰۸)

ومن مشايخ بخارى من جعل بيع الوفاء كبيع المكره، منهم: الإمام ظهير الدين، والصدر الشهيد حسام الدين، والصدر السعيد تاج الإسلام، وصورته: أن يقول البائع للمشتري: بعت منک هذا العين بدين لک علي، على أني متى قضيت الدين فهو لي –إلى قوله– ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، منهم الإمام نجم الدين النسفي، فقال:

إتفق مشايخنا في هذا الزمان، فجعلوه بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، وهو الانتفاع به دون البعض، وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه -إلى قوله- وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى. (تبيين الحقائق، كتاب الإكراه، مكتبه إمداديه ملتان ٥/ ١٨٣-١٨٤، زكريا ديوبند ٦/ ٢٣٦-٢٣٧)

ومن هذا القبيل بيع الأمانة، المسمى ببيع الوفاء جوزه مشايخ بلخ وبخارى توسعة. (الأشباه والنظائر، قديم ص: ١٣٠)

ومنها: الإفتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على أهل بخارى، وهكذا بمصر وقد سموه: بيع الأمانة، والشافعية يسمونه: الرهن المعاد.

(الأشباه والنظائر، قديم، ص: ١٤٩، وهكذا، ص: ١٦١) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ

۷؍ ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ

(الف فتویٰ نمبر: ۱۱/۱۲/۱۱۷)

قرض کی واپسی تک زمین کو فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۸۴۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک آدمی کے پاس بہت سی زمین جائیداد ہے؛ لیکن نقد روپیہ پیسہ نہیں؛ حالانکہ پیسہ کی اس کو ضرورت ہے، تو وہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ۱۰؍ ہزار روپئے فی بیگہ اپنی زمین اس شخص کو دے دیتا ہے، جس سے پیسہ لینا ہوتا ہے، اس وقت تک کے لئے کہ جب تک یہ صاحب معاملہ کو روپئے واپس نہیں کرے گا، تو اس وقت تک وہ اس زمین سے فائدہ اٹھاتا رہے گا، تو اس طرح کا معاملہ سود کے دائرے میں آتا ہے یا نہیں؟

المستفتی: عظمت علی آسام

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: روپئے کے عوض میں زمین کو رہن میں دینا، پھر مرتہن اس زمین سے روپئے واپس دینے تک فائدہ اٹھاتا رہے، تو یہ قرض کے اوپر سود لینا لازم ہوا جو قطعاً ناجائز اور حرام ہے، یہ دراصل معاملہ رہن ہے اور مرتہن کے لئے مال رہن سے فائدہ اٹھانا قرض کے عوض میں سود کے دائرہ میں داخل ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے، ہاں البتہ متأخرین فقہاء نے سود سے بچنے کے لئے انتہائی مجبوری میں ایک متبادل شکل جواز کی بتلائی ہے، اس کی شکل یہ ہے کہ: زمین کی تقریباً پوری قیمت لے کر کے پیسے والے کو زمین فروخت کردے اور اس میں شرط یہ لگائے کہ جب اتنے پیسے پر زمین والا خود خریدنا چاہے تو پیسے والے پر لازم ہے کہ اتنے ہی پیسے پر زمین واپس کردے۔ اور اس درمیان میں پیسے والا آدمی اس زمین سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس کو شریعت میں ''بیع الوفاء'' اور ''بیع الامانت'' بھی کہا جاتا ہے، اس شکل کو اختیار کئے بغیر پیسے والے کے لئے زمین سے فائدہ اٹھانا ہرگز ثابت نہیں۔

لأن المرتهن لا يجوز له الانتفاع بالرهن أصلا. (بدائع الصنائع، كتاب الرهن، فصل وأما حكم للرهن، زكريا ٥/ ٢١٠، قديم ٦/ ١٤٥)

ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، منهم الإمام نجم الدين النسفي، فقال: إتفق مشايخنا في هذا الزمان، فجعلوه بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، وهو الانتفاع به دون البعض، وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه -إلى قوله- وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى.

(تبيين الحقائق، كتاب الإكراه، مكتبه إمداديه ملتان ٥/ ١٨٣-١٨٤، زكريا ديوبند ٦/ ٢٣٧)

ومنها: الإفتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على أهل بخارى، وهكذا بمصر وقد سموه: بيع الأمانة، والشافعية يسمونه: الرهن المعاد.

(الأشباه والنظائر، القاعدة الخامسة: الضرر يزوال، قديم، ص: ١٤٩،جديد زكريا ١/ ٢٦٧)

ومن هذا القبيل بيع الأمانة، المسمى ببيع الوفاء جوزه مشايخ بلخ وبخارى توسعة. (الأشباه والنظائر، القاعدة الرابعة: المشقة تجلب التيسير، قديم ص: ١٣٠، جديد زكريا، ١/ ٢٣٥-٢٣٦) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
٢٨/ جمادی الثانیہ ١٤٣٦ھ
(الف فتویٰ نمبر: ٤١/ ١٣٠١٩)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
١٤٣٦/٦/٣٠ھ

رہن یا کرایہ پر رکھی ہوئی زمین سے فائدہ اٹھانے کی مختلف شکلیں

سوال [٨٨٤٤]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: (١) ایک ضرورت مند شخص جسے غیر سودی قرض نہیں ملتا اور وہ سودی قرض لینا بھی نہیں چاہتا، تو شریعت میں اس کے لئے کیا متبادل شکل موجود ہے؟ کیا وہ اپنا سامان مثلاً زمین ومکان وغیرہ یہ کہہ کر کسی پیسے والے شخص سے معاملہ کرسکتا ہے کہ تم اتنے روپئے مجھے دے دو اور میری زمین سے اس وقت سے مکمل فائدہ اٹھاؤ جب تک کہ میں تمہارے پیسے واپس نہ کردوں، پھر جب میں تمہارے روپئے واپس کردوں گا تو تم میری زمین بھی واپس کردوگے، ہمارے شہر میں اس طرح کے معاملات بہت رائج ہیں، تقریباً ٥٠/ فیصد لوگ اس میں مبتلا ہیں، کیا یہ معاملہ از روئے شرع جواز کے دائرہ میں آتا ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کن حالات میں، کن شرائط کے ساتھ؟ اور اگر شریعت میں اس کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے اسباب ووجوہات کیا ہیں؟

(٢) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ صورت بالا میں زمین والے ایک مدت متعینہ مثلاً ایک سال میں جمع شدہ رقوم میں سے صاحب حق کی رضا مندی سے متعین تعداد مثلاً سو روپئے کاٹ لیتے ہیں اور عاقدین اس صورت کو ربا سے پاک سمجھتے ہیں، کیا اس طرح سے یہ معاملہ جائز ہوجائے گا یا نہیں؟

(۳) تیسرا مسئلہ جس میں ہمارے علاقہ کے تقریباً ۷۵ر فیصد لوگ مبتلا ہیں، وہ یہ ہے کہ صاحب زمین کسی کا شتکار کو اپنی زمین اس شرط پر دے کہ تم مجھے فی بیگہ مثلاً ۵ر من گندم دینا اور تمہیں اب اختیار ہے کہ جو چاہو اس میں زراعت کرو؛ لیکن وقت متعین پر ہمیں اتنا گندم ملنا چاہئے خواہ پیداوار ہو یا نہ ہو، کم ہو یا زیادہ، صاحب زمین کو اس سے کوئی مطلب نہیں، مگر اپنی رضامندی سے یہ معاملہ کرتے ہیں، تو کیا شرعاً یہ جائز ہوگا یا ناجائز؟ اگر جائز ہے تو کن شرائط کے ساتھ اور اگر ناجائز ہے تو اس کے اسباب و وجوہات کیا ہیں؟ برائے مہربانی مذکورہ سوالات کے جوابات مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور رہوں۔

المستفتی: مرشد عالم ارریہ (بہار)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰه التوفيق: سوال نامہ میں صاحب قرض کے قرض لینے کی تین شکلیں بیان کی گئی ہے:

(۱) صاحب زمین پیسے والے سے اس شرط پر پیسے لے کہ جب تک وہ پیسے واپس نہیں کرے گا اس وقت تک وہ زمین سے فائدہ اٹھاتا رہے گا، یہ شکل شرعی طور پر ناجائز ہے؛ اس لئے کہ یہ رہن کی شکل ہے اور رہن میں مرتہن کے لئے مال رہن سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں، یہ ’’**کل قرض جر نفعا**‘‘ کے تحت آ کر ناجائز اور حرام ہے، اگر صاحب زمین کو غیر سودی قرض کسی طرح نہیں ملتا ہے تو اس کے لئے انتہائی مجبوری میں فقہاء متأخرین نے ایک متبادل شکل ’’بیع الوفاء‘‘ کی پیش کی ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ صاحب زمین پیسے والے کے ہاتھ اس شرط کے ساتھ زمین فروخت کرے کہ جب اتنا پیسہ صاحب زمین پیسے والے کو واپس کردے گا جتنا کہ اس نے لیا ہے، تو پیسے والا صاحب زمین کے ہاتھ وہ زمین اتنے پیسہ میں فروخت کردے گا اور اس کے لئے بہتر شکل یہ ہے کہ اس معاملہ کے لئے کچا کاغذ بنالے، سرکاری رجسٹری نہ کرے، اس کو بیع الوفاء اور بیع الامانہ بھی کہا جاتا ہے، جیسا کہ حسب ذیل جزئیات سے واضح ہوتا ہے:

كل قرض جر نفعا حرام، فكره للمرتهن سكنى المرهونة بإذن الراهن. (الدر مع الرد، زكريا ٧/ ٣٩٥)

لا يحل له أن ينتفع بشيء منه بوجه من الوجوه وإن أذن له الراهن؛ لأنه أذن له في الربا؛ لأنه يستوى دينه كاملا فتبقى له المنفعة فضلا، فيكون ربا. (شامي، زكريا ١٠/ ٨٣)

وليس للمرتهن الانتفاع بالرهن باستخدام ولا للسكنى. (مجمع الأنهر ٤/ ٢٧٣، البحرالرائق ٦/ ٤٣٨)

ومن مشايخ سمرقند من جعله بيعا جائزا مفيدا بعض أحكامه، ومنهم الإمام نجم الدين النسفي، فقال: اتفق مشايخنا في هذا الزمان، فجعلوه بيعا جائزا مفيدا بعض أحكام، وهذا الانتفاع به دون البعض، وهو البيع لحاجة الناس إليه ولتعاملهم فيه -إلى قوله- وقال صاحب النهاية: وعليه الفتوى. (زيلعي ٥/ ١٨٣)

ومن هذا القبيل بيع الأمانة المسمى ببيع الوفاء جوزه مشايخ بلخ توسعة. (الأشباه: ص: ١٣٠)

ومنها الإفتاء بصحة بيع الوفاء حين كثر الدين على أهل بخارى، وهكذا بمصر وقد سموه بيع الأمانة، والشافعية يسمونه الرهن المعاد. (الأشباه والنظائر، ص: ١٤٩، ايضاح النوادر ٧١- ٧٢، أنوار رحمت ٢١٨)

(۲) اور دوسری شکل سوال نامہ میں یہ پیش کی گئی ہے کہ صاحب زمین پیسے والے کے ہاتھ اپنی زمین اس شرط پر دے دے کہ لئے گئے پیسوں میں سے سالانہ یاماہانہ اتنی مقدار کرایہ میں کاٹ دئے جائیں گے، تو یہ شکل جائز ہے؛ لیکن کرایہ میں جو پیسہ کٹے گا اس میں غبن فاحش کی شکل نہیں ہونی چاہئے، اگر غبن فاحش ہے تو کم سے کم معاملہ مکروہ ہوگا۔

كل ما صلح ثمنا أي بدلا في البيع صلح أجرة؛ لأنها ثمن المنفعة.

(الدرالمختار مع الشامي، زكريا ۹/ ٥، كراچی ٦/ ٤، هندية ٤/ ٤١٢، جديد زكريا ٤/ ٤٤٢، شرح المجلة ١/ ٢٦٠، رقم المادة: ٤٦٣)

(۳) تیسری شکل یہ بیان کی گئی ہے کہ زمین کو بٹائی پر نہیں دیا جارہا ہے؛ **بلکہ زمین کو کرایہ پر** دیا جارہا ہے اور کرایہ داری کے ثمن میں پیسے بھی جائز ہیں اور غلہ اور دیگر ساز وسامان بھی دینا جائز ہے؛ لہٰذا متعین وقت پر متعین مقدار کے عوض میں زمین کو کرایہ پر دینا جائز ہے اور کرایہ پر لینے والے کو اختیار ہے، چاہے اس زمین پر کھیتی کرے یا ایسے ہی خالی چھوڑ کر جانور چرائے تو اس طرح زمین کو کرایہ پر دینا شرعاً جائز ہے، مگر یاد رکھیں کہ اس زمین کی پیداوار میں سے مخصوص مقدار کو کرایہ کے عوض میں قرار دینا جائز نہیں۔

وما صلح أن يكون ثمنا في البيع كالنقود والمكليل والموزون صلح أن يكون أجرة في الإجارة. (هندية ٤/ ٤١٢، جديد زكريا ٤/ ٤٤٢، الدرالمختار مع الشامي، زكريا ۹/ ٥، كراچی ٦/ ٤، شرح المجلة ١/ ٢٦٠)

ولو دفع غزلا لآخر لينسجه له بنصفه أو استأجر بغلا ليحمل طامه ببعضه أو ثورا ليطحن بره ببعض دقيقة فسدت في الكل؛ لأنه استأجره بجزء من عمله. (الدرالمختار كراچی ٦/ ٥٦، شامي زكريا ۹/ ٧٨، بزازية على الهندية ٥/ ٣٥، جديد زكريا ٢/ ٢١، البحرالرائق ٨/ ٤١) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۲؍رجب ۱۴۳۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۴۱/ ۱۲۱۶۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۲؍۷؍۱۴۳۶ھ

بیع الوفاء کی شرعی حیثیت

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم، أما بعد:

اس مضمون کواس طریقہ سے پیش کرتے ہیں،اولاً بیع الوفاء کی وجہ تسمیہ اوراس کے اسماء، اس کے بعد بیع الوفاء کی حقیقت اور جواز کا خلاصہ اور مختصر نوٹ جومعتدل حکم تک ہے، پھر اس کے بعد بیع الوفاء کے بارے میں مفصل بحث سات اقوال کے ساتھ پیش کی گئی ہے، پھرآخر میں مبیع کے بارے میں چنداحکام پرمضمون ختم کیا گیاہے۔

بیع الوفاء کےاسماء

اس عقدکوحسبِ ذیل ناموں سے موسوم کیا جا تاہے:

(۱) بیع الوفاء(۲) بیع الامانت(۳) بیع الاطاعت(۴) بیع المعاملہ(۵)البیع الجائز(٦) بیع الرہن۔

(۱) **بیع الوفاء**: اس کوبیع الوفاءاس لئے کہاجا تاہے کہ بائع اورمشتری کےدرمیان اس عقدمیں وفاداری کا معاہدہ ہوتاہے کہ جس وقت بائع ثمن کولاکر واپس کردے گا تو مشتری معاہدہ کےموافق ایفائے وعدہ کےطور پرمبیع کو واپس کردے گا،اوراس عقدکے ناموں میں سےمشہورترین نام یہی ہے۔

(۲) **بیع الأمانة**: اس کانام مصروغیرہ میں بیع الامانۃ کےنام سےمشہورہے،اوراس کو بیع الامانۃ اس لئے کہاجاتاہےکہ مبیع مشتری کے پاس بطورامانت رہتی ہے۔

(۳) **بیع الاطاعة**: ملک شام وغیرہ میں یہ بیع بیع الاطاعت کےنام سےموسوم اور مشہورہے؛ اس لئے کہ اس عقدکے اندراطاعت اوروفاداری پائی جاتی ہے کہ مشتری مبیع کےحق میں بائع کی اطاعت کرتاہےاوربائع ثمن کےحق میں مشتری کی اطاعت کرتاہے۔

(۴) **بیع المعامله**: بعض فقہاءنےاس کانام بیع المعاملہ رکھاہے،اوراس کی وجہ یہ

بیان کرتے ہیں کہ اس بیع کے اندر مشتری در پردہ اپنے قرض سے فائدہ اٹھاتا ہے؛ اس لئے کہ مشتری درحقیقت دائن اور قرض دینے والا ہے، اور اس قرض کے مقابلہ میں وہ مبیع سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس لئے بعض فقہاء نے اس کا نام بیع المعاملہ رکھا ہے۔

(۵) **البیع الجائز**: بعض فقہاء نے اس کا نام ''البیع الجائز'' رکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بیع کو ربا اور سود سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے صحیح اور جائز قرار دیا گیا ہے، اور مشتری کے لئے مبیع کا نفع کھانے اور استعمال کرنے کی گنجائش دی ہے۔

(۶) **بیع الرھن**: اس کی وجہ یہ ہے کہ مبیع مشتری کے پاس ایسی محفوظ رہتی ہے کہ جس طرح مرتہن مالِ رہن کو فروخت نہیں کرسکتا اور اس کی ملکیت کو منتقل نہیں کرسکتا، اسی طرح بیع الوفاء میں مشتری مبیع کو بیچ نہیں سکتا اور اس کی ملکیت کو منتقل نہیں کرسکتا۔ علماء شوافع نے اس کا نام ''بیع رہن'' اور ''الرہن المعاد'' رکھا ہے۔

یہ چھ نام ہمارے سامنے ہیں، حضراتِ فقہاء نے ان مختلف وجوہات کی بناء پر اپنے اپنے طور پر اس عقد کو مختلف ناموں سے موسوم کیا ہے اور ان ناموں کی وجہِ تسمیہ وہی ہے جو ہم نے آپ کے سامنے پیش کی ہے۔

عربی عبارات ملاحظہ فرمایئے:

وَبَيْعُ الْوَفَاءِ صُورَتُهُ أَنْ يَبِيعَهُ الْعَيْنَ بِأَلْفٍ عَلىٰ الدَّيْنِ وَهٰذَا يَشْتَرِيهِ أَنَّهُ إِذَا رَدَّ عَلَيْهِ الثَّمَنَ رَدَّ عَلَيْهِ الْعَيْنَ وَسَمَّاهُ الشَّافِعِيَّةُ الرَّهْنَ الْمُعَادَ وَيُسَمّٰى بِمِصْرَ بَيْعَ الْأَمَانَةِ وَبِالشَّامِ بَيْعَ

اور بیع الوفاء اس کی صورت یہ ہے کہ مشتری کے ہاتھ عینِ مبیع کو بیچے مثلاً ایک ہزار کے عوض میں اس شرط کے ساتھ کہ جب ثمن واپس کردے گا تو عینِ مبیع بھی واپس کردے گا، اور شافعیہ نے اس کا نام ''الرہن المعاد'' رکھا ہے، اہل مصر نے اس کا نام ''بیع الامانۃ'' رکھا ہے، اور اہل شام نے اس کا نام ''بیع الاطاعۃ'' رکھا

الإِطَاعَةِ (وَتَحْتَهُ فِيْ الشَّامِيَةِ) وَوَجْهُ تَسْمِيَتِهِ بَيْعُ الْوَفَاءِ أَنَّ فِيْهِ عَهْداً بِالْوَفَاءِ مِنَ الْمُشْتَرِيْ بِأَنْ يَّرُدَّ الْمَبِيْعَ عَلَى الْبَائِعِ حِيْنَ رَدَّ الثَّمَنَ، وَبَعْضُ الْفُقَهَاءِ يُسَمِّيْهِ الْبَيْعَ الْجَائِزَ وَلَعَلَّهُ مَبْنِيٌّ عَلٰى أَنَّهُ بَيْعٌ صَحِيْحٌ لِحَاجَةِ التَّخَلُّصِ مِنَ الرِّبَا حَتّٰى يَسُوْغَ لِلْمُشْتَرِيْ أَكْلُ رِيْعِهٖ وَبَعْضُهُمْ يُسَمِّيْهِ بَيْعَ الْمُعَامَلَةِ وَوَجْهُهُ أَنَّ الْمُعَامَلَةَ رِبْحَ الدَّائِنُ لِيَنْتَفِعَ بِهٖ بِمُقَابَلَةِ دَيْنِهٖ (وَقَوْلُهُ) بَيْعُ الْأَمَانَةِ وَجْهُهُ أَنَّهُ أَمَانَةٌ عِنْدَ الْمُشْتَرِيْ (وَقَوْلُهُ) وَفِيْ بَعْضِهَا بَيْعُ الطَّاعَةِ وَهُوَ الْمَشْهُوْرُ الْآنَ فِيْ بِلَادِنَا. (الدر المختار مع الشامی زکریا ۷/۵۴۵، کراچی ۵/۲۷۶)

ہے،اس کے نیچے شامی میں ہے کہ اس کا ’’بیع الوفاء‘‘ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس عقد میں مشتری سے وفاداری کا عہد کیا جاتا ہے، بایں طور کہ مشتری مبیع کو واپس کردے گا جس وقت بائع ثمن واپس کردے گا، اور بعض فقہاء نے اس کا نام ’’البیع الجائز‘‘ اور ’’البیع الصحیح‘‘ رکھا ہے، اور شاید اس کا مدار اس بات پر ہے کہ یہ عقد بیع ربا سے خلاصی حاصل کرنے کے لئے صحیح اور جائز ہے، یہاں تک کہ مشتری کے لئے اس کا نفع کھانے کی گنجائش ہے اور بعض فقہاء نے اس کا نام ’’بیع المعاملۃ‘‘ رکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں دین سے نفع اٹھانے کا معاملہ پایا گیا اور یہ اس طور پر ہے کہ قرض دینے والے نے مبیع کو خریدا ہے؛ تاکہ اپنے دین کے مقابلہ میں اس مبیع سے نفع اٹھائے، اور ’’بیع الامانۃ‘‘ اس کا نام اس لئے ہے کہ مبیع مشتری کے پاس بطورِ امانت رہتی ہے اور بعض نسخوں میں ’’بیع الطاعۃ‘‘ ہے۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے بلاد میں اس وقت یہی مشہور ہے۔

اور الاشباہ والنظائر میں ہے کہ:

وَمِنْ هٰذَا الْقَبِيْلِ بَيْعُ الْأَمَانَةِ الْمُسَمّٰى بِبَيْعِ الْوَفَاءِ جَوَّزَهُ مَشَائِخُ بَلْخٍ وَبُخَارىٰ تَوْسِعَةً. (الاشباه والنظائر قديم ۱۳۰)

اور اسی قبیل سے ہے، بیع الامانۃ جو بیع الوفاء کے نام سے موسوم ہے، مشائخ بلخ اور مشائخ بخاریٰ نے لوگوں سے تنگی کو دور کرکے وسعت دیتے ہوئے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

بیع الوفاء کی حقیقت

کوئی شخص صاحبِ ضرورت ہے اس کو روپیہ کی ضرورت ہے، اور کہیں سے ادھار بھی نہیں ملتا، اور اس کے پاس مکان یا دوکان یا زمین وغیرہ موجود ہے، اور اس کو رہن میں رکھ کر روپیہ حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر رہن میں رکھنے کی صورت میں مرتہن اس سے فائدہ حاصل نہیں کرسکتا، اس لئے کوئی شخص رہن رکھ کر بھی قرض دینے پر تیار نہیں، اور صاحبِ جائداد اس ضرورت کی وجہ سے اپنی ہمیشہ کی جائیداد کو بالکلیہ فروخت کرنا بھی نہیں چاہتا، تو اس طرح حاجت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لئے فقہاء نے عقد کی ایک نئی شکل نکالی ہے، اور وہ یہ ہے کہ مکان یا دوکان یا زمین وغیرہ صاحبِ ضرورت شخص اس طرح فروخت کرے کہ فروخت شدہ جائیداد مشتری کے پاس من کل الوجوہ امانت تو نہیں مگر مثل امانت کے ہوگی، کہ مشتری اس سے فائدہ تو اٹھا سکتا ہے مگر اس کو فروخت نہیں کرسکتا۔ اور فائدہ اٹھانے کا سلسلہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک بائع لی ہوئی رقم واپس نہ کردے، اور جب بائع رقم واپس کردے گا تو مشتری پر لازم ہوگا کہ اتنی ہی رقم لے کر جائیداد واپس کردے جتنی میں بائع نے مشتری کو دی تھی۔

علامہ ابن نجیم مصریؒ البحر الرائق اور علامہ فخر الدین زیلعیؒ تبیین الحقائق میں اس عقد کی نوعیت کو ان الفاظ میں نقل فرماتے ہیں:

وَصُوْرَتُهُ أَنْ يَّقُوْلَ الْبَائِعُ لِلْمُشْتَرِيْ بِعْتُ مِنْكَ هٰذَا الْعَيْنَ بِدَيْنٍ لَكَ عَلَيَّ عَلٰى أَنِّيْ مَتٰى قَضَيْتُ الدَّيْنَ فَهُوَ لِيْ أَوْ يَقُوْلَ الْبَائِعُ بِعْتُ هٰذَا بِكَذَا عَلٰى أَنِّيْ مَتٰى دَفَعْتُ الثَّمَنَ تَدْفَعُ الْعَيْنَ إِلَيَّ الخ.

(البحر الرائق كوئٹه ٦/ ١١، تبيين الحقائق إمداديه ملتان ٥/ ١٨٣، زكريا ٦/ ٢٣٧، البناية أشرفيه ١١/ ٤٥، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ٤١، مصري قديم ٢/ ٤٣٠، ايضاح النوادر ١/ ٦٩)

اور اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ بائع مشتری سے یوں کہہ دے کہ میں تیرے ہاتھ یہ شئ اس قرض کے عوض فروخت کرتا ہوں جو تیرا میرے اوپر لازم ہے، اس شرط پر کہ جب میں قرض ادا کردوں گا تو وہ شئ میری ہوجائے گی، یا یوں کہہ دے کہ یہ شئ اتنے میں اس شرط کے ساتھ تیرے ہاتھ فروخت کرتا ہوں کہ جب میں ثمن واپس دے دوں گا تو وہ شئ مجھ کو واپس کردے گا۔

بیع الوفاء کا جواز

اس عقد کے جواز اور عدمِ جواز میں فقہاءِ متأخرین میں دو فریق ہوگئے:

فریقِ اول:

حضرت امام ظہیر الدین اور صدر الشہید اور تاج الاسلام وغیرہؒ نے شرطِ فاسد کی وجہ سے اس عقد کو فاسد قرار دیا ہے، اور امام ابوشجاعؒ، امام علی سغدیؒ اور قاضی ابوالحسن ماتریدیؒ وغیرہ نے اس عقد کو رہن کی طرح اور رہن کے حکم میں قرار دیا ہے، اور مرتہن کے لئے رہن سے انتفاع جائز نہیں ہے، اور بیع الوفاء میں مشتری مبیع سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس لئے یہ عقد ان کے نزدیک جائز ہے۔

علامہ زیلعیؒ اس کو ان الفاظ سے نقل فرماتے ہیں:

مِنْهُمُ الإِمَامُ ظَهِيرُ الدِّينِ وَالصَّدْرُ الشَّهِيدُ حُسَامُ الدِّيْنِ وَالصَّدْرُ السَّعِيدُتَاجُ الإِسْلَامِ -إلى- فَجَعَلُوهُ فَاسِداً بِاعْتِبَارِ شَرْطِ الْفَسْخِ (إِلٰى قَوْلِهٖ) وَمِنْهُمْ مَنْ جَعَلَهُ رَهْناً مِنْهُمْ السَّيِّدُ الإِمَامُ أَبُو شُجَاعٍ وَالإِمَامُ عَلِي السُّغْدِيُ وَالإِمَامُ الْقَاضِيُ أَبُو الْحَسَنِ الْمَاتُرِيْدِيُ قَالُوا: لَمَّا شُرِطَ عَلَيْهِ أَخْذُهُ عِنْدَ قَضَاءِ الدَّيْنِ أَتىٰ بِمَعْنَى الرَّهْنِ (إِلٰى قَوْلِهٖ) فَإِذَا كَانَ رَهْناً لَا يَمْلِكُهُ وَلَا يَنْتَفِعُ بِهٖ. (تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ١٨٣، زكريا ٦/ ٢٣٧)

فقہاء میں سے امام ظہیر الدین، صدر الشہید امام حسام الدینؒ اور صدر السعید تاج الاسلامؒ نے اس کو فسخ کی شرط کی وجہ سے عقد فاسد قرار دیا ہے۔ (زیلعیؒ فرماتے ہیں) اور فقہاء میں سے جن لوگوں نے اس کو رہن قرار دیا ہے ان میں سید امام ابوشجاعؒ اور امام علی سغدیؒ اور امام ابوالحسن ماتریدیؒ وغیرہ شامل ہیں، ان لوگوں نے کہا کہ جب قضاء دین کے وقت واپسی کی شرط لگائی ہے تو یہ عقد رہن کا معنی ادا کرتا ہے۔ پس جب رہن ثابت ہوگا تو مرتہن اس کا مالک نہ ہوگا، اور نہ ہی اس سے انتفاع جائز ہوگا۔

فریقِ ثانی:

مشائخ سمرقند اور مشائخ بلخ اور مشائخ بخاریٰ نے مفلسین اور حاجت مندوں کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مذکورہ بیع الوفاء کو جائز قرار دیا ہے، اور امام نجم الدین نسفیؒ نے نقل کیا ہے کہ ان کے زمانہ کے تمام مشائخ نے متفق ہو کر اس معاملہ کو جائز قرار دیتے ہوئے بہت سے احکامِ بیع کے لئے مفید ثابت کیا ہے۔

اور صاحبِ نہایہ نے اس کے جواز کے قول کو مفتی بہ قرار دیا ہے، اور علامہ زین الدین ابن نجیم مصریؒ نے دیون کی کثرت کے زمانہ میں بیع الوفاء کی صحت و جواز پر فتویٰ کا حکم فرمایا ہے۔

وَمِنْ مَشَايِخِ سَمَرْقَنْدَ مَنْ جَعَلَهُ بَيْعًا جَائِزاً مُفِيداً بَعْضَ أَحْكَامِهِ وَمِنْهُمُ الإِمَامُ نَجْمُ الدِّيْنِ النَّسَفِيُّ فَقَالَ اِتَّفَقَ مَشَايِخُنَا فِيْ هٰذَا الزَّمَانِ فَجَعَلُوْهُ بَيْعاً جَائِزاً مُفِيداً بَعْضَ أَحْكَامِهِ وَهُوَ الْاِنْتِفَاعُ بِهٖ دُوْنَ الْبَعْضِ وَهُوَ الْبَيْعُ لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَيْهِ وَلِتَعَامُلِهِمْ فِيْهِ وَالْقَوَاعِدُ قَدْ تُتْرَكُ بِالتَّعَامُلِ، وَقَالَ صَاحِبُ النِّهَايَةِ وَعَلَيْهِ الْفَتْوىٰ. (تبیین الحقائق إمدادیہ ملتان ۱۸۳/۵، زکریا ۲۳۷/۶، ایضاح النوادر ۷۱/۱)

اور مشائخ سمرقند میں سے وہ مشائخ بھی ہیں جو اس بیع کو جائز قرار دیتے ہیں، جو بعض احکامِ بیع کے لئے مفید ہے، اور ان میں سے امام نجم الدین نسفیؒ نے کہا کہ اس زمانہ کے مشائخ اس عقد کے جواز پر متفق ہیں، یہ عقد بعض احکام کو مفید ہے، مثلاً مبیع سے انتفاع حاصل کرنا اور بعض کو مفید نہیں (مثلاً فروختگی کے عدمِ جواز) اور یہ عقد لوگوں کی ضرورت اور تعامل کی وجہ سے جائز ہے اور صاحبِ نہایہ نے کہا ہے کہ اس کے جواز ہی پر فتویٰ ہے۔

اور علامہ ابن نجیم مصریؒ الاشباہ میں اس کے جواز کو ان الفاظ میں بھی نقل فرماتے ہیں:

وَمِنْ هٰذَا الْقَبِيْلِ بَيْعُ الْأَمَانَةِ الْمُسَمّٰى بِبَيْعِ الْوَفَاءِ جَوَّزَهُ مَشَايِخُ بَلْخٍ وَبُخَارىٰ تَوْسِعَةً الخ. (الاشباہ والنظائر قدیم ۱۳۰)

اور اسی قبیل میں سے بیع الامانت ہے، جس کو بیع الوفاء کہا جاتا ہے، اس کو مشائخ بلخ و مشائخ بخاریٰ نے لوگوں کے لئے وسعت دیتے ہوئے جائز قرار دیا ہے۔

وَمِنهَا الإِفُتَاءُ بِصِحَّةِ بَيُعِ الُوَفَاءِ حِيُنَ كَثُرَ الدَّيُنُ عَلٰى أَهُلِ بُخَارىٰ وَهٰكَذَا بِمِصُرَ وَسَمُّوُهُ بَيُعَ الُأَمَانَةِ وَالشَّافِعِيَّةُ يُسَمُّوُنَهُ الرَّهُنَ الُمُعَادَ. (الأشباه والنظائر قديم ١٤٩، انوار رحمت ٢١٥-٢١٩)

اور ان میں سے بیع الوفاء کی صحت پر فتویٰ ہے، جب اہلِ بخاریٰ پر دیون کا سلسلہ زیادہ ہوگیا تھا، اور اسی طرح مصر میں بھی جواز کا فتویٰ ہے اور اس کو بیع الامانۃ کہا جاتا ہے اور شافعیہ نے اس کا نام ''رہنِ معاد رکھا ہے۔

مناسب ومعتدل حکم

اب معلوم ہوا کہ بیع الوفاء کے جواز وعدمِ جواز میں فقہاء متأخرین اور اساطینِ امت کے مابین اختلاف واقع ہو چکا ہے، اور دونوں طرف ایسے ایسے فقہاء ہیں جن کے قول ورائے کو دلیل شرعی مانا جاتا ہے، اور لوگوں کی ضرورت اور تعاملِ ناس جواز کے قائلین کے موافق ہے۔ اور تعاملِ ناس اور عرف کو شرعی طور پر ''اَلثَّابِتُ بِالُعُرُفِ کَالثَّابِتِ بِالنَّصِّ'' (عقود رسم المفتی ۹۴) کے قاعدہ سے حجتِ شرعیہ کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اور حضرت تھانوی قدس سرہ نے امداد الفتاویٰ میں فریقِ اول کے دلائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اصولاً عدمِ جواز کو ثابت کیا ہے، اور بوقتِ ضرورت فریقِ ثانی کے قول پر عمل کی اجازت دی ہے۔ (مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۱۰۷)

اور حضرت مولانا حافظ مفتی عبداللطیف صاحب محدث سہارن پوریؒ نے فتاویٰ خلیلیہ میں بیع الوفاء کو جائز قرار دیتے ہوئے یہ شکل پیش فرمائی ہے کہ دستاویز لکھتے وقت بیع کو مطلق عن الشرط رکھا جائے، اور مبیع مع الشرط کی عبارت اور قید نہ لگائی جائے؛ تاکہ فقہاء متأخرین کے دونوں فریقوں کے قول پر عمل ثابت ہو جائے۔ (مستفاد: فتاویٰ خلیلیہ ۱/۳۹۵، ایضاح النوادر ۱/۳۷)

نیز حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مایہ ناز شاگرد حضرت فخر الاسلام مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فتوی بھی یہی ہے کہ جب بغیر نفع لئے کوئی شخص رہن لینے پر رضا مند نہیں ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں ربا سے بچنے کے لئے بیع الوفاء کا معاملہ جائز اور درست ہے، اگر مدت کی قید لگائی ہے تو ایسی صورت میں مدت پوری ہوجانے کے بعد بائع یعنی راہن کا حق اسی وقت ختم نہیں ہوگا؛ بلکہ اس کے بعد بھی اس کو لینے کا حق باقی رہے گا؛ البتہ اس مدت کے بعد مشتری کو مرتہن کی طرح یہ اختیار رہے گا کہ بائع کے نہ لینے کی صورت میں جائیداد کو فروخت کر کے اپنی رقم وصول کرلے۔ ملاحظہ ہو عکس احمد (سوانح حیات فخر الاسلام حضرت مولانا محمد احمد صاحب مہتمم خامس دار العلوم دیوبند، ص: ۴۵۲، مکتبہ حجۃ الاسلام اکیڈمی دار العلوم وقف دیوبند)

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ کے قابل اعتماد عالم اور فقیہ تھے، نظام حیدر آباد نے آپ کو وہاں کے مسند افتاء کی صدارت بھی عطا کی تھی، اس زمانہ میں جو فتاوی لکھے گئے ہیں ان میں سے حضرت والا کے اہم ترین چھپن فتاوی جو انتہائی مدلل ہیں عکس احمد میں ص: ۳۷۶ سے ۴۶۳ تک میں نقل کئے گئے ہیں، ان میں مذکورہ فتوی تقریباً دو صفحہ پر مدلل طور پر موجود ہے۔

اس لئے ضرورت اور حاجتِ ناس کی وجہ سے مشائخِ سمرقند اور مشائخِ بلخ اور مشائخِ بخاری اور امام نجم الدین نسفیؒ اور صاحبِ نہایہ وغیرہم کے فتویٰ کے مطابق اس زمانہ میں بیع الوفاء کے جواز پر فتویٰ دینا اولیٰ اور انسب ہوگا۔

بیع الوفاء کے بارے میں مفصل بحث اور فقہاء کی آراء

بیع الوفاء کو فقہی نقطۂ نظر سے کس اصول اور ضابطہ کے دائرہ میں داخل کیا جائے؟ آیا اسے بیعِ صحیح کے دائرہ میں داخل کیا جائے یا بیعِ فاسد کے دائرہ میں یا رہن کے اصول وضابطہ کے دائرہ میں شمار کیا جائے یا بیع مکرہ کے ضابطہ میں داخل کیا جائے، یا اسے بیع اور رہن سے مرکب ایک الگ عقد قرار دیا جائے یا بیع صحیح اور بیع فاسد اور رہن تینوں سے مرکب ہو کر ایک مستقل عقد

قرار دیا جائے؟ تو اس سلسلہ میں فقہاءِ متأخرین کے مختلف نظریات اور مختلف اقوال پر غور کرنے کے بعد حضراتِ فقہاء کے سات فریق اور سات اقوال وآراء ہمارے سامنے ہیں، جن کو ترتیب وار یہاں پر درج کر دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

فریقِ اول بیع صحیح کے قائلین

مشائخ بلخ اور مشائخ بخاریٰ نے بیع الوفاء کے جواز پر فتویٰ جاری فرمایا ہے اور مشائخ سمرقند میں سے امام نجم الدین نسفیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء کو لوگوں کی ضرورت اور اس میں تعامل کی وجہ سے بیع صحیح کے اصول وضابطہ کے دائرہ میں داخل کر کے صحیح قرار دیا جائے گا، اس لئے کہ زمانہ کے تمام مشائخ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ ایسی بیع ہے جو جائز ہے اور بہت سے احکامِ بیع کو محیط اور مفید ہے، اور لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس عقد کو جائز اور صحیح قرار دیا گیا ہے، اور امام زیلعیؒ نے اسی کو مفتی بہ قرار دیا ہے۔ اور علامہ ابن نجیمؒ نے الاشباہ میں بیع الوفاء کے بیع صحیح ہونے اور اس کی صحت پر فتویٰ نقل فرمایا ہے؛ لہٰذا بیع الوفاء شرعی طور پر جائز اور درست ہے۔ حضراتِ فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمایئے:

وَمِنْ مَشَايِخِ سَمَرْقَنْدَ مَنْ جَعَلَهُ بَيْعاً جَائِزاً مُفِيْداً بَعْضَ أَحْكَامِهِ مِنْهُمُ الإِمَامُ نَجْمُ الدِّيْنِ النَّسَفِيُّ فَقَالَ اِتَّفَقَ مَشَايِخُنَا فِيْ هٰذَا الزَّمَانِ فَجَعَلُوْهُ بَيْعاً جَائِزاً مُفِيْداً بَعْضَ أَحْكَامِهِ وَهُوَ الْاِنْتِفَاعُ بِهِ دُوْنَ الْبَعْضِ

اور مشائخ سمرقند میں سے کچھ وہ حضرات ہیں جنہوں نے اس کو بیع صحیح اور بیع جائز کے دائرہ میں داخل کیا ہے، جو بیع کے بعض احکام کو مفید ہے، انہیں مشائخ میں سے امام نجم الدین نسفیؒ ہیں، پس وہ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ کے مشائخ نے متفق ہو کر اس بیع کو جائز قرار دیا ہے جو عقد بیع کے بعض احکام کو مفید ہے، اور وہ اس بیع کے بعض منافع سے فائدہ اٹھانا ہے، بعض سے نہیں (جیسا کہ مشتری اس کو بیچ

وَهُوَ الْبَيْعُ لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَيْهِ وَلِتَعَامُلِهِمْ فِيْهِ وَالْقَوَاعِدُ قَدْ تُتْرَكُ بِالتَّعَامُلِ وَجُوِّزَ الْاِسْتِصْنَاعُ لِذٰلِكَ وَقَالَ صَاحِبُ النِّهَايَةِ وَعَلَيْهِ الْفَتْوىٰ.

(تبيين الحقائق إمداد ملتان ١٨٣/٥، ١٨٤، زكريا ٢٣٧/٦)

نہیں سکتا) اور لوگوں کو اس بیع کی ضرورت ہونے کی وجہ سے اور لوگوں کے اس میں تعامل ہونے کی وجہ سے اس بیع کو جائز قرار دیا گیا ہے، اور کبھی تعاملِ ناس کی وجہ سے قواعد وضوابط کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے بیعِ استصناع کو جائز قرار دیا گیا ہے اور صاحبِ نہایہ نے کہا کہ اس کے بیعِ صحیح ہونے پر ہی فتویٰ ہے۔

اور علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بیع صحیح ہونے کو زیلعی کے حوالہ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، نیز علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کے الفاظ نقل فرمائے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

أَنَّهُ بَيْعٌ صَحِيْحٌ يُفِيْدُ لِبَعْضِ أَحْكَامِهِ مِنْ حِلِّ الْاِنْتِفَاعِ بِهٖ إِلَّا أَنَّهُ لَا يَمْلِكُ بَيْعَهُ، قَالَ الزَّيْلَعِيُ فِي الْإِكْرَاهِ وَعَلَيْهِ الْفَتْوىٰ. (شامی زکریا ٥٤٦/٧، كراچی ٢٧٧/٥، وهٰكذا فی البحر الرائق كوئٹه ٧/٦، زكريا ١٢/٦)

بے شک یہ بیع صحیح ہے جو بیع کے بعض احکام کو مفید ہے، اس کے ذریعہ نفع کے حلال ہونے کی وجہ سے مگر یہ کہ مشتری اس کو بیچنے کا مالک نہیں ہوگا، زیلعی نے کتاب الاکراہ میں فرمایا ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے۔

الاشباہ والنظائر میں اس طرح کے الفاظ سے نقل کیا گیا ہے:

وَمِنْ هٰذَا الْقَبِيْلِ بَيْعُ الْاَمَانَةِ الْمُسَمّٰى بَيْعُ الْوَفَاءِ جَوَّزَهُ

اور اسی قبیل سے بیع الأمانۃ ہے جو بیع الوفاء کے نام سے موسوم ہے، مشائخ بلخ اور مشائخ

مَشَايِخُ بَلْخٍ وَبُخَارىٰ تَوْسِعَةً. (الاشباہ والنظائر قدیم ۱۳۰)

بخاریٰ نے لوگوں سے تنگی دور کر کے وسعت دیتے ہوئے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

اورالاشباہ والنظائر میں دوسری جگہ صاف الفاظ کے ساتھ مذکور ہے کہ بیع الوفاء کے بیع صحیح ہونے پر ہی فتویٰ ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

وَمِنْهَا الإِفْتَاءُ بِصِحَّةِ بَيْعِ الْوَفَاءِ حِيْنَ كَثُرَ الدَّيْنُ عَلٰى أَهْلِ بُخَارىٰ وَهٰكَذَا بِمِصْرَ وَقَدْ سَمُّوْهُ بَيْعَ الْأَمَانَةِ وَالشَّافِعِيَّةُ يُسَمُّوْنَهُ الرَّهْنَ الْمُعَادَ. (الاشباہ والنظائر قدیم ۱۴۹)

اسی قبیل میں سے بیع الوفاء کی صحت پر فتویٰ جاری کرنا ہے جس وقت اہل بخاریٰ پر دیون کی کثرت ہوگئی تھی اور ایسا ہی مصر میں ہوا ہے اور یقیناً اس کا نام مشائخ مصر نے بیع الأمانۃ رکھا ہے اور شوافع نے اس کا نام ''الرہن المعاد'' رکھا ہے۔

فریقِ ثانی بیع فاسد کے قائلین

امام ظہیرالدین ابوبکر محمد بن احمد البخاری اور امام شہاب الدین احمد الحلبی وغیرہ فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء میں مقتضائے عقد کے خلاف شرطِ فاسد پائی جاتی ہے اس لئے بیع الوفاء کو بیع فاسد کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل کیا جائے گا اور بائع کے ثمن اور دین کی واپسی کے موقع پر مبیع کی واپسی کو بیع فاسد کے اصول وضوابط کے مطابق واجب الاسترداد قرار دیا جائے گا؛ لہٰذا اس کا حکم تمام بیوعِ فاسدہ کے حکم کی طرح ہوگا، اس لئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقد بیع کے ساتھ شرط لگانے سے منع فرمایا ہے، اس کو حضراتِ فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

وَاخْتَارَهُ الإِمَامُ ظَهِيْرُ الدِّيْنِ أَنَّهُ بَيْعٌ فَاسِدٌ فَلَوْ تَبَايَعَا ثُمَّ قَالَ أَحَدُهُمَا چون سیم آریم بیع بمن بازده فَقَالَ نَعَمْ لَا يَفْسُدُ الْبَيْعُ، أَمَّا لَوْ شَرَطَاهُ فِي الْبَيْعِ يَفْسُدُ. (بزازية زكريا جديد ١/ ٢٥١، وعلى هامش الهندية ٤/ ٤٠٧)

اسی کو امام ظہیر الدین نے اختیار فرمایا ہے بایں طور پر کہ یہ بیع فاسد ہے؛ لہٰذا اگر طرفین نے عقد کرلیا ہے پھران میں سے ایک نے کہا جب میں ثمن لاکر کے واپس کردوں گا تو میری مبیع مجھے واپس کردینا، دوسرے نے کہا جی ہاں! تو بیع فاسد نہیں ہوگی، بہرحال اگر دونوں نے عقد بیع میں اس کی شرط لگادی ہے تو بیع فاسد ہوجائے گی۔

وَالْأَصَحُّ عِنْدِيْ أَنَّهُ بَيْعٌ فَاسِدٌ يُوْجِبُ الْمِلْكَ بَعْدَ الْقَبْضِ وَحُكْمُهُ حُكْمُ سَائِرِ الْبِيَاعَاتِ الْفَاسِدَةِ لِأَنَّهُ بَيْعٌ بِشَرْطٍ لَا يَقْتَضِيْهِ الْعَقْدُ وَقَدْ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعٍ وَشَرْطٍ الخ. (حاشيه شلبى على تبيين الحقائق إمداديه ملتان ٥/ ١٨٤، زكريا ٦/ ٢٣٨)

اور زیادہ صحیح میرے نزدیک یہی ہے کہ بیع الوفاء بیع فاسد ہے جو قبضہ کے بعد ملکیت کو لازم کرتی ہے اور اس کا حکم تمام بیوعِ فاسدہ کی طرح ہے؛ اس لئے کہ یہ بیع ایسی شرط کے ساتھ مشروط ہے جس کا عقد تقاضہ نہیں کرتا، حالاں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع اور شرط سے منع فرمایا ہے۔

فریقِ ثالث بیع صحیح یا بیعِ فاسد کے قائلین

امام فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی وغیرہ نے فرمایا کہ بیع الوفاء رہن کے دائرہ میں داخل نہیں ہوسکتی؛ بلکہ صحیح بات یہی ہے کہ وہ عقدِ بیع ہی کے دائرہ میں داخل ہوگی؛ لہٰذا اگر صلبِ

عقد میں اس بات کی شرط لگائی ہے کہ ثمن کی واپسی پر مبیع بھی واپس ہو جائے گی تو صلبِ عقد میں مقتضائے عقد کے خلاف شرط لگانے کی وجہ سے بیع فاسد کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہوگی، اس لئے حضراتِ صاحبین فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء بیع فاسد کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہے، اور اگر صلبِ عقد میں شرط نہیں لگائی ہے؛ بلکہ اولاً بغیر شرط کے عقد بیع وجود میں آجائے پھر اس کے بعد آپس کی تراضی سے اس بات کی شرط لگادی جائے کہ ثمن کی واپسی پر مبیع کی واپسی لازم ہو جائے گی تو ایسی صورت میں چوں کہ صلبِ عقد میں شرطِ فاسد نہیں پائی گئی ہے، اس لئے یہ عقد بیعِ صحیح کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہوگا، اور وعدہ کے مطابق ثمن کی واپسی پر مبیع کا استرداد لازم ہو جائے گا، جیسا کہ فقہاء کی حسبِ ذیل عبارات سے واضح ہوتا ہے:

وَالصَّحِيحُ أَنَّ الْعَقْدَ الَّذِيْ جَرىٰ بَيْنَهُمَا إِنْ كَانَ بِلَفْظِ الْبَيْعِ لَا يَكُوْنُ رَهْناً ثُمَّ يُنْظَرُ إِنْ ذَكَرَا شَرْطَ الْفَسْخِ فِي الْبَيْعِ فَسَدَ الْبَيْعُ وَإِنْ لَمْ يَذْكُرَا ذٰلِكَ فِي الْبَيْعِ وَتَلَفَّظَا بِلَفْظِ الْبَيْعِ بِشَرْطِ الْوَفَاءِ أَوْ تَلَفَّظَا بِالْبَيْعِ الْجَائِزِ وَعِنْدَهُمَا هٰذَا الْبَيْعُ عِبَارَةٌ عَنْ عقد غَيْرِ لَازِمٍ فَكَذٰلِكَ وَلَفْظُهُ صَاحِبِ الْبَحْرِ فَالْبَيْعُ فَاسِدٌ وَإِنْ ذَكَرَا الْبَيْعَ بِلَا شَرْطٍ ثُمَّ شَرَطَاهُ عَلٰى

اور صحیح یہی ہے کہ بے شک وہ ایسا عقد ہے جو متعاقدین کے درمیان میں جاری ہوا ہے، اگر لفظ بیع کے ساتھ عقد ہوا ہے تو وہ رہن نہیں ہوسکتا، پھر دیکھا جائے کہ اگر صلب عقد میں فسخ کی شرط کا ذکر کیا ہے تو بیع فاسد ہو جائے گی، اور اگر صلب عقد میں اس شرط کا ذکر نہیں کیا ہے اور دونوں نے لفظ بیع کا تلفظ وفا کی شرط کے ساتھ کیا ہے یا دونوں نے بیع جائز کے ساتھ تلفظ کیا ہے اور ایسی بیع کا نام حضراتِ صاحبینؒ کے نزدیک بیع غیر لازم ہے، تو بھی ایسا ہی حکم ہوگا اور صاحب بحر کے الفاظ یہ ہیں کہ ایسی صورت میں بیع فاسد

وَجْهِ الْمُوَاعِدَةِ جَازَ الْبَيْعُ وَلَزِمَ الْوَفَاءُ وَقَدْ يَلْزَمُ الْوَعْدُ لِحَاجَةِ النَّاسِ فِرَاراً مِنَ الرِّبَا. (قاضي خان زكريا جديد ٢/ ٩٩، وعلى هامش الهندية ٢/ ١٦٥، تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/ ١٨٤، زكريا ٦/ ٢٣٧، بزازية، زكريا جديد ١/ ٢٥١، وعلى هامش الهندية ٤/ ٤٠٦، البحرالرائق، كوئٹه ٦/ ٨، زكريا ٦/ ١٢)

ہوجائے گی اور اگر بغیر شرط کے دونوں نے عقد میں لفظ بیع کا ذکر کیا ہے، پھر اس کے بعد معاہدہ کے طور پر وفا کی شرط لگائی ہے تو بیع جائز اور صحیح ہوجائے گی اور وفا بھی لازم ہوجائے گی، اور کبھی سود سے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے وعدہ کا پورا کرنا لازم ہوجاتا ہے۔

فریقِ رابع رہن کے حکم کے قائلین

امام سید ابوشجاع اور امام ابوالحسن علی السغدی اور امام قاضی ابوالحسن الماتریدی اور ائمہ خوارزم اور خاتم المجتہدین مولانا سیف الدین عصبہ وغیرہ بیع الوفاء کو رہن کے اصول وضابطہ کے دائرہ میں داخل کرتے ہیں، اور اس کو رہن ہی تسلیم کرتے ہیں، بس فرق اتنا ہے کہ ائمہ خوارزم بعض شرائط کے ساتھ رہن تسلیم کرتے ہیں اور امام سیف الدین عصبہ علی الاطلاق اس کو رہن تسلیم کرتے ہیں، اسی طرح فتاویٰ قاضی خان میں ہے کہ امام ابوشجاع اور قاضی ابوالحسن علی سغدی بھی بیع الوفاء کو علی الاطلاق رہن کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل کرکے اس کے اوپر رہن کے حکم کی طرح حکم لگاتے ہیں، چناں چہ ان کے نزدیک مشتری مبیع کا مالک نہیں ہوگا اور مبیع سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانا مشتری کے لئے جائز نہیں ہوگا؛ البتہ رہن کی طرح مالک کی اجازت سے فائدہ اٹھانا جائز ہوسکتا ہے، اور رہن کی طرح مبیع کے ہلاک ہونے کی وجہ سے

دین بھی ساقط ہو جائے گا؛ لیکن ائمہ خوارزم اس کو تین باتوں میں سے ایک بات کے ساتھ مشروط کرتے ہیں:

(۱) بوقتِ عقد بیع مطلق رکھی جائے اور بوقتِ واپسی جب بائع ثمن لے کر حاضر ہو جائے گا تو مشتری بیع کو فسخ کرنے کے لئے کسی کو وکیل بنادے۔

(۲) بیعِ مطلق کے بعد اس بات پر معاہدہ ہو جائے کہ جب بائع ثمن لے کر آئے گا تو خود بخود بیع فسخ ہو جائے گی۔

(۳) عقد کے بعد مشتری اصل مال پر نفع کی شرط لگا دے تو ان تینوں صورتوں میں ائمہ خوارزم بیع الوفاء کو رہن کے درجہ میں قرار دیتے ہیں۔

اور یہ حضرات بیع الوفاء کو رہن کے حکم میں قرار دینے میں حسبِ ذیل نظائر پیش کرتے ہیں:

(۱) اس بیع میں مشتری کو مبیع کی فروختگی کا حق نہیں۔

(۲) مبیع کو دوسرے کے ہاتھ رہن میں رکھنے کا حق نہیں۔

(۳) مبیع اگر باغ ہے تو اس کے درختوں کو کاٹنے کا حق نہیں۔

(۴) مبیع اگر عمارت ہے تو منہدم کرنے کا حق نہیں۔

(۵) مشتری کے ہاتھ میں اگر مبیع ہلاک ہو جائے تو ثمن اور دین ساقط ہو جاتا ہے؛ لہٰذا بائع سے ثمن کی واپسی کا مطالبہ نہیں کرسکتا۔

(۶) اگر مبیع میں نقصان اور کمی آجائے تو رہن کی طرح ثمن اور دین طرفین کے درمیان نقصان کے تناسب سے تقسیم ہو جاتا ہے۔ (مستفاد: بزازیہ زکریا جدید ا/۲۵۲، وعلی ہامش الہندیہ ۴/ ۴۰۹)

(۷) جس طرح معاملہ رہن میں مرتہن کے مالِ رہن کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کردینے پر راہن کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ بیع باطل کر کے مالِ رہن کو اپنے قبضہ میں لے لے، اسی

طرح بیع الوفاء میں بھی مشتری جب مبیع کو دوسرے کے ہاتھ فروخت کردے گا تو مالک کو یہ حق حاصل ہوجاتا ہے کہ بیعِ ثانی کو باطل کرکے مشتری ثانی سے مالِ مبیع اپنے قبضہ میں لے لے، ہاں البتہ یہ بات الگ ہے کہ مرتہن کو اپنے قرض کے وصول ہونے تک لوٹ کر مالِ رہن کو اپنے قبضہ میں لینے کا حق ہے، اسی طرح بیع الوفاء میں بھی مالک کے قبضہ میں پہنچ جانے کے بعد مشتری اول کو اپنے ثمن کے وصول ہونے تک مالک سے مالِ مبیع اپنے قبضہ میں لینے کا حق ہے۔ (بزازیہ زکریا جدید۱/ ۲۵۱، وعلی ہامش الہندیہ۴/ ۴۰۶، شامی زکریا۷/ ۵۴۸، کراچی۵/ ۲۷۸)

ان تمام نظائر کی وجہ سے ان حضرات نے اس کو رہن کے اصول وضابطہ کے دائرہ میں داخل کردیا ہے، اوران لوگوں کی رائے کے مطابق مشتری بائع کی اجازت کے بغیر مالِ مبیع سے کوئی فائدہ اٹھانہیں سکتا۔ جوحسبِ ذیل عبارت سے واضح ہوتا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

قَالَ أَكْثَرُ الْمَشَايِخِ مِنْهُمُ السَّيِّدُ الإِمَامُ أَبُوْ شُجَاعٍ وَالْقَاضِيُ الإِمَامُ أَبُو الْحَسَنِ عَلِي السُّغْدِيُ، حُكْمُهُ حُكْمُ الرَّهْنِ لَا يَمْلِكُهُ الْمُشْتَرِيُ وَيَضْمَنُهُ الْمُشْتَرِيُ بِالأَكْلِ مِنْ ثَمَرِهِ وَلَا يُبَاحُ لَهُ الإِنْتِفَاعُ وَلَا الأَكْلُ إِلَّا بِإِبَاحَةِ الْمَالِكِ وَيَسْقُطُ الدَّيْنُ بِهَلَاكِهِ إِذَا كَانَ بِهِ وَفَاءً بِالدَّيْنِ وَلَا يَضْمَنُ الزِّيَادَةَ إِذَا هَلَكَ لَا بِصُنْعِهِ

اکثر مشائخ نے کہا جن میں سید امام ابوشجاع اور قاضی امام ابوالحسن علی السغدی وغیرہ ہیں کہ اس بیع کا حکم رہن کے حکم کی طرح ہے، اس میں مشتری مبیع کا مالک نہیں ہوگا اور اس کے پھل کھانے کی وجہ سے مشتری اس کا ضامن ہوجائے گا، اور مشتری کے لئے مبیع سے انتفاع مباح نہیں ہے، اور نہ ہی اس میں سے کچھ کھانا جائز ہے، مگر مالک کی اجازت سے جائز ہے اور مبیع کی ہلاکت کی وجہ سے دین ساقط ہوجائے گا، جب مبیع دین کے

وَلِلْبَائِعِ أَنْ يَّسْتَرِدَّ إِذَا قَضَى الدَّيْنَ. (فتاویٰ قاضي خان جديد زكريا ٢/ ٩٩، وعلى هامش الهندية ١٦٥/٢، تبيين الحقائق إمداديه ملتان ٥/ ١٨٣، زكريا ٦/ ٢٣٧)

برابر ہو، اور زیادہ کا تاوان لازم نہیں ہوگا، جب مشتری کی تعدی اور لاپرواہی کے بغیر ہلاک ہوجائے اور بائع کو مبیع واپس لینے کا حق ہوگا جب دین ادا کردے۔

اور الجامع الوجیز میں حافظ الدین بزازیؒ نے ائمہ خوارزم کی رائے کو ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

وَاخْتَارَهُ أَئِمَّةُ خَوَارِزْمَ أَنَّهُ إِذَا أُطْلِقَ الْبَيْعَ لٰكِنْ وَكَّلَ الْمُشْتَرِيْ وَكِيْلاً بِفَسْخِ الْبَيْعِ إِذَا أَحْضَرَ الْبَائِعُ الثَّمَنَ أَوْ عَهِدَ عَلٰى أَنَّهُ إِذَا أَوْفَاهُ فَسَخَ الْبَيْعُ وَالثَّمَنُ لَا يُعَادِلُ الْمَبِيْعَ وَفِيْهِ غَبَنٌ فَاحِشٌ أَوْ وَضَعَ الْمُشْتَرِيْ عَلٰى أَصْلِ الْمَالِ رِبْحاً بِأَنْ وَضَعَ عَلٰى مِائَةٍ عِشْرِيْنَ دِيْنَاراً فَرَهَنَ (إِلٰى قَوْلِهٖ) وَاخْتَارَ خَاتَمُ الْمُجْتَهِدِيْنَ مَوْلَانَا سَيْفُ الدِّيْنِ الْعَصَبَةُ أَنَّهُ رَهْنٌ. (بزازية، زكريا جديد ١/ ٢٥١، على هامش الهندية ٤٠٧/٤)

جس کو ائمہ خوارزم نے اختیار فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ جب بیع کو مطلق رکھا جائے؛ لیکن جب بائع ثمن لے کر کے حاضر ہوجائے تو مشتری بیع کو فسخ کرنے کے لئے کسی کو وکیل بنادے یا بیع مطلق کے بعد اس بات پر معاہدہ ہوجائے کہ جب بائع ثمن لاکر پیش کردے گا تو عقد بیع خود بخود فسخ ہوجائے گا اور ثمن مبیع کے برابر نہ ہو اور اس میں غبن فاحش ہو یا مشتری عقد کے بعد اصل مال پر نفع کی شرط لگادے مثلاً ہر سو دینار پر بیس دینار نفع کا رہے گا، تو ان تمام صورتوں میں یہ عقد رہن کے حکم میں ہوگا، اور خاتم المجتہدین مولانا سیف الدین عصبہ نے اسی کو اختیار فرمایا ہے کہ وہ رہن ہی ہوگا۔

فریقِ خامس بیع المکرّہ کے حکم کے قائلین

مشائخ بخاریٰ میں سے امام صدر الشہید حسام الدین اور امام صدر السعید تاج الدین امام علاء الدین بدر اور صاحبِ ہدایہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء بیع مکرہ کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہوگی اور اس کو بیع فاسد قرار دینا صحیح نہیں ہے جیسا کہ امام ظہیر الدین بخاریؒ نے اس کو بیع فاسد بھی تسلیم کیا اور بیع مکرہ کے درجہ میں بھی قرار دیا جو کہ درست نہیں ہے؛ بلکہ بیع مکرہ کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل کرنا زیادہ صحیح ہے، امام زیلعیؒ نے تبیین الحقائق میں امام ظہیر الدین بخاریؒ کو بیع مکرہ کے قائلین کی فہرست میں شمار فرمایا ہے، حالاں کہ وہ بیع فاسد کے قائلین کی فہرست میں شامل ہیں، اسی وجہ سے بزازیہ میں اس بات کو صاف واضح کردیا گیا ہے کہ بیع الوفاء بیع مکرہ کے اصول وضابطہ کے دائرہ میں داخل ہے، اس لئے بیع الوفاء بیع مکرہ کی طرح ہوگی۔

اور بیع فاسد کے اصول وضوابط میں داخل نہیں ہے؛ لہٰذا بیع الوفاء کا حکم بیع فاسد کی طرح نہیں ہوگا؛ بلکہ بیع مکرہ کی طرح ہوگا اور امام ظہیر الدین بخاری نے دونوں کو مخلوط کردیا ہے، اور امام علاء الدین بدرؒ فرماتے ہیں کہ جنہوں نے دونوں کو مخلوط کردیا ہے وہ درست نہیں ہے؛ اس لئے کہ دونوں کے شرائط وضوابط الگ الگ ہیں؛ لہٰذا بیع الوفاء واجب الاسترداد ہونے میں بیع مکرہ کی طرح ہوگی، بیع فاسد کی طرح نہیں۔ فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیے:

وَمِنْ مَشَايِخِ بُخَارىٰ مَنْ جَعَلَ بَيْعَ الْوَفَاءِ كَبَيْعِ الْمُكْرَهِ مِنْهُمْ الإِمَامُ ظَهِيْرُ الدِّيْنِ وَالصَّدْرُ الشَّهِيْدُ حُسَامُ الدِّيْنِ وَالصَّدْرُ السَّعِيْدُ تَاجُ الاسْلامِ وَصُوْرَتُهُ	مشائخ بخاریٰ میں سے جنہوں نے بیع الوفاء کو بیع مکرہ کی طرح قرار دیا ہے ان میں سے امام ظہیر الدینؒ اور صدر الشہید حسام الدینؒ اور امام صدر السعید تاج الاسلامؒ (وغیرہ) ہیں، اور اس کی صورت یہ ہے کہ بائع مشتری سے

أَنْ يَّقُوْلَ الْبَائِعُ لِلْمُشْتَرِيْ بِعْتُ مِنْكَ هٰذَا الْعَيْنَ بِدَيْنٍ لَكَ عَلَيَّ عَلٰى أَنِّيْ مَتٰى قَضَيْتُ الدَّيْنَ فَهُوَ لِيْ فَجَعَلُوْهُ فَاسِداً بِاعْتِبَارِ شَرْطِ الْفَسْخِ عِنْدَ الْقُدْرَةِ عَلٰى إِيْفَاءِ الدَّيْنِ يُفِيْدُ الْمِلْكَ وَعِنْدَ اتِّصَالِ الْقَبْضِ بِهٖ وَيَنْقُضُ بَيْعُ الْمُشْتَرِيْ كَبَيْعِ الْمُكْرَهِ لِأَنَّ الْفَسَادَ بِاعْتِبَارِ عَدَمِ الرِّضَا فَكَانَ حُكْمُهُ حُكْمُ بَيْعِ الْمُكْرَهِ فِيْ جَمِيْعِ مَا ذَكَرْنَا. (تبيين الحقائق، إمداديه ملتان ٥/١٨٣، زكريا ٦/ ٢٣٧)

کہے کہ یہ چیز میں نے تمہارے ہاتھ تمہارے دین کے بدلہ میں بیچ دی ہے اس شرط پر کہ جب میں تمہارا قرض ادا کردوں گا تو وہ چیز میری ہوجائے گی، تو ان حضرات نے اس عقد کو دین کی ادائیگی پر قدرت کے وقت فسخ عقد کی شرط کا اعتبار کرتے ہوئے عقد فاسد قرار دیا ہے، جو اتصالِ قبضہ کے وقت ملکیت کا فائدہ دیتا ہے اور دوسرے کے ہاتھ مشتری کی بیع ٹوٹ جایا کرے گی جیسا کہ مکرہ کی بیع ٹوٹ جاتی ہے؛ اس لئے کہ عدمِ رضا کی وجہ سے اس میں فساد آیا ہے؛ لہٰذا بیع الوفاء کا حکم بیع مکرہ کے حکم میں ہوگا، ان تمام امور میں جو ہم نے ذکر کئے ہیں۔

اور اس حکم کو امام حافظ الدین بزازی نے ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

أَجَابَ عَلاءُ الدِّيْنِ بَدْرٌ أَنَّهُ لا يَصِحُّ وَعَلٰى هٰذَا اخْتِيَارُ صَاحِبُ الْهِدَايَةِ وَأَوْلادِهٖ وَمَشَائِخُ زَمَانِنَا وَعَلَيْهِ الْفَتْوىٰ أَعْنِيْ لا يَمْلِكُ الْمُشْتَرِيْ الْبَيْعَ مِنَ الْغَيْرِ كَمَا فِيْ بَيْعِ

امام علاء الدین بدر نے اس طرح سے جواب دیا ہے کہ یہ بیع صحیح نہیں ہے اور اسی کو صاحب ہدایہ اور ان کی اولاد اور ہمارے زمانہ کے مشائخ نے اختیار کیا ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے یعنی مشتری دوسرے کے ہاتھ بیچنے کا مالک نہیں ہے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ بیع مکرہ میں

اَلْمُكْرَهِ لَا الْبَيْعِ الْفَاسِدِ بَعْدَ الْقَبْضِ.
(بزازیہ، زکریا جدید ۱/ ۲۵۱، وعلی هامش الهندية ٤/ ٤٠٨)

ہوتا ہے اور ایسا نہیں ہے جیسا کہ بیع فاسد میں قبضہ کے بعد ہوتا ہے۔

فریقِ سادس بیع اور رہن سے مرکب کے قائلین

امام فخر الدین زاہد وغیرہ نے اس عقد کو من وجہٍ بیع صحیح اور من وجہٍ رہن تسلیم کیا ہے، یعنی صلب عقد میں جب شرط کا ذکر نہ ہو تو مشتری کے حق میں بیع صحیح ہے اور مبیع کی آمدنی کا مشتری مالک ہوا کرے گا اور بائع کے حق میں یہ عقد رہن ہوگا اس لئے مشتری مبیع کے قبضہ اور اس کی ملکیت کو منتقل نہیں کرسکتا، نہ دوسرے کو بطورِ ہدیہ دے سکتا ہے اور نہ ہی دوسرے کو فروخت کرسکتا ہے، اور نہ ہی دوسرے کے ہاتھ میں رہن کے طور پر رکھ سکتا ہے اور جب بائع ثمن واپس کردے گا تو مشتری کو مبیع کی واپسی پر مجبور کیا جائے گا؛ لہٰذا بیع الوفاء من وجہٍ بیع صحیح کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہوکر جائز ہوجائے گی اور من وجہٍ رہن کے اصول وضوابط کے دائرہ میں داخل ہوکر جائز ہوجائے گی، اور اس عقد کو زرافہ کی طرح دو چیزوں سے مرکب مانا جائے گا جیسا کہ زرافہ گردن کے اعتبار سے اونٹ کی طرح ہے اور پیروں کے اعتبار سے گائے اور بیل کی طرح ہے، اسی طرح اس عقد کا حال ہے کہ مشتری مبیع کی آمدنی کا مالک ہوجاتا ہے اور مشتری مبیع سے ہر طرح کا نفع اٹھا سکتا ہے، تو اس اعتبار سے بیع صحیح ہے اور دوسرے کے ہاتھ میں قبضہ کو منتقل نہیں کرسکتا اور دوسرے کو مالک نہیں بنا سکتا، اور ثمن کی واپسی پر مبیع کی واپسی لازم ہوجاتی ہے تو اس اعتبار سے یہ عقد رہن کی طرح ہے۔ فقہاء کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

اَلْقَوْلُ السَّادِسُ مَا اخْتَارَهُ الْبَعْضُ وَاخْتَارَهُ الْإِمَامُ الزَّاهِدُ أَنَّ الشَّرْطَ إِذَا لَمْ يُذْكَرْ فِي

قولِ سادس وہ ہے جس کو بعض فقہاء نے اختیار فرمایا ہے اسی کو فخر الدین زاہد نے پسند فرمایا ہے بایں طور پر کہ جب عقد بیع کے اندر

الْبَیْعِ نَجْعَلَهٗ صَحِیْحاً فِیْ حَقِّ الْمُشْتَرِیْ حَتّٰی مَلَکَ الْأَنْزَالَ وَرَهْناً فِيْ حَقِّ الْبَائِعِ فَلَمْ یَمْلِکِ الْمُشْتَرِیْ تَحْوِیْلَ یَدِهٖ وَمَلَکَهٗ إِلٰی غَیْرِهٖ وَأُجْبِرَ عَلَی الرَّدِّ إِذَا أَحْضَرَ الدَّیْنَ لِأَنَّهٗ کَالزِّرَافَةِ مُرَکَّبٌ مِنَ الْبَیْعِ وَالرَّهْنِ. (فتاوی بزازیه، زکریا جدید ۱/ ۲۵۱، وعلی هامش الهندیة ٤/ ٤٠٨)

شرط کا ذکر نہ کیا ہوتو اس کو مشتری کے حق میں بیع صحیح قرار دیں گے؛ تاکہ مشتری مبیع کی آمدنی کا مالک ہوجائے اور بائع کے حق میں رہن قرار دیں گے؛ تاکہ مشتری مبیع پر قبضہ کر کے مبیع کی ملکیت کو دوسرے کی طرف منتقل کرنے کا مالک نہ ہوجائے اور مشتری کو مبیع کی واپسی پر مجبور کیا جائے گا جب بائع دین ثمن لاکر پیش کردے؛ اس لئے کہ یہ عقد زرافہ کی طرح بیع اور رہن سے مرکب ہے۔

فریقِ سابع بیعِ صحیح اور بیعِ فاسد اور رہن تینوں سے مرکب کے قائلین

امام حافظ الدین بزازی وغیرہ فرماتے ہیں کہ بیع الوفاء کے اندر تین صفتیں موجود ہیں:

(۱) یہ بیع بیع تلجئہ کے مشابہ ہے، بیع تلجئہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بیع صحیح ہے اور صاحبین کے نزدیک صحیح نہیں ہے؛ لہٰذا امام ابوحنیفہؒ کے قول پر عمل کرتے ہوئے اس کے اوپر بیع صحیح کا حکم لگادیا جائے گا؛ لہٰذا مشتری اس عقد کی مبیع سے فائدہ اٹھاسکتا ہے، اور حضراتِ صاحبینؒ کے قول پر عمل کرتے ہوئے اس کے بعض احکام کے اعتبار سے اس کے اوپر بیع فاسد کا حکم لگادیا جائے گا کہ جس طریقہ سے مقتضائے عقد کے خلاف شرط کی وجہ سے بیع فاسد ہوجاتی ہے اسی طرح اس عقد کے اندر بھی واپسی کی شرط بیع فاسد کے اصول کے مطابق شرط فاسد ہے، اور ان لوگوں کے قول پر عمل کرتے ہوئے جنھوں نے بیع الوفاء کو رہن کی طرح قرار دیا ہے اس کے اوپر رہن کا حکم لگادیا جائے گا کہ جس طریقہ سے مرتہن کو مالِ رہن دوسرے کے قبضہ میں دینے اور

دوسرے کو مالک بنانے کا حق نہیں ہوتا ہے، اسی طرح اس عقد کے اندر مشتری کو دوسرے کی ملکیت میں دینے کا حق نہیں ہے، اس لئے اس کے اوپر معاملہ رہن کا حکم لگا دیا جائے گا؛ لہٰذا بیع الوفاء تین قسم کے عقود سے مرکب ہے، بیع صحیح اور بیع فاسد اور رہن ان تینوں سے مرکب ہے، جیسا کہ ایک جانور جس کا نام زرافہ ہے تین قسم کے جانوروں کی صفتوں کے ساتھ وہ جانور متصف ہے کہ گردن کو دیکھا جائے تو اس کے اندر اونٹ کی صفت ہے اور پیروں کو دیکھا جائے تو اس کے اندر گائے اور بیل کی صفت ہے اور رنگ کو دیکھا جائے تو اس کے اندر چیتے کی صفت ہے تو جس طرح ایک جانور تین قسم کے جانوروں کی صفات کے ساتھ متصف ہو کر وجود میں آیا ہے اور اس طرح کا جانور وجود میں آنا صحیح اور درست ہے، اسی طرح بیع الوفاء بھی تین قسم کے عقود کی صفتوں کے ساتھ متصف ہو کر وجود میں آئی ہے۔ اور وجود میں آنا درست ہے اور اسی وجہ سے اس کو عقد صحیح اور عقد جائز ہی قرار دیا جائے گا اور جب اس عقد کے اندر یہ تینوں صفتیں موجود ہیں تو ان تینوں میں سے کس کو ترجیح دی جائے؟ تو بزازیہ میں ہے کہ بیع صحیح کے پہلو کو ترجیح دینا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے؛ اس لئے کہ اس کو بیع صحیح قرار دینے میں امام ابوحنیفہؒ کے قول کو ترجیح دینا ثابت ہوتا ہے، اور صاحب مذہب کے قول کو ترجیح دینا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہوا کرتا ہے۔ عربی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

قُلْتُ هٰذَا الْعَقْدُ مُرَكَّبٌ مِنَ الْعُقُوْدِ الثَّلاثَةِ كَالزَّرَافَةِ فِيْهَا صِفَةُ الْبَعِيْرِ وَالْبَقَرِ وَالنَّمِرِ جَوَّزَ لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَيْهِ بِشَرْطِ سَلامَةِ الْبَدَلَيْنِ لِصَاحِبِهِمَا (إلٰى قَوْلِهٖ) لِأَنَّهُ يُشْبِهُ بَيْعَ التَّلْجِئَةِ

میں کہتا ہوں یہ عقد عقودِ ثلاثہ سے مرکب ہے جیسا کہ زرافہ اس میں اونٹ، بیل اور چیتے کی صفت ہوتی ہے، اس کی طرف لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس عقد کو جائز قرار دیا گیا ہے، متعاقدین کے لئے بدل کی سلامتی کی شرط کے ساتھ اور مصنف کا قول اس لئے کہ یہ عقد بیع تلجیہ کے مشابہ ہے، اور بے شک بیع

وَإِنَّهٗ صَحِيْحٌ عِنْدَهٗ لَا عِنْدَهُمَا فَأُعْطِيَ لَهٗ حُكْمُ الصَّحِيْحِ عَمَلاً بِقَوْلِهٖ وَحُكْمُ الْفَاسِدِ فِيْ بَعْضِ الْأَحْكَامِ عَمَلاً بِقَوْلِهِمَا وَحُكْمُ الرَّهْنِ فِيْ بَعْضِ الْأَحْكَامِ عَمَلاً بِقَوْلِ النَّاسِ كَمَا ذَكَرْنَاهُ فِيْمَا تَقَدَّمَ وَإِذَا وَقَعَ التَّرَدُّدُ فِيْ إِلْحَاقِهٖ بِالْفَاسِدِ أَوِ الصَّحِيْحِ فَإِلْحَاقُهٗ بِالصَّحِيْحِ أَوْلىٰ تَقْلِيْلاً لِلْفَسَادِ وَتَرْجِيْحاً لِقَوْلِ الإِمَامِ فَيُعْتَبَرُ الْمَذْكُوْرُ ثَمَناً لَا الْمَأْخُوْذُ. (فتاویٰ بزازية، زكريا جديد ۱/ ۲۵۲، وعلى هامش الهندية ٤/ ٤١٠، البحر الرائق كوئٹه ٦/ ١٢)

ترجمہ: امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صحیح ہے، صاحبین کے نزدیک صحیح نہیں؛ لہٰذا امام صاحب کے قول پر عمل کرتے ہوئے اس کو بیع صحیح کا حکم دیا جائے گا اور صاحبین کے قول پر عمل کرتے ہوئے بعض احکام میں بیع فاسد کا حکم دیا جائے گا اور دوسرے لوگوں کے قول پر عمل کرتے ہوئے بعض احکام میں رہن کا حکم دیا جائے گا جیسا کہ ماقبل میں دوسرے کا قول ہم نے ذکر کردیا ہے اور جب اس کو بیع فاسد یا بیع صحیح کے ساتھ لاحق کرنے میں تردد واقع ہوگیا تو اس کو بیع صحیح کے ساتھ لاحق کرنا زیادہ بہتر ہوگا فساد کی کمی کو ثابت کرنے کے لئے اور امام ابوحنیفہؒ کے قول کو ترجیح دینے کے لئے؛ لہٰذا ذکر کی گئی چیز کو ثمن قرار دیا جائے گا نہ کہ ماخوذ اور مقبوض کو۔

مبیع کو کرایہ پر دینے کا حکم

بیع الوفاء میں مشتری مبیع کو کرایہ پر دے کر اس کی آمدنی حاصل کرسکتا ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں یہ بات خوب ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ بیع الوفاء کے بارے میں فقہاء

کے درمیان کافی اختلاف واقع ہو چکا ہے، جس کو ہم نے اس مقالہ کے اندر واضح کر دیا ہے کہ بعض فقہاء نے بیع الوفاء کو رہن کے درجہ میں قرار دیا ہے اور بعض فقہاء نے بیع فاسد کے درجہ میں قرار دیا ہے اور بعض فقہاء نے بیع مکرہ کے درجہ میں قرار دیا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ ان تمام صورتوں میں مشتری کی ملکیت نہیں ہوسکتی، اسی کی جانب علاء الدین حصکفیؒ اور علامہ شامیؒ کا رجحان ہے۔

اور اس کے برخلاف بعض فقہاء نے بیع الوفاء کو بیع صحیح کے درجہ میں قرار دیا ہے اور بعض فقہاء نے بیع صحیح اور رہن سے مرکب عقد قرار دیا ہے، اور ساتھ میں یہ فرمایا ہے کہ مشتری کے حق میں بیع صحیح ہے اسی لئے مشتری مبیع کی آمدنی اور پیداوار کا مالک ہو جائے گا اور بائع کے حق میں رہن ہے اس لئے مشتری مبیع کو بیچنے اور دوسرے کے ہاتھ رہن رکھنے کا مجاز نہ ہوگا، اور بعض فقہاء نے بیع صحیح اور رہن اور بیع فاسد تینوں سے مرکب زَرافہ کی طرح الگ سے ایک عقد تسلیم کیا ہے، اور بعض فقہاء نے تعاملِ ناس اور لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس کو بیع صحیح کے درجہ میں قرار دیا ہے، ان تمام فقہاء کے قول کے مطابق بیع الوفاء صحیح اور جائز عقد ہے؛ لہٰذا ان سب حضرات کے نزدیک مشتری کے لئے مبیع سے فائدہ اٹھانے اور مبیع کے ذریعہ سے آمدنی حاصل کرنے کا حق ہے اور آمدنی کا ایک ذریعہ اجارہ اور کرایہ پر دینا بھی ہے، اس لئے ان تمام فقہاء کے نزدیک مشتری کے لئے مبیع کو بائع کے ہاتھ یا کسی دوسرے کے ہاتھ کرایہ پر دینا جائز ہے؛ لہٰذا اگر کھیتی کی زمین ہے تو مشتری اس زمین کو خود بائع کے ہاتھ میں یا کسی دوسرے کے ہاتھ میں کرایہ یا بٹائی پر دے کر نفع حاصل کرسکتا ہے، اور اگر عمارت ہے اس کو بھی کرایہ پر دے کر آمدنی حاصل کرسکتا ہے، اور متأخرین کا فتویٰ اسی پر جاری ہو چکا ہے کہ آمدنی مشتری کی ملکیت ہوگی؛ لہٰذا راجح یہی ہوگا کہ مبیع کو کرایہ پر دے کر اجرت حاصل کرنا مشتری کے لئے اس وقت تک جائز ہوگا جب تک بائع

ثمن دے کر مبیع کو واپس نہ لے گا، اس کو حضراتِ فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے۔عبارت ملاحظہ فرمایئے:

وَإِنْ آجرَ الْمَبِيْعَ وَفَاءً مِنَ الْبَائِعِ مِمَّنْ جَعَلَهُ فَاسِداً قَالَ لا تَصِحُّ الإِجَارَةُ (إِلٰى قَوْلِهٖ) وَمَنْ جَعَلَهُ رَهْناً كَذٰلِكَ لَمْ يَلْزَمِ الْبَائِعَ الأَجْرُ، وَمَنْ أَجَازَهُ جَوَّزَ الإِجَارَةَ مِنَ الْبَائِعِ وَغَيْرِهٖ وَأَوْجَبَ الأَجْرَ. (فتاویٰ بزازيه، زكريا جديد ۱/ ۲۵۳، على الهندية ۴۱۳/۴، شامی زکریا ۵۴۸/۷، کراچی ۲۷۸/۵)

اور اگر مبیع کو بیع الوفاء میں بائع کے ہاتھ اجرت پر دیا ہے تو جن لوگوں نے اس کو بیع فاسد قرار دیا ہے تو انہوں نے کہا کہ اجارہ صحیح نہیں ہوگا اور جنہوں نے رہن قرار دیا ہے ان کے نزدیک ایسے ہی اجارہ صحیح نہ ہوگا اور بائع پر اجرت لازم نہ ہوگی اور جن لوگوں نے بیع الوفاء کو بیع صحیح قرار دیا ہے ان لوگوں نے مبیع کو بائع کے ہاتھ اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں کرایہ پر دینے کو بھی جائز قرار دیا ہے، اور اجرت بھی لازم ہو جائے گی۔

(وَقَوْلُهُ) وَذُكِرَ فِيْ الإِيْضَاحِ أَنَّ كُلَّ مَا يَصِحُّ بَيْعُهُ قَبْلَ قَبْضِهٖ تَجُوْزُ إِجَارَتُهُ وَمَا لا فَلا وَبَيْعُ الْعَقَارِ قَبْلَ الْقَبْضِ جَائِزٌ فَكَذٰلِكَ إِجَارَتُهُ. (فتاویٰ بزازيه، زكريا جديد ۱/ ۲۵۳، وعلى هامش الهندية ۴/ ۴۱۳)

اور ایضاح میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ ہر وہ شئ جس کو قبضہ سے پہلے بیچنا جائز ہے اس کو اجارہ پر دینا بھی جائز ہے اور جس کو قبل القبض بیچنا صحیح نہیں اس کو اجارہ پر دینا بھی صحیح نہیں ہے اور عقار کی بیع قبضہ سے پہلے جائز ہے؛ لہٰذا اس کو کرایہ پر دینا بھی جائز ہو جائے گا۔

بیع الوفاء میں مبیع کی آمدنی کا حق دار کون؟

جب لوگوں کی ضرورت اور تعاملِ ناس کی وجہ سے بیع الوفاء کو جائز قرار دیا گیا ہے تو مشتری کے لئے مبیع کی واپسی تک اس سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے اور مبیع سے جو آمدنی پیدا ہوگی وہ آمدنی بھی مشتری کی ملکیت میں ہوگی؛ لہٰذا اگر مبیع کے ذریعہ سے کچھ آمدنی حاصل ہوجائے یا مبیع عقار ہے اور کھیتی کی زمین ہے اس میں سے پیداوار حاصل ہوجائے تو وہ ساری کی ساری مشتری کی ملکیت میں ہوگی؛ لہٰذا اگر آمدنی اور پیداوار ضائع ہوجائے یا مشتری نے ضائع کردیا ہے تو اس کا تاوان بائع کے لئے مشتری پر لازم نہیں ہوگا، یہی فقہاء کا آخری قول ہے اور صاحبِ ہدایہ اور ان کی اولاد اور اس زمانہ کے مشائخ کا فتویٰ اسی پر جاری ہو چکا ہے۔ عبارت ملاحظہ فرمایئے:

اَلَّذِیْ اسْتَقَرَّ عَلَیْهِ فَتْوٰی صَاحِبِ الْهِدَایَةِ وَأَوْلَادِهٖ وَمَشَایِخِ الْعَهْدِ أَنَّ الْمِلْکَ یَثْبُتُ لِلْمُشْتَرِیْ فِیْ زَوَائِدِهٖ وَلَا یَضْمَنُهٗ بِالإِتْلَافِ. (فتاویٰ بزازیه، زکریا جدید ۱/ ۲۵۲، وعلی هامش الهندیة ٤/ ٤١٠)

جس کے اوپر صاحب ہدایہ اور ان کی اولاد اور اس زمانہ کے مشائخ کا فتویٰ مسلسل جاری ہو چکا ہے وہ یہی ہے کہ بیع الوفاء میں مبیع کی پیداوار اور آمدنی میں مشتری کی ملکیت ثابت ہوجائے گی اور آمدنی کو ضائع اور ہلاک کردینے سے مشتری بائع کے لئے ضامن نہیں ہوگا۔

بیع الوفاء میں مبیع کے نقصان کی تلافی

اگر بیع الوفاء میں مشتری کے یہاں مبیع ہلاک ہوجائے تو ثمن کی ادائیگی ساقط ہوجاتی ہے؛ لیکن اگر مبیع ہلاک تو نہیں ہوئی ہے؛ لیکن اس میں نقصان آجائے تو اس نقصان کی تلافی کی کیا

شکل ہے؟ تو اس سلسلہ میں شرعی حکم یہ ہے کہ مبیع میں جتنا نقصان ہوا، دینِ ثمن میں سے اتنا مجریٰ ہوکر ساقط ہوجائے گا، مثال کے طور پر ایک ہزار روپیہ لے کر کے مبیع مشتری کے قبضہ میں دی گئی ہے اور مبیع کی قیمت پندرہ سو روپیہ ہے اور مبیع میں پانچ سو روپیہ قیمت کا نقصان ہوجائے تو ثمن میں سے پانچ سو روپیہ کی ادائیگی ساقط ہوجائے گی، اس کو حضراتِ فقہاء نے اس طرح کے الفاظ سے نقل فرمایا ہے، ملاحظہ ہو:

وَالَّذِیْ اسْتَقَرَّ عَلَیْهِ فَتْوٰی الْأَئِمَّةِ وَالْأَسَاتِذَةِ فِیْ مَسْئَلَةِ نُقْصَانِ الْمَبِیْعِ وَفَاءً سُقُوْطُ حِصَّةِ النُّقْصَانِ مِنْ مَالِ الْوَفَاءِ وَهُوَ الثَّمَنُ وَیُقَسَّمُ مَالُ الْوَفَاءِ عَلٰی قِیْمَةِ الْبَاقِیْ وَالْهَالِکِ فَیَسْقُطُ قِسْطُ الْهَالِکِ وَیَبْقٰی حِصَّةُ الْبَاقِیْ بَیَانُهٗ اشْتَرٰی دَاراً بِالْوَفَاءِ قِیْمَتُهَا تُسَاوِیْ أَلْفاً بِمِائَةٍ فَخَرِبَتْ الدَّارُ حَتّٰی صَارَتِ الْقِیْمَةُ خَمْسَ مِائَةٍ تَسْقُطُ مِنَ الثَّمَنِ خَمْسُوْنَ.

(فتاویٰ بزازیہ، زکریا جدید ١/ ٢٥٣، وعلی هامش الهندیة ٤/٢ ٤١)

بیع الوفاء میں مبیع کے نقصان کے مسئلہ میں اساتذہ اور ائمہ کا فتویٰ اس بات پر جاری ہوچکا ہے کہ مالِ وفاء یعنی ثمن میں سے نقصان کا حصہ ساقط ہوجائے گا اور ثمن وفاء مبیع کی باقی قیمت پر اور مبیع کے ہلاک شدہ پر تقسیم ہوجائے گا؛ لہٰذا ہلاک شدہ کا حصہ بائع کے اوپر سے ادا کرنا ساقط ہوجائے گا اور باقی کا حصہ باقی رہے گا، اس کی وضاحت یوں ہے کہ بیع الوفاء کے طور پر ایک مکان خریدا ہو جس کی قیمت ایک ہزار روپیہ کے برابر ہے اس کو سو روپیہ میں خریدا ہے پھر مکان منہدم ہوجائے یہاں تک کہ اس کی قیمت پانچ سو روپیہ رہ جائے تو ثمن میں سے پچاس روپیہ ساقط ہوجائیں گے۔

بیع الوفاء میں ثمن کی زکوٰۃ کون ادا کرے؟

یہاں یہ مسئلہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ مشتری کے قبضہ میں مبیع ہوتی ہے اور بائع کے قبضہ میں ثمن ہوتا ہے اور مبیع چوں کہ مالِ نمو نہیں ہوتی ہے، اس لئے مبیع کی زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی؛ لیکن ثمن مالِ نمو ہوتا ہے، اسی لئے اس کے اوپر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور یہ مال فی الحال بائع کے قبضہ اور ملکیت میں ہے، اس اعتبار سے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا بائع کے اوپر لازم ہوگا اور مشتری کے اوپر اس لئے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہے کہ اس نے ثمن کے بدل پر قبضہ کر رکھا ہے جس کی وجہ سے ثمن در پردہ اس کی ملکیت ہے اس لئے مشتری پر بھی اس کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہو جائے گا، اور چوں کہ عقود وفسوخ میں یعنی عقد کے منعقد ہونے میں اور عقد کے فسخ ہو جانے میں نقود متعین نہیں ہوتے ہیں، اس لئے یہ نہیں کہا جائے گا کہ ایک مالِ متعین کی زکوٰۃ دو آدمیوں پر لازم آرہی ہے؛ بلکہ لاعلی التعیین اتنے مال کی زکوٰۃ بائع کے اوپر بھی لازم ہے اور مشتری کے اوپر بھی لازم ہے جو فقہاء کی اس طرح کی عبارات سے واضح ہوتا ہے۔

وَزَكوٰةُ مَالِ الْوَفَاءِ عَلَى الْبَائِعِ لِأَنَّهُ مِلْكُهُ بِالْقَبْضِ وَعَلَى الْمُشْتَرِيْ أَيْضاً لِأَنَّهُ يُعَدُّ مَالاً لَهُ مَوْضُوْعاً عِنْدَ الْبَائِعِ لَيْسَ فِيْهِ زَكوٰةُ مَالٍ عَلٰى رَجُلَيْنِ لِأَنَّ النُّقُوْدَ لَا تَتَعَيَّنُ فِى الْعُقُوْدِ وَالْفُسُوْخِ وَعَلَيْهِ صَاحِبُ الْهِدَايَةِ وَالإِمَامُ الْبَزْدَوِيُّ.

(فتاویٰ بزازیه، زکریا جدید ۱/ ۲۵۳، وعلى هامش الهندية ٤١٢/٤)

بیع الوفاء کے مال ثمن کی زکوٰۃ بائع کے اوپر اس وجہ سے لازم ہوگی کہ قبضہ کی وجہ سے بائع اس کا مالک ہو چکا ہے اور مشتری کے اوپر بھی اس لئے واجب ہے کہ وہ مشتری ہی کا مال شمار ہوتا ہے جو بائع کے یہاں رکھا ہوا ہے اور اس میں ایک متعین مال کی زکوٰۃ کا ادا کرنا دو آدمیوں پر اس لئے لازم نہیں آتا ہے کہ عقود وفسوخ میں نقود یعنی ثمن متعین نہیں ہوا کرتا ہے، یہی صاحب ہدایہ اور امام بزدوی کی رائے ہے۔

بائع اور مشتری کا اختلاف

اگر بائع اور مشتری کے درمیان اس طرح اختلاف ہو جائے کہ دونوں میں سے ایک اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ بیع قطعی ہو چکی ہے واپسی اور استرداد کا کوئی مسئلہ نہیں اور دوسرا اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ بیع قطعی نہیں ہوئی؛ بلکہ بیع الوفاء کے طور پر عقد ہوا ہے؛ لہٰذا ثمن کی واپسی پر مبیع کا استرداد لازم ہے اور دونوں نے اپنے اپنے دعویٰ پر بینہ اور گواہ پیش کر دئے ہیں تو ایسی صورت میں کس کو ترجیح دی جائے؟ تو اس سلسلہ میں صاحبِ درِمختار فرماتے ہیں کہ استحساناً بیع الوفاء کے دعویٰ کرنے والے کے قول کو ترجیح دی جائے؛ لیکن اس کے نیچے شامی نے ملتقط کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ اولاً متأخرین نے بیع قطعی کے دعویٰ کرنے والے کے بینہ کو ترجیح دینے پر فتویٰ دیا ہے پھر اس کے بعد بیع الوفاء کے دعویٰ کرنے والے کے بینہ کے اولیٰ ہونے پر فتویٰ دیا ہے، اور اس کے اوپر استحسان کا نشان لگایا ہے، اس کے بعد یہ وضاحت نقل فرمائی ہے کہ اگر مشتری نے بیع قطعی کا دعویٰ کیا ہے کہ بیع مکمل ہو چکی ہے اب استرداد کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اور بائع دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے بیع الوفاء کے طور پر بیچا ہے تو ایسی صورت میں اگر دونوں نے بینہ پیش کیا ہے تو بائع کے گواہ کو ترجیح دی جائے گی اور اگر بینہ پیش نہیں کیا گیا؛ بلکہ دونوں کا محض دعویٰ ہے تو ایسی صورت میں بیع قطعی کے دعویٰ کرنے والے کے قول کو ترجیح دی جائے گی، ہاں البتہ اگر مبیع کے مقابلہ میں ثمن کی کمی پر واضح دلیل اور قرینہ موجود ہو تو ایسی صورت میں بیع الوفاء کے دعویٰ کرنے والے کے قول کو ترجیح ہوگی؛ تاکہ بائع غبن فاحش کے نقصان کا شکار نہ ہو تو حاصل یہ نکلا کہ گواہ نہ ہونے کی صورت میں اگر بیع الوفاء کا قرینہ موجود ہو مثلاً مبیع کے مقابلہ میں ثمن کی مقدار کم ہے تو ایسی صورت میں بائع کے قول کا اعتبار کر کے بیع الوفاء کا حکم صادر کر دیا جائے گا اور دونوں کو اس کا پابند بنایا جائے گا اور اگر کوئی قرینہ موجود نہیں ہے اور ثمن اور مبیع کے درمیان تناسب میں تفاوت نہیں ہے اور نہ ہی غبنِ فاحش لازم آ سکتا ہے تو ایسی صورت میں مشتری کے قول کا

اعتبار کر کے بیعِ قطعی کا حکم جاری کر دیا جائے گا۔ فقہاء کی عبارات ملاحظہ فرمائیے:

إِنَّ الْقَوْلَ لِمُدَّعِي الْوَفَاءِ اِسْتِحْسَاناً، وَلَوْ قَالَ الْبَائِعُ بِعْتُكَ بَيْعاً بَاتًّا فَالْقَوْلُ لَهُ إِلَّا أَنْ يَّدُلَّ عَلَى الْوَفَاءِ بِنُقْصَانِ الثَّمَنِ كَثِيراً (وَتَحْتَهُ فِي الشَّامِيَةِ) قَوْلُهُ: هُنَّ اسْتِحْسَاناً يَقْتَضِي تَرْجِيحَ مُدَّعِي الْوَفَاءِ فَيَنْبَغِي تَقْيِيدُهُ بِقِيَامِ الْقَرِيْنَةِ (إِلٰى قَوْلِهٖ) وَإِنْ ادَّعٰى أَحَدُهُمَا بَيْعاً بَاتًّا وَالآخَرُ بَيْعَ الْوَفَاءِ وَأَقَامَ الْبَيِّنَةَ كَانُوْا يُفْتُوْنَ أَنَّ الْبَاتَّ أَوْلٰى ثُمَّ أَفْتَوْا أَنَّ بَيْعَ الْوَفَاءِ أَوْلٰى وَهٰذَا اِسْتِحْسَانٌ (إِلٰى قَوْلِهٖ) وَلَوْ قَالَ الْمُشْتَرِيْ اشْتَرَيْتُهُ بَاتًّا وَقَالَ الْبَائِعُ بِعْتُهُ بَيْعَ الْوَفَاءِ (إِلٰى قَوْلِهٖ) أَنَّ الْاِسْتِحْسَانَ فِي الْاِخْتِلَافِ فِي الْبَيِّنَةِ تَرْجِيحُ بَيِّنَةِ الْوَفَاءِ وَفِي الاخْتِلَافِ فِي الْقَوْلِ تَرْجِيحُ

بے شک استحسانا بیع الوفاء کے مدعی کا قول معتبر ہوگا اور اگر بائع نے کہا کہ میں نے تمہارے ہاتھ بیع قطعی کے طور پر بیچا ہے تو اس کا قول معتبر ہوگا؛ لیکن اگر بیع الوفاء پر ثمن کے کثیر نقصان کی وجہ سے دلالت کرنے والی کوئی دلیل ہو تو بیع الوفاء کا اعتبار ہوگا اس کے نیچے شامی میں ہے کہ یہاں استحسانا کا لفظ بیع الوفاء کے مدعی کے دعویٰ کی ترجیح کا تقاضا کرتا ہے؛ لہٰذا اس کو قیامِ قرینہ کے ساتھ مقید کرنا زیادہ مناسب ہے اور اگر دونوں میں سے ایک نے بیع قطعی کا دعویٰ کیا اور دوسرے نے بیع الوفاء کا اور دونوں نے بینہ قائم کر دیا تو فقہاء متأخرین اس بات پر فتویٰ دیتے تھے کہ بیع قطعی کی ترجیح کو اولیٰ قرار دیا جائے پھر اس کے بعد بیع الوفاء کی ترجیح کے اولیٰ ہونے پر فتویٰ دینے لگے اور بیع الوفاء کو ترجیح دینا مستحسن ہے اور اگر مشتری نے کہا کہ میں نے بیع الوفاء کے طور پر بیچا ہے تو ایسی صورت میں بینہ کے ساتھ میں اختلاف کی صورت میں مستحسن یہی ہے کہ بیع الوفاء کے بینہ کو ترجیح

قَوْلِ مُدَّعِي الْبَتَاتِ (إِلٰى قَوْلِهٖ) وَهُوَ كَوْنُ الْقَوْلِ لِمُدَّعِي الْبَتَاتِ بِمَا إِذَا لَمْ تُقِمِ الْقَرِينَةُ عَلٰى خِلَافِهٖ. (الدر المختار مع الشامي زكريا ۷/۵۵۰، شامي كراچی ۵/۲۷۹)

دی جائے اور بغیر بینہ کے قول میں اختلاف کی صورت میں بیع قطعی کے مدعی کے قول کو ترجیح دی جائے اور بیع قطعی کے مدعی کے قول کی ترجیح اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ جب اس کے خلاف پر کوئی قرینہ قائم نہ ہو۔

اور الاشباہ والنظائر کے حاشیہ حموی میں صاف الفاظ کے ساتھ بائع کے قول کو ترجیح دی گئی ہے کہ جب مشتری اور بائع کے درمیان اس طرح کا اختلاف ہو جائے کہ مشتری بیع قطعی کا دعویٰ کرے اور بائع بیع الوفاء کا دعویٰ کرے تو ایسی صورت میں بائع کے قول کا اعتبار کر کے اس معاملہ کو بیع الوفاء قرار دیا جائے گا؛ اس لئے کہ بیع قطعی ہونے کی صورت میں مشتری کا فائدہ ہے اور بائع کا نقصان ہے اور بیع الوفاء ہونے کی صورت میں کسی کا نقصان نہیں؛ کیوں کہ مشتری کو اپنا ثمن واپس مل جاتا ہے اور بائع کو اپنی مبیع واپس مل جاتی ہے۔

وَفِي الْفُصُوْلِ الْعِمَادِيَةِ إِذَا اخْتَلَفَ الْمُتَبَائِعَانِ فَقَالَ الْمُشْتَرِيُ اشْتَرَيْتُهٗ شِرَاءً بَاتًّا وَقَالَ الْبَائِعُ بَيْعَ الْوَفَاءِ فَإِنَّ الْقَوْلَ قَوْلُ الْبَائِعِ لِأَنَّ الْمُشْتَرِيَ يَدَّعِي زَوَالَ عَيْنِهٖ بِالْبَتَاتِ وَمُدَّعِي الْوَفَاءِ يُنْكِرُ الزَّوَالَ فَيَكُوْنُ الْقَوْلُ قَوْلَهٗ. (حاشيه الحموي على الأشباه قديم ۱۳۰)

فصولِ عمادیہ میں ہے کہ جب متبائعین میں اختلاف ہو جائے تو مشتری کہتا ہے کہ میں نے عقد لازم اور عقد قطعی کے طور پر خریدا ہے اور بائع کہتا ہے کہ بیع الوفاء کے طور پر میں نے بیچا (اور تم نے خریدا ہے) تو بائع کے قول کو ترجیح حاصل ہوگی؛ اس لئے کہ مشتری معاملہ قطعی کے ذریعہ سے عین مبیع کے زوال کا دعویٰ کرتا ہے اور بیع الوفاء کا مدعی زوال کا انکار کرتا ہے؛ لہٰذا اسی کے قول کا اعتبار ہوگا۔

شبیر احمد قاسمی
خادم الحدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد (یو-پی)

❁❁❁

۱۲/ باب الشفعة

اپنے پڑوس کو بتائے بغیر زمین فروخت کرنے کا حکم

سوال [۸۸۴۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ترکہ پدری سے حاصل شدہ ایک قطعہ زمین چار حصوں میں کر کے دو حقیقی بھائیوں میں تقسیم ہوگئی، بعدہ محمد دین صاحب نے ایک قطعہ اپنی زمین کے بیچنے کا خیال اب سے تین سال پہلے ظاہر کردیا تھا، اس کے متعلق محمد دین نے اپنے حقیقی بھائی امام الدین سے کسی تیسرے شخص کی معرفت سودے بازی بھی کی، مگر محمد دین نے امام الدین کو بغیر بتائے دوسرے شخص کے ہاتھ معاملہ بیع کردیا، جب کہ محمد دین کی زمین دونوں جانب سے امام الدین کی زمین کے درمیان واقع ہے، جس کی صورت یہ ہے:

(۱) امام الدین	(۲) محمد الدین	(۳) امام الدین	(۴) محمد دین

اور خریدار بھی قریبی رشتہ دار ہیں، تو کیا امام الدین کو حق شفعہ حاصل ہے؟ اور بائع اور مشتری پر بھی کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

المستفتی: امام الدین، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسئولہ صورت میں حق مبیع اور پڑوس کی بنیاد پر امام الدین کو مذکورہ جائیداد میں شفعہ کا حق حاصل ہے، بائع اور مشتری کو چاہئے کہ وہ اس کے شرعی حق کو ادا کریں۔

سمع أبا رافع، سمع النبي صلى الله عليه وسلم يقول: الجار أحق بسقبه. (سنن أبي داؤد، باب في الشفعة، النسخة الهندية، مكتبة البدر ۲/ ۴۹۶، دارالسلام، رقم: ۳۵۱۶، صحيح البخاري، باب عرض الشفعة على صاحبها قبل البيع،

النسخة الهندية ١/ ٣٠٠، رقم: ٢٢٠٣، ف: ٢٢٥٨، سنن الترمذي، باب ماجاء في الشفعة للغائب، النسخة الهندية ١/ ٢٥٣، دارالسلام، رقم: ١٣٦٩)

ثم له في حق المبيع الخ. ثم لجار ملاصق بابه في سكة أخرى. (التنوير مع الدرالمختار، کتاب الشفعة، زکریا ۹/ ۳۲۰-۳۲۲، کراچی ٦/ ۲۲۰-۲۲۱) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۴ ؍صفر ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۱/ ۳۸۸۰)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۲/۲۴ھ

مکان میں شریک شفعہ کا مستحق ہے یا قبرستان؟

سوال [۸۸۴٦]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: میرا مکان دادالٰہی ہے، جس پر میں قابض ودخیل ہوں، جو قبرستان سے ملحق ہے، اس میں چند حصہ دار مختصر جزو کے مالک ہیں، کیا کوئی حصہ دار اپنا جزو قبرستان کے نام مجھے نہ دے کر بیع نامہ کرسکتا ہے اور میرے مکان کو جبراً توڑ کر قبرستان میں شامل کرنا اور قبور کا کھودنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی: نعیم اللہ مغل پورہ مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آپ کے ساتھ جو لوگ مکان میں شریک ہیں، وہ اگر اپنا حصہ فروخت کرنا چاہیں اور آپ خریدنا چاہیں، تو آپ ہی شرعی طور پر خریدنے کے حق دار ہوں گے۔ اور اگر آپ کو نہ دے کر قبرستان کو فروخت کردیا ہے، تو آپ کو اس کی خریداری ختم کرکے خریدنے کا حکم ہے۔

عن شريح قال: الخليط أحق من الشفيع، والشفيع أحق من سواه.

(مصنف عبدالرزاق، باب الشفعة بالجوار والخليط أحق، المجلس العلمي ٨/ ٧٨، رقم: ١٤٣٨٦)

عن هشام بن المغيرة قال: سمعت الشعبي يقول: قال رسول الله ﷺ: الشفيع أولى من الجار، والجار أولى من الجنب. (مصنف عبدالرزاق، باب الشفعة بالجوار والخليط أحق، المجلس العلمي ٨/ ٧٩، رقم: ١٤٣٩٠)

ليس للشريك في الطريق والشرب، والجار شفعة مع الخليط في الرقبة. (هداية، كتاب الشفعة، أشرفی ٤/ ٣٩٠)

وإذا بنى المشتري أو غرس، ثم قضى للشفيع بالشفعة فهو بالخيار إن شاء أخذها بالثمن وقيمة البناء والغرس، وإن شاء كلف المشتري قلعه.

(هداية، كتاب الشفعة، باب طلب الشفعة والخصومة فيها، أشرفي ٤/ ٤٠٠)

اورقبور کھودنے کی بات واضح کیجئے، اس کے بعد جواب دیا جائے گا۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۲؍محرم الحرام ۱۴۱۵ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸۱۱/۳۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۵/۱/۱۱ھ

شریک فی حق المبیع کوشفعہ میں حق تقدم حاصل ہے

سوال [۸۸۴۷]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ثناء الرحمٰن اپنا مکان فروخت کررہے ہیں، جن کے دو بھائی بھی ہیں اور دیگر رشتہ دار بھی جو مکان سے کچھ دوری پر رہتے ہیں، ثناء الرحمٰن کے مکان سے متصل پچھم جانب محمد یوسف کا مکان ہے اور پورب جانب سیٹھ مشتاق احمد صاحب کا مکان ہے اور اتر جانب محمد اطہر کا مکان ہے (محمد اطہر اور ثناء الرحمٰن کا مکان پہلے ایک ہی تھا، پھر تقسیم ہوا اور دیوار ہی صرف حد فاصل کے طور پر ہے) محمد اطہر کے مکان کے کل پانی کی نکاسی ثناء الرحمٰن کے مکان کے اندر ہی سے ہے جو کہ تقسیم سے پہلے ہی سے پشتینی راستہ ہے، اب ثناء الرحمٰن صاحب اپنا مکان فروخت کررہے ہیں، تو حق شفعہ دور رہنے والے بھائیوں کو ہے یا بالواسطہ متصل رہنے والے محمد اطہر کو ہے؟

المستفتی: محمد اطہر

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب ثناء الرحمٰن کے مکان کے اندر ہی سے محمد اطہر کے مکان کے کل پانی کی نکاسی ہوتی ہے، تو محمد اطہر ثناء الرحمٰن کے مکان میں شریک فی حق المبیع ہے؛ اس لئے دائیں بائیں کے پڑوس، تو محمد یوسف اور سیٹھ مشتاق کے مقابلہ میں محمد اطہر ہی کو ثناء الرحمٰن کے مکان میں حق شفعہ کا تقدم حاصل ہے؛ اس لئے اگر محمد اطہر، ثناء الرحمٰن کے مکان کو خریدنے کے لئے تیار ہے، تو محمد یوسف اور سیٹھ مشتاق احمد کو حق شفعہ حاصل نہیں ہوگا۔

عن الشعبي قال: الخليط أحق من الشفيع، والشفيع أحق من الجار، والجار أحق ممن سواه. (المصنف لابن أبي شيبة، البيوع والأقضية من كان يقضي بالشفعة للجار، موسسة علوم القرآن، جديد ١١/ ٥٣٨، رقم: ٢٣٧٢)

عن هشام بن المغيرة قال: سمعت الشعبي يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الشفيع أولى من الجار، والجار أولى من الجنب. (المصنف لابن أبي شيبة، كتاب البيوع والأقضية من كان يقضي بالشفعة للجار، موسسة علوم القرآن، جديد ١١/ ٥٣٧، رقم: ٢٣٧٢)

فدل ذلک علی أن الشفعة كما تستحق بالشركة في نفس المبيع تستحق بالشركة في الطريق، ولما استحقت بالشركة في الطريق، فبالشركة في حق آخر كالمسبل وغيره، كذلک لاشتراک العلة. (إعلاء السنن بيروت ١٧/ ٩) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷؍ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۹۴۳۲/۳۸)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۹/۱/۲۸ھ

دس ماہ کے بعد حق شفعہ کا دعویٰ کرنا

سوال [۸۸۴۸]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ایک قطعہ مکان کے چار بھائی وزیر بیگ، شبیر بیگ، صدیق بیگ، شاہد بیگ مالک تھے

اور برابر حصوں کے مالک تھے، اس میں سے ایک حصہ وزیر بیگ کا ان کے بھتیجے راشد بیگ ابن شاہد بیگ نے خرید لیا، پھر ۱۰ رمہینہ کے بعد صدیق بیگ نے راشد بیگ پر حق شفعہ کا دعویٰ کر دیا تھا، اب صدیق بیگ کا انتقال ہوگیا، ان کے ورثاء مقدمہ چلا رہے ہیں، تو آپ سے دریافت یہ کرنا ہے کہ شرعاً وزیر بیگ کے اس مکان پر صدیق بیگ کا دعویٰ حق شفعہ کرنا اور پھر ان کے بیٹوں کا اسی پر مقدمہ چلانا جائز ہے یا نہیں؟ یا راشد بیگ نے جب خرید لیا اور دس ماہ تک کوئی حق شفعہ کا دعویٰ نہیں ہوا، تو اس کی خریداری صحیح ہوگی؟ شرعی حکم جو بھی ہو تحریر فرمائیں۔

المستفتی: راشد بیگ سنبھلی گیٹ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب راشد بیگ کے خرید لینے کے دس ماہ بعد تک صدیق بیگ نے خاموشی اختیار کی، تو اب اتنے ایام گذرنے کے بعد حق شفعہ ثابت نہ ہوگا؛ کیونکہ جس مجلس میں خریداری کا علم ہو جائے اسی مجلس میں حق شفعہ کا دعویٰ کرکے اپنے دعویٰ پر گواہ نہیں بناتا ہے تو بعد میں شرعی طور پر کوئی حق باقی نہیں رہتا ہے۔

وقال الشعبي: من بيعت شفعته وهو شاهد لا يغيرها فلا شفعة له.

(صحيح البخاري، باب عرض الشفعة على صاحبها قبل البيع، النسخة الهندية ١/ ٣٠٠)

إذا ترك الشفيع الإشهاد حين علم بالبيع وهو يقدر على ذلك بطلت شفعته. (هداية، كتاب الشفعة، باب ما تبطل به الشفعة، اشرفي ٤/ ٤٠٦، الدر مع الرد، كراچى ٦/ ٢٤٠، زكريا ٩/ ٣٤٠-٣٥٠) **فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۱/۱۱/۲ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۵/ ۶۹۲۹)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۱/۱۱/۳ھ

ایک سال بعد حق شفعہ کا دعویٰ کرنا

سوال [۸۸۴۹]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے

میں: مرزا نذیر بیگ نے بوقت انتقال ۲۰۶ر گز زمین کا ایک مکان چھوڑا اور ورثاء میں چار لڑکے: وزیر بیگ، شبیر بیگ، صدیق بیگ، شاہد بیگ کو چھوڑا، بعد میں وزیر بیگ کا انتقال ہوا، اس کا ایک لڑکا افتخار بیگ تھا، افتخار بیگ کا بھی انتقال ہوگیا، اس کے بعد افتخار بیگ کے ورثاء سے اس کا حصہ شاہد بیگ کے لڑکے راشد بیگ نے خرید لیا۔ خریدے ہوئے ایک سال گذر جانے کے بعد صدیق بیگ نے حق شفعہ کا دعویٰ دائر کر دیا ہے، تو کیا شریعت میں خرید کو ایک سال گذر جانے کے بعد صدیق بیگ کا حق شفعہ کا دعویٰ صحیح ہے یا نہیں؟ شریعت کا جو بھی حکم ہو تحریر فرمائیں عنایت ہوگی۔ فقط

المستفتی: شاہد بیگ، متصل سرائے پختہ، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک سال گذر جانے کے بعد تک باوجود فروختگی کے علم کے حق شفعہ کا مطالبہ نہیں کیا ہے، یا قیمت زیادہ سمجھ کر زیادہ قیمت سے نہیں لیا ہے اور سال گذرنے کے بعد اب حق شفعہ کا دعویٰ کر رہا ہے، تو شرعاً یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ اور سال گذر جانے کے بعد صدیق بیگ کو حق شفعہ کے دعویٰ کا حق باقی نہیں رہا ہے؛ لہٰذا خرید شدہ حصہ کا مالک شرعاً شاہد بیگ کا لڑکا راشد بیگ ہو چکا ہے، اب اس میں کسی کا کوئی حق باقی نہیں رہا ہے۔

وقال الشعبي: من بيعت شفعته وهو شاهد لا يغيرها فلا شفعة له.

(صحيح البخاري، باب عرض الشفعة على صاحبها قبل البيع، النسخة الهندية ١/ ٣٠٠)

إذا علم الشفيع بالبيع اشهد في مجلسه ذلک على المطالبة اعلم أن الطلب على ثلاثة أوجه: طلب المواثبة: وهو أن يطلبها كما علم حتى لو بلغ الشفيع البيع ولم يطلب شفعته بطلت الشفعة. (هداية، كتاب الشفعة، باب طلب الشفعة، والخصومة، اشرفي ٤/ ٣٩٢، شامي، كراچی ٦/ ٢٢٤، زكريا ٩/ ٣٢٩-٣٣٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۷ر رمضان ۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۲۵/۱۴۰۰)

۱۳ / باب المزارعة

پندرہ کیلو تیل پر کھیتی کاشت کے لئے دینا

سوال [۸۸۵۰]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنی سات بیگہ زمین میتھی کی کھیتی کرنے کے لئے بکر کو یہ کہہ کر دی کہ جب تیل نکلے تو اس میں سے مجھ کو تم پندرہ کلو تیل دینا اور کھیتی میں آنے والا خرچ سب تم کروگے اور پندرہ کلو تیل سے اوپر جو بھی ہوگا وہ سب تمہارا ہوگا، پھر بکر نے اس زمین میں آٹھ ہزار کی لاگت لگائی اور کھیتی کو محنت سے پالا، کھیتی کٹنے کے چند دن پہلے شدید بارش ہوگئی، جس سے تقریباً آدھی کھیتی پانی بھر کر سوکھ گئی اور خراب ہوگئی، پھر بکر باقی ماندہ کھیتی کو کاٹ کر اپنے ٹریکٹر ٹرالی سے لا رہا تھا کہ کھیت میں ٹریکٹر پھنس گیا، بمشکل تمام خالی ٹریکٹر ٹرالی نکلی اور کٹی بھری کھیتی اتارنی پڑی، پھر چند دن بعد ذرا موسم ٹھیک ہونے پر بکر اس کو بھرنے گیا تو ٹریکٹر پھر دلدل میں پھنس گیا اور بھری کھیتی اتار کر بمشکل تمام ایک دوسرے ٹریکٹر کی مدد سے ٹریکٹر ٹرالی نکلی، اس میں بکر اور اس کا بھائی زور لگاتے لگاتے بیہوش ہوگئے اور بیمار بھی پڑ گئے، بکر نے زید سے آکر کہہ دیا کہ اس کو لانے سے ہم تو عاجز آگئے آپ نکال سکو تو لاکر تیل نکال لو، آخر وہ کٹی پڑی کھیتی نہ نکل سکی اور خراب ہوگئی، اب صورت حال یہ ہے کہ زید بکر کو مجبور کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میرا پندرہ کلو تیل دو اور بے ایمان بتا رہا ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ زید اور بکر کے درمیان اس طرح کھیتی کرنے کا معاہدہ ٹھیک ہوا تھا یا نہیں؟ اور بکر کے ذمہ وہ پندرہ کلو تیل دینا لازم ہے یا نہیں؟

المستفتی: محمد طاہر القادری افضل پور، مرادآباد

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید اور بکر کے درمیان زمین کی پیداوار کے سلسلہ میں جو

معاملہ ہوا ہے، وہ از روئے شرع صحیح نہیں؛ اس لئے کہ عقد مزارعہ کے صحیح ہونے کے لئے کل پیداوار کا نصف یا ربع یا ایک تہائی یا دوتہائی کے حساب سے طے کرنا لازم ہوتا ہے، اس کے بغیر معاملہ فاسد ہوجاتا ہے، متعین طریقہ سے طے کرنا کہ پیداوار سے حاصل شدہ پندرہ کلو تیل مالک زمین لے گا اور بقیہ کھیتی کرنے والا صحیح نہیں۔ اور بٹائی کے معاملہ میں پیداوار کھیتی کرنے والے کے پاس امانت کے درجہ میں ہوتی ہے؛ لہٰذا مذکورہ صورت میں پیداوار کے ضائع ہونے میں بکر کے کسی عمل کا دخل نہیں تھا؛ اس لئے وہ پیداوار کا ضامن نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی زید کو پندرہ کلو تیل دینا اس پر لازم ہوگا۔

عن حنظلة بن قيس الأنصاري، سمع رافع بن خديج قال: كنا أكثر أهل المدينة مزدرعا، كنا نكري الأرض بالناحية منها مسمى لسيد الأرض، قال: فمما يصاب ذلک وتسلم الأرض، ومما تصاب الأرض ويسلم ذلک، فنهينا، وأما الذهب والورق فلم يكن يومئذ. (صحيح البخاري، كتاب الحرث والمزارعة، النسخة الهندية ١/ ٣١٢، رقم: ٢٢٦٩، ف: ٢٣٢٧، صحيح مسلم، باب كراء الأرض بالذهب والورق، النسخة الهندية ٢/ ١٢، بيت الأفكار رقم: ١٥٤٨)

منها: أن يكون ذلک البعض من الخارج معلوم القدر من النصف أو الثلث أو الربع أو نحوه، ومنها: أن يكون جزءا شائعا من الجملة، حتى لو شرط لأحدهما قفزان معلومة لا يصح العقد. (هندية، كتاب المزارعة، الباب الأول، زكريا جديد ٥/ ٢٧٢، قديم ٥/ ٢٣٥)

وفي الدر: الغلة في المزارعة مطلقا ...... أمانة في يد المزارع ...... فلا ضمان عليه لو هلكت الغلة في يده بلا صنعه. (درمختار مع الشامي، كتاب المزارعة، زكريا ٩/ ٤٠٨، كراچی ٦/ ٢٨٢، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٤٧، مصري قديم ٢/ ٥٠٤) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
یکم شعبان ۱۴۲۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۸/ ۹۶۸۸)

مزارعت میں مخصوص مقدار کی شرط لگانے کا حکم

سوال [۸۸۵۱]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: ہمارا ایک مکتب ہے، جس کی کئی بیگہ زمین ہے، کمیٹی والے ایک شخص کو ایک بیگہ زمین اس شرط پر دیتے ہیں کہ ہم دھان کے موسم میں دس من دھان لیں گے اور دھان اسی زمین کی پیداوار سے لیں گے۔ اور گیہوں کے موسم میں پانچ من گیہوں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک بیگہ زمین میں کل دھان دس من نہیں ہو پاتا، تو کیا کمیٹی والے اس شخص سے تب بھی دس من دھان وصول کریں گے؟ اور کیا یہ صورت شرعاً جائز ہے، جب کہ یہ مخابرہ کی ایک شکل معلوم ہوتی ہے جو کہ شرعاً حرام ہے۔

المستفتی: محمد عبداللہ رشیدی، جامعہ اشاعت السنہ رام گنج، مغربی بنگال

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زمین کو اس شرط پر دینا کہ دھان کے موسم میں دس من دھان اور گیہوں کے موسم میں پانچ من گیہوں اسی زمین کی پیداوار سے لئے جائیں گے، تو یہ معاملہ فاسد ہے، شرعاً جائز نہیں ہے؛ البتہ اس کے جواز کی یہ شکل ہوسکتی ہے کہ اس زمین کی پیداوار سے نصف یا ثلث یا ربع لیا جائے گا اور اس کو مخابرہ کی شکل کہنا درست نہیں ہے۔

عن حنظلة بن قيس الأنصاري، سمع رافع بن خديج قال: كنا أكثر أهل المدينة مزدرعا، كنا نكري الأرض بالناحية منها مسمى لسيد الأرض، قال: فمما يصاب ذلك وتسلم الأرض، ومما تصاب الأرض ويسلم ذلك، فنهينا، وأما الذهب والورق فلم يكن يومئذ. (صحيح البخاري، كتاب الحرث والمزارعة، النسخة الهندية ۱/ ۳۱۲، رقم: ۲۲۶۹، ف: ۲۳۲۷، صحيح مسلم، باب كراء الأرض بالذهب والورق، النسخة الهندية ۲/ ۱۲، بيت الأفكار رقم: ۱۵۴۸)

لا تصح المزارعة إلا على مدة معلومة، وأن يكون الخارج شائعا

بينهما ، فإن شرطا لأحدهما قفزانا مسماة، فهي باطلة؛ لأن الأرض عساها لا تخرج إلا هذا المقدار. (هداية، كتاب المزارعة، أشرفي ٤/ ٤٢٦، مختصر القدوري، ص: ١٥٥، هندية، زكريا قديم ٥/ ٢٣٥، جديد ٥/ ٢٧٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ:شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۴۲۳/۵/۱۹ھ
(الف فتویٰ نمبر:۳۶/۷۶۵۵)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۲۳/۵/۱۹ھ

ایک کا کھیت اور دوسرے کی محنت وبیج ہونے کی صورت کا حکم

سوال [۸۸۵۲]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: بٹائی پر دینا یعنی ایک آدمی کا کھیت دوسرے آدمی کی محنت مزدوری بیج وغیرہ دونوں کے درمیان شامل ہو، تو کیا حکم ہے؟

المستفتی: محمد اطہر بن عبد الجلیل ارریہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بٹائی کی یہ مخصوص صورت کہ ایک آدمی کا کھیت ہو اور دوسرے آدمی کی محنت ومزدوری اور بیج وغیرہ میں دونوں شامل ہوں، شرعاً جائز نہیں ہے۔
(مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳/۵۲۲)

دفع رجل أرضه إلى آخر على أن يزرعها بنفسه وبقره والبذر بينهما نصفان، والخارج بينهما كذلك فعملا على هذا، فالمزارعة فاسدة. (شامي، كتاب المزارعة، زكريا ٩/ ٤٠٦، كراچى ٦/ ٢٨١، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٤/ ١٤٤، مصري قديم ٢/ ٥٠١، المبسوط للسرخسي، دارالكتب العلمية بيروت ٢٣/ ٣٠)

اور اگر بیج کل کے کل کسی ایک کی طرف سے ہوں تو بٹائی کی یہ مذکورہ شکل شرعی طور پر جائز اور درست ہے۔

إن کان الأرض لواحد والعمل والبقر والبذر لواحد جازت. (هداية، کتاب المزارعة، اشرفی ٤/ ٤٢٦، مختصر القدوري، ص: ١٥٥، الدر مع الرد، زکريا ٩/ ٤٠١، کراچی ٦/ ٢٧٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۳/۴/۱۴۲۳ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۶/۷۶۱۱)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۲۳/۴/۱۴۲۳ھ

مزارعت میں خاص مقدار میں غلہ متعین کرنا

سوال [۸۸۵۳]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے بکر سے ایک قطعہ زمین کرایہ پر لیا اور ایک تیسرے شخص کے ساتھ مزارعت کا معاملہ کیا، بایں طور کے تم خود کھیتی کرو میں تم کو دانہ کھاد وغیرہ کچھ بھی نہیں دوں گا، تم صرف ہر فصل پر مجھ کو اتنی تعداد غلہ دے دینا، چاہے پیداوار کتنی بھی زیادہ ہو یا کم ہو تجھ کو اس سے کوئی سروکار نہیں، کیا اس طرح کا معاملہ شریعت مطہرہ میں جائز ہے؟

المستفتی: سعید احمد قاسمی ٹانڈہ بادلی، ضلع رامپور

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللہ التوفیق: یہ معاملہ شرعاً باطل ہے؛ کیوں کہ مزارعت میں کسی ایک فریق کے لئے غلہ کی خاص مقدار متعین کرنا جائز نہیں ہے۔

عن حنظلة بن قيس الأنصاري، سمع رافع بن خديج قال: كنا أكثر أهل المدينة مزدرعا، كنا نكري الأرض بالناحية منها مسمى لسيد الأرض، قال: فمما يصاب ذلک وتسلم الأرض، ومما تصاب الأرض ويسلم ذلک، فنهينا، وأما الذهب والورق فلم يكن يومئذ. (صحيح البخاري، کتاب الحرث والمزارعة، النسخة الهندية ١/ ٣١٢، رقم: ٢٢٦٩، ف: ٢٣٢٧، صحيح مسلم، باب کراء الأرض بالذهب والورق، النسخة الهندية ٢/ ١٢، بيت الأفكار رقم: ١٥٤٨)

لا تصح المزارعة إلا على مدة معلومة، وأن يكون الخارج شائعا بينهما، فإن شرطا لأحدهما قفزانا مسماة، فهي باطلة؛ لأن الأرض عساها لا تخرج إلا هذا المقدار. (هداية، كتاب المزارعة، أشرفي ٤/ ٤٢٦، مختصر القدوري، ص: ١٥٥، هندية، زكريا قديم ٥/ ٢٣٥، جديد ٥/ ٢٧٢) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۱۶/۶/۱۴۰۹ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۱۲۷۱/۲۴)

پیسوں کے عوض میں زمین کو کرایہ پر دینا

سوال [۸۸۵۴]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کوئی شخص اپنی زمین اناج کے بدلے کرائے پر نہیں دیتا؛ بلکہ پیسوں کے بدلے کرائے پر دیتا ہے، مثلاً پانچ بیگہ زمین ڈھائی ہزار (۲۵۰۰) کے بدلے کرائے پر دیتا ہے، یہ جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زمین کو پیسوں کے بدلے کرائے پر دینا مثلاً پانچ بیگہ زمین ڈھائی ہزار روپئے کے بدلے کرائے پر دے تو جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۶/ ۵۵۹، میرٹھ ۲۵/ ۱۱۳)

ما صلح بدلا في البيع يصلح بدلا في الإجارة؛ لأن البدل في الإجارة ثمن المنفعة، وهي تابعة للعين، وما صلح بدلا عن الأصل صلح بدلا عن التبع. (شرح المجلة رستم باز، إتحاد ١/ ٢٦٠، رقم المادة: ٤٦٣)

وما صلح ثمنا في البيع صلح أجرة في الإجارة؛ لأن الأجرة بثمن المنفعة. (مجمع الأنهر، كتاب الإجارة، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٥١٣، مصري

قدیم ۲/ ۳۶۹، هندية زكريا قديم ٤/ ٤١٢، جديد ٤/ ٤٤٢، الدر مع الرد، كراچی ٦/ ٤، زكريا ٩/ ٥، البحرالرائق، زكريا ٨/ ٥٠٦، كوئٹه ٧/ ٢٩٨) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۷ ر جمادی الاخریٰ ۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/ ۱۱۳۴۱)

متعین غلہ کے عوض میں زمین کرایہ پر دینا

سوال [۸۸۵۵]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: کسان اپنی کھیتی کی زمین کرائے پر دیتا ہے، مگر بٹائی کی شکل میں نہیں دیتا، کرائے کی شکل میں دیتا ہے اور کہتا ہے: ہمیں فصل میں فی بیگہ ایک کوئنٹل اناج چاہئے، چاہے تو کھیتی کریا نہ کر کہیں سے بھی اناج لا ہمیں اناج چاہئے، یہ جائز ہے یا نہیں؟

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: زمین کو اس شرط پر کرائے پر دینا کہ ہمیں فی بیگہ ایک کوئنٹل اناج چاہئے، خواہ وہ اناج کوئی سا بھی کہیں سے بھی آیا ہو، اسی زمین سے دینے کی شرط نہ ہو، تو اس طرح کرائے پر زمین دینا جائز اور درست ہے۔ (مستفاد: فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۶/ ۳۵۹، محمودیہ میرٹھ ۲۵/ ۱۱۳)

يجوز استئجار الأرض للزارعة إن بين ما يزرع فيها، أو قال على أن يزرع فيها يشاء وللبناء والغرس، أو يقول له: ازرع فيها ما شئت كي لا يفضي إلى المنازعة. (البحرالرائق، كتاب الإجارة، باب ما يجوز من الإجارة وما يكون خلافا فيها، زكريا ٨/ ١٧، كوئٹه ٨/ ١٠، مجمع الأنهر، دارالكتب العلمية بيروت ٣/ ٥٢٢، مصري قديم ٢/ ٣٨٩)

رجل استأجر أرضا بطعام ولم يسم أين يقبض الطعام، قال: هو جائز.
(تاتارخانية، زكريا ١٥/ ٩، رقم: ٢١٩٢٥)

والحيلة في ذلك لمن أراد الجواز أن يشترط صاحب الحنطة قفيزا من الدقيق الجيد ولم يقل من هذه الحنطة، أو يشترط ربع هذه الحنطة من الدقيق الجيد؛ لأن الدقيق إذا لم يكن مضافا إلى حنطة بعينها يجب في الذمة والأجر كما يجوز أن يكون مشارا إليه يجوز أن يكون دينا في الذمة.

(هندية، كتاب الإجارة، الباب الخامس عشر، الفصل الثالث في قفيز الطحان، زكريا قديم ٤/ ٤٤٤، جديد ٤/ ٤٨٠) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۸؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۵ھ
(الف خاص فتویٰ نمبر: ۴۰/۱۱۵۶۳)

غیر کی ملکیت میں لگایا گیا پودا کس کا ہوگا؟

سوال [۸۸۵۶]: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: زید نے اپنی زمین سمجھ کر اس میں پودا لگایا اور پوری سینچائی سالہا سال کرتا رہا؛ لیکن زمین پیمائش کرنے پر زمین اور پودا سب بکر کے حصہ میں نکل رہا ہے، حالانکہ قبضہ اور پودے کی سینچائی زید نے کی ہے، از روئے شرع پودا کس کو دیا جائے؟

المستفتی: محمد نعیم الدین جھگڑوا، دربھنگہ

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

الجواب وبالله التوفيق: درخت اور پودے کا اصل مالک وہی ہوتا ہے جس نے درخت لگایا ہو اور اس کی دیکھ بھال کی ہو؛ البتہ پیمائش کے بعد زمین جس کے حصہ میں نکلے گی وہی زمین کا مالک ہوگا اور زمین کے مالک کو زمین کی مناسب اجرت دلوائی جائے گی۔

(کفایت المفتی ۷/ ۳۴۷، جدید زکریا مطول ۱۱/ ۵۷۶، امداد الفتاوی ۳/ ۵۲۰)

حدثنا أبو جعفر الخطمي، قال: بعثني عمي أنا وغلاما له إلى سعيد

بن المسيب، قال: قلنا له شيء: بلغنا عنك في المزارعة؟ قال: كان ابن عمر لا يرى بها بأسا، حتى بلغه عن رافع بن خديج، حديث، فأتاه فأخبره رافع أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أتى بني حارثة، فرأى زرعا في أرض ظهير، فقال: ما أحسن زرع ظهير، قالوا: ليس لظهير، قال: أليس أرض ظهير؟ قالوا: بلى، ولكنه زرع فلان، قال: فخذوا زرعكم وردوا عليه النفقة، قال: رافع: فأخذنا زرعنا ورددنا إليه النفقة. (سنن أبي داؤد، البيوع، باب في التشديد ذلك، النسخة الهندية ۲/ ۴۸۳، دارالسلام، رقم: ۳۳۹۹)

وإذا فسدت عنده، فإن سقى الأرض وكربها ولم يخرج شيء فله أجر مثله لو البذر من رب الأرض، ولو منه فعليه أجر مثل الأرض، والخارج في الوجهين لرب الأرض. (شامي، كتاب المزارعة، زكريا ۹/ ۳۹۸، كراچی ۶/ ۲۷۵، هداية، أشرفی ۴/ ۴۲۵) **فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم**

کتبہ: شبیر احمد قاسمی عفا اللہ عنہ
۲۰؍ جمادی الثانیہ ۱۴۱۶ھ
(الف فتویٰ نمبر: ۳۲/ ۴۵۰۶)

الجواب صحیح:
احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ
۱۴۱۶/۶/۲۰ھ